محفل شعرو سخن
قارئین
150
آپ کے ہاتھوں بجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

منتقم مزاج
دانش علی
153
واقعات میں دخل اندازی کرنے
والے ایک بلیک میلر کی چالبازی

ماروی
محی الدین نواب
168
ایک چہرے کی دھوپ کبھی چھاؤں کی دھوپ محبت کی
عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

تسبیح
منظر امام
215
رشتوں کی حقیقتوں کو واضح کرتی
ایک دلخراش روداد

فخر دین و دنیا
ضیا تسنیم بلگرامی
223
دین و دنیا کا فخر بننے والے
ایک بشر کا خاص قصہ

بے وفا
فرحت یاسمین
237
احساس سرشاری میں دنیا کو فراموش
کرنے والے ایک جوڑے کی اڑان

شہ مات
سلیم انور
241
پل بھر میں مات کھانے
والے ایک شرزور کا ماجرا

رات کا مسافر
طاہر جاوید مغل
252
منظور نظر کی نظروں میں رہنے
کے لیے ایک اندھے راستے کا زندہ ماجرا

پبلشر و پروپرائٹر: نیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

دنگل

جون ایلیا

''کتبیان! اے صاحب وجود و وجدان، اے صاحب حجت و برہان! وہ کلام کیا تھا جو ہم کر رہے تھے؟''

''صاحبی! ہم ان پانچ جوہری بموں کے دھماکوں، جوہری بموں کے جہنمی دھماکوں کے بارے میں کلام کر رہے تھے جو پچھلے دنوں ہندوستان نے کیے اور گاندھی جی کی اہنسا، امن اور آشتی کے لیے اور زندگی کی نرمی، نمی، شادابی اور شادیاگی کو نگے، بے ڈھنگے اور لنگڑے جھٹکے دیے اور پھر اس کلام میں برطانیہ کے سامراج کی سازشوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ کہا گیا تھا۔''

''ہاں کتبیان! مجھے یاد آیا کہ اس کلام کا سلسلہ یہی تھا اور یہ بھی یاد آیا کہ پھر اس کے چند روز کے بعد ہم نے سرزمین خوش آب و شاداب کا رخ کیا تھا اور اپنے شجرے کے بزرگ سید وارث شاہ کے فیضان کے مہمان ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں حقیقت کی حقیقت کے چھلکے سے اس کے مغز اور معنی کا رزق حاصل کیا تھا اور اس کی ہڈیوں کو کتوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔''

''حضرت صاحب، جونی جی! کچھ ایسی ہی بات فارسی کے کسی عالی مرتبہ شاعر نے بھی کہی ہے۔ یعنی یہ بات کہ ہم نے مغز کا عرفان اور فیضان فیضان تو کسب کرلیا۔ اب رہیں ہڈیاں تو وہ وقت کے برتنوں اور بازاروں میں بھیڑ سے لگانے والے جانداروں کے تھوبڑوں کے آگے ڈال دی ہیں۔''

''تمہیں خوب یاد آیا کتبیان!''

''ہاں مجھے یاد آیا اور وہ یہ کہ ہندوستان کے جوہری بموں کے دھماکوں کے بعد ہم دونوں پنجاب چلے گئے۔ کچھ دن بعد وہاں جو کچھ ہوا وہ تو بہت حیران کرنے والا تھا۔ یعنی مئی کے مہینے کی کسی تاریخ کو پاکستان نے بھی جوہری بم کے پانچ دھماکے منعقد کر دیے۔ اس دفاعی جہاد نے پنجاب کے خواص و عوام کو پائے کوبی، دست افشانی اور وجد کے حال میں مست و بے خود کر دیا اور جب ان دھماکوں کے دوسرے دن پاکستان نے پانچ اور پانچ کا حساب برابر کر کے چھٹا دھماکا کیا تو پنجاب کے لوگوں کو کچھ ایسے معجزاتی فیضان کی رسد نصیب ہوئی جو کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔

''تو بات یہ ہے کہ مجھے ان دنوں پنجاب کے شہروں میں نشاط و طرب کی وہ کیفیت کارفرما دکھائی دی جس کا مجھے آزادی کے بعد دو تین بار ہی تجربہ ہوا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد پاکستان کے ماہر فوجی مبصرین نے جو خوش نقش رقم فرمائی تھیں، ان میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا تھا کہ ہندوستان، پاکستان سے دس گنا طاقتور ہے۔

''سالہا سال کی اس کیفیاتی صورت معاملہ کے ذہنوں میں نقش ہو جانے کے بعد جب پاکستان نے ہندوستان کے پانچ جوہری بموں کے دھماکوں کے بعد چھ جوہری بموں کے دھماکے کیے تو قوم جہاد کے سرور مقدس سے سرشار ہوگئی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کو سمجھنے میں کسی دشواری کی گنجائش نہیں تھی۔

پھر یہ کہ پاکستان کے خواص اور عوام کو جو اخلاقی برتری حاصل تھی، وہ یہی تھی کہ جوہری بموں کی بازگشت برسانے میں ہندوستان نے پہل کی تھی پاکستان نے نہیں۔

میرے ان خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے شاعر وزیر اعظم نے نہایت غیر شاعرانہ رویے کا ارتکاب کیا اور یہ کہ انھوں نے ہندوستان میں جوہری بموں کے پانچ دھماکے کیے اور پاکستان میں چھ دھماکے کرائے۔ جن کا حاصل جمع کیا ہوا؟

''کتبیان! میں نے صورت معاملہ کے ایک رخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ میرے گمان میں قابل لحاظ حد تک درست ہے۔ مگر جانا اور مانا جائے کہ اس کا ایک اور رخ بھی ہے اور اس کے باب میں پاکستان کے سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلوں کے نہایت محترم اور معتبر ماہروں اور عالموں نے ہمیں بڑی دانش جوئی، دانش طلبی، دانش یاری اور دانش مندی کے ساتھ پُرزور اور ارجمند افادات سے نوازا ہے۔ ان کے افادات کا جوہر یہ ہے کہ ہم اپنے الجھے ہوئے معاملوں کو پہلوانوں اور جانبازی کارروائی کے پُرجوش اور جہاد پسند تومندوں کی طرح طے کریں گے تو چاروں خانے چت ہوں گے اور حریف ہمیں تاریخ کے دنگل میں بری طرح منہ کے بل دے مارے گا۔ مانا کہ زندگی ایک دنگل ہے۔ جس میں کشتی لڑی جاتی ہے اور ''دھوبی پاٹ'' اور ''لوکان'' جیسے داؤ مارے جاتے ہیں۔ مگر زندگی دنگل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے بلکہ اس کے علاوہ ہی سب کچھ ہے۔ وہ دانش، دلیل، حجت اور برہان کی ایک مباحثہ گاہ ہے جہاں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کے حال اور مستقبل کے سب سے زیادہ مبہم اور اہم قضیوں کو طے کیا جاتا ہے۔ یہ دور دنگلوں اور ''میدان داریوں'' کا دور نہیں ہے۔ یہ تفکر اور تدبر کا دور ہے۔ اس دور کا ہم سے جو سب سے زیادہ توجہ طلب تقاضا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بائستہ و بجو و شائستہ بقا اور اپنے ہمہ جہت ارتقا کے وسعت اور گرد و پیش سے آگاہی حاصل کریں۔

ہم فاقہ کش اور فلاکت زدہ ڈھور ڈنگر ہیں۔ ہم جہل اور جنگلی پن کا ایک بے ڈھنگا ریوڑ ہیں۔ ہماری آبادی کے سب سے بڑے گلے کو کسی طرح بھی ''حیوان ناطق'' کے خانے میں مندرج نہیں کیا جا سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ''نیم انسان'' ہیں۔

جان لیا جائے کہ میں یعنی جون ایلیا کسی بھی نسلی، لسانی اور مذہبی گروہ کی خوشنودی کمانے کی خاطر بیہودہ نگاری اور قلم دوات اور کاغذ کی فحاشی کا مجرم قرار پانے کے لیے اپنی آخری سانس تک تیار نہیں ہوں گا۔ سنا جائے اور سمجھ جائے کہ ''جون ایلیاؤں'' کو روٹی کی روٹی چاہیے۔ انہیں تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے چاہئیں۔ ان کے بیمار ڈھانچوں اور ڈھچروں کو دوائیں چاہئیں۔ ان ڈھور ڈنگروں کو کسی نہ کسی حد تک انسان کہلائے جانے کے لیے حرفوں کی شدید چاہیے۔ یہ ذہن کی جولانی، جہد اور اجتہاد کا دور ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو ماننے میں الکساہٹ سے کام لے رہے ہیں، انہیں اپنے جسد کے لیے کافور اور کفن کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆

عزیز قارئین
السلام علیکم!

مئی 2015ء..... موسم گرما کا دلچسپ شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ موسم چاہے گرم ہو یا سرد، آج حالات کی گرما گرمی نے ہر انسان کو ماحول بدلنے کی فکر میں مبتلا کیا ہوا ہے کیونکہ گوار تسلسل کی وجہ سے سب کا مزاج برہم ہے۔ پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں جس طرح مچھلی بازار کا گمان ہو رہا تھا اور مثال بننے اور قانون کی بالادستی کا نعرہ لگانے والے جس طرح بدنظمی اور بے قاعدگی کا اظہار کر رہے تھے اور عالمی سطح پر میڈیا نے جیسے مناظر پیش کیے، کیا اس سے پاکستان کے تشخص اور وقار میں اضافہ ہو رہا تھا ..... یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے..... نئی نسل کو اندرونی سیاست سے متعارف کرانے اور بین الاقوامی سطح پر ایک نئی سوچ کو ترتیب دینے کا یہ طریقہ کس قدر مثالی ہے اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ عوام کے مفاد کا صرف نعرہ لگانے سے کام نہیں چلے گا، اس کا عملی ثبوت بھی چاہیے..... یکم مئی بظاہر تو مزدوروں کے نام پر منایا جانے والا فقط ایک عالمی دن ہے ... اگر اس دن اس طبقے کے مسائل کے حل کی جانب بھی کوئی بہتر قدم اٹھایا جائے تو اس دن کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ جیسے کہ اچھی تعلیم کا حصول اس طبقے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد بااختیار طبقے کے دل میں بے روزگار عوام کے لیے درد تو اٹھتا ہے مگر علاج کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاندار کامیابی کے لیے مہنگے اسکولوں کے بجائے بہترین اساتذہ اور کم بجٹ میں تعلیم کا حصول ممکن بنا دیا جائے تو مزدور طبقے کا ایک بڑا خواب پورا ہو جائے، جسے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں، اس کے باوجود اکثر زیادہ فیس ہونے کی وجہ سے ادھوری تعلیم چھوڑ کر تلاش معاش کے لیے نکلنا پڑتا ہے ..... اور یہ ایک انتہائی تکلیف دہ لمحہ ہوتا ہے جب کوئی اپنے مقصد سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی طرف گامزن ہوتا ہے اور جناب اتنی گرما گرم باتوں کے بعد ہم چلتے ہیں اپنی ٹھنڈی چھاؤں جیسی محفل کی جانب، جہاں مطلع کہیں ابر آلود اور کہیں تیز دھوپ ہے۔

✠ **بلقیس خان**، واہ کینٹ سے محفل کی رونق بنی ہیں "اپریل کا شمارہ سامنے ہے۔ کمان ابرو شہد رنگ زلفیں، چوڑیاں بالیاں لالیاں سب دیکھنے کے لائق سوائے لڑکی کے۔ واہ کیا کہنے جون ایلیا کے کٹھن لفظوں کے۔ محمد صفدر معاویہ، دلکش تبصرے کے ساتھ سرفہرست رہے۔ برادر سانحہ دسمبر 71ء نے ہزیمت، شرمندگی، شکست اور بے بسی کے اصل معنی سمجھائے یہ تو فقط کھیل ہے اس کو کھیل ہی سمجھیں۔ دکھ ٹیم کی ہار سے زیادہ کھلاڑیوں کی تذلیل سے ہوتا ہے۔ طالب حسین طلحہ، اللہ پاک نے آپ کو با عزت بری کیا، مبارک ہو۔ دعا ہے دیگر بھائی بھی سرخرو ہوں۔ نادر سیال! ہمارے دل کا حال بھی آپ کے دل جیسا ہے۔ آفریدی کے چھکے پر بھی آنکھیں بند کر لیتی ہوں کہ کیا باؤنڈری پہ کیچ ہو گیا، اس کا آسان حل یہ نکالا کہ اب میچ دیکھتی ہی نہیں۔ کوئی نہ کوئی مصروفیت نکال لی لیکن کان کنٹری کی طرف دعائیں مانگ مانگ کے زباں خشک ... بہرحال جیت کا اصل حق اسی کا ہے جو اچھی کارکردگی دکھائے۔ اب تو پڑوسی بھی سیمی فائنل ہار گیا۔ اپنی شکست کے بعد اگر کسی ٹیم کی شکست کا دکھ ہوتا ہے تو وہ انڈیا ہے۔ یہ میری اپنے خطے سے محبت اور وفاداری ہے۔ بہترین تبصرہ احسان سحر کا، احمد خان توحیدی! بڑے خطرناک عزائم ہیں آپ کے۔ ہم تو پہلے ہی ورلڈ بینک کے مقروض ہیں آپ مزید اضافے کی بات کر رہے ہیں۔ دیگر جامع تبصروں کے ساتھ روحی نیازی، مہرین، طاہرہ اور نادر سیال رہے۔ زیب حسن، درشہوار، ادریس خان اور ابرار وارث نے بھی اچھا لکھا۔ اور اب کہانیوں پہ عرض کریں، ساری ہمدردی، دور ماندہ عشق کے فیروز بخت کے ساتھ مگر اس نے سارے تجسس کا بیڑا غرق کر دیا بھکاری بن کر۔ یہ مانا کہ عشق نے کچھ ذات مگر یہ کیسا عشق تھا خود بھیک مانگتے سالوں در بدر اور محبوبہ دلنواز حویلی کے لیے آنسو بہاتی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید تقط، سچے موتی، سورج، صبح نور، صادق جذبوں کے امین اور درد دل کی بے بہا دولت رکھنے والے ڈاکٹر صاحب آپ کی "محاذ" حاصل مطالعہ رہی۔ عذاب ماضی، عمدہ کاوش تھی۔ اختتام آزردہ کر گیا۔ سودائے جنوں، ڈاکٹر بھٹی کی نہایت عمدہ تحریر ہے۔ خدا کرے امت مسلمہ امریکی چالوں کو سمجھے، دعا ہے بین المذاہب ہم آہنگی ہو اور زمین فساد فی الارض سے بچی رہے۔ پانی میں شکار، سام کی موت کی ذمے دار انجیلا ہی نہیں خود اس کی دوست بھی تھی جس نے آخر دم تک انجیلا پر پردہ ڈالے رکھا۔ سلاسل مکافات، مکافات عمل پر لکھی جانے والی انتہائی سبق آموز تحریر تھی۔ عظیم احمد کا نام پہلی بار سنا ہے یہ میری کم علمی ہے۔ یوں لگتا ہے برسوں سے لکھ رہے ہوں، پہلی بار وکیلوں کی حالت زار سے آگاہی ہوئی اور یہ بھی پہلی بار جانا کہ آسرا دینے والے بھی (شوکت چغتائی کی طرح) بے آسرا ہو جاتے ہیں۔ کاش انسان اپنے بڑوں کی غلطیاں نہ دہرائے۔ کاش ہم ہر اس قبیح فعل کو رد کر دیں جو ہم سے پہلے کر چکے۔ بازوئی، اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اسمارٹ آفیسر مرینہ کھوتی والے پر مرمٹی کیونکہ دنیا میں ہم چلتو جوان مر چکے ہیں۔ منظر امام کاش دنیا میں کوئی ایسا جزیرہ ہوتا۔ فرزند دروغ، بندوبست، بزدل، چال اور دوسری شکست بھی ٹھیک تھیں۔ اشعار میں حنیف گبول، مہرین، زاہد چوہدری، وزوہیب احمد، سونا، نیازی اور محمد طلحہ کے اشعار اچھے لگے۔ اقوال زریں اور کترنیں بھی خوب تھیں۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل**، ماہی ضلع ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "بندۂ ناچیز آپ سب کی خیریت کے لیے دعا گو ہے۔ ماہ اپریل کا خوب

صورت شمارہ بروقت مل گیا اور بہت خوشیاں دے گیا۔ بہاروں کے اس موسم میں گویا ہم نے بہار کے مزے لوٹ لیے ہیں۔ میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کا تہِ دل سے متشکر ہوں جن کی وجہ سے میرا رابطہ ایسے لوگوں سے ہوا جن کی دوستی و محبت پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ وہ لمحہ میری زندگی کا حاصل تھا جب مسافر کے تخلیق کار سرِ نامہ ملک کے میں روبرو تھا۔ چونک اعظم لیے کے یہ زندہ دل انسان اور عظیم قلم کار اپنے دل میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ سے وابستہ لوگوں کے لیے کتنی محبت رکھتے ہیں، اس بات کا اندازہ مجھے ان سے ملنے کے بعد ہوا۔ سرورق پر موجود محبوبہ دل نواز شولڈر پہ کبوتر کو بٹھائے امن و شانتی کا آدرش دیتی نظر آئی۔ فہرست حسبِ سابق قابلِ ستائش انداز میں سجائی گئی۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب کی حکمت و دانش بھری باتیں نگاہ و قلب سے پڑھنے کے بعد اداریہ میں ایڈیٹر صاحب کی پُر فکر باتیں ملاحظہ کرنے کے بعد محفل گلستان میں قدم رکھا تو اس دفعہ بھائی صفدر معاویہ کے ہاتھ گلاب نظر آیا۔ بھائی صدارت مبارک ہو..... زیب حسن ہم بھی مجنوں کے سفیر جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی کوئی داستان پڑھنا چاہتے ہیں۔ ادریس احمد، ابرار وارث، رمضان پاشا، احمد خان توحیدی کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ در شہوار بیرزادہ آپ کا حسنِ نظر ہے۔ مہرین ناز اور ابنِ مشترکہ خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی بھی زبردست تبصرہ کر گئے ہیں۔ سید محی الدین اشتاق آپ کے شہر میں ہم آئے اور آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ سب سے پہلے حسبِ معمول عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں پڑھی۔ اسٹوری بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ عابد شکیری کا کردار اسٹوری میں چھایا ہوا ہے خیر اور شر کی جنگ میں ان شاء اللہ آخر جیت خیر کی ہوگی۔ سودائے جنوں کی موجودہ قسط کا اختتام تجسس کو مزید ہوا دے گیا۔ ماروی میں بھی اس دفعہ کافی ہنگامے نظر آئے۔ اس دنیا میں کوئی ہی شاید پرفیکٹ ہو۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ محبوب کی ماضی کی غلطی ہی تھی کہ وہ ماروی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ویلڈن نواب صاحب۔ آخری صفحات پر عظیم احمد کی سنا سل مکافات بہت ہی خوب صورت اور غور طلب اسٹوری ثابت ہوئی۔ انسان اپنی زندگی میں کیا کچھ کرتا ہے اس بات سے بے خبر کہ کل کو یہ سب کچھ اس کے اپنے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ بیگم چغتائی کو بھی مکافاتِ عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ درماندہ عشق بعشق نہ پوچھے ذات فیروز بخت کی داستانِ عشق کافی دلدوز ثابت ہوئی۔ عشقِ مجازی انسان کو ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ فیروز بخت کو بھی آخر دریوزہ گری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ کاشف زبیر صاحب کی عذابِ ماضی اور ثمر عباس کی بزدل بھی بہت عمدہ ولا جواب ثابت ہوئیں ویلڈن۔ محفل گل و بو یعنی محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، در شہوار بیرزادہ، لبنیٰ علیم مشاز یہ کمال کے اشعار اچھے لگے۔ اپریل کا شمارہ بیسٹ اینڈ بیسٹ ثابت ہوا۔“

✠ وسیم احمد خان، خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ”ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے تو ہم بھی دم بخود رہ گئے کہ دیتا ملک ٹاپ حسینہ نے بازو پر ٹیٹو زبنوا رکھے ہیں مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ حسینہ کے ڈریس کا کلر اسکن ہے۔ حسینہ کے کاندھے پر بیٹھے کبوتر نے ٹائٹل کی خوب صورتی کو بڑھا دیا۔ انشائیہ کے بعد محفل میں پہنچے، صفدر معاویہ بھائی مبارک ہو بھئی۔ مارچ میں وزارت اور اپریل میں صدارت ویلڈن۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ طالب حسین طلحہٰ بھائی آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی سزا ختم ہوئی آپ باعزت بری ہو گئے۔ احسان سحر پیارے بھیا آپ نے لکھا ہے کہ محفلِ یاراں میں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے علم اور سمجھ کے مطابق بونگیاں مارتے نظر آئے۔ خطوط کے اینڈ میں ہم نے اپنے آپ کو بلیک سنڈے کی صدارت کرتے ہوئے پایا۔ کہانیوں کا آغاز جمال دستی کی پانی میں شکار سے کیا۔ انجیلا کی چالاکی ایک آنکھ نہ بھائی۔ منظر امام کی سنجیدہ سی اسٹوری سنجیدہ انداز میں اچھی لگی۔ پناہ گاہ میں ماہر کو پروفیسر قدوائی کی صورت میں اپنا ہم رکاب مل گیا۔ ثمر عباس کی بزدل میں کوثر نے جیتی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بندوبست میں تنویر ریاض نے گستاووکی لڑکیوں کی حفاظت اور انجیلا کی ملازمت کا اچھا بندوبست کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی گھاؤ بھی عصرِ حاضر کے مطابق زبردست تحریر رہی۔ ارم واحد بٹ کی حسین اتفاقات کہانی کا نام اور کہانی کا مکمل ایک سا محسوس نہیں ہوا۔ ملک صفدر حیات کی فرزند در و خ میں آسیہ کی موت کا دکھ ہوا۔ محفلِ شعر و سخن اس مرتبہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ سب اشعار بس ٹھیک ہی لگے۔ کترنیں اور معلومات سب دلچسپ رہیں۔ 23 مارچ قرار دادِ پاکستان کا دن اپنی رسمی کارروائی کے ساتھ گزر گیا۔ آج پاکستان کا حال دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین۔“

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے چلے آ رہے ہیں ”سسپنس اپریل میں ہمارا تبصرہ اور شعر شائع ہوئے بڑی نوازش۔ شکریہ۔ الیاس صاحب کی رومانوی کہانی تاریخ کے جھروکوں سے درماندہ عشق بہت خوب کہانی رہی۔ پڑھ کر بہت سارے رومانوی کردار جیسے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، شیریں فرہاد اور سوہنی ماہیوال ان سب لوگوں نے عشق میں کچھ نہ کچھ کیا۔ کسی نے دودھ کی نہر تو کوئی سر کو پھاڑ کر راہِ عشق میں امر ہو گئے یا آئے مگر الیاس صاحب کے فیروز بخت نے تو کمال کر دیا۔ تخت اور تاج کو لات مار کر ایک بھکاری کے عشق میں بھکاری بن گیا وہ بھی ایسے ویسے نہیں۔ ساری برادری کے من پسند بھکاری۔ الیاس صاحب کیا خوب اور منفرد کہانی لے کر آئے۔ بہت خوب۔ درخواست ہے ایسی ہی کوئی دلچسپ کہانی پھر ہو جائے۔ بندوبست تنویر ریاض، بزدل ثمر عباس کی کہانیاں خوب تھیں منظر امام صاحب بڑی دلچسپ کہانی لے کر آئے۔ پناہ گاہ قدوائی صاحب جیسے کردار منظر صاحب ہی لکھ سکتے ہیں۔ عظیم صاحب کی آخری صفحات میں بیگم چغتائی کی اثر انگیز کہانی ہے۔ سچ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اپریل 2015ء کے سسپنس کے سرورق کی دوشیزہ نہ صرف حسین تھی بلکہ تندرست بھی تھی، کبوتر بھی خوب صورت اور توانا تھا۔ انشائیہ جون صاحب سے نجات پانے کا سبق از بر کیا۔ محفل میں اول نمبر پر آنے والے محمد صفدر معاویہ کو مبارکباد، موصوف کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ نادر سیال بھائی آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنے تبصرے میں اس حقیر فقیر کا بھی ذکرِ خیر کیا۔ اشعار کی محفل میں عمران قاسم، در شہوار، عبدالجبار رومی انصاری کے اشعار بہت پسند آئے۔ سب کو داد دیتا ہوں اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ سودائے جنوں اور ماروی کی یہ

قسطیں بہت دھما کا خیز تھیں۔ کشش و بیچ میں پڑا ہوں کہ کسے اول نمبر دوں اور کسے دوم۔ ساحل مکافات، یہ ناول بہت عمدہ تھا۔ حسین اتفاقات، غیر ملکی کہانیوں میں سب سے اعلیٰ درجے کی کہانی تھی۔ بہت لطف آیا۔ کھاؤ حسب معمول شیر شاہ صاحب نے ایک حساس موضوع پر مضمون تحریر کیا۔ اختتام پر آنکھیں نم ہو گئیں۔ بندوبست نہایت بور کہانی تھی۔ چال، بہت دلچسپ، جیسے کو تیسا۔ پناہ گاہ، اس بار منظر صاحب قاری کو جھانسے میں ناکام رہے۔ دوسری شکست، خاصی متاثر کن تھی۔ سائنسی کہانی عذاب ماضی نے دل میں بڑا تہلکہ مچا دیا۔“

✱ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ”اپریل 2015ء کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ گرمی کا اثر سرورق پر بھی نظر آیا۔ جون ایلیا گمشدہ حکمت کو پانے کا مشورہ دیتے نظر آئے۔ اداریہ کرکٹ و سیاست سے مزین رہا۔ کوارٹر فائنل میں شکست کے فوری بعد کچھ کھلاڑیوں کو ہنستے اور قہقہے لگاتے دکھایا گیا۔ شاید گھر واپسی کی خوشی انہیں قہقہے لگانے پر مجبور کر رہی تھی۔ کرسیِ صدارت پر اپنے شہر خانیوال کے محمد صفدر معاویہ کو قابض دیکھ کر ہم بھی خوشی سے پھول کر کپا ہو گئے۔ تبصرہ کافی جامع تھا جس میں حالاتِ حاضرہ کو بھی موضوع بنایا گیا۔ ورلڈ کپ میں بھارت سے ہارنے کی روایت ہم سب کے لیے افسردگی کا باعث ہے۔ محمد صفدر بھائی آپ زیادہ دل پر نہ لیں۔ زیب حسن! آپ آتے رہا کریں۔ سال میں ایک دفعہ آنا کوئی فارمولا تو نہیں ہے۔ آپ کی تجویز سے ہم متفق ہیں اور اس مطالبے میں آپ کے ساتھ ہیں۔ طاہرہ گلزار کا شکووں سے بھرپور تبصرہ بھی کافی پراثر رہا۔ طاہرہ باجی! ہم تذکرہ برائے تذکرہ نہیں کیا کرتے۔ اس بار آپ کا جاندار تبصرہ دیکھ کر واہ واہ کر رہے ہیں۔ ادریس احمد خان عمر رفتہ کو آواز دیتے نظر آئے۔ ابرار وارث! یہ تو اچھی بات نہ ہوئی بھیا۔ احمد خان توحیدی! نواب انکل نے آپ کی بات مان کر ماروی اور مراد کی شادی کروا دی ہے۔ نئی زمانہ بیوی ایک بلا ہے اور بلا ایک ہی کافی ہوتی ہے اس لیے ہمیں تو مزید کی حسرت نہیں ہے۔ ہاں، آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ نادر سیال! پاکستان کا میچ دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ 15 سے 20 اوورز بعد دیکھا جائے۔ ورشہوار! انچارج اکیلی زکوٰۃ نکالتی رہتی ہیں ڈونٹ وری! اور آپ کے لیے ایک مفت مشورہ ہے کہ بناپتی چیزوں سے ذرا دور رہا کریں۔ عمبرین ناز اور اعجاز راحیل کا مشترکہ محبت نامہ پڑھ کر دور جدید کے مقولے ”دنیا ایک گلوبل ویلج ہے“ پر یقین آگیا۔ عبدالجبار رومی انصاری! درست کہا آپ نے سسپنس نے بلاشبہ پورے پاکستان کے قارئین کو ایک رشتے میں جوڑ رکھا ہے۔ احسان سحر! کافی شاعرانہ انداز تبصرہ تھا۔ کچھ راز کی باتوں کا ذکر بھی تھا ذرا ہمیں بھی پتا چلنا چاہیے۔ رہی بات ہارٹ کچر کی تو وہ اب ایک کھلا راز ہے۔ محی الدین اشفاق! سسپنس کا شمارہ 17 تک آجاتا ہے ذرا نزدیکی ایجنسی سے طلب کریں تو آپ کو یقیناً مل جائے گا کیونکہ یہ میرا آزمودہ نسخہ ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے درماندہ عشق پڑھی۔ پہلے حمرہ، پھر داؤد اور اب فیروز بخت تینوں نے عجب عشق قصے ترتیب دیے۔ تاہم فیروز بخت سب پر بازی لے گیا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ عشق نہ پچھے ذات۔ فرخندہ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنا مال و دولت، کاروبار جاہ کدا وسب لٹا دی۔ البتہ فرخندہ کی خواہش کہ وہ ملک التجار کی بیوی کہلائے پوری نہ ہو گی۔ سودائے جنوں میں عابد اور ناتمہ اسرائیلی آبدوز پر اسرائیلی فوجیوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں اور آبدوز تباہی کے دہانے پر، دیکھیں اب کیا انجام ہوتا ہے؟ ماروی میں آخرکار مراد اور ماروی رشتۂ ازدواج میں بندھ ہی گئے۔ محبوب اور میرا بھی تمام حدیں پار کر چکے ہیں۔ شاید اب میرا کی بات بھی بن جائے۔ بے اور بلی کا کردار بھی مزہ دے گیا۔ آخری صفحات پر عظیم احمد ساحل مکافات لے کر آئے۔ بیگم چغتائی نے باپ سے جو سلوک کیا فاران نے ان سے وہی سلوک کیا یقیناً فاران کا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ فاران جس طرح بیگم چغتائی کے وکیلوں کو قابو کر رہا، اس سے اس کی منفی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ شاید منصور اس کا سبب سے آسان شکار ثابت ہوا۔ کاشف زبیر کی عذاب ماضی مستقبل کی سائنسی ترقیوں پر مشتمل ایک تصوراتی کہانی تھی۔ سسپنس، ایکشن اور تھرل سے بھرپور کہانیوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید حسب معمول طبی سہولتوں کی ناکامی پر افسردہ نظر آئے۔ قمر عباس کی بزدلی نے بہت گہرا اثر چھوڑا۔ کوثر کی وقت گزاری نے جعفر کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی زندہ درگور کر دیا۔ کوثر کی بزدلی پھر آڑے آئی اور ازالے کا جو ایک موقع اسے ملا اس نے وہ بھی کھو دیا۔ پناہ گاہ، منظر امام کی ایک ملاحتی تحریر تھی جس میں انہوں نے حسب سابق معاشرے کی برائیوں اور سیاست کے گند کا ذکر کیا۔ بابر نعیم کی دوسری شکست مغرب کے آزاد ماحول کے حامی افراد کے لیے ایک سبق آموز تحریر ہے۔ جہاں لڑکیوں کو شوہر ڈھونڈ کر نہیں نہ صرف سپورٹ کرنا پڑتا ہے بلکہ شوہر کی تلاش میں سرگرداں دیگر لڑکیوں سے بچانا بھی ہوتا ہے۔ کترنوں میں اسد عباس کی کترنوں نے مزہ دیا۔ محفل شعر و سخن میں شازیہ کمال کراچی اور جاویہ بلوچ کا انتخاب پسند آیا۔“

✱ **زویا اعجاز**، لاہور سے تشریف لائی ہیں ”3 ماہ کے طویل وقفے کے بعد آج قلم اٹھایا ہے اور سسپنس کی محفل میں حاضری دینے حاضر ہیں۔ ڈائجسٹ اس بار 17 مارچ کی ایک پر بہار شام کو موصول ہوا۔ ٹائٹل ایک آنکھ نہیں بھایا جناب۔ اداریہ سے اگر گزر کرتے ہوئے جون ایلیا سے گمشدہ حکمت و دانائی کی میراث کے موتی سمیٹے۔ محفل کے شرکا اور تمام ہم وطنوں سمیت ان سطور کے ذریعے عالمی کپ کے ارمانوں اور امنگوں کے ناگہانی وصال کی ہم تعزیت کرتے ہیں۔ بڑے بے آبرو ہو کے ایڈیلیڈ کے کوچوں سے ہم نکلے۔ پھر بھی ہمارے ارادوں اور حوصلوں کی دیواریں کون سی کمزور ہیں۔ اس امر سے آگاہی کے باوجود کہ کھیلوں میں سیاست اور سازشیں دخیل ہیں۔ ہم آئندہ بھی یوں ہی اپنی وابستگی کا سفر جاری رکھیں گے۔ الیاس سیتاپوری کی درماندہ عشق کا آخری پڑاؤ بہت سے اتار چڑھاؤ کے بعد تمام ہوا۔ پہلے ہی حصے سے ان کے تمام تر کردار اپنے جبلتے کا مکمل آئینہ تھے۔ فیروز بخت کا مجازی عشق کی خاطر دریوزہ گری جیسی حنت کا شکار ہو جانا بہت کریہہ فعل تھا۔ فرخندہ کی زندگی کا تشنہ خواہشات کا مرقد بن جانا اس کے اپنے اعمال کا صلہ تھا۔ اگر عقل سے کام لیتی تو نہایت معزز اور پرتعیش زندگی بانہیں کھولے اس کی منتظر تھی۔ سائنس فکشن کی کمان اس بار کاشف زبیر کے ہاتھ میں نظر آئی۔ خلائی سفر اور قدرت کے بھید ہمیشہ انسان کے لیے ایک معما بنے رہیں گے۔ کہانی نے مکمل طور پر سحر زدہ رکھا۔ سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی عمیق نگاہ اور گہری

ریسرچ کا واضح ثبوت ہے۔ یہودیت کے تانے بانے آشکار کرتا یہ ناول ان کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ حسین اتفاقات میں روتھ کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ اینگس کے ساتھ کی گئی ناحق بے وفائی کا نا قابلِ فراموش بدلہ ملا اسے۔ فرزند دروغ میں عاقبت نا اندیش والدین کی انا پرستی نے آسیہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ لیاقت علی نے اپنی مردانگی کے زعم میں آسیہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی گھاؤ میں سسکتی انسانیت اور اربابِ اقتدار کی بے حسی کا نوحہ بہت عبرت ناک تھا۔ بندوبست اور بزدل مغربی تہذیب کا ایک جزوی آئینہ نظر آ گئیں۔ ماروی اب دیوتا اور واپسی کی کمس چاٹ بن چکی ہے جس میں دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں۔ چال اور دوسری شکست بھی بہتر تھیں۔ منظر امام کی پناہ گاہ ہمیشہ کی طرح مختصر اور پُراثر و پُر فکر...... وہ وقت دور نہیں جب جنگلوں میں انسان بسیرا کریں گے اور انسانی بستیوں پر حیوانیت اور درندگی کا راج ہوگا۔ خواجہ احرار روحانی کمالات کی ایک ایمان افروز تحریر جو ہمیشہ ہمیں اپنی بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اعادہ کراتی تھی۔ پانی میں شکار مغربی عورت کے چلتر اور بے حسی کا ایک چھوٹا سا ٹریلر۔ آخری صفحات پر عظیم احمد کی سلاسل مکافات بے حد جاندار تحریر تھی۔ کہانی کی بنت شاندار اور تمام ٹوئسٹ اور ٹرن متوقع تھے۔ عظیم احمد کے اندازِ بیان اور انسانی نفسیات پر عبور نے بہت متاثر کیا۔ اس دنیا میں بوئی گئی فصل ببول کی کٹائی کے بغیر سزا آخرت کی نکہت بھی نہیں مل سکتی۔ مکافات کے سلسلے کی پیکری اب تسنیم کے گرد لپٹی نظر آئی۔ کترنوں میں صفحہ 119 پر رضوان تنولی کا انتخاب بیسٹ تھا۔ محفلِ شعروسخن کے سلسلے میں ہم محمد قدرت اللہ نیازی کے ساتھ تجربے سے بالکل متفق ہیں۔''

✱ **ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی** سے چلے آ رہے ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ بروقت مل گیا جو دیدہ زیب رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ سرورق کی حسینہ ناز نین دوش پر محبتوں کے امین امن کے سفیر کو بٹھائے سوچوں میں پنہاں ہے۔ انشائیے میں حکمت و دانائی کے موتی چنے اور اداریے سے بہرہ مند ہوئے۔ ناموں میں سرفہرست محمد صفدر معاویہ نظر آ رہے تھے۔ سو مبارکباد قبول کریں۔ دیگر دوستوں کی آرا بھی اچھے اچھے انداز لیے ہوئے تھیں۔ انیاس سیتاپوری کی خوب صورت پیرائے میں لکھی ہوئی درماندہ عشق تمام ہوئی۔ فیروز بخت نے اپنے معاملات میں سرخروئی اختیار کی۔ سائنس گلشن عذاب ماضی بھی بہتر تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں بھی دلچسپی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ حسین اتفاقات فرزند دروغ بھی ٹھیک تھیں۔ گھاؤ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی متاثر کن تھی۔ جب مسیحا مسیحائی کرے تو اس کے لیے عقیدت اور محبت تو واجبی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہر کہانی میں معاشرے کے لیے سوال ہوتا ہے مگر شاید ہم بحیثیت قوم بے حس ہو چکے ہیں۔ وقتی طور پر تو متاثر ہوتے ہیں پھر اپنی اپنی پرانی ڈگر پر چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے اور سلسلہ دراز ہی ہوتا جاتا ہے۔ اس کے مداوے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بندوبست میں انیکا نے اچھی سوچ کا ثبوت دیا اور گستاوو اور انجیلا کے لیے آئندہ جینے کا سامان کر دیا۔ محفلِ شعروسخن اور کترنوں نے بھی لمحات کو پُرلطف بنا دیا۔ بزدل میں کو زروا تھوں سے منہ نہ موڑ سکا اور گھی کی نظروں میں بزدل بن گیا۔ دلوں کو تسخیر کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ماروی بھی اپنے اختتامی مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ منظر امام کی پناہ گاہ بھی اچھی تھی۔ خواجہ احرار روح کو تسخیر کرنے والے ولیوں کے قصے کا سلسلہ تھا۔ اللہ سے لو لگانے والے اللہ کے سچے دوست ہوتے ہیں۔ پانی میں شکار جس میں ایک بیوی نے انتہائی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری شکست بھی اچھی تحریر تھی۔ آخری کہانی سلاسل مکافات نے بھی آخری صفحات کی کہانی کا حق ادا کر دیا۔ انسانی رویوں کو اجاگر کرتی بہترین کہانی تھی۔''

✱ **رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن** سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''دل مضطرب، مرغِ بسمل کے مانند تڑپنے لگا فراق یار بام عروج کی حد چھونے لگا۔ بے خودی میں اٹھتے گویا خیالوں میں اٹھتے قدموں نے بارگاہِ محبوب سسپنس کی چوکھٹ کا بوسہ لیا۔ سرورق کی نمائندہ خاتون جلوہ سے ہم رنگ لباس زیب تن کیے یک کلائی میں سونے کی چوڑیاں ہم رنگ 16 ورثاں ''چوڑیاں'' دائیں کان میں سنہری بالی، بائیں شانے پہ تشریف فرما پیام بر دا کیا کبوتر، واہ جی واہ...... دیدہ زیب فہرست میں نے راحت کو پکارا اور رخ کیا۔ میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے حصے میں آیا۔ ایک سطر کالم انشائیہ نجات میں مرحوم جون ایلیا نے گراں قدر منفرد نایاب الفاظ کے جوہر پارے بکھیر دیے۔ اداریے میں آپ کی بات آگے بڑھاتا چلوں۔ انسانی خوشگوار موسم ''دل'' سے منسوب ہوتا ہے۔ محفل خطوط میں طاہرہ گلزار کے خوش رنگ تبصرے نے چراغاں کا سماں باندھ لیا۔ حسن پرست تو سرورق کی بہت خوانی تعریف ہو جاتی ہے لازم و ملزوم...... عبدالجبار رومی انصاری کے شاندار تبصرے پہ میں قربان، اپنی شاعری میں میرا اخلاص بھی پرو دیجیے گا۔ سید محی الدین اشفاق کاش آپ کے شیریں سخن الفاظ شرفِ قبولیت کی سند پائیں تو میری طرف سے آپ کی منگنی پکی۔ منفرد نایاب الفاظ کی خالق شاعرہ سیماب ملک سے محفل میں شامل ہونے کی درخواست...... درماندہ عشق میں انیاس سیتاپوری کا یہ جملہ دل پہ اثر کر گیا لکھتے ہیں۔ میں نے کسی شیر کو نہیں دیکھا جو دوسرے شیر کو کمتر سمجھے، میں نے بلی کو بلی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا نسلی مساوات بربری میں مل جاتی ہے لیکن اگر نہیں ملتی تو انسانوں میں...... کاشف زبیر کی انگلش ترجمے کی عذاب ماضی مارک کے شیطانی دماغ نے کتنے انسانوں کی جان لے لی...... دام فریب میں مبتلا کرنے والے ایک ساحر کی کارفرمائیاں ارم واحد بٹ کی حسین اتفاقات عمدہ رہی...... ملک صفدر حیات کی فرزند دروغ آسیہ کے قاتل لیاقت کو کمالِ مہارت سے پکڑ لیا اچھی کہانی...... ڈاکٹر شیر شاہ کی گھاؤ ہمارے بے حس، بے ضمیر حکمرانوں کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکا ثابت ہوئی۔ مغربی ادب سے عمدہ انتخاب تحریر ریاض کی بندوبست انسان دوست ثابت ہوئی۔ ماروی میں مراد اینڈ محبوب کے تاریک پہلو کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ سلیم انور کی مختصر شاندار چال فلپ سمرز نے بلیک والٹرز کی چال کا خوب توڑ کیا۔ منظر امام کی پناہ گاہ مزاح کے شوخ رنگ سے اسٹارٹ لے کر بوریت پہ ختم ہوگئی۔ موصوف کہانی پر گرفت رکھنے میں یکسر ناکام ہو گئے۔ تصوف کے نادر صفحات سے ضیا تسنیم بلگرامی نے خواجہ احرار پیر عالمگیر کا بہت خوب صورت تحفہ دیا۔ جمال دستی کی

تحریر پانی میں شکار، انجیلا نے سام کو نہایت چالاکی سے پانی میں ٹھکانے لگا دیا۔ بابر نعیم کی دوسری شکست سیلی ٹیلر کی شال کی اوٹ بنا تنگ روداد بچہ کہانی سے بھی گئی گزری۔ پڑھ کر افسوس ہوا کہ اس کہانی پہ ٹائم ضائع کیوں کیا؟...... عظیم احمد کی سلاسل مکافات ایک ہی چہرے کے ہزاروں روپ اور ہر روپ کی ایک الگ داستان بیسٹ کہانی۔ محفل شعر و سخن میں عبدالجبار رومی، رمضان پاشا، محمد رشید سیال، ادریس احمد خان، احمد خان کا انتخاب پسند آیا کستوری لگا کے۔ اس کے ساتھ اپریل کے خوب صورت سرورق سے پس ورق تک اختتام پذیر ہوا۔"

✱ **رانا منشی حماد۔ قیدی سزائے موت، سینٹرل جیل، ساہیوال سے محفل میں شامل ہیں** "کافی عرصے کے بعد محفل یاراں کی بزم میں داخلے کے لیے خود کو راضی کر پایا ہوں کیونکہ میرے خطوط کی تنقیدیت کی بنا پر محبت ناموں کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا جاتا تھا (یہ آپ کی غلط فہمی ہے) اور آپ کی پذیرائی بھی انہی لوگوں کو ملتی ہے جو آپ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ میں آپ کے ادارے سے چھپنے والے تمام رسائل کا رسیا تھا۔ (آگے سفر جاری رکھیے) مدعا یہ تھا کہ سسپنس میں شائع ہونے والی تاریخی کہانیوں میں مسلمان حکمرانوں اور پرانے ادوار کے بادشاہوں کے نام سے منسوب کہانیوں میں ان کی خامیوں کو ہائی لائٹ کرنے کے بجائے ان کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ آپ کی محبت میں آپ سے منسلک ہونے والے لوگ تاریخ سے محبت حاصل کرنے کے متمنی ہیں (شاید آپ نے توجہ سے ان اوراق کا مطالعہ نہیں کیا تھا) اس ایک خامی کے علاوہ سسپنس کی ہر چیز قابلِ داد اور قابلِ ستائش ہے۔ سسپنس کی تمام کہانیاں بے حد مزے سے محظوظ کرتی ہیں۔ یہ صرف اصلاحی تنقید تھی۔ (مگر اسے آپ نے دل پر بھی لے لیا) سزائے موت کے قیدیوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے حکومت کے سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ سب کو معاف فرمائے۔" (آمین)

✱ **علی رضا ولد گل جہان، کمالیے شورکوٹ سے۔ چلے آرہے ہیں** "تقریباً 10 سال سے سسپنس اور جاسوسی کا خاموش ممبر ہوں اور پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے آپ نے ایک شعر میرا شائع کیا جس کا میں بہت مشکور ہوں۔ تمام لحاظ سے ڈائجسٹ بہت مزے دار ہے۔ بس ایک کمی ہے طاہر جاوید مغل صاحب کی کوئی لمبی اسٹوری للکار کے بعد شائع نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا 2 نومبر کو پیدا ہوا اور 13 نومبر کو اللہ کو پیارا ہوا۔ میں نے اس کا نام علی رضا رکھا تھا اور اب اپنے بیٹے کے نام پر ہی خط اور شعر لکھتا ہوں۔" (اللہ آپ کو صبر کی توفیق دے)

✱ **سعید عباسی، بہاولپور سے حاضر ہیں** "سسپنس 17 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل ذرا بھی نہیں بھایا۔ بالکل بورنگ کہانیوں میں سب سے پہلے عظیم احمد کی سلاسل مکافات پڑھی۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، بالکل اسی طرح بیگم چغتائی نے جو کیا تھا بدلے میں آج اس کی اولاد اس کے ساتھ کر رہی تھی۔ کہانی کے باقی کردار عقیلہ تسنیم فاران بس ٹھیک ہی تھے۔ دوسری کہانی ثمر عباس کی بزدل پڑھی۔ کوثر بزدل نکلا جبکہ اس کے پیار میں پاگل ہو گئی۔ تیسری کہانی کاشف زبیر کی عذاب ماضی پڑھی، سائنسی دنیا پر مبنی زبردست داستان لرزا دینے والی کہانی سسپنس سے بھرپور کارلن اور اینا کا کردار پسند آیا۔ چوتھی کہانی ارم واحد بٹ کی حسین اتفاقات پڑھی۔ میکس بہت چالاک نکلا اور شاطر نکلا جس نے روتھ کو الو بنایا۔ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہوئی۔ پانچویں کہانی منظر امام کی پناہ گاہ پڑھی۔ تھوڑی سی مزاحیہ جنوں والی داستان جمیل قدوائی اور عامر کا کردار پسند آیا۔ چھٹی کہانی بابر نعیم کی دوسری شکست پڑھی۔ سیلی نے اپنی قیمتی شال کو ڈھونڈ نکالا۔ سیلی کا انجام برا ہوا۔ ساتویں کہانی شوکت ریاض کی بندوبست پڑھی۔ بے روزگار لکڑی چور انجیلا بوڑھے کی لکڑیاں چراتی تھی اور آخرکار پکڑی گئی۔ اینا نے اس مسئلے کا کیا خوب حل نکالا۔ آٹھویں کہانی صفدر حیات کی فرزند دروغ پڑھی۔ لیاقت کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ قدیر بھی بچ گیا۔ آسیہ بے چاری ماری گئی۔ نویں کہانی پانی میں شکار پڑھی۔ انجیلا نے چالاکی سے سام کو پانی میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دسویں کہانی چال سلیم انور کی پڑھی۔ قسب نے والٹرز کی چال اسی پر چلی اور اس کو بے وقوف بنا کر اس جگہ سے ہی بھگا دیا۔"

✱ **احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں** "فروری 28 دن ہونے کے باوجود شمارہ اپریل 16 مارچ کی شام مل گیا۔ بروقت جلد آمد پر شکریہ۔ حسینہ ٹائٹل کے تھے میں پیارا کبوتر بٹھائے پیار و امن کا پیغام دیتی نظر آئی۔ جس جذبے سے ہم دینی تہوار چراغاں و حمد و ثنا سے اور قومی تہوار آتش بازی کی لڑی سینکڑوں میں منا تے ہیں، ایسے دینی احکام پر عمل مستقل اور قومی ترقی کے لیے عملی اقدام مستقل کریں تو دنیا میں ہم سب سے زیادہ امن و سکون ریکارڈ ترقی مالدار قوم بن سکتے ہیں۔ نام نہاد اسلام کا واویلا کرنے والوں نے یوحنا آباد میں قصور اور سرگودھا سے نجی کام پر آنے والے مسافروں کو بھی زندہ جلا دیا۔ اف۔ انشائیہ جون ایلیا محبت، زندگی میں مصائب و آلام سے نجات واقعی حکمت و دانائی و فہم سے ممکن ہے۔ کاش، ہم دوسروں پر فتوے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں۔ محفل خطوط میں چھلانگ لگائی۔ جناب صفدر معاویہ کرسی پر جلوہ افروز تبصرہ وہی گڈ۔ مبارکاں جی۔ بے بی گڑیا طاہرہ گلزار، پشاور واقعی سب سے زیادہ مظلوم شہر ہے۔ تبصرہ بہت اچھا مگر طویل۔ بھائی طالب حسین طلحہ، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر۔ آپ باعزت بری ہو گئے۔ میں سب کے لیے ہر روز حضرت نوح والی دعا سورۃ قمر آیت نمبر 10 پڑھتا ہوں۔ بھائی نادر سیال، میچ کا حشر آپ کے سامنے ہے۔ سیاسی مداخلت اور کرپشن ختم ہوگی تب جیتیں گے۔ مسٹر جہین ناز اینڈ اعجاز راشل، قدرت اللہ نیازی جیسے سیٹھ سرمایہ دار کے بجائے 27 افراد کے سربراہ خاندان مکان مجھے اکیلا رہنے کے لیے دیں۔ احسان سحر، قدرت اللہ نیازی، رومی انصاری، درشہوار پیرزادہ تبصرے اچھے مگر تمام طویل۔ طویل کہانیاں، بھاگ کریم کے دائرے میں مراد اور ماروی کے نکاح میں شرکت چھوارے لینے گیا۔ تو محبوب و فیروز وکی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو دیکھ کر کھسکے میں آ گئے۔ مراد اور ماروی تو گئے ہنی مون پر۔ سیتاپوری صاحب کی درماندہ عشق خوب رہی۔ ولولہ انگیز تحریر کے آگے منتظر ہیں۔ سوائے جنوں خوب جاری ہے۔ بس امریکی و یہودی لابی سے اکتاہٹ ہوتی ہے۔ ملک صاحب کی فرزند دروغ، آسیہ کو لیاقت سے انکار کا والدین کو بتا دینا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی گھوڑ،

ایسے واقعات بہت زیادہ ہیں۔ محفلِ شعروسخن، اعجاز راحیل، حنیف گبول، لبنیٰ علیم، سونا رضوان، زاہد چودھری، رشید سیال اچھے اشعار ہیں۔ جمال دستی کی پانی میں شکار، انجیلا نے سام کو خود غرق کیا ہے۔ بلگرامی صاحب کی خواجہ احرار ایمان افروز تحریر ہے۔ عظیم احمد کی آخری کہانی سلاسلِ مکافات، معاشرے میں بیگم چغتائی جیسے واقعات عام ہیں۔ باقی کہانیاں لائقِ گزارہ ہیں۔"

✠ **محمد صفدر معاویہ،** ضلع خانیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سرورق کو خوب صورت اور دل نشین دوشیزہ اور اس کے کندھے پر بیٹھے خوب صورت کبوتر سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم نجات لے کر آئے۔ کاش ساری انسانیت کے اندر ایسے اعلیٰ اور ارفع نقطے سمو دیے جائیں تو ساری دنیا جنت کا نمونہ پیش کرے مگر کرے کون کہاں سے ہمیں اب جون ایلیا اشفاق احمد جیسے لوگ ملیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ پاکستان کی فتح پر تو ہر شخص خوشی سے نہال دکھائی دیتا تھا۔ چہرے نہیں نظام بدلنا چاہیے کیونکہ نظام کے درست ہونے سے ہی بہتر آسکتی ہے ورنہ پاکستان کے حالات بدلنا ناممکن ہے۔ اپنی محفل میں آئے تو خود کو فرسٹ دیکھا ادارے کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ زیب حسن بھائی کی تجویز پر غور کیا جائے۔ طالب حسین طلحٰہ بھائی آپ کو بہت بہت مبارک ہو کہ اللہ کی ذات نے آپ پر اپنا کرم کیا اور اسیری کے دن تمام ہوئے۔ ابرار وارث کا بھی اعلیٰ تبصرہ رمضان پاشا بھائی انکل نے ٹھیک کیا کیونکہ اسلام میں ویلنٹائن ڈے کا کوئی تصور نہیں اس لیے انہوں نے کوئی ایسا خاکہ نہیں دیا۔ توحیدی صاحب میں نے مذاق کیا تو آپ تو سچ مچ میں چار شادیوں کے قریب ہیں۔ قدرت اللہ بھائی ماڈل اس وجہ سے تھی ان تھی خانیوال کے چار اکٹھے ہو گئے۔ اب تو اور زیادہ ہوگی کہ خانیوال والا پہلے نمبر آ گیا۔ چلیں کیا یاد کریں گے اپنا تبصرہ آپ کے نام کرتا ہوں فرسٹ نمبر والا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی بہت اعلیٰ ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے درماندہ عشق پڑھی۔ ہائے ہائے عشق نے کیا کر دیا فیروز بخت کے ساتھ۔ عشق قاسم نے بھکاری بنا دیا۔ باقی سب کامیاب ہوئے دولت ہتھیالی نظام بھی کچھ نہ پاسکا۔ وصی احمد نے فیروز بخت کو بھی مات دے دی۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔ کاشف زبیر کی اچھی کاوش انسان کو سمجھایا گیا کہ اپنا کردار اچھا بناؤ اپنے کیریئر کے لیے اپنوں کو بھولو گے یا زیادتی کرو گے تو تمہارا ماضی تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا جیسا کہ فلپس مارک میک وغیرہ کے ساتھ ہوا۔ سودائے جنوں کا یہ حصہ ایک دو جھڑپوں کے علاوہ پرسکون رہا۔ نابید اور تاجہ پھنس چکے ہیں تو باقی پارٹیاں ابھی تک محوِ سفر ہیں۔ جو مسلمان ان کافروں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اللہ ان کو کامیابی عطا کرے۔ ارم واحد بٹ حسین اتفاقات لے کر آئیں میکس نے کیا خوب پھنسایا، روتھ کو۔ ہر چیز ہر کام کے لیے پلاننگ ضروری ہے تو بھی کچھ کیا میکس نے تین سال تک آخر میں کامیاب بھی رہا۔ ملک صفدر حیات فرزند دروغ کی صورت میں ایک واقعہ لے کر آئے۔ لیاقت بہت جذباتی ہو گیا اگر آسیہ راضی نہیں تھی تو وہ گھر بتا کر یہ رشتہ ختم کر سکتا تھا۔ تحریر ریاض کی بندوبست میں انیکا نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ اسے ملازمت کی ضرورت تھی گستاو کو بھی ضرورت تھی، گھر کی صفائی کی۔ اب لکڑیاں بھی چوری نہیں ہوں گی اور گھر بھی صاف رہے گا۔ محفلِ شعروسخن بہت ہی اعلیٰ اشعار سے مزین تھی۔ ثمر عباس بزدل لے کر آئے۔ کوزو واقعی بزدل نکلا کہ دوسری مرتبہ اپنی منگنی کو کھو دیا۔

✠ **طاہرہ گلزار،** پشاور سے چلی آرہی ہیں "15 مارچ کو میرے ایک فیورٹ تبصرہ نگار رضوان سلطان تنولی نے فون کر کے کہا کہ طاہرہ تمہارا خط سسپنس میں تیسرے نمبر پہ آیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ ادارے والوں کی محبت ہے جو مجھے اتنی عزت دی۔ میں نے آج 19 مارچ کی شام کو اپنا سوئٹ سوئٹ سسپنس پڑھا اپنا اتنا تفصیلی خط دیکھ کے دل بہت خوش ہوا۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر بھائی کا نام دیکھ کے دل خوشی سے بھر گیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی نجات پڑھ کے ان کو اپنا نجات دہندہ پایا کہ وہ ہمیں اپنے قیمتی الفاظ سے نواز رہے تھے لیکن ہائے رے ہم میں اتنی عقل کہاں کہ کچھ سیکھ لیں۔ اداریے میں انکل معراج کی پریقین باتیں پڑھ کے دل ایک بار پھر پرامید ہونے لگا۔ پلیز پرانے تبصرہ نگار جلد حاضر ہوں۔ خاص کر بابر عباس، آغا فرید آف سکھر، جاوید بلوچ، ہمایوں سعید اور شیر علی خان سے خاص کر آنے کی درخواست۔ حسبِ عادت اپنے فیورٹ رائٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی اسرائیل اور فلسطین کے ظلم اور ظلم سہنے کی عکاسی کرنے والی شاندار تحریر ناصر اور عابد کی ہمت کو داد دیتے ہیں۔ ساتھ ہی عام سی عورت رخسانہ کو سلام جس نے شوہر کو وار کر وطن کی محبت پہ آنچ نہیں آنے دی۔ شوہر تو دوسرا، تیسرا بھی مل سکتا ہے۔ یہودیوں کے خلاف ہٹلر کا یہ سنہری جملہ بہت پسند آیا کہ 'دنیا دیکھے گی کہ میں یہودیوں کو ہلاک کر کے ظلم کر رہا تھا یا دنیا پر احسان، بہت جلد تم ان کی مکاریاں دیکھو گے۔' یہودی مل ڈاگ آرنک فرحاتی پہ درپے ناکامی پہ طیش میں ناچتا رہا۔ زبردست ایکشن، آخر محسن پھر لیلیٰ گروپ مل گیا۔ کاش وہ آیدونا بھی ختم ہو جاتی۔ ..... ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر خواجہ احرار روح تک سرشار کر گئی۔ پلیز پہلے کی طرح پیغمبروں والا سلسلہ دوبارہ شروع کریں تاکہ نئی نسل کچھ حاصل کرے۔ ثمر عباس کی مغربی معاشرے کی عکاسی کرنے والی تحریر بزدل واقعی کوزو ایک بزدل مرد تھا جو نہ اپنی محبت کو حاصل کر سکا اور نہ ہی ایک اچھا شوہر اور باپ بنا لیکن اینڈ میں اس کا فیصلہ بہت صحیح تھا۔"

✠ **محمد خواجہ،** کورنگی کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اپریل کا ماہنامہ بروقت ہی مل گیا۔ سرورق حسبِ معمول بہت خوب صورت رہا۔ نازک اندام اور کبوتر کا امتزاج بڑی خوبصورتی سے یکجا کیا گیا۔ گزشتہ ماہ بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ شوگر لیول اور ڈپریشن نے گھیر لیا۔ کچھ نہ لکھ سکا۔ (اللہ آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین) انشائیہ ہمارے حساس دلوں کی آواز ہوتا ہے۔ تحریر سیدھا دل اور دماغ کو جھنجوڑ دیتی ہیں۔ یہ ہم سب کے دل کی عکاسی کر جاتی ہے۔ حیرانی کی بات ہے ہماری قوم پڑھی لکھی ہے سب اچھے برے کی مکمل پہچان رکھتے ہیں لیکن عمل کیوں نہیں کر پاتے۔ طالب حسین طلحٰہ کی سزا معاف ہونے پر دلی مبارکباد۔ درماندہ عشق، الیاس سیتاپوری کے پراثر قلم سے کہانی کا اختتام ہوا۔ پوری کہانی تجسس اور ہر طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی پراثر تحریر۔ عذابِ ماضی، یہ ایک سائنس فکشن کہانی۔ فضا میں بھی خون ریزی، یہ کہانی ایک خاص طبقہ اور

سائنس فکشن کی قصوں کے شوقین حضرات کے لیے ضرور دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ سودائے جنوں، ڈاکٹر صاحب نے صیہونی قوتیں اور مسلمانوں کے عزم اور ہمت کی عمدہ کہانی قدم قدم پر موت کے سامنے ڈٹ جانے والے مسلم اخوت کا مظاہرہ بڑی گرم جوشی سے پیش کیا جاتا رہا۔ حسین اتفاقات، یہ کہانی کمال کی ہے۔ فرزند دروغ، ملک صفدر حیات جب بھی کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ ایک اچھی نیت اور فرض شناس کی خدا خود بھی مدد کرتا ہے۔ بہت عمدہ اور دل کو چھو لینے والی کہانی۔ گماؤ، ڈاکٹر شیر شاہ سید بہت ہی دردناک کہانیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہندوستان، یورپ، امریکا کتنے بھی ترقی یافتہ ہوں۔ انسانیت کے علم بردار لیکن بوڑھوں اور والدین کے لیے اسلام نے جو ہدایت کی ہے۔ اس لیے ہمارا مذہب سے بہتر تعلیمات کسی مذہب میں نہیں۔ یہ کہانی ایک بوڑھے شخص کی تنہا، پریشان زندگی کی غم زدہ تصویر تھی۔ بزدل، کوثر ایک ایسا شخص جو بے حد بزدل تھا۔ اس کی خاطر ایک لڑکی جو اس کی محبت تھی اور نیم پاگل ہو چکی وہ کچھ نہ کرسکا۔ پناہ گاہ، منظر امام نے ایک نا سمجھ کا قصہ تحریر کیا۔ پوری کہانی ہی نا سمجھی پر مشتمل تھی۔ خواجہ احرار، بزرگان دین کی حیرت انگیز اور ایمان افروز کہانی۔ بہت ہی نصیحتیں جوانات قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہیں۔ دوسری شکست، ایک اچھی کہانی، ایک معمولی مثال سے شروع ہونے والی کہانی جس میں بہت راز چھپے تھے۔ سلاسل مکافات، اس ماہنامہ کی آخری شاہکار کہانی۔ انسانی نفسیات اور عذاب ماضی کی ایک دلچسپ کہانی۔ بیگم چغتائی نے اپنے خراب ماضی کو جھوٹ کے لبادے میں چھپا کر کہانی بنائی اور ... بھی جھوٹ کا سہارا لے کر ماں کی جھوٹی کہانی کے خلاف ڈٹ گیا۔ سب ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھ رہے تھے لیکن مکافات عمل اور خدائی حکمت عملی نے سزا اور کو ایک عذاب ناک کرب میں مبتلا کر دیا۔ کترنیں اور لطائف حسب معمول ایک سے بڑھ کر ایک۔"

✠ **حبیب الرحمٰن**، خوش بخت الرحمن، سینٹرل جیل، کوٹ لکھپت لاہور سے اپنے شکایت نامے کے ساتھ حاضر ہیں "ایک شکایت ہے ادارے والوں سے۔ بات یہ ہے کہ میں نے 2010ء سے ادارے کے تمام ڈائجسٹوں میں تبصرہ لکھنا شروع کیا تھا جواب تک لکھ کر مقررہ وقت پر بھیج دیتا ہوں لیکن پھر ایک ماہ بعد جواب ندارد یعنی ایک سال میں 3 یا 4 خط شامل اشاعت اور باقی ... میں شامل اس کے علاوہ جو بھیجیں وہ پوسٹ آفس کی نذر اس میں آپ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ پاکستان ملک ہی ایسا ہے۔ اس میں ہر آدمی اپنا قصور اور غلطی دوسرے کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ میرے جیسا آدمی جو سزائے موت کے سیلوں میں بند ہو جس کے پاس کاغذ قلم سے لے کر خط تک بھی بہت زیادہ مشکل سے پہنچتا ہو۔ وہ اس مشکل کو حل کیسے کرے گا یعنی کہ اس مشکل کا حل۔ اس کے علاوہ ایک خبر ہے کہ اس بارے میں بھی مختصر بتاتا ہوں کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ انرجی یعنی توانائی کا ایک فارمولا جانتا ہے جس میں ... کوئلہ، گیس، پانی وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے اس کے بغیر ہی بجلی کا بحران ختم کر سکتا ہوں۔ (کہاں ہے وہ نایاب ہیرا۔ ملک وقوم کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی) امید ہے آپ ... خط میں شامل کریں گے۔ باقی شمارہ مجموعی طور پر بہت اچھا ہے۔ ہماری قارئین دوست روشنی رشید سے التجا ہے کہ وہ ضرور ڈائجسٹ میں شامل رہا کریں۔"

✠ **انعم ریاض**، نیول کالونی ڈاسیوں، کراچی سے محفل میں حاضر ہیں "20 مارچ کی خوش گوار صبح کو نیند کی آغوش سے نکلتے ہی ہمیں ... کا دیدار نصیب ہوا۔ سرورق پر دوشیزہ کے کاندھے پر ... سفید کبوتر بڑے رعب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ورق پلٹے تو جون ایلیا کا انشائیہ نیئوں کے سامنے آ گیا۔ تین مہینوں کی مصروفیات کے بعد آج خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ خطوط کی محفل میں آتے ہی ہم تو جیسے شاک کی کیفیت میں آ گئے۔ ارے یہ کیا سارے ... تبصرہ نگار کہاں گئے۔ کوئی ہمیں بتائے گا کہ وہ سب کہاں کوچ کر گئے۔ (اسی کا نام دنیا ہے۔ لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں) محمد صفدر معاویہ پہلی پوزیشن آنے پر آپ کو مبارک باد، اور آپ افسردہ نہ ہوں کیونکہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے لیے ہارنا معمولی بات ہے۔ زیب حسن صاحب آپ کی طرح یہ درخواست ہم بھی کئی بار کر چکے ہیں کہ مغل صاحب کی کوئی قسط وار کہانی شروع کریں۔ جناب طالب حسین ... جیل سے رہا ہونے پر آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور نئی آنے والی زندگی کے لیے ہم دعا گو ہیں۔ ... درسیل ہار جیت تو کھیلوں کا حصہ ہے بھئی آپ کیا کمامت چھوڑ دیں گے۔ مہرین ناز اور ایاز احمد راحیل کا تبصرہ بہت عمدہ تھا۔ ... بہرہ ... آپ ... معذرت۔" (بہت اچھے بھی بہت اچھے)

✠ **سجاد خان آف موچھ**، سینٹرل جیل میانوالی سے محفل میں شریک ہیں "سسپنس ڈائجسٹ کا بہت ہی پرانا قاری ہوں۔ . . . لیکن خط لکھنے کی دوسری بار کوشش کر رہا ہوں۔ پہلا خط مارچ کے شمارے میں لکھا جو شاید موسم کی خرابی ٹریفک جام کی وجہ سے رہ گیا۔ مجھے ایک دوست نے کہا کہ یہ مت لکھنا کہ سینٹرل جیل میانوالی سے خط لکھ رہا ہوں کیونکہ جیل میں رہنے والوں سے کوئی بات نہیں کرتا۔ میں نے کہا جو بھی ہو چاہے کوئی بات کرے یا نہ کرے بتانا سچ ہے کیونکہ یہ لازمی تو نہیں کہ جیلوں میں صرف دہشت گرد بند ہوں۔ کوئی بات نہیں ہم نے اپنی کوشش جاری رکھنی ہے۔ امید ہے خط بھی شامل ہوگا (اور دیکھ لیجیے آپ کا خط شامل ہو گیا) ہمیشہ کی طرح محمد صفدر معاویہ بھائی کو اچھے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ طالب حسین طلو بھائی مبارک ہو۔ آپ کو نئی زندگی ملی ہے۔ خدا پاک کا شکر ادا کرتے رہنا۔ سب سے پہلے ماروی پڑھی۔ محبوب کو تو محبوب نہیں ملی البتہ مراد کی مرادیں پوری ہوگئیں۔ سودائے جنوں اچھی جا رہی ہے۔ دنیا میں بہت سے سرفروش باقی ہیں جن پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"

ب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

امتیاز خٹک، ضلع اٹک۔ محمد زریان سلطان، اردو بازار، کراچی۔ محمد رضوان، کورنگی، کراچی۔ اطہر حسین، کراچی۔ زبیدہ صدیقی، لاہور۔ حیدر زوہیب، ملتان۔ تنویر خالد، دادو۔ احمد حق، لاہور۔ حمیرا اقبال، کورنگی کراچی۔ مظہر طارق، ملتان

قطب الدین ایبک

ڈاکٹر ساجد امجد

تاج وری اگر مقدر میں ہو تو چاہے انسان فقیر کے گھر میں پیدا ہو یا غلام منڈی میں فروخت ہو جائے... زمانے کی ہوا اسے آپ ہی شاہوں کے درمیان دھکیل دیتی ہے... اور پھر حالات و واقعات کی ترتیب ایسی تربیت کرتی ہے کہ اس کی سوجھ بوجھ پر دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ قطب الدین ایبک بھی ایک ایسا ہی لاوارث غلام تھا جو کم سنی میں معمولی داموں پر بازار میں فروخت ہوا اور سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بن گیا... وقت کا پہیا بھی عجب گھن چکر ہے جو کبھی سونے کو مٹی بنا دیتا ہے تو کبھی ذرے کو آفتاب بنا کر آنکھیں خیرہ کردیتا ہے۔ جو بھی ہے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اپنے وجود کو اہل ثابت کرنے کے لیے انسان کو خار زار رستوں پر چلنا پڑتا ہے، ورنہ بہت سے شہ زور اسی پہیے کے نیچے دب کر بے نام و نشان چلے گئے کیونکہ انہیں ان رستوں پر چلنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا لیکن... قطب الدین ایبک کو اس ہنر میں کمال حاصل تھا۔ تب ہی بادشاہت اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت آمیز واقعات

نیشاپور کی غلام منڈی میں آج خلافِ معمول کچھ زیادہ بھیڑ تھی۔ اس لیے نہیں کہ کوئی غیر معمولی غلام فروخت کے لیے آیا ہوا تھا بلکہ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مہینے کا پہلا جمعہ تھا۔ پہلے جمعے کو اکثر بھیڑ ہوا کرتی تھی۔

قاضی فخر الدین بن عبدالعزیز کوفی چند ساتھیوں کے ساتھ جامع مسجد سے باہر آئے۔ انہیں چند دنوں سے ایک غلام کی ضرورت تھی۔ اس وقت ان کے ساتھیوں نے غلام منڈی کا رخ کیا تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ میدان میں قدم رکھتے ہی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ان کا دل گھبرانے لگا تھا لیکن ساتھیوں کی دلچسپی دیکھ کر ان کی بھی ہمت بندھی رہی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انسان بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت ہوا کرتے تھے۔ نہ بیچنا جرم تھا نہ خریدنا۔ کوئی یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ کس کے جگر گوشے ہوں گے۔ کہاں سے آئے ہوں گے۔ کس کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ آقا اچھا مل گیا تو زندگی سنور جائے گی ورنہ ٹھوکروں میں گزارہ ہوگا۔

بعض غریب لوگ اپنے بچوں کو خود بھی فروخت کر دیا کرتے تھے اور سوداگر انہیں منڈی تک پہنچا کر اچھے دام وصول کرتے تھے۔ منڈی میں ایسے غلام بھی ہوتے تھے جنہیں بردہ فروش اٹھا کر لے آتے تھے۔

قاضی فخر الدین ایک ایک غلام کو دیکھتے رہے۔ سوداگر ان غلاموں کی تعریف میں مبالغہ آرائی بلکہ شاعری کر رہے تھے تاکہ خریدار متوجہ ہوں۔

''ترکستان کا نایاب ہیرا۔ قدر دانوں کے لیے عظیم تحفہ۔ باتیں میٹھی آواز رسیلی۔ عقل و دانش کا پتلا۔ کم سن مگر جہاں دیدہ۔''

ایک جگہ یہ آواز سن کر قاضی فخر الدین کے قدم رک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سوداگر کے قریب ایک بچہ کھڑا ہے۔ عمر بہ مشکل دس سال ہوگی۔ چہرہ خوب صورت تھا مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ نور کا پتلا ہو البتہ آنکھیں بے پناہ ذہانت کا

مظاہرہ کر رہی تھیں۔ باریک لبوں پر مستقل مسکراہٹ تھی جو اس کے مزاج کی خوش اخلاقی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ قاضی صاحب اس بچے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد سوداگر سے مخاطب ہوئے۔

''کیوں بھائی، ترکستان کے اس تحفے کا نام کیا ہے؟''

''قطب الدین۔''

''ماشاء اللہ بڑا اچھا نام ہے۔ اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ اس لڑکے کو تم کہیں سے اٹھا کر لائے ہو یا .....''

''ارے جناب، اس بازار میں میری شہرت اسی وجہ سے ہے کہ میں بردہ فروش نہیں ہوں۔ کھرا سودا کرتا ہوں۔ اس بچے کی میں نے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اب اپنا منافع شامل کر کے اس کی قیمت خریداروں سے وصول کروں گا۔ آپ قیمت لگائیں یا پھر میں عرض کروں؟''

''آپ ہی فرمادیں۔ میری جیب اجازت دے گی تو ٹھیک ورنہ آگے بڑھ جاؤں گا۔''

''آپ مجھے قدردان معلوم ہوتے ہیں اس لیے جانے نہیں دوں گا۔'' قاضی فخرالدین نے قطب الدین کو اپنے قریب بلا کر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹا، تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟''

''میرا مالک جس سے میری قیمت وصول کرے گا، میں اس کے ساتھ جانے کا پابند ہوں۔''

قاضی صاحب نے سوداگر سے قیمت پوچھی اور پھر تھوڑی سی تکرار اور ردوبدل کے بعد قطب الدین کو خرید لیا۔ جب قاضی صاحب اسے لے کر چلنے لگے تو سوداگر ان کے پیچھے دوڑا۔

''قاضی صاحب! مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ اس بچے کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا۔ اب آپ کی مرضی ہے، اس عیب کے ظاہر ہونے کے بعد آپ اسے خریدیں تو ٹھیک ورنہ آپ کی دی ہوئی رقم حاضر ہے۔'' قاضی صاحب نے قطب الدین کی انگلی کی طرف دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔ بس اتنا ہوگا کہ آج سے اس کے نام میں ایبک کا اضافہ ہوجائے گا۔ ترکی زبان میں ایبک اسے کہتے ہیں جس کی انگلی نہ ہو۔ آج سے میں اسے قطب الدین ایبک کہوں گا۔''

''قاضی صاحب! مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے نیک آدمی کی صحبت میں رہ کر یہ بچہ کسی بڑے مرتبے پر پہنچے گا۔''

قاضی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور قطب الدین کو لے کر آگے بڑھ گئے۔ قاضی فخرالدین بن عبدالعزیز کوفی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے اور نیشاپور میں نہایت اچھی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے دل میں خدا نے یہ بات ڈالی کہ اس بچے کو غلام سے زیادہ اپنا بیٹا سمجھیں اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں سے بھی کہہ دیا کہ قطب الدین کو وہ بے شک اپنی خدمت اور گھر کے کام کاج کے لیے لائے ہیں لیکن اسے اپنا بھائی سمجھنا اور اپنے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھانا۔

قطب الدین ان کے ساتھ قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔ دن بھر وہ مکتب میں گزارتا اور شام کو گھر کے کام کاج میں مشغول ہوجاتا۔ اس نے چند ہی دن میں ایسی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا کہ قاضی صاحب اسے اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے۔

قاضی صاحب کے بیٹے آپس میں یہ باتیں ضرور کرتے تھے کہ والد صاحب ایک غلام کو ان پر ترجیح دیتے ہیں لیکن والد کے خوف سے قطب الدین کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے پھر یہ ترکیب نکالی کہ قطب الدین کے خلاف من گھڑت شکایتیں قاضی صاحب تک پہنچانے لگے۔ ایک مرتبہ تو چوری کا الزام بھی اس پر لگا دیا۔ قاضی صاحب نیک طبیعت بھی تھے اور جہاں دیدہ بھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ چاروں بیٹے کیوں اس کے خلاف ہوگئے ہیں۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے چوری کے الزام کی تفتیش کی اور قطب الدین کو بے قصور پا کر بیٹوں کی سرزنش کی۔

''دیکھو بچو! تمہارے والدین حیات ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں۔ قطب الدین بے چارہ بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ انہوں نے نہ جانے کس مجبوری کے تحت اپنے جگر گوشے کو سوداگر کے حوالے کردیا اور وہ ہم تک پہنچ گیا۔ رات کی تنہائیوں میں کیا وہ اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کرتا ہوگا۔ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ اگر ہم اس کی دلداری کریں تو کیا یہ ثواب کا کام نہیں۔ ہمیں تو اس کا اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھول جائے اور تم لوگ ہو کہ اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ یہ بھی تو سوچو وہ گھر کے کام کاج میں کتنا مستعد رہتا ہے۔''

قاضی صاحب کے لڑکوں نے یہ باتیں سن تو لیں اور چپ بھی ہوگئے لیکن قطب الدین کی طرف سے ان کا دل صاف نہ ہوسکا۔ اب انہوں نے اسے پریشان کرنے کے لیے یہ طریقہ وضع کیا کہ اسے تنگ کرنے کے لیے ہر وقت مصروف رکھنے لگے۔ اسے ہر وقت کام میں لگائے رکھتے۔

ابھی وہ ایک کام کرنے نہیں پاتا کہ دوسرا کام بتا دیتے۔ اس سے مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ تنگ ہو کر کہیں بھاگ جائے لیکن وہ ایسا مستقل ثابت ہوا کہ اس کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا۔

وقت گزرتا رہا۔ قطب الدین قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ تہذیب و اخلاق کے بہت سے درس حاصل کر لیے۔

اتفاق یہ ہوا کہ قاضی فخر الدین کا انتقال ہو گیا۔ اب قاضی صاحب کے بیٹوں کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ انہیں قطب الدین کا وجود برداشت نہیں تھا اور وہ انہیں کہیں چھوڑ کر جانے والا تھا نہیں۔ ان بیٹوں نے آپس میں طے کیا کہ قطب الدین کو کسی سوداگر کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے۔ کچھ پیسے بھی ہاتھ لگ جائیں گے اور قطب الدین سے پیچھا بھی چھوٹ جائے گا۔

اس زمانے کے نیشا پور میں کسی غلام کا خریدنا یا فروخت کرنا کون سا مشکل تھا۔ قاضی صاحب کے بیٹوں نے برادران یوسف کا سا کام کیا اور اسے لے کر ایک سوداگر کے پاس پہنچ گئے۔

''یہ ہمارے باپ کا غلام ہے۔ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اب ہمارے اپنے ہی کھانے کے لیے نہیں ہے، اسے کہاں سے کھلائیں۔'' سوداگر نے ایک معقول رقم دے کر قطب الدین کو خرید لیا۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین غوری کو خداوند تعالیٰ نے صرف ایک بیٹی دی تھی۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لیے اس کو ترکی غلام خریدنے اور انہیں بیٹوں کی طرح پالنے کا بڑا شوق تھا۔ دور و نزدیک کے تاجر بڑی قیمت کے لالچ میں ترکی غلاموں کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

وہ اس وقت غزنی میں تھا اور اپنے امیروں کے جھرمٹ میں گھرا بیٹھا تھا۔ نئی فتوحات اور سلطنت کی حدود بڑھانے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک منہ چڑھے امیر نے یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ خداوند تعالیٰ آپ کو کوئی بیٹا بھی عطا کرتا تا کہ کسی ناگزیر واقعے کے پیش آنے کے بعد اس کو تخت سلطنت کا وارث بنا دیا جاتا۔ آپ جو اتنی محنت کر رہے ہیں تو کس کے لیے؟''

ایسی بے موقع بات سن کر تمام امیروں کے چہرے فق ہو گئے تھے کہ دیکھیں شہاب الدین غوری کا ردعمل کیا ہوتا ہے لیکن شہاب الدین خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا اور اس نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''کون کہتا ہے میرا کوئی بیٹا نہیں۔ عام طور پر بادشاہوں کے چند بیٹے ہوتے ہیں جو اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت کے وارث قرار پاتے ہیں لیکن میرے ہزاروں ایسے سعادت مند بیٹے موجود ہیں جو میرے بعد عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مدت تک میرا نام زندہ رکھیں گے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سوداگر کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے جو غالباً غلام ہے۔ سوداگر اس غلام کو فروخت کرنے کے لیے لایا ہے۔ شہاب الدین غوری نے اپنے امیروں پر ایک نظر ڈالی اور سوداگر کو اجازت مرحمت فرما دی۔

اس اجازت کے ساتھ ہی ان امیروں نے سمجھ لیا کہ اب اجلاس ختم ہوا۔ انہوں نے جگہ خالی کر دی اور سوداگر حاضر ہو گیا۔ اس کے ساتھ قطب الدین بھی تھا۔

شہاب الدین کی نظریں سوداگر سے زیادہ قطب الدین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا تجربہ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں۔ اس کی پیشانی اس کی عظمت کا صاف پتا دے رہی تھی۔

''سوداگر! تم یقیناً اس غلام کی قیمت دل میں سوچ کر آئے ہو گے؟ ہمیں بتاؤ تا کہ ہم اسے خرید لیں۔''

''میں نے اس کی کوئی قیمت طے نہیں کی۔ میں تو اسے آپ کی خدمت میں بطور تحفہ لے کر آیا ہوں۔ اسے قبول کیجیے۔''

''ہم تمہیں اس لڑکے کی قیمت ادا نہ کریں لیکن تمہارے ایثار کی قیمت تمہیں ضرور ادا کریں گے۔''

شہاب الدین غوری نے سوداگر کو ایک بیش بہا رقم ادا کی اور قطب الدین کو خرید لیا۔

قطب الدین ایبک نے بڑے سلیقے اور محبت کے ساتھ سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں اس نے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

قطب الدین، قاضی فخر الدین کے مکان سے شہاب الدین غوری کے عظیم الشان محل میں پہنچا تو اس کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی تصور نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس نعمت کو وہ ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مستعدی سے سرگرم خدمت تھا۔ شہاب الدین غوری بھی اسے ایک پل کے لیے خود سے جدا نہ کرتا تھا۔ دربار میں بھی

وہ بادشاہ کی پشت پر کھڑا ہوتا تھا۔

ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو کسی طرح بھی کسی غلام کی فطرت سے بعید تھا۔ جشن کی ایک محفل منعقد ہوئی جس میں سلطان کے قریب ترین مخصوص درباری شریک تھے۔ قطب الدین ایک بھی شریک محفل تھا۔ سلطان نے درباریوں کو خلعت و انعام سے سرفراز کیا۔ سب سے زیادہ قیمتی اور بہترین انعام قطب الدین کو ملا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو قطب الدین نے اپنے حصے کا شاہی انعام فراشوں اور خدمت گاروں کو بخش دیا۔

یہ خبر جب سلطان تک پہنچی تو اسے تعجب بھی ہوا اور خود پر فخر بھی ہوا کہ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ اس نے قطب الدین کو طلب کیا۔

''ہم نے سنا ہے کہ ہمارا بخشا ہوا انعام تم نے فراشوں اور خدمت گاروں کو بخش دیا؟''

''سلطان! یہ جسارت مجھے اس لیے ہوئی کہ سخاوت کا یہ سبق میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔''

''کچھ تو اپنے لیے بھی رکھ لیتے۔''

''میرے لیے آپ بہت ہیں۔ میرے ہاتھ جب خالی ہوں گے، آپ کا دستِ سخاوت میرا دامن بھر دے گا۔''

سلطان اس کے اس کلام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے درباری امیروں میں شامل کرلیا اور اس کی جگہ تخت کے عین سامنے مقرر کی حالانکہ وہ ابھی اچھی طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا۔

امیر مقرر ہونے کے بعد بھی قطب الدین ایبک کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ ہر روز چارا تلاش کرنے کے لیے جنگل کی طرف جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ جنگل سے نکل کر دریائے مرو کے کنارے تک چلا گیا۔ کسی خطرے سے بے نیاز وہ اپنے تھوڑے سے لشکر کے ساتھ چلا جارہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ ابھی وہ واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ خطرہ مجسم ہوکر اس کے سامنے آگیا۔ ایک بڑا لشکر اس کے سامنے تھا۔ یہ خوارزم کی فوج تھی جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ خوارزم اور غزنی کے درمیان ہمیشہ کی دشمنی تھی۔ آج ان کا داؤ چل گیا تھا۔ قطب الدین بھی محل میں رہ کر تیغ زنی کا ماہر ہوچکا تھا۔ اس نے اب فرار کو بے عزتی سمجھا اور تلوار کھینچ کر میدان میں آگیا لیکن لشکر کم ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا اور گرفتار ہوگیا۔ خوارزم کے لشکری اسے سلطان خوارزم کے پاس لے گئے۔ سلطان شاہ کے حکم سے اسے لوہے کے پنجرے میں قید کردیا گیا۔

قطب الدین کے ساتھی فرار ہوکر سلطان شہاب الدین کے پاس آئے اور سارا ماجرا سنایا۔ شہاب الدین غوری یہ سن کر تڑپ اٹھا کہ اس کا چہیتا غلام گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس نے اسی وقت لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا اور سلطان شاہ پر حملہ آور ہوگیا۔ سلطان شاہ شکست کھا کر فرار ہوگیا۔ اسے بھاگتے ہوئے یہ ہوش نہ رہا کہ وہ پنجرا اٹھا کر لے جاتا جس میں قطب الدین کو قید کیا گیا تھا۔ غزنی فوج کے سپاہی قطب الدین کو اسی عالم اسیری میں پنجرے سمیت اونٹ پر لاد کر شہاب الدین کے سامنے لائے۔

''خدا کی قسم قطب الدین، تو اس لیے پیدا نہیں ہوا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے اس لوہے کے پنجرے میں جانوروں کی طرح قید ہو۔''

شہاب الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اسی وقت اسے پنجرے سے باہر نکالا اور اس کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالے۔ اب قطب الدین کا مقام و مرتبہ پہلے سے بھی دو چند ہوگیا۔ اسے امیر الامراء بنادیا گیا۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز کے محل کے ایک کمرے میں اس کے اہلِ خانہ باہم شریکِ گفتگو تھے۔ اس وقت سلطان شہاب الدین کی فیاضی اور قطب الدین کے کارنامے موضوع گفتگو تھے۔ قطب الدین کی اسیری اور پھر رہائی کا تذکرہ نکل آیا۔

تاج الدین کی بیٹی فاخرہ اس گفتگو میں دخل نہیں دے رہی تھی لیکن سن سب رہی تھی اور اندر ہی اندر قطب الدین کو دیکھنے کا اشتیاق بھی بڑھتا جارہا تھا۔

تاج الدین یلدوز بھی شہاب الدین کے غلاموں میں سے ایک تھا۔ جب وہ بچہ تھا تو اسے شہاب الدین نے ایک سوداگر سے خریدا تھا۔ یلدوز کی صورت و سیرت کی پاکیزگی اور حسن نے شہاب الدین کو اس کا دلدادہ بنادیا تھا۔ اس کے بہت سے لے پالکوں میں یلدوز کو ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ جب یلدوز جوان ہوا تو سلطان نے اس کے چہرے پر برتری اور حوصلہ مندی دیکھ کر اسے اپنے گرامی قدر امیروں کی جماعت میں شامل کرلیا اور کرمان کا علاقہ اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اب وہ کبھی کرمان اور کبھی غزنی میں رہنے لگا تھا۔ ان دنوں غزنی آیا ہوا تھا۔

جب بہت دیر گفتگو ہوچکی تو فاخرہ سے رہا نہیں گیا۔ اس کا جی چاہا کہ قطب الدین کا نام بار بار اپنے ہونٹوں سے ادا کرے۔

''ابا جان! ہم نے قطب الدین کو کبھی دیکھا نہیں اور آپ اتنی تعریفیں کر رہے ہیں۔''

''تم کہاں سے دیکھتیں۔ تم تو زیادہ تر کرمان میں رہی ہو۔''

''قطب الدین ہے کون؟'' فاخرہ نے ایک مرتبہ پھر قطب الدین کا نام اپنے ہونٹوں سے ادا کیا۔

''میں نے بتایا تو ہے سلطان شہاب الدین کا لے پالک بیٹا ہے لیکن اعزاز واکرام میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔''

''کیا آپ کے اس سے تعلقات کشیدہ ہیں؟''

''یہ کس نے کہہ دیا؟ وہ تو شہاب الدین کے رشتے سے میرا بھائی ہوا۔''

''آپ اتنے دن سے یہاں ہیں، وہ ملنے تک تو آیا نہیں۔''

''ہم نے کیا اسے مدعو کیا تھا جو وہ آتا؟''

''سلطان کی خوشنودی کے لیے اس کی دعوت آپ کو کرنی چاہیے۔ اگر اس کی بیوی ہے تو اسے بھی بلائیں ہم اس سے مل لیں گے۔''

''ابھی اس کی شادی کہاں ہوئی ہے۔''

فاخرہ یہی سننا چاہتی تھی لہٰذا سن کر چپ ہوگئی۔ اس نے تاج الدین کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ قطب الدین کو مدعو کرنا چاہیے۔ تاج الدین کئی دن تک سوچتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شہاب الدین کی خوشنودی کے لیے قطب الدین کو مدعو کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

شہاب الدین غوری ملتان فتح کرنے کے بعد اچھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قطب الدین ایبک بھی اس معرکے میں اس کے ساتھ تھا۔ اپنی دانش اور بہادری کی بدولت وہ سلطان کی نظروں میں پہلے ہی مقام حاصل کر چکا تھا۔ اس معرکے میں اس نے مزید دلوں میں جگہ پیدا کرلی۔

اچھ کے راجا کو شہاب الدین کی آمد کی خبر ملی تو وہ مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کرسکا اور قلعہ بند ہوگیا۔ شہاب الدین نے قلعے کے اردگرد اپنے خیمے لگا دیے۔ تسخیر قلعہ کی کوششیں کرنے لگا لیکن ہر دن کے گزرنے کے ساتھ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ بزورِ طاقت قلعہ فتح کرنا مشکل ہوجائے گا۔ قطب الدین کچھ اور ہی مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ شہاب الدین جب بھی باہر نکلتا ہے فصیل پر دو نسوانی قد ابھرتے ہیں۔ ان کے چہرے چادروں سے چھپے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے نظر نہیں آتے لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا لیکن تصدیق کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک روز اس نے حلیہ تبدیل کیا اور قریب کے دیہات میں نکل گیا۔ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی ہندو جوگی ہے۔ اس نے دیکھا کہ دیہات میں خوف کی فضا طاری ہے۔ ہر جگہ مسلمانوں کی آمد اور راجا کی بزدلی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک کھیت میں کچھ کسان کھڑے یہی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہوگیا۔

''تم لوگ اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟''

''خوف کی تو بات ہی ہے۔ مسلمان پالی ملتان پر اپنا قبضہ جما چکے اور اچھ کی طرف آئے ہیں۔ راجا کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ قلعے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ رانی بے چاری بھی کیا کرے۔ وہ تو سنا ہے راجا سے کہہ کہہ کر تھک گئی کہ شہاب الدین سے میل جول کرلو۔''

ایک اور دیہاتی نے کہا۔ ''وہ کیسے میل جول کرلے۔ وہ تو راجا بھیم دیو (گجرات کا راجا) کی مدد کی امید میں بیٹھا ہوا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''اسے اپنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ وہ کیوں مدد کو آنے لگا۔ مسلمانوں سے دشمنی مول لینا کوئی آسان ہے۔''

''بھائی اصل بات تو یہ ہے کہ راجا اور رانی میں بنتی ہی نہیں ہے۔ دو بچے بھی نہ جانے کیسے ہوگئے۔''

''راجا کے دو بچے ہیں؟'' قطب الدین نے پوچھا۔

''ہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکا تو بھیم دیو کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہوکر راج نیتی سے غافل ہی ہوگیا ہے۔ ان دنوں بھی سنا ہے وہ بھیم دیو کے پاس چلا گیا ہے۔ ماں بیٹی قلعے میں اکیلی ہیں۔''

اب یہ بات سوچنے کی نہیں رہ گئی تھی کہ فصیل سے جھانکنے والی عورتیں کون ہوسکتی ہیں۔ قطب الدین لشکر گاہ میں واپس آگیا اور جو معلومات اس نے حاصل کی تھیں، ان کی روشنی میں وہ آئندہ کے لیے سوچنے لگا۔

اس روز بڑی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ خیمے میں رکھا ہوا چراغ بری طرح بھڑک رہا تھا۔ لشکر گاہ میں خاموشی بھی تھی اور پراسراریت بھی۔ نیند قطب الدین کی آنکھوں سے نکل کر دور کھڑی ہوگئی تھی۔ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور چراغ بجھ گیا۔ اب قطب الدین کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ اسی وقت اس کے خیمے کے باہر کھڑے محافظ نے اندر آکر مشعل روشن کردی۔

''امیر اعظم! شاید کسی طوفان کی آمد ہے۔''
''اگر ایسا ہے تو میرا خیمے میں رہنا مناسب نہیں۔ ہمیں کسی کھلی جگہ پر ہونا چاہیے۔''

وہ مشعل کی روشنی میں باہر نکل آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دو آدمی رسیوں سے بندھے پڑے ہیں۔ محافظ کوشش کر رہا تھا کہ قطب الدین کی نظر ان پر نہ پڑے لیکن قطب الدین نے انہیں دیکھ ہی لیا۔

''یہ دونوں کون ہیں اور انہیں یہاں کیوں ڈالا گیا ہے؟''
''امیر اعظم! یہ دونوں جاسوس ہیں اور قلعے سے نکل کر اس طرف آئے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مقصد آپ کی جان کو... ضرر پہنچانا ہو۔ میں نے چند دوسرے پہرے داروں کی مدد سے انہیں گرفتار کرلیا۔ میرا ارادہ تھا کہ آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالوں۔ صبح ہو تو آپ کی خدمت میں انہیں پیش کردوں۔''
''تمہیں فوراً مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی پیغام لے کر آئے ہوں۔''
''حضور! غلطی ہوگئی۔''
''ان دونوں کی رسیاں کھول دو۔''

محافظ آگے بڑھا اور دونوں کو آزاد کردیا۔ قطب الدین دونوں کو لے کر خیمے کے اندر آگیا۔ وہ دونوں چہرے مہرے سے مطمئن نظر آرہے تھے۔ اپنی گرفتاری پر گھبرائے ہوئے نہیں تھے۔ قطب الدین نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کس مقصد سے آئے ہو؟''
''ہمیں کسی نے نہیں بھیجا۔ ہم تو مسلمانوں کے سرداروں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ راجا کی ہٹ دھرمی نے قلعے کے لوگوں کو جان کے عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔ آپ لوگ حملہ کرکے ہماری جان کیوں نہیں چھڑواتے۔''
''اگر ہمیں قلعے کے اندر سے کوئی سہارا مل جائے تو شہر ہمارے قبضے میں آجائے۔ تم بتاؤ ہمارے لیے کیا کرسکتے ہو؟''
''ہم آپ کی مدد تو نہیں کرسکتے لیکن ایک اطلاع فراہم کرسکتے ہیں۔'' ان دونوں نے کہا۔ ''رانی اور راجا کے درمیان چپقلش رہتی ہے۔ اس موقع پر تو دونوں کے درمیان خوب جھگڑے رہنے لگے ہیں۔ اگر کسی طرح رانی کو شیشے میں اتار لیا جائے تو وہ یقیناً مدد کریں گی۔''
''پھر یہ کام تو تم ہی کرسکتے ہو۔''
''شاید نہیں کرسکتے کیونکہ رانی تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہوسکتی البتہ ہم کوئی ایسا آدمی تلاش کرسکتے ہیں جو رانی کے قریب ہو۔ آپ اسے جو پیغام دیں، وہ رانی تک پہنچادے۔''

اب رات بہت تھوڑی رہ گئی تھی لہٰذا قطب الدین نے ان دونوں کو جانے دیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد قطب الدین پھر سوچنے بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اسے وہ مناظر یاد آرہے تھے جب دو عورتیں شہاب الدین کو دیکھنے کے لیے فصیل پر آجاتی تھیں پھر وہ اب یہ بھی سن رہا تھا کہ رانی اور راجا کے درمیان ناچاقی ہے خصوصاً مسلمانوں کے معاملے میں۔

طوفان تھم چکا تھا لیکن قطب الدین کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اسے جلد سے جلد سلطان سے ملنا تھا۔ لشکر میں نمازِ فجر باجماعت ادا ہوئی تو قطب الدین سلطان کے پہلو میں کھڑا تھا۔ نماز کے بعد وہ سلطان کے ساتھ اس کے خیمے میں چلا گیا اور رات میں پیش آنے والے واقعات سے اسے آگاہ کیا۔

''سلطان معظم! جہاں فولادی تلواریں زنگ آلود ہوجائیں وہاں ذہن کی تلوار کام آتی ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ اب برسات کا موسم بھی قریب ہے۔ مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ محاصرے کے ذریعے قلعہ اور اہلِ قلعہ کو مغلوب کرنا مشکل ہوگا لہٰذا اس سلسلے میں کوئی اور چال چلنی چاہیے۔''
''تمہارے ذہن میں کیا ترکیب آئی ہے؟''
''ترکیب یہ ہے کہ ہم ایک قاصد کے ذریعے پیغام رانی کو پہنچائیں کہ اگر اس کی کوشش سے قلعہ فتح ہوگیا تو آپ اسے اپنی ملکہ بنائیں گے۔''
''قطب الدین! کیا تم پھر سے بچے ہوگئے ہو۔ ایک ہندو رانی میری ملکہ بننے پر کیوں تیار ہوگی؟''
''راجا اور رانی کے درمیان قطعی ہم آہنگی نہیں۔ میں نے تمام معلومات حاصل کرلی ہیں۔''

قطب الدین نے یہ بھی بتایا۔ ''رانی اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہی ہے۔ وہ یقیناً آپ کو پسند کرنے لگی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ کا پیغام گیا تو وہ یقیناً خوش ہوگی۔''

قطب الدین نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو رضامند کرلیا۔ اب یہ انتظار تھا کہ قلعے سے کوئی باہر آتا ہے یا نہیں۔ دو دن گزر گئے اور پھر ایک دن اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک شخص قلعے سے باہر آگیا۔ لشکر کے لوگ اسے قطب الدین کے پاس لے آئے۔ قطب الدین نے اسے اعتماد میں لے کر سلطان کے نام سے یہ پیغام اسے دیا۔

''اپنی رانی سے کہنا کہ اگر وہ کسی طرح شہر پر ہمارا قبضہ

کروادے تو سلطان شہاب الدین اسے اپنی ملکہ بنالے گا۔''

یہ پیغام لے کر وہ شخص قلعے میں واپس چلا گیا۔ اسی رات وہ پھر آیا اور رانی کا پیغام پہنچایا۔

''رانی ماں کا کہنا ہے کہ میری عمر تو اب ایسی نہیں رہی کہ بادشاہ کی ملکہ بنوں البتہ میری لڑکی اس قابل ہے کہ وہ شہاب الدین جیسے جاں باز کے عقد میں آئے۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب بادشاہ کو فتح حاصل ہو تو وہ میری لڑکی کو اپنی ملکہ بنالے اور قلعے پر قابض ہو کر میرے مال و متاع اور اسباب کو ہاتھ نہ لگائے۔''

قطب الدین نے سلطان سے اجازت لیے بغیر رانی کی یہ شرطیں منظور کرلیں۔

''اپنی رانی سے کہنا کہ سلطان تمہاری بیٹی کو ملکہ بنانے کے لیے تیار ہے۔ تمہاری دیگر شرطیں بھی قبول ہیں۔ بس تم شہر پر قبضہ کروانے کی تیاری کرو۔''

اس کے دو دن بعد ہی راجا کے ہلاک ہونے کی خبر آگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ رانی نے اسے فصیل پر چڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ دشمن کی فوج کا جائزہ لے اور خود بھی اس کے ساتھ گئی۔ جب وہ بالکل آخری زینے پر پہنچا تو رانی نے موقع دیکھ کر اسے دھکا دے دیا اور شور مچانے لگی۔ وہ اتنی بلندی سے گرا تھا کہ گرتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ اس کی فوج میں ویسے ہی بددلی پھیل گئی تھی۔ اس کے مرتے ہی کسی میں لڑنے کی طاقت نہ رہی۔ سارا انتظام رانی کے قبضے میں آگیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار کو مجبور کیا کہ وہ شہر مسلمانوں کے حوالے کردے۔

رانی کی کوششوں سے شہر پر شہاب الدین کا قبضہ ہوگیا۔

شہر پر قبضہ ہوتے ہی شہاب الدین نے راج کماری سے شادی کرلی اور اسے مسلمان کرلیا۔ شہاب الدین نے قطب الدین کو بلایا اور اسے انعام و اکرام سے نوازا کہ اس کی کوششوں سے قلعہ فتح ہوا تھا۔

''قطب الدین! میں چاہتا ہوں تم راج کماری اور رانی کو لے کر غزنی چلے جاؤ۔ غزنی پہنچ کر رانی کو اسلامی تعلیمات اور قرآن سے بہرہ ور کرو۔ ملتان اور اچھ کے انتظامات میں استحکام پیدا کرنے کے بعد میں بھی غزنی چلا آؤں گا۔''

قطب الدین نے دونوں ماں بیٹیوں کو ساتھ لیا اور غزنی پہنچ گیا۔

تاج الدین یلدوز کو موقع مل گیا کہ سلطان کی خوشنودی کے لیے نہ صرف قطب الدین کو مدعو کرے بلکہ نئی ملکہ اور اس کی ماں کو بھی اپنے گھر دعوت پر بلائے۔ اس وقت یہ بھی اچھا موقع تھا کہ سلطان غزنی میں نہیں تھا۔

تاج الدین ایک روز قطب الدین کے مکان پر آیا اور سلطان کی نئی شادی کی خوشی میں اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

''سلطان اس وقت موجود نہیں ہیں۔ میں ان کی اجازت کے بغیر یہ دعوت کیسے قبول کرسکتا ہوں؟''

''ملکہ کہیں اور نہیں جائے گی اپنے بیٹے کے گھر جائے گی۔ ہم سب سلطان کے بیٹے ہی تو ہیں۔ ملکہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلم گھرانوں کی طرزِ معاشرت سے واقفیت حاصل کرے۔''

''اگر سلطان کو معلوم ہوا اور اس نے اسے ناپسند کیا تو؟''

''میں یہ الزام اپنے سر لے لوں گا۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

قطب الدین نے ہامی بھرلی۔

شاہی سواریاں تاج الدین کے محل تک پہنچ گئی تھیں۔ فاخرہ کی خوشی دیدنی تھی۔ کچھ دیر بعد قطب الدین کو اندر آنا ہی تھا لیکن فاخرہ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ محل کی چھت سے ان سواریوں کو اترتے ہوئے دیکھنے کے لیے پہنچ گئی تھی۔ اس کی نظریں قطب الدین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔ بیس بائیس سال کا نوجوان اس کے سامنے تھا۔ اس کا چھریرا بدن، بڑی بڑی آنکھیں اور چوڑی پیشانی اس کی خوب صورتی میں اضافہ کررہی تھیں۔ ہلکی مونچھیں اور چہرے پر سبزۂ خط کا آغاز اس کی مردانہ وجاہت کا سبب تھا۔

ابھی آنکھوں نے دیکھتے رہنے کا حق ادا نہیں کیا تھا کہ قطب الدین محل میں داخل ہوگیا۔ فاخرہ نیچے اتر آئی اور اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب دیوان خانے میں سب جمع ہوں اور اسے قطب الدین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے۔

فاخرہ کی بڑی بہن کئی مرتبہ دیوان خانے کا چکر لگا آئی تھی لیکن فاخرہ اپنے اندر ایسی جھجک محسوس کررہی تھی جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کھانے کا دور شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ تاج الدین یلدوز فاخرہ کو بلانے آیا۔

''کمال ہے گھر کے تمام افراد دیوان خانے میں ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ تم ہی کو قطب الدین سے ملنے کا اشتیاق

تھا اور تم ہی......''

''ابا جان! آپ کو تو معلوم ہے کہ کسی غیر مرد سے ملتے ہوئے مجھے کتنی شرم محسوس ہوتی ہے۔''

''وہ غیر نہیں ہے۔ تمہارے لیے چچا کا درجہ رکھتا ہے۔ فوراً آجاؤ تاکہ میں اس سے تمہارا تعارف کراؤں۔ نئی ملکہ اور اس کی والدہ بھی آئی ہے۔ تم یہ بھی دیکھ لوگی کہ ہندو عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔''

''آپ چلیں میں آتی ہوں۔''

''کچھ دیر میں کھانا لگنے والا ہے۔ میرے ساتھ ہی چلو ورنہ تم اور دیر لگاؤ گی۔''

وہ سر جھکائے خاموشی سے باپ کے ساتھ دیوان خانے میں پہنچ گئی۔ قطب الدین ہی تھا جس نے سب سے پہلے نظر اٹھا کر فاخرہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ حسن کا ایسا نادر نمونہ اس کی نظروں سے اب تک کیوں پوشیدہ رہا۔

''یہ میری بیٹی فاخرہ ہے۔'' تاج الدین نے تعارف کروایا۔

وہ چلتی ہوئی گئی اور راج کماری کے برابر جا کر بیٹھ گئی مگر اس کی آنکھیں قطب الدین کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔

اسی دوران کھانے کا وقت ہو گیا اور وہ سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے میں بھی فاخرہ نے اپنے لیے ایسی نشست کا انتخاب کیا جو قطب الدین کے سامنے تھی۔

دونوں وقفے وقفے سے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

کھانے کے بعد جب سب لوگ رخصت ہونے لگے تو فاخرہ کہیں غائب ہو گئی۔ قطب الدین کی نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ قطب الدین نے مایوسی کے عالم میں غلام گردش پار کی اور اپنی سواری کی طرف بڑھنے لگا۔ تاج الدین اسے رخصت کر کے واپس جا چکے تھے۔

''اللہ حافظ!'' ایک جانب سے آواز آئی۔ قطب الدین نے چونک کر دیکھا۔ ملکہ اور رانی آگے بڑھ چکی تھیں۔ فاخرہ اچانک کسی جانب سے نمودار ہوئی تھی۔

''کیا ہم دوبارہ مل سکیں گے؟'' قطب الدین نے کہا۔

''آپ کو سلطان کی خدمت سے کہاں فرصت ہے۔''

''آپ کے لیے تو وقت نکالنا ہی ہوگا۔''

''اگر میں ابا جان کے ساتھ کرمان نہیں گئی تو ملاقات ہوگی۔''

''کرمان غزنی کا ایک صوبہ ہی تو ہے۔ میں تم سے ملنے وہاں آجاؤں گا۔''

''اس وعدے کو یاد رکھیے گا۔'' فاخرہ نے کہا اور الٹے قدموں لوٹ گئی۔ دوسرے دن وہ اپنے والدین کے ساتھ کرمان چلی گئی۔

شہاب الدین اچھ کی مہمات سے فارغ ہو چکا تھا۔ یہاں سے وہ براہ ریگستان گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ گجرات کا راجا بھیم دیو، راجا اچھ کا حامی و مددگار تھا۔ اس کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی بھی وقت اچھ کا رخ کرے گا لہٰذا اس پر حملہ کر کے اس کی طاقت کو توڑنا ضروری تھا۔

راجا بھیم دیو ایک طاقتور راجا تھا۔ اس نے خوب ڈٹ کر شہاب الدین کا مقابلہ کیا۔ بڑے زوروں کی معرکہ آرائی ہوئی۔ ایک طویل مقابلے کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ بہت سے مسلمان سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شہاب الدین بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر غزنی کی طرف لوٹ گیا۔

اس عرصے میں شہاب الدین کی نئی ملکہ کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ملکہ بھی بیمار رہتی تھی۔ بات یہ تھی کہ شہاب الدین کو ان ماں بیٹیوں پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ عورتیں جب اپنے شوہر اور باپ کی نہیں ہوئیں تو میری کیا ہوں گی۔ اس لیے اس نے ان پر توجہ نہیں دی۔ کچھ عرصے بعد راج کماری کا بھی انتقال ہو گیا۔

شہاب الدین کے غزنی سے آجانے کے بعد قطب الدین کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اسے بھی فاخرہ کا خیال آتا تھا لیکن اب وہ غزنی میں نہیں تھی۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سے ملنے کرمان آئے گا لیکن شہاب الدین اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے دور ہونے نہیں دے رہا تھا۔

شہاب الدین ایک مرتبہ پھر ہندوستان کا رخ کرنے والا تھا۔ اس کے لیے وہ لشکر کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے قدم قدم پر قطب الدین کے مشوروں کی ضرورت پڑ رہی تھی۔

تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ کسی ضروری پیغام کے لیے ایک قاصد کرمان بھیجنا تھا۔ قطب الدین نے سنا تو ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ یہ اہم پیغام کسی قاصد کے ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں۔ یہ پیغام لے کر وہ خود تاج الدین کے پاس جائے گا۔ سلطان نے اس کی درخواست کو قبول کرلیا۔

وہ تقریباً ایک سال بعد فاخرہ سے ملنے والا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس دن قطب الدین غزنی سے کرمان

جانے کے لیے نکلا، اسی روز تاج الدین کرمان سے غزنی پہنچ گیا۔

قطب الدین کرمان پہنچا تو خلافِ توقع فاخرہ نے اس کا استقبال کیا۔ استقبال بھی طنز کے نشتروں کے ساتھ۔

''ہمیں آپ نے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ خود نہ آئے تو خیریت کا نامہ ہی بھیج دیتے۔''

''میں نے خط کا نہیں خود آنے کا وعدہ کیا تھا۔''

''یہ وعدہ بھی خوب نبھایا۔ آپ تو کہتے تھے کہ کرمان غزنی کا صوبہ ہی تو ہے، چلا آؤں گا۔ کرمان تو ہندوستان سے بھی دور ہو گیا۔''

''اب شرمندہ کیوں کرتی ہو۔ ہم تو یہ چاہتے تھے کہ آپ سے ملنے روز کرمان آیا کریں لیکن سلطان کی آمد کے بعد فرصت ناپید ہو گئی۔ سلطان کو ہندوستان کے ایک علاقے میں بہت بری شکست ہوئی ہے۔ اب وہ دوبارہ ہندوستان کا رخ کرنے والے ہیں۔ شاید اس مرتبہ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑے۔''

''یا اللہ خیر! ہمیں جنگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ کے دشمنوں کو کچھ نہ بھی ہوا تو طویل عرصے کی جدائی تو ہے۔''

''فکر مت کرو فاخرہ ..... ہم تمہارے باپ سے ایک ایسی چیز مانگنے والے ہیں جو اس جدائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔''

''اس میں بھی آپ کو دیر لگ جائے گی۔''

''کیوں؟''

''ابا جان کرمان میں نہیں ہیں۔ وہ آج ہی غزنی گئے ہیں۔''

''غزنی گئے ہیں مگر کیوں؟''

''کوئی خاص بات نہیں بس سلطان سے ملاقات کی غرض تھی۔ کوئی اور بات ہو تو میں کہہ نہیں سکتی۔''

یہ اطلاع ملنے کے بعد مناسب نہیں تھا کہ وہ کرمان میں ٹھہرتا۔ اس کی تھکن تو فاخرہ سے بات کرنے کے بعد ہی اتر گئی تھی۔ وہ کرمان سے چلا آیا۔

راستے بھر وہ یہ سوچتا آیا تھا کہ اگر کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ وہ ہندوستان نہ جا سکے تو فاخرہ سے ملاقاتوں کا موقع مل سکے گا۔

غزنی پہنچ کر وہ ابھی لباس بھی تبدیل کرنے نہیں پایا تھا کہ سلطان نے اسے طلب کر لیا۔ سلطان کے پاس تاج الدین یلدوز بھی بیٹھا ہوا تھا۔

قطب الدین کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ سلطان نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب تاج الدین اپنے لشکر کے ساتھ سلطان کے ہمراہ جاتا اور قطب الدین غزنی میں رہ کر سلطان کی نیابت کرتا۔

''سلطان شاہ خوارزم کی طرف سے برابر خطرہ لگا ہوا ہے لہٰذا کسی ذمے دار آدمی کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مہم میں تاج الدین میرے ساتھ ہوگا۔ تم غزنی میں رہ کر ایک ایک پل کی خبریں مجھے ہندوستان پہنچاتے رہو گے۔ میں نے تاج الدین سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ حفاظت کی غرض سے اپنے اہلِ خانہ کو غزنی پہنچا دے۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کی حفاظت کا بندوبست کرو گے۔''

''یہ غلام آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔'' قطب الدین نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیے اور سر جھکا دیا۔

شہاب الدین روانہ ہو گیا۔ تاج الدین اس کے ہمراہ تھا اور اس کے اہلِ خانہ غزنی پہنچ چکے تھے۔ قطب الدین بادشاہ کی نیابت کے لیے غزنی میں ٹھہر گیا تھا۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز کے محل میں موم شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ فاخرہ اور اس کی بڑی بہن ہندوستان سے آنے والی خبروں پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

''ابا جان کو اگر غزنی میں ٹھہرنے کا حکم ملتا اور قطب الدین ایبک بادشاہ کے ساتھ چلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' فاخرہ کی بڑی بہن نے کہا۔

''تمہیں شاید یہ بات معلوم نہ ہو لیکن مجھے معلوم ہے۔'' فاخرہ نے اپنی بہن سے کہا۔ ''سلطان معظم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ان کے بعد ابا جان ان کے جانشین ہوں۔ غزنی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں جائے۔ اسی لیے سلطان انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں کہ جو فتوحات ان کے حصے میں آئیں، ان میں ابا جان کی ناموری بھی ہو۔''

''یہ تو تم نے نئی بات بتائی مگر سوال یہ ہے کہ غیاث الدین کا بیٹا محمود موجود ہے جو سلطان شہاب الدین کا بھتیجا ہے۔ تخت کی وراثت تو اسے جائے گی۔ ابا جان کوئی سلطان شہاب الدین کے صلبی بیٹے تو ہیں نہیں۔''

''ہو سکتا ہے سلطان، ابا جان کو اپنی زندگی میں ہی وارث مقرر کر دیں۔ میں نے تو ایک بات کہی کہ ابا جان کو اعزاز بڑھانے کے لیے سلطان انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے کچھ علاقے فتح کر کے ابا جان کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا جائے۔''

''اللہ! یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ مجھے ہندوستان دیکھنے کا

بڑا شوق ہے۔"

کچھ دیر بعد لڑکیوں کی والدہ بھی اس گفتگو میں شریک ہوگئی تھیں۔ ایک ملازم نے آکر خبر دی کہ قطب الدین ایک دروازے پر ہیں اور باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی فاخرہ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ کام ملازموں کا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور غلام گردش کو پار کرگئی۔ قطب الدین اسے راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے محافظوں نے گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ دیا تھا۔

"زہے نصیب، آپ ہمارے گھر کا راستہ تو بھولے۔" فاخرہ نے طنز کیا۔

"میں بھولے سے آتو گیا، تم تو بھول کر بھی میرے گھر نہ آسکیں۔"

"میں اگر آسکتی تو صبح شام آتی۔ ویسے میں آپ کی ذہانت کی داد دیتی ہوں۔ آپ نے کس ترکیب سے ابا جان کو ہندوستان بھیج دیا اور خود غزنی میں ٹھہر گئے۔"

"بخدا اس میں ہماری ذہانت کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سلطان کا اپنا فیصلہ تھا۔"

"وہاں سے کوئی خبر آئی؟"

"اب کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے کرلوگی۔ اندر چلنے کے لیے نہیں کہوگی؟"

"میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ کو بیٹھنا بھی ہوگا۔"

فاخرہ نے اسے لے جاکر دیوان خانے میں بٹھادیا۔ ملازموں نے خشک میوہ جات اور شربت لاکر رکھ دیا۔ فاخرہ کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ یہاں کوئی نہ آئے لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اسے والدہ اور بڑی بہن کو بھی بلانا پڑا۔

باتوں کا دریا بہنے لگا لیکن فاخرہ سب سے بے نیاز اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے تو جب ہوش آیا جب قطب الدین جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

اب کا گیا وہ کب آئے گا۔ اس نے سوچا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی غلام گردش میں آگئی۔

"فاخرہ! کیا ہمیں تنہائی کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آسکتا؟"

"آپ ہی کہہ رہے تھے کہ میں تمہارے والد سے کہہ کر اس جدائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گا۔"

"وہ ہندوستان گئے ہوئے ہیں۔ واپسی نہ جانے کب ہو۔ اس وقت تک ہم تمہارے بغیر کیسے رہیں گے؟"

"آپ پر ہمارے گھر کے دروازے بند تو نہیں ہوئے۔"

"آپ کی والدہ کو اعتراض ہوگا۔"

"وہ ہم پر بھروسا کرتی ہیں۔"

"آپ پر بھروسا کرتی ہیں، ہم پر تو نہیں۔"

"ایسا نہ کہیے۔ ہمارے گھر میں سب آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

"ہم آپ سے ملنے ضرور آیا کریں گے۔"

☆☆☆

لاہور کا غزنوی حکمراں راجا دہلی اور دوسرے مقامات ہند کے راجاؤں کی دشمنی تیز افغانوں کی یورشوں کے سبب بہت کمزور ہوچکا تھا لہٰذا جب خسرو، شہاب الدین کے مقابلے پر آیا تو مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور مجبوراً قلعہ بند ہوکر بیٹھ گیا اور پھر صلح کے لیے کوششیں کرنے لگا۔ اس نے اپنا ایک نوعمر لڑکا مع ایک شاندار ہاتھی شہاب الدین کے پاس بھجوادیا۔ شہاب الدین نے اس پیشکش کو قبول کیا اور جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا۔

خسرو کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد اس نے سندھ کے مشہور شہر دیول یا دیبل پر حملہ کیا اور دریائے سندھ کے کنارے کے تمام مقامات کو اپنے قبضے میں کرلیا۔

شہاب الدین کے جاتے ہی خسرو ملک اپنی سرشت پر اتر آیا۔ گکھڑوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس نے سیالکوٹ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہ قلعہ شہاب الدین نے تعمیر کروایا تھا اور اس کے بعد سندھ کی طرف گیا تھا۔ خسرو نے بہت کوشش کی کسی طرح قلعے پر قبضہ ہوجائے لیکن وہ ناکام رہا اور نامراد لاہور کی طرف لوٹ گیا۔ شہاب الدین نے اسے مزہ چکھانے کے لیے لاہور پر حملہ کردیا۔ خسرو ملک اس بار بھی قلعہ بند ہوگیا۔ شہاب الدین نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور اس محاصرے میں ایسی شدت پیدا کی کہ خسرو عاجز آگیا اور تنگ آکر شہر کے دروازے کھول دیے۔

شہاب الدین نے اس مرتبہ کوئی رعایت نہیں کی اور اسے گرفتار کرکے اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کے پاس غورستان بھیج دیا۔ غیاث الدین نے اسے ایک قلعے میں نظر بند کردیا اور بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خسرو ملک کی موت کے ساتھ ہی محمود غزنوی کے خاندان کا چراغ گل ہوکر رہ گیا۔ اب کوئی نہیں تھا جو شہاب الدین کے سامنے آتا۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز کے محل کا پائیں باغ چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ گھر کے تمام لوگ خواب غفلت میں تھے لیکن باغ میں رہ رہ کر سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔ ان میں ایک

مردانہ آواز تھی ایک نسوانی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند نے ذرا جھک کر دیکھا تو ان میں ایک قطب الدین تھا اور نسوانی آواز فاخرہ کی تھی۔

''ابا جان کو گئے دو سال ہونے کو آئے۔ وہ نہ جانے کب تک ہندوستان میں رہیں۔ آپ امی جان سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

''میری مجبوری سمجھو فاخرہ۔ میں سلطان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا۔ شادی بھی نہیں۔ وہ یہاں ہوتے تو اب تک ہماری شادی ہو بھی چکی ہوتی۔''

''اگر سلطان رضامند نہ ہوئے؟''

''پھر میں اپنا راستہ خود بناؤں گا۔ میں باغی بن سکتا ہوں بے وفا نہیں۔ سلطان سے پوچھنا ضروری ہے۔ وہ انکار کردیں وہ الگ بات ہے۔ ویسے وہ انکار نہیں کریں گے۔ انہوں نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی۔''

''قطب الدین! ذرا سوچو، یہ اچھی بات نہیں کہ ہم چھپ چھپ کر ملتے رہیں۔ کبھی کسی نے دیکھ لیا تو قیامت سے کم چیز اس گھر میں نہیں آئے گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو فاخرہ بیگم..... میں خود بھی سوچتا رہتا ہوں کہ میری بے تابی تمہیں رسوا نہ کردے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس باغ میں نہیں آیا کروں گا۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہے گا تو سب کی موجودگی میں آیا کروں گا۔''

''آپ تو خفا ہوگئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ ملنا ہی چھوڑ دیں۔ آپ سے ملے بغیر تو ہمیں بھی کہاں چین ملتا ہے۔''

''فاخرہ بیگم..... احتیاط ضروری ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ کسی اچھے وقت کا انتظار کرو۔ سلطان کے غزنی پہنچتے ہی میں تمام دوریاں مٹا دوں گا۔''

دو سائے اپنی جگہ سے اٹھے۔ قطب الدین اس خفیہ راستے کی طرف بڑھ گیا جو اسے باہر لے جاسکتا تھا۔ دیوار کے ساتھ اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ قطب الدین سوار ہوا تو گھوڑے نے قدم اٹھا دیے۔

☆☆☆

شہاب الدین نے لاہور فتح کرنے کے بعد اسے ملتان کے حاکم علی کرماج کے سپرد کیا اور قاصد کو غزنی کی طرف دوڑایا کہ فتح نامہ قطب الدین کو پیش کرے اور نوید سنائے کہ سلطان عنقریب داخل غزنی ہوگا۔

قطب الدین امراء کا اجلاس برخاست کرنے کے بعد فاخرہ کی طرف جانے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ لاہور سے آئے ہوئے قاصد نے محل میں قدم رکھا۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی، نفیریاں بجنے لگیں۔ جب تک قاصد قطب الدین تک پہنچتا فتح نامے کی خبر سب کو ہو چکی تھی۔

قاصد نے فتح نامہ پڑھ کر سنایا۔ قطب الدین نے اسے انعام واکرام سے نوازا۔ فاخرہ کے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب اسے سلطان کی آمد کا جشن منانا تھا۔

شہاب الدین بہت سا مالِ غنیمت لے کر وطن میں داخل ہوا۔ ہفتوں تک غزنی کے در و دیوار ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے۔

شہاب الدین کے آنے کے بعد قطب الدین، تاج الدین یلدوز سے ملنے ان کے گھر گیا ضرور، وہاں فاخرہ کو بھی دیکھا لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ تاج الدین سے فاخرہ کے متعلق کوئی بات کرتا۔ یہ موقع ایسا بھی نہیں تھا کہ سلطان کے سامنے کوئی ذکر چھیڑتا۔ تاج الدین کچھ دن غزنی میں گزارنے کے بعد اپنی جاگیر کرمان چلے گئے۔ فاخرہ کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ قطب الدین انہیں رخصت کرنے بھی نہ جاسکا۔

اسی زمانے میں خوارزم شاہیوں سے جنگ چھڑ گئی جو طویل عرصے تک جاری رہی۔ یہ جنگ قطب الدین کے سپرد کی گئی لہٰذا اسے اتنی فرصت بھی نہ مل سکی کہ وہ کرمان جاتا اور فاخرہ سے ملتا۔ کسی قاصد کو اس کے پاس بھیجتا تو کیوں بھیجتا اور کیا کہلواتا۔

اس جنگ کی وجہ سے غزنی میں بھی بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ شہاب الدین، تاج الدین کی مدد سے ان بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔

قطب الدین کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ فاخرہ کس حال میں ہے۔

قطب الدین اس نہر کے کنارے مقیم تھا جو دریائے جیحوں کے پانی سے سیراب ہوکر خوارزم اور خلیج کی مشرقی جانب بہتی تھی۔ تیغوں کی جھنکار میں اسے فاخرہ کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ رات کے وقت جب جنگ کے بادل چھٹ جاتے تھے تو وہ چاند سے باتیں کرتا تھا۔

غزنی سے اچھی خبریں نہیں آرہی تھیں۔ کرمان کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ اس نے ایک خط فاخرہ کے نام لکھا اور ایک بااعتماد آدمی کو کرمان کی طرف بھیج دیا۔ ہدایت یہی تھی کہ یہ خط فاخرہ کے ہاتھوں تک پہنچے اور اس کا جواب بھی لانا۔

ایک ہفتے کے سات دنوں کی مسافت طے کر کے وہ

قاصد واپس آیا۔ قطب الدین کو فاخرہ کا جواب موصول ہو گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا، وہ قیامت تک قطب الدین کا انتظار کرے گی۔

قیامت تو نہیں آئی لیکن سلطان کا پیغام آ گیا۔ اس نے کسی اور امیر کو خوارزم بھیج کر قطب الدین کو واپس بلا لیا۔ قطب الدین خوش تھا کہ اسے غزنی کا آسمان دیکھنے کو ملے گا۔ فاخرہ سے ملاقات کا موقع ہاتھ آئے گا۔ اس نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے لیکن ابھی وہ راستے میں تھا کہ ایک اور پیغام مل گیا۔ وہ ہندوستان پر ایک اور حملے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور قطب الدین کو حکم ہوا تھا کہ وہ غزنی کی سرحدوں پر سلطان سے آ کر مل جائے۔ اسے بھی سلطان کے ساتھ ہندوستان جانا ہوگا۔ انکار کی نہ تاب تھی نہ مجال۔ اپنے لشکر کے ساتھ سلطان سے جا کر مل گیا۔

غزنی کے در و دیوار اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس مرتبہ شہاب الدین نے ایک زبردست حملے کے بعد بھٹنڈہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں بھٹنڈہ بڑے بڑے راجاؤں کا مرکزی شہر بن گیا تھا اور راجا اجمیر رائے پتھورا کے قبضے میں تھا۔

سلطان شہاب الدین قلعہ بھٹنڈہ کو اپنے ایک امیر کے حوالے کر کے وطن واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ رائے پتھورا ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر بھٹنڈہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ راجا دہلی کھانڈے راؤ بھی ہے۔

اس عظیم الشان لشکر کی آمد کی خبر سن کر شہاب الدین نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قطب الدین ایک مرتبہ پھر فاخرہ سے بہت دور چلا گیا۔ شہاب الدین مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر دریائے سرستی کے کنارے دونوں افواج کا آمنا سامنا ہوا۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو ابتدا ہی میں ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ ہندوؤں کا پلڑا ایسا بھاری ہوا کہ سلطان کے غوری، افغانی اور خلجی امیر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

شہاب الدین نے جانبازی کا مظاہرہ کیا اور باقی ماندہ فوج اور قطب الدین کی جانبازی اور رفاقت سے دشمن سے لڑتا رہا۔ قطب الدین کی جانبازی اور رفاقت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے تو جیسے مرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اکیلا دشمن کی صفوں میں داخل ہوتا اور صفوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔ ایک بجلی تھی کہ کوند رہی تھی۔ ایک طوفان تھا جو اٹھ رہا تھا۔

اس جنگ کے دوران کھانڈے راؤ نے اس پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ زخمی ہو گیا۔ قریب تھا کہ گھوڑے سے گر جائے کہ ایک خلجی سردار کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ اس کے گھوڑے پر چڑھا اور اسے اپنی گود میں لے کر میدان سے بھاگ نکلا۔

سلطان کو چھوڑ کر بھاگے ہوئے امیر میدان جنگ سے بیس کوس کے فاصلے پر مقیم تھے۔ یہ سردار سلطان کو بھی وہاں لے کر پہنچ گیا۔ سلطان اپنے امیروں سے سخت ناراض تھا۔ صرف قطب الدین ایبک تھا جو اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ سلطان اسی سے اپنے دل کی باتیں کر رہا تھا۔

"فرزند من! تو نے میرے امیروں کی بے وفائی دیکھ لی۔ یہ مجھے مرنے کے لیے میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ میں اپنے زخم اچھے ہوتے ہی غزنی جاؤں گا اور ایک نیا لشکر لے کر دوبارہ ہندوستان آؤں گا۔"

"سلطان معظم! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو بہ حفاظت غزنی تک لے کر جاؤں گا۔"

"میرے بیٹے! تم میرے ساتھ غزنی نہیں جاؤ گے۔ میں نے جو علاقے ہندوستان میں رہ کر فتح کیے ہیں، تم ان کی نگرانی کرو گے۔ چند امیر اور بھی ہیں جو تمہارے ساتھ ہوں گے۔ میرے دوبارہ آنے تک ان علاقوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دو گے۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

اس حکم کی تعمیل اس نے کس دل سے کی، یہ اس کا دل جانتا تھا۔ فاخرہ نہ جانے کیا سوچتی ہوگی۔ وہ میری مجبوریوں کو سمجھے گی یا نہیں؟

شہاب الدین غزنی پہنچا تو تاج الدین یلدوز کی بھی کیا ہمت تھی جو پوچھتا کہ قطب الدین کو ساتھ کیوں نہیں لائے۔

شہاب الدین نے غزنی پہنچتے ہی میدان جنگ سے بھاگنے والے امیروں کو سزا دینے کا حکم جاری کیا۔ اس نے توبروں میں کچے "جو" بھروا کر ان امیروں کی گردن میں لٹکا دیے اور اسی عالم میں ان کو سارے شہر میں پھروایا۔

شہاب الدین نے یہ حکم دیا کہ جو امیر اپنے توبرے کے کچے جو نہ کھائے اسے قتل کر دیا جائے۔ امیروں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے توبروں کے کچے جو کھا لیے۔ تب جا کے خلاصی ہوئی۔

اس کے بعد بھی غزنی میں سوگ کا عالم طاری تھا۔ شہاب الدین کو اس شکست کا ایسا صدمہ تھا کہ ہر عیش خود پر حرام کر لیا تھا۔

فاخرہ کو اپنے والد کی زبانی قطب الدین کا احوال

معلوم ہوگیا تھا۔ اب وہ انتظار کے سوا کیا کرسکتی تھی۔ انتظار بھی ایسا جس کی طوالت کا اسے علم نہیں تھا۔

شہاب الدین اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تیاریاں کرتا رہا اور ایک سال کے اندر اندر ایک عظیم الشان لشکر تیار کرلیا۔ جب لشکر کی تیاری مکمل ہوگئی تو اس نے غزنی کو خیر باد کہا۔ یہ لشکر منزلیں طے کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ ملتان میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد وہ لاہور پہنچا۔ قطب الدین بھی ایک لشکر کے ساتھ اس سے آکر مل گیا۔ شہاب الدین نے اپنے ایک امیر کو اجمیر، رائے پتھورا کے پاس بھیجا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

''میں اس وقت لاہور میں ہوں اور تمہاری راج نیتی کو ختم کرنے کے لیے یہاں پہنچا ہوں۔ اگر تم اس ذلت سے بچنا چاہتے ہو تو اسلام قبول کرلو۔ تمہارے توسط سے اجمیر کے باشندوں کو بھی میری یہی دعوت ہے۔ اگر تم ایسا کرلو گے تو میں تمہاری سلطنت تمہارے پاس رہنے دوں گا۔''

اس خط کے جواب میں رائے پتھورا نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایسے ناشائستہ الفاظ کہے کہ اب جنگ کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔

رائے پتھورا نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے خطوط لکھے۔ ان راجاؤں نے رائے پتھورا کا ساتھ دینے کا اعلان کیا اور اپنے اپنے لشکر لے کر اس کی مدد کو چل پڑے۔ تمام راجا رائے پتھورا کے گرد جمع ہوگئے۔ رائے پتھورا تین لاکھ راجپوتوں اور افغانوں کا لشکر لے کر شہاب الدین کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا اور دریائے سرتی کے کنارے، ترائن کے مقام پر خیمہ زن ہوگیا۔ یہاں سے اس نے شہاب الدین کے نام یہ خط لکھا۔

''ہم ہندو راجاؤں کی کیفیت تو تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے، وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہے لیکن ابھی مختلف افواج کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں پر رحم کھاؤ۔

''اگر تم اپنے ارادے سے باز آکر واپسی کا ارادہ کرلو گے تو ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں گے۔ ہم تمہیں لوٹ جانے کا نیک مشورہ دیتے ہیں ورنہ یاد رکھو کل صبح ہم اپنے سپاہیوں کی مدد سے جنگ کو میدان حشر بنا دیں گے۔''

شہاب الدین نے یہ خط پڑھ کر ایسا مصلحت آمیز خط لکھا کہ ہندو کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

''مجھے اس امر کا پورا اندازہ ہے کہ آپ کا خط محبت اور ہمدردی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر خود عمل کرتا لیکن کیا کروں میں اپنے بھائی کا محکوم ہوں اور اسی کی ہدایت پر عمل کرتا ہوں۔ اگر مجھے اتنی فرصت ملے کہ کسی کو اپنے بھائی کے پاس بھیج کر آپ کی قوت کا حال بیان کرسکوں اور اپنی کمزوری کی روداد بیان کرسکوں تو مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہوسکتی ہے کہ پنجاب، سرحد اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی ہندوستان آپ کے پاس رہے۔''

اس خط کو پا کر رائے پتھورا پر مسلمانوں کی کمزوری واضح ہوگئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ شہاب الدین اپنے بھائی کی طرف سے ہدایت آنے سے قبل حملہ آور نہیں ہوگا۔

ہندو اپنی طاقت کے نشے میں سرشار ہوکر مسلمانوں کی طرف سے غافل ہوگئے اور عیش و عشرت میں وقت گزارنے لگے۔

جب شہاب الدین نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ ہندو راجا پوری طرح غفلت میں مبتلا ہیں تو اس نے راتوں رات لشکر مرتب کیا اور علی الصباح میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ ہندو ابھی ضروریات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ شہاب الدین نے جنگ شروع کردی۔

اک بلائے ناگہانی تھی جو ہندوؤں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن مسلح ہوکر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ وہ اتنی بہادری سے لڑ رہے تھے کہ مسلمان لشکریوں کے قدم اکھڑے جا رہے تھے۔

عصر کے وقت تک جب اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو شہاب الدین اور قطب الدین نے مل کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ ہندوؤں کے قدم اکھڑ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانسا پلٹ گیا۔ کھانڈے راؤ اور بہت سے دوسرے ہندوستانی راجا ہلاک ہوگئے۔ رائے پتھورا اپنی بچی فوج لے کر بھاگ نکلا لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مسلمان لشکریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ اسے بعد میں قتل کردیا گیا۔

اس فتح کے بعد شہاب الدین اجمیر میں داخل ہوا۔ اجمیر اور اس کے نواح پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی گیا۔ دہلی کے راجا نے اس کا دوستانہ استقبال کیا اور قیمتی تحائف بطور نذرانہ پیش کیے۔

جب شہاب الدین غزنی واپس جانے لگا تو اس نے قطب الدین کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اب اس کا ہندوستان میں رہنا مقدر تھا۔

اتنے بڑے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد قطب

الدین کو خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن غزنی سے دوری کا مطلب تھا، فاخرہ سے دوری۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ کہنے کی جرأت کر سکا۔

"سلطان معظم! میں تو آپ کے قدموں میں رہنے کا عادی ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ آپ کی جدائی مجھے خوش نہیں رکھ سکے گی۔"

اس کے جواب میں شہاب الدین نے تسلی دی۔ "یہاں کا انتظام تمہارے سوا کوئی نہیں سنبھال سکتا اور پھر یہ جدائی عارضی ہے۔ میں بہت جلد ہندوستان آؤں گا اور تم سے ملوں گا۔"

فاخرہ سے ملنے کا خیال پھر خواب و خیال ہو گیا۔

شہاب الدین کی واپسی کے بعد قطب الدین نے دہلی اور میرٹھ کے قلعوں پر حملہ کر کے ان دونوں علاقوں کو رائے پتھورا اور کھانڈے راؤ کے رشتے داروں کی حکومت سے نکال کر اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ میرٹھ پر قبضہ ہوتے ہی دہلی کون سا دور تھا۔ وہ آگے بڑھا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ راجپوتوں نے بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑنے کے لیے باہر نکل آئے۔ فریقین میں زبردست جنگ ہوئی۔ راجپوت شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ بند ہو گئے۔ قطب الدین نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ محاصرے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ راجپوت جب بہت تنگ آ گئے تو انہوں نے قطب الدین سے امان طلب کی اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے دہلی کو اسلامی مقبوضات میں شامل کر کے اسلامی قانون رائج کر دیا۔

کچھ عرصے بعد ہندوستان کے در و دیوار جنگ کے شور سے پھر گونجنے لگے۔ شہاب الدین پھر ہندوستان میں قدم رکھ رہا تھا۔ قطب الدین کو معلوم ہوا تو وہ بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے قنوج کا راستہ اختیار کیا۔ قطب الدین اس کے ہراول میں شامل تھا۔

راجا جے چند والی بنارس اس کے مقابلے پر صف آرا ضرور ہوا لیکن وہ قطب الدین کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ اس کے ساتھ کوہ پیکر ہاتھیوں کی قطاریں تھیں لیکن وہ ان سب کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہاب الدین کے لیے قطب الدین نے راستہ صاف کر دیا تھا۔ وہ بہ آسانی بنارس میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک ہزار مندروں کو اس غرض سے مسمار کر دیا کہ مسلمانوں کے رہنے کے لیے مکان بنائے جا سکیں۔ شہاب الدین نے ہندوستانی علاقوں کی حکومت قطب الدین کے سپرد کی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

☆☆☆

تاج الدین کے گھر میں کئی دن سے کشیدگی تھی۔ فاخرہ اور اس کی بہن کی شادیوں کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ فاخرہ کے لیے شہاب الدین کے ایک غلام ناصر الدین قباچہ کا رشتہ آیا ہوا تھا لیکن فاخرہ شادی کے لیے رضامند نہیں تھی۔ اسے قطب الدین کا انتظار تھا اور قطب الدین ہندوستان کی فتوحات میں گھرا ہوا تھا۔ اسے فرصت نہیں مل سکی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فاخرہ اپنے کمرے میں تھی۔ کبھی بیٹھ جاتی کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اس نے قطب الدین کے نام خط لکھنا شروع کیا۔

"غفلت مآب قطب الدین!

میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ دشمنوں کو پامال کرنے والے قطب الدین دوستوں کو تو بے قرار مت کرو۔ میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ میں کب تک انکار کرتی رہوں گی۔ میں نے خودکشی کا پورا سامان کر لیا ہے۔ اگر تم اب بھی نہیں آئے تو میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔ اس خط کا فوری جواب دو ورنہ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

صبح اٹھ کر اس نے اپنے ایک ملازم کو اعتماد میں لیا اور اسے دہلی کی طرف دوڑا دیا۔

وہ جب تک جاتا اور واپس آتا، فاخرہ کو شادی کے لیے مجبور کیا جانے لگا۔ مجبوراً اسے اپنی ماں کو اپنی مجبوری سے آگاہ کرنا پڑا۔ ماں نے سن کر سر پیٹ لیا۔ "قطب الدین اب ہندوستان کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا انتظار مت کر۔"

"ہندوستان بھی اسی دنیا میں ہے ماں۔"

"یہ دنیا اتنی چھوٹی نہیں جتنی تم سمجھتی ہو۔ قطب الدین، سلطان کا زر خرید ہے۔ قطب الدین اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ با اختیار نہیں ... وہ اگر با اختیار ہوتا تو کب کا تم سے ملنے آ چکا ہوتا۔"

ماں سمجھاتی رہی لیکن فاخرہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

ایک مہینا ہو چکا تھا۔ فاخرہ کا ملازم لوٹ آیا تھا اور قطب الدین کا یہ پیغام لایا تھا کہ وہ فاخرہ کو بھولا نہیں ہے۔ بہت جلد غزنی آئے گا۔

یہ تو فاخرہ کو بھی معلوم تھا کہ قطب الدین اسے بھولا نہیں ہے لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ اس سے شادی کب کرتا ہے۔ یہ پیغام بھی اسے صرف یہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت جلد غزنی آئے گا۔ کب آئے گا، یہ پھر بھی معلوم نہیں تھا۔ فاخرہ کے لیے یہ پیغام ہی بہت تھا۔ اس نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ قطب الدین سے شادی کرے گی ورنہ نہیں کرے گی۔ اس کا یہ

صاف جواب سن کر اس کے والدین نے فاخرہ کے بجائے اس کی بڑی بہن کا رشتہ ناصر الدین قباچہ سے طے کردیا۔

فاخرہ کا انتظار قطب الدین کی مشکلوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا جارہا تھا۔ قطب الدین نے آنا بھی چاہا تو غزنی نہ آسکا۔ ایک موقع وہ آیا کہ جب قطب الدین نے غزنی جانے کی پوری تیاری کرلی۔ اس نے فاخرہ کو خط بھی تحریر کردیا کہ وہ اس سے ملنے بہت جلد غزنی آئے گا لیکن عین وقت پر اسے اپنے ایک قلعے کی حفاظت کے لیے ہانسی جانا پڑ گیا۔ ایک راجپوت سردار جس کا نام جیتوان تھا، ہانسی کے قلعے کے نیچے خیمہ زن ہوگیا۔ ہانسی کا مسلمان صوبےدار مقابلے کی جرأت نہ کرسکا اور قلعہ بند ہوکر قطب الدین کو مدد کے لیے پکارا۔

قطب الدین کو غزنی جاتے جاتے ہانسی جانا پڑا۔ قطب الدین نے ہانسی پہنچ کر جیتوان کو شکست دی۔ جیتوان فرار ہوگیا۔ اس فتح کے بعد اس نے غزنی جانے کا پورا ارادہ کرلیا لیکن اس وقت بھی اس کی قسمت آڑے آگئی۔ اسے معلوم ہوا کہ سلطان شہاب الدین غزنی سے ہندوستان کی طرف آرہا ہے۔ قطب الدین اپنے آقا کے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور کچھ دور جاکر مسلمانوں سے جاملا۔ اس نے ایک سو عربی گھوڑے، ہاتھیوں کی ایک طلائی اور ایک نقرئی زنجیر اور پچاس ہزار سوار اس مہم کے لیے پیش کیے۔ شہاب الدین نے بھی خوش ہوکر اسے خلعت سے سرفراز کیا اور اسے لشکر کا پیش رو مقرر کیا۔

قطب الدین بادشاہی لشکر کے آگے آگے روانہ ہوا۔ شہاب الدین بھی اپنے لشکر کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

قطب الدین ابھی تھوڑی دور ہی چلا ہوگا کہ بنارس کے راجا جے چند کے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا۔ قطب الدین نے جے چند کے لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا۔ جے چند نے جب یہ خبر سنی تو وہ خود میدان جنگ میں آیا اور قطب الدین سے لڑائی شروع کردی۔ مسلمان سپاہیوں نے دشمن کی فوج پر تیروں کی بارش شروع کردی۔ ایک تیر جے چند کی آنکھ میں لگا۔ یہ تیر ایسا کاری تھا کہ جے چند اپنے ہاتھی سے نیچے گر گیا اور وہیں ختم ہوگیا۔ اپنے راجا کا یہ حشر دیکھ کر دشمن کے سپاہی میدان سے بھاگ نکلے۔ اس فتح کے بعد شہاب الدین بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے دشمن کی بربادی پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے لشکر کو لے کر بنارس میں داخل ہوا۔ بنارس میں دربار عام منعقد ہوا تو کسی نے اس کی خدمت میں ہاتھیوں کی ایک قطار پیش کی۔

جو ہاتھی بھی بادشاہ کے سامنے سے گزرتا، وہ فیل بان کے اشارے پر بادشاہ کو سلام پیش کرتا۔ ان ہاتھیوں میں ایک سفید ہاتھی بھی تھا۔ جب یہ ہاتھی بادشاہ کے سامنے سے گزرا تو فیل بان نے اسے اشارہ کیا تاکہ وہ بادشاہ کو سلام کرے لیکن اس ہاتھی نے اشارے کی کوئی پروا نہیں کی۔ فیل بان نے ہاتھی کو طرح طرح سے سلام کرنے پر مجبور کیا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا بلکہ غضب ناک ہوگیا۔

''قطب الدین! اسے تم ہی درست کروگے۔''

شہاب الدین نے یہ کہہ کر ہاتھی قطب الدین کے حوالے کردیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب قطب الدین اس کے سامنے آیا تو یہ شریر جانور بالکل قابو میں آگیا اور اشارے کے بغیر ہی اسے سلام کرنے لگا۔

یہ ہاتھی زندگی بھر قطب الدین کے ساتھ رہا۔ جب قطب الدین کا انتقال ہوا تو یہ ہاتھی بھی مرگیا۔ شہاب الدین، قطب الدین کو القاب فرزندی دینے کے بعد ایک مرتبہ پھر غزنی روانہ ہوگیا۔ قطب الدین ایک مرتبہ پھر فاخرہ سے دور ہوگیا۔ بہت دور... بہت دور۔

قطب الدین دارالخلافہ دہلی کی طرف واپس ہوا۔ ابھی اس نے تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ اسے معلوم ہوا دہلی اور اجمیر دونوں جگہوں پر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔

اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر دو راجاؤں نے سرکشی دکھائی تھی۔ سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ جھت رائے نامی ایک راجپوت لشکر جرار لے کر دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے اپنے شہر سے روانہ ہوچکا تھا۔ یہ لشکر دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا اور آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچادی تھی۔

یہ خبریں سن کر قطب الدین جھت رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسے ہر قیمت پر دہلی کو قبضے سے بچانا تھا۔ جھت رائے کو قطب الدین کی آمد کی خبر ملی تو وہ اجمیر کی طرف بھاگ گیا۔ قطب الدین نے اس کا تعاقب کیا اور اجمیر پہنچ گیا۔ اجمیر کے راجا ہیمراج نے شہر سے نکل کر قطب الدین کا مقابلہ کیا لیکن قطب الدین کی تلوار نے اس کا قلع قمع کردیا۔ اجمیر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور ہندوؤں کا یہ مرکزی شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمان فرماں رواؤں کا صدر مقام بن گیا۔

شہاب الدین جب پہلی مرتبہ ملتان آیا تھا، حاکم بھیم راج سے اس کی دشمنی اسی وقت سے چل رہی تھی۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ بہت خوف زدہ تھا اور مسلسل

اپنی طاقت میں اضافہ کررہا تھا تاکہ دیگر راجاؤں کی مدد سے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے نکلے۔

☆☆☆

بھیم راج کے محل میں اس کی رانی اور بیٹی رتنا سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ بھیم راج کو آج معمول سے زیادہ دیر ہوگئی تھی جبکہ اس وقت اس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ رام دیو آیا بیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا ہے۔ وہ رتنا کا ہاتھ تھامنے کے لیے بضد تھا بلکہ رانی کو اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی رتنا سے نہیں کی گئی تو وہ اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ رانی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو رتنا اس کا پورا ساتھ دے گی۔ اسی لیے اس نے کوئی خاص بات زبان سے نہیں نکالی تھی بلکہ یہ کہہ کر بات ٹال دی تھی کہ وہ راجا سے پوچھے بنا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔

رام دیو اچھ کی اس رانی کا بیٹا تھا جس نے سلطان شہاب الدین کی شادی اپنی رانی سے کروادی تھی۔ رام دیو کو اپنے رشتے دار بھیم راج کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہیں اس کا اور رتنا کا عشق پروان چڑھا۔ رام دیو کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے بھیم راج سے مایوس ہونے کے بعد اپنا گروہ تیار کرلیا اور مسلم علاقوں میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ بھیم راج اس کے گروہ کو ڈاکوؤں کا گروہ کہتا تھا اور اس کی حرکتوں سے تنگ تھا۔ رام دیو نے گھر بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھی رتنا سے ملنے آجاتا تھا۔

بھیم راج گھر پہنچا تو شام ہوچکی تھی۔ اس کے آتے ہی رانی اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ”آپ نے آج بہت دیر کردی۔“

”تم میرے ارادوں سے واقف تو ہو۔ میں ہندوستان کی زمین پر مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔ ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ میں آہستہ آہستہ اپنی طاقت بڑھا رہا ہوں۔ اب میرے پاس اتنا لشکر ہوگیا ہے کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔ میں اور سیناپتی (سپہ سالار) جیتو اس لشکر گاہ کی طرف گئے تھے۔ وہیں دیر ہوگئی۔“

”ایک جنگ گھر میں بھی چھڑی ہوئی ہے، پہلے اس کا مقابلہ تو کرلو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”رام دیو آیا بیٹھا ہے۔“

وہ تو آتا ہی رہتا ہے۔“

”اب کے اس کے تیور دوسرے ہیں۔ کہتا ہے اگر رتنا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دیا تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا۔“

”اس کی یہ مجال ہوگئی، اس نے کیا رتنا کو اپنی بہن سمجھ لیا ہے جس نے راجپوتوں کی ناک کٹوادی اور شہاب الدین کے ساتھ غزنی بھاگ گئی۔ میری بیٹی وہ ہاتھ توڑ دے گی جو اسے زبردستی اٹھائیں گے۔“

”دھیرج مہاراج دھیرج۔ اتنے غصے میں مت آؤ۔ رام دیو کے ساتھ ذرا دھیان سے بات کرنا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ دونوں کچھ طے کرچکے ہیں۔ اگر رام دیو نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس کا ساتھ ضرور دے گی۔“

راجا بھیم کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”رام دیو کو میرے پاس بھیجو، میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔“

”ذرا آرام سے بات کرو۔“

”تم بھیجو تو سہی۔“

رام دیو کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ذرا بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کی سنجیدگی گستاخی کی حدوں کو چھو رہی تھی لیکن بھیم دیو اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ بڑے پیار سے پیش آیا۔

”رام دیو! اس مرتبہ بڑے دن میں پھیرا لگایا؟“

”آپ کو رانی ماں نے بتا دیا ہوگا کہ میں کیوں آیا ہوں۔“

”بتایا تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ تم اس طرح بھی بات کرسکتے ہو۔“

”آپ نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں اس طرح بات کروں۔ آپ رتنا کی شادی مجھ سے کیوں نہیں کردیتے؟“

”مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں بیٹوں کی طرح سمجھا ہے لیکن میرے دل میں مسلمانوں کے لیے نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے تو ٹھنڈا ہونے دو۔“

”میں اتنا انتظار نہیں کرسکتا۔“

”تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ شہاب الدین غزنی واپس چلا گیا ہے۔ اس وقت اس کا لے پالک قطب الدین ایبک ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کا حکمران ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ میں یہ علاقے اس سے آزاد کروالوں۔ اس کے بعد رتنا کی شادی تم سے ہوجائے گی بلکہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم اپنے گروہ کے ساتھ ان معرکوں میں میرا ساتھ دو کیونکہ تمہارے اور میرے مقاصد ایک ہی ہیں۔“

رام دیو نے یہ شرط مان لی اور یہ طے ہوگیا کہ

عنقریب مسلمانوں پر جو حملہ کیا جائے گا، رام دیو اس میں شریک ہوگا۔ فتح اور شکست ہر دونوں صورتوں میں رتنا کی اس سے شادی کردی جائے گی۔

قطب الدین بھی بھیم راج کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اسے بھیم راج کے ارادوں کی خبر مل گئی۔ اس سے پہلے کہ بھیم راج اپنے ارادوں پر عمل پیرا ہوتا، قطب الدین نے خود پہل کردی۔ اس نے آگے بڑھ کر بھیم راج کے علاقے پر حملہ کردیا۔ راجا بھیم کا سپہ سالار قلعے کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ قطب الدین نے اس کا تعاقب کیا اور تھوڑے ہی فاصلے پر جاکر اسے پکڑ لیا۔ جیتو اس ایسا بدحواس ہوگیا کہ اس نے راجا بھیم کا بھی انتظار نہیں کیا اور لڑائی شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میدان جنگ میں قطب الدین کے ہاتھوں مارا گیا۔

جیتو اس کی موت کی خبر سن کر راجا بھیم بھاگ گیا اور اپنی سلطنت کے کسی سرحدی مقام پر پناہ گزیں ہوگیا۔ قطب الدین نے نہروالا سے بہت سا مالِ غنیمت سمیٹا اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہانسی پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ تعمیر کروایا اور کہرام کو فتح کرتا ہوا دہلی آگیا۔

اب اس کی فتح پر مبنی کارنامے ایسے شاندار تھے کہ اس نے نہایت فخر سے شہاب الدین کو خط روانہ کیا۔ جس وقت وہ شہاب الدین کو خط تحریر کررہا تھا، فاخرہ کا خیال آنا لازمی تھا۔ لہٰذا اس نے لکھ دیا کہ وہ غزنی آرہا ہے۔ فتوحات کی نشانیاں مالِ غنیمت کی صورت میں سمیٹ کر وہ غزنی روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین کو ترکی غلاموں سے عشق تھا۔ سوداگروں کو اس کی کمزوری کا علم تھا لہٰذا دور دور سے غلام اس کی خدمت میں لاتے اور انعام واکرام سے سرفراز ہوکر جاتے تھے۔

آتش نام کا ایک غلام مختلف سوداگروں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا غزنی پہنچا۔ غزنی پہنچتے ہی اس کے حسن وجمال کی شہرت ہوگئی۔

”سلطان معظم! ایک غلام فروخت کے لیے غزنی لایا گیا ہے۔ ایسا حسین ہے کہ یوسف ثانی جیسے کہا جائے۔ نہ جانے کس کے ہاتھوں فروخت ہو اور اس کے حسن کی توہین ہو۔ ایسا بے مثال ہیرا تو خزانۂ شاہی میں ہونا چاہیے۔“

درباریوں کی زبان سے یہ تعریف سن کر بادشاہ کو شوق ہوا کہ اس کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ اس نے درباریوں سے پوچھا۔

”وہ غلام کس سوداگر کے پاس ہے؟“

”حضور، حاجی جمال نامی سوداگر ہے جو اسے غزنی لایا ہے۔“

”اس سوداگر کو کل صبح دربار میں پیش کیا جائے۔“

حاجی جمال کو حکم دے دیا گیا۔ حاجی جمال کے پاس دو غلام تھے۔ آتش اور ایک دوسرا۔ وہ دونوں کو لے کر سلطان کے دربار میں پیش ہوگیا۔

سوداگر نے دونوں غلاموں کی قیمت دو ہزار دینار بتائی۔ شہاب الدین نے ایک ہزار دینار کے عوض دونوں غلاموں کو خریدنے کا خیال ظاہر کیا۔

حاجی جمال نے اس قیمت پر دونوں غلاموں کو بیچنے سے انکار کردیا اور اس بے رخی سے جواب دیا کہ بادشاہ کو غصہ آگیا۔ اس نے حکم جاری کردیا۔ ”کوئی شخص ان غلاموں کو نہ خریدے۔ جو خریدے گا وہ اپنے نتائج کا خود ذمے دار ہوگا۔“

کس کی جرأت تھی کہ جو اس حکم کے خلاف کام کرتا۔ ہر دولت مند آدمی کی تمنا تھی کہ وہ آتش کو خریدے لیکن بادشاہ کے خوف سے کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی۔

انہی دنوں نہروالا کے حاکم راجا بھیم کو شکست دینے کے بعد قطب الدین غزنی آیا۔ غزنی پہنچتے ہی اس نے آتش کے حسن کا شہرہ سنا۔ اسے اشتیاق ہوا کہ وہ اس غلام کو خریدے۔ اس نے شہاب الدین سے اجازت طلب کی۔

”آقائے محترم! میں نے سنا ہے غزنی میں ایک غلام آیا ہوا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس غلام کو میں خریدوں؟“

”غلام تو واقعی قابل دید ہے لیکن اس کے پیچھے قصہ کیا ہے تمہیں معلوم ہے؟“

اس کے بعد شہاب الدین نے سوداگر کے ساتھ پیش آنے والا پورا معاملہ دہرایا۔

”آقائے محترم! کوئی صورت نکالیے، میں اس غلام کو ملاحظہ کرچکا ہوں۔ نادانستگی میں اسے خریدنے کی پیشکش بھی کرچکا ہوں۔ کوئی صورت نکالیے کہ میں جھوٹا نہ پڑوں۔“

”جانِ عزیز! یہ پہلا موقع ہے کہ تم مجھ سے کچھ طلب کررہے ہو۔ میں تمہیں مایوس نہیں کرسکتا لیکن اپنے فرمان کا بھی مجھے پاس ہے۔ میں اعلان کرچکا ہوں کہ غزنی میں کوئی ان غلاموں کو نہ خریدے اور تم اس وقت غزنی میں ہو۔ یہ سودا یہاں نہیں ہوسکتا۔ ہاں ایک صورت ہے، حاجی جمال ان غلاموں کو لے کر دہلی چلا جائے۔ جب تم دہلی واپس جاؤ

تو ان غلاموں کو خرید لو۔''

قطب الدین کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوداگر کو حکم دیا کہ وہ دونوں غلاموں کو لے کر دلی چلا جائے اور اس وقت تک اس کا انتظار کرتا رہے جب تک کہ وہ غزنی سے دلی نہ پہنچ جائے۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز کے مکان پر اداسی پہرا دے رہی تھی۔ قطب الدین کی بیماری کی خبریں یہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ ایک روز تو یہ خبر آگئی کہ اب قطب الدین کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں۔

قطب الدین غزنی پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی بیمار پڑ گیا تھا۔ اتنی مہلت مل ہی نہیں سکی کہ بادشاہ سے فاخرہ کے سلسلے میں کوئی بات کرتا۔

قطب الدین پر غنودگی کا عالم طاری تھا۔ حکمائے وقت ابھی ابھی اس کے لیے نئی دوائیں تجویز کر کے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ قطب الدین نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سیاہ چادر میں لپٹا ایک سایہ کمرے میں داخل ہوا اور اس کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا پھر کسی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ ایسا لمس تھا کہ اس نے چونک کر پوری آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آواز نے کئی دن بعد قدم نکالا تھا۔

''اگر مجھے پوری طرح ہوش ہے تو تم فاخرہ ہی ہونا؟''

''ہاں میں ہی وہ بدنصیب ہوں جو تمہیں اس حال میں دیکھنے کے لیے زندہ ہے۔''

''بدنصیب تو میں ہوں کہ اٹھ کر تمہارا استقبال بھی نہیں کر سکتا۔''

''آپ کو تو اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ اپنی آمد کی اطلاع ہی دے دیتے۔''

''میں تمہارے پاس کرمان آنے ہی والا تھا کہ بیماری سے ملاقات ہوگئی۔''

''طبیبوں کا کیا کہنا ہے؟''

''وہ کہتے ہیں جب تک فاخرہ سے تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تم ٹھیک نہیں ہو سکتے۔''

''ان سے آپ نے یہ نہیں کہا کہ آپ فاخرہ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتے؟''

''یہ نہ کہو فاخرہ۔'' قطب الدین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بعض اوقات آدمی جو کہنا چاہتا ہے، وہ کہہ نہیں پاتا۔''

قطب الدین کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نقاہت کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ فاخرہ نے سیاہ چادر سمیٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اب قطب الدین کا کمرا طبیبوں سے بھر جائے گا۔ اس کے ملازم اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔

اس کے جاتے ہی یہ خبر پھیلنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی عورت قطب الدین کے پاس آئی تھی اور اس کے بعد قطب الدین کی طبیعت خراب ہوئی۔

یہ خبر شہاب الدین تک بھی پہنچ گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قطب الدین کے پاس آنے والی لڑکی کوئی اور نہیں تاج الدین یلدوز کی بیٹی فاخرہ بیگم تھی۔ وہ کیوں آئی تھی؟ اکیلی کیوں آئی؟ یہ ایسے سوال تھے جن کے جواب قطعی مشکل نہیں تھے۔

تاج الدین یلدوز ان دنوں کرمان سے غزنی آیا ہوا تھا۔ فاخرہ گھر پہنچی نہیں تھی کہ شاہی حکم آ گیا۔ شہاب الدین نے تاج الدین کو طلب کیا تھا۔ فاخرہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ راز کھل گیا تھا۔ وہ پہچان لی گئی تھی۔

وہ کمرے میں بند ہو کر آنے والے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

تاج الدین بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس آیا تو بہت خوش تھا لیکن جب اس نے یہ کہا کہ وہ کل کرمان جا رہا ہے اور سب کو اس کے ساتھ چلنا ہوگا تو فاخرہ کی خوشی کافور ہو گئی۔

''بابا جانی! ہم ابھی تو کرمان سے آئے ہیں۔ آپ پھر کرمان جا رہے ہیں۔ سلطان کو آخر غزنی میں ہمارا رہنا کیوں گوارا نہیں؟''

''یہ تمہیں وقت بتائے گا کہ ہم کرمان کیوں جا رہے ہیں۔ فی الحال تو چلنے کی تیاری کرو۔''

''کیا ہم مزید ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے؟''

''میں نے کہا نا چلنے کی تیاری کرو۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ فاخرہ چپ ہو گئی۔ اب وہ پوری طرح سمجھ گئی تھی کہ بادشاہ اسے قطب الدین سے دور کر دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اسے غزنی سے کرمان بھیجا جا رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ کرمان پہنچ گیا۔

قطب الدین تیزی سے رو بہ صحت ہو رہا تھا۔ شاہی طبیب کے علاج نے اس کی بیماری کو دور کر دیا۔ اب توانائی بحال کرنے کے لیے اسے صرف آرام کی ضرورت تھی۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ فاخرہ کو شاہی حکم کے مطابق کرمان بھیج دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی لیا جا سکتا تھا کہ بادشاہ اس شادی پر رضامند نہیں۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ایک اور شاہی حکم آ گیا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے وہ فوراً دہلی چلا جائے۔ قطب الدین کو فاخرہ سے کہا ہوا اپنا ایک فقرہ یاد آ گیا۔ اس نے کبھی کہا تھا، میں باغی بن سکتا ہوں بے وفا نہیں۔ کیا باغی بننے کا وقت آ گیا ہے؟

اس نے بغاوت کی پہلی منزل طے کی۔ وہ غزنی سے ہندوستان جانے کے لیے روانہ ضرور ہوا لیکن کرمان پہنچ کر رک گیا۔ تاج الدین اس کا اس طرح استقبال کر رہا تھا جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ قطب الدین اس کے گھر آ کر قیام کرے گا۔

''فاخرہ! میں شہاب الدین سے بغاوت کر کے آ گیا ہوں لیکن اس کا اعلان ہندوستان جا کر کروں گا۔ اب شہاب الدین سے شادی کے لیے کچھ کہنا بے کار ہے۔ کیا تم اپنی والدہ سے کہہ سکتی ہو کہ وہ مجھے اپنی دامادی میں قبول کریں۔ میں صرف ایک دن یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔''

''یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ کو ابا جان سے بات کرنی ہوگی۔''

''وہ میرے محسن ہیں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تیار ہیں یا نہیں۔ اگر وہ انکار کرتے ہیں تو میں خاموشی سے چلا جاؤں گا۔''

''آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں؟ آپ کی سفارش کے لیے میں جو موجود ہوں۔ امی جان ضرور میری مدد کریں گی۔''

فاخرہ نے اپنی ماں سے بات کی تو شکر گزاری کے سوا اس کے ہونٹوں پر کوئی اور لفظ آ ہی نہ سکا۔ اس نے قطب الدین کو بھی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ امی جان موقع دیکھ کر ابا سے بات کریں گی۔ جو ہو گا صبح تک معلوم ہو جائے گا۔

اسے معلوم تھا صبح کیا ہونے والا ہے۔ صبح ہوئی نہیں تھی کہ شہاب الدین اپنے محافظ دستوں کے ساتھ کرمان پہنچ گیا۔

''قطب الدین! میں نے تمہیں ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا؟''

''کرمان، ہندوستان کے راستے میں ہی پڑتا ہے۔''

''یہ پہلا موقع ہے جب کوئی کام تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کیا ہے۔''

''اس لیے کہ میں آپ کی زبان سے انکار سننے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں وہاں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا، جہاں تم چاہتے ہو؟''

''مگر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ معاملہ شادی کا ہے؟''

''میں نے تاج الدین سے کہہ دیا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم تاج الدین کی بیٹی فاخرہ بیگم سے شادی کر لو۔''

''آقائے من، میری جان آپ پر نثار۔''

''تمہاری وفاداریوں کا یہ ایک چھوٹا سا انعام ہے۔''

قطب الدین نے بادشاہ کے حکم کے مطابق فاخرہ سے شادی کر لی۔ چند دن کرمان میں گزارنے کے بعد ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

قطب الدین نے برسوں کے انتظار کے بعد اپنی محبت حاصل کی تھی۔ اسے وہ اپنی تقدیر کی فتح قرار دیتا تھا۔ اس کے دہلی پہنچتے ہی اس فتح کا عظیم الشان جشن منایا گیا۔ شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا اور دولت اس بے دردی سے لٹائی کہ دہلی کے لوگوں نے اس کا نام قطب الدین لکھ بخش رکھ دیا۔

''فاخرہ بیگم! آپ ہماری زندگی میں داخل تو ہو گئی ہیں لیکن آپ نے نادانستگی میں کانٹوں کے بستر پر قدم رکھ دیا ہے۔''

''جس بستر پر آپ سوئیں گے اسی پر تو ہمیں سونا ہے۔''

''شاید یہ بستر بھی الگ ہو جائے۔''

''ہمیں آپ سے اس بے وفائی کی توقع نہیں۔''

''یہ بے وفائی کا نہیں فرض کا تقاضا ہے۔ ہم جس ملک میں ہیں، وہاں محض ایک علاقے کی حکومت پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے مزید فتوحات کے لیے دہلی سے باہر جانا پڑے گا۔''

''مجھے ان تقاضوں کا علم ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔''

قطب الدین بیانہ کے قلعے کی تسخیر کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اسے غزنی سے شہاب الدین کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس نے بیانہ جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور شہاب الدین کے استقبال کے لیے ہانسی کی طرف روانہ ہوا۔ ہندوستان کے راجاؤں میں ان دنوں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک طرف قطب الدین نے ناطقہ بند کیا ہوا تھا، دوسری جانب شہاب الدین جب چاہتا ہندوستان پر چڑھ دوڑتا تھا۔

دہلی سے ہانسی تک راستے مخدوش تھے۔ مسلمان لشکریوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ اس کے چہیتے غلام قطب الدین ایبک نے قلعہ بیانہ کی مہم کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اب وہ اس کے استقبال کے لیے ہانسی کی طرف آ رہا ہے۔ وہ قطب الدین کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہیں رک

گیا۔ قطب الدین اپنے لشکر سمیت اس سے ملا۔ شہاب الدین نے اسے گھوڑے اور خلعت سے سرفراز کیا۔

''قطب الدین، میرے بیٹے! تم نے قلعہ بیانہ کی تسخیر کا ارادہ کیوں ملتوی کر دیا؟''

''اس لیے کہ آپ کی آمد اور میرے آگے بڑھنے کا مقصد ایک ہی تھا۔ اب آپ تشریف لے آئے ہیں تو میری تلوار آپ کی تلوار سے کیسے سبقت لے جاسکتی ہے۔ یہ اتفاق ہی تو ہے کہ آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے لہٰذا ہم دونوں مل کر قلعہ بیانہ فتح کریں گے۔''

آقا اور غلام دونوں قلعہ بیانہ فتح کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس مقصد میں دونوں کامیاب ہوئے۔ شہاب الدین بیانہ ہی میں رک گیا اور قطب الدین نے گوالیار کی طرف کوچ کیا۔

بیانہ کی فتح کی شہرت گوالیار تک پہنچ چکی تھی لہٰذا وہاں کا راجا، قطب الدین کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اس نے قیمتی تحائف قطب الدین کی خدمت میں ارسال کیے اور سالانہ خراج کی ادائیگی پر معاملے کو رفع دفع کیا۔

گوالیار سے نمٹنے کے فوراً بعد شہاب الدین غزنی روانہ ہوگیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اجمیر اور اس کے.... گردوپیش کے راجاؤں نے قطب الدین ایبک سے نمٹنے کی ٹھان لی۔ ہندوؤں کا ایک مشترکہ لشکر تیار ہوگیا جس کا مقصد اجمیر کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنا تھا۔ نہروالا کا راجا بھیم اس لشکر کی سربراہی کر رہا تھا جو پہلے بھی قطب الدین ایبک کے ہاتھوں شکست اٹھا چکا تھا۔

قطب الدین ایبک دہلی سے روانہ ہوا اور وہاں راجا نہروالا کے پہنچنے سے پہلے ہی راجپوتوں سے جنگ شروع کردی۔

ابھی نہروالا کا راجا پہنچا بھی نہیں تھا۔ قطب الدین کو امید تھی کہ راجا نہروالا کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ نہتروان کے راجپوتوں پر غلبہ حاصل کرلے گا۔ آثار بھی یہی بتا رہے تھے۔ مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا لیکن اچانک قطب الدین کا گھوڑا زخمی ہوکر گر پڑا۔

قطب الدین کے گرتے ہی مسلمان سپاہیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ ان سپاہیوں نے بڑی مشکلوں سے قطب الدین کو ایک دوسرے گھوڑے پر سوار کیا اور اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔

راجپوت اپنی فتح کی خوشی منا ہی رہے تھے کہ حاکم نہروالا بھی پہنچ گیا۔ اس وقت ضروری تھا کہ اجمیر تک قطب الدین کا پیچھا کیا جاتا۔ دونوں لشکر مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور اجمیر سے تین کوس کے فاصلے پر مقیم ہوگئے۔

ہندوؤں کی افواج نے لڑائی کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رکھا۔ راجپوتوں کے لشکر غول در غول وہاں پہنچ رہے تھے اور ہندوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ قطب الدین کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ ان پر غلبہ حاصل کرتا بلکہ الٹا یہ ظاہر ہونے لگا کہ یہی حال رہا تو اجمیر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ شہاب الدین کو یہ خبریں پہنچیں تو اس نے اپنے نامور امیروں کی سربراہی میں ایک لشکر قطب الدین کی مدد کے لیے غزنی سے روانہ کیا۔

ایک طرف یہ لشکر جانباز غزنی سے ہندوؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا اور دوسری طرف سردی کے موسم نے راجپوتوں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کردیے۔ یہ عالم دیکھ کر ان لوگوں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور ان کے لشکر کا ہر گروہ ایک ایک کرکے اپنے اصلی مقام پر روانہ ہوگیا۔

غزنی سے لشکر آجانے کی وجہ سے قطب الدین ایبک کے ہاتھ مضبوط ہوگئے۔ اس نے اس لشکر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ طے کرلیا کہ وہ ہندو دشمنوں کا پوری طرح صفایا کردے گا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن گجرات کا راجا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اسی کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔

حاکم نہروالا بھی نہایت ہوشیار دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بھی قطب الدین ایبک کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ قطب الدین نے اجمیر سے نہروالا کی طرف کوچ کیا ہے۔ غزنی کا لشکر بھی اس کے ساتھ ہے۔ گویا خود شہاب الدین ہندوستان میں موجود ہے لہٰذا زبردست تیاری کی ضرورت ہے۔ اس وقت بھی اس کے راج محل میں گردوپیش کے ہندو راجاؤں کا ایک اجلاس جاری تھا جس میں یہ وعدے لیے جارہے تھے کہ اس مرتبہ قطب الدین کو شکست ہوئی تو مسلمان علاقوں کے حصے بخرے کس طرح کیے جائیں گے۔

قطب الدین ایبک اپنی منزل کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ نہروالا کے راجا نے دیگر راجپوتوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا ہے۔

مخبروں نے آکر اطلاع دی کہ راجپوت لشکر ہوگڑھ کے قلعے کے نیچے مسلمانوں سے معرکہ آرا ہونے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

قطب الدین دشمن کے لشکر سے مقابلے کے لیے آگے ضرور بڑھا لیکن معروف راستے کو چھوڑ کر پرپیچ پہاڑی راستوں میں داخل ہوگیا۔ راجپوت یہ تصور بھی نہیں کرسکتے

تھے کہ قطب الدین ان پہاڑی راستوں سے گزر کر آئے گا۔ وہ بالکل غافل تھے کہ مسلمان سپاہیوں کے گھوڑے ان کے لشکروں کے سروں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ جتنی دیر میں وہ سنبھلتے مسلمانوں کی تلواروں نے انہیں کم کرنا شروع کر دیا۔

جنگ اتنی ہولناک تھی کہ کہتے ہیں تھوڑے سے وقت میں مسلمانوں نے دشمن کے پچاس ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنی پچھلی شکست کا شاندار انتقام لیا۔

یہاں سے وہ گجرات کی طرف بڑھا اور بلا خوف و خطر شہر میں داخل ہو گیا۔ خوب جی بھر کے شہر کو لوٹا۔ نہروالا کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کی اور خود اجمیر ہوتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہ اتنی بڑی اور شاندار فتح تھی کہ اس نے دہلی پہنچ کر ایک عظیم الشان جشنِ فتح منعقد کیا۔ اس کا مقصد ظاہر داری نہیں تھی بلکہ دشمنوں پر اپنا خوف مسلط کرنا مقصود تھا۔

☆☆☆

بختیار خلجی نامی شخص غور کا رہنے والا تھا۔ اس لیے شہاب الدین غوری کا دربار اس سے دور نہیں تھا۔ اس خانع آزما نے سلطان شہاب الدین غوری کے دربار کا رخ کیا۔

عام طور پر یہی مشہور تھا کہ وہ بہادر اور دلیر افراد کی تلاش میں رہتا ہے لیکن بختیار خلجی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ سلطان شہاب الدین کو اس کی عجیب و غریب ہیئت اور شکل و صورت پسند نہ آئی۔

محمد بختیار خلجی دربار غزنی میں جگہ نہ پا سکا۔ کہا جاتا ہے بختیار خلجی کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا تھا تو گھٹنوں تک آتے تھے۔ اس کی انگلیاں اس کی پنڈلیوں کو چھو لیتی تھیں۔

یہ شخص مایوس ہو کر غزنی سے ہندوستان چلا آیا۔ دہلی پہنچا تو یہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو غزنی شہر میں سلطان شہاب الدین غوری کے سامنے پیش آئی تھی۔ یہاں بھی اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھتے ہوئے کسی نے بھی اسے لشکر میں کسی اچھے عہدے کی پیشکش نہیں کی۔ یہ ترک بہادر دہلی سے بددل ہو کر بدایوں چلا گیا۔ وہاں کے جاگیردار سپہ سالار حسن نے اس کے لیے کچھ روزینہ مقرر کر دیا۔

یہاں رہتے ہوئے اس کی ملاقات بدایوں کے حاکم حسام الدین سے ہو گئی۔ اس دوران اس نے اچھا گھوڑا اور اسلحہ حاصل کر لیا تھا اور چند مقامات پر جواں مردی بھی دکھائی تھی لہٰذا حسام الدین نے کچھ حوالے اس کے سپرد کر دیے۔

آدمی تھا بہادر ذرا جو سہارا ملا تو ان علاقوں میں جو بہار میں شامل تھے، یورشیں شروع کر دیں اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگا۔ اس کی فتوحات کو دیکھتے ہوئے لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ گھوڑے، ہتھیار اور مسلح لشکری اس کے گرد جمع ہو گئے۔

اس کی شہرت بڑھی تو ہندوستان میں جہاں بھی خلجی ترک بیٹھے ہوئے تھے، محمد بختیار خلجی کے پاس جانے کے لیے بہار کا رخ کرنے لگے۔ ایک دو سال اسی حالت میں گزر گئے پھر وہ پورے بہار کو اپنے ماتحت لانے کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

بختیار خلجی نے دو سو سواروں کو ساتھ لیا اور بہار نام کے قلعے کے دروازے پر پہنچا اور اچانک جنگ شروع کر دی۔ اتنی دلیری سے لڑا کہ کچھ ہی دیر میں قلعہ فتح کر لیا۔ اس قلعے سے بختیار خلجی کو بے انتہا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔

☆☆☆

قطب الدین ایبک کالنجر پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس حملے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ یہاں کے راجا سلطان محمود غزنوی کے باجگزار تھے لیکن موجودہ راجا نے خراج دینا بند کر دیا تھا اور بغاوت پر اتر آیا تھا۔

کالنجر کا راجا مقابلے پر آیا ضرور لیکن شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا لیکن اپنے انجام پر غور کرتا رہا تھا تو افسوس کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اس نے بہت مجبور ہو کر اپنے بزرگوں کی پیروی کی۔ قطب الدین کی خدمت میں تحائف بھیج کر صلح کا ارادہ کیا۔ جس طرح اس کے بزرگ سلطان محمود کے باجگزار تھے اسی طرح وہ بھی قطب الدین کا اطاعت گزار ہو گیا۔

اس نے قطب الدین کو پیغام بھیجا کہ وہ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے کل اس کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ جانے کیا مصلحت تھی کہ یہ دن اس کی زندگی میں کبھی نہ آیا۔ اسی رات راجا کا انتقال ہو گیا۔ قطب الدین نے راجا کے انتقال کے بعد راجا کے وکیل کو پیغام بھیجا اور اسے معاہدہ یاد دلایا۔ وکیل سلطنت کا جواب آیا لیکن نہایت بے ہودہ۔

”اگر راجا نے غلطی کی تھی تو ضروری نہیں کہ میں بھی وہی غلطی دہراؤں۔ اگر تم میں طاقت ہے تو بزورِ شمشیر قلعہ فتح کر لو۔“

وکیل سلطنت کا یہ غرور صرف اس لیے تھا کہ قلعے کا چشمہ لبریز تھا اور اہلِ قلعہ کو پانی حاصل کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوتی تھی لیکن یہ عالم زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ قطب الدین کی قسمت کا ستارہ بلندی پر تھا۔ اچانک قلعے کا چشمہ خشک ہو گیا۔ اہلِ قلعہ پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترسنے لگے۔ جب زندگی کے لالے پڑے تو قطب الدین

سے امان طلب کی اور یوں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔
قطب الدین نے کالنجر کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔
کالنجر کو فتح کرنے کے بعد قطب الدین نے کالپی کے دارالسلطنت مہوبہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کی تسخیر کے بعد مسلمانوں کا لشکر بدایوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس شہر کو بھی فتح کر لیا۔
ان فتوحات کے بعد وہ آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بہار سے محمد بختیار خلجی نے اس کی خدمت میں قیمتی ترین تحائف پیش کیے۔ قطب الدین اس کی بہادری کے قصے سن رہا تھا۔ اب اس کی وفاداری سے متاثر ہوا اور اسے انعامات سے نوازا۔
بختیار خلجی نے قطب الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی توجہ اور مدد شامل حال رہی تو وہ بہار فتح کر کے دکھائے گا۔ اب اسے کسی زحمت کی ضرورت نہیں۔ قطب الدین نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور دہلی واپس آ گیا۔ قطب الدین نے لکھنوتی کا علاقہ اسے تفویض کر کے اسے فتح کرنے کا حکم دیا۔
بختیار خلجی بہار کو پہلے ہی فتح کر چکا تھا لہٰذا اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کے ارادوں کی خبر جب رائے لکھمینہ تک پہنچی جس کا دارالسلطنت شہر نودیہ تھا تو اس نے 22 نجومیوں کو طلب کیا تاکہ وہ بختیار خلجی کے بارے میں معلوم کریں۔
نجومیوں نے حساب کتاب لگا کر جو کچھ بتایا اسے سن کر رائے لکھمینہ کے ہوش اڑ گئے۔
"پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس ملک کو ترک یعنی مسلمان فتح کریں گے۔ وہ وقت قریب آ گیا ہے کیونکہ وہ بہار پر قابض ہو چکے ہیں۔ آئندہ سال یہ تمام علاقے ان کے قبضے میں چلے جائیں گے۔"
"جو شخص مجھ پر غلبہ حاصل کرے گا تمہاری کتابوں میں اس کی کوئی نشانی بھی لکھی ہے؟" لکھمینہ نے پوچھا۔
"ہاں ایک بہت واضح نشانی لکھی ہوئی ہے۔" نجومیوں نے بتایا۔ "وہ شخص جب سیدھا کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ چھوڑے گا تو اس کے ہاتھ کی انگلیاں اس کے گھٹنوں سے نیچی ہوں گی۔"
رائے لکھمینہ نے کچھ آدمی اس علامت اور نشانی کی تحقیق کے لیے بھیجے۔ جب یہ معتبر اشخاص واپس آئے تو سر پیٹنے کے لیے یہ اطلاع ان کی زبانوں پر تھی۔
"یہ تمام نشانیاں بختیار خلجی میں موجود ہیں جو بہار فتح کر چکا ہے اور اب نودیہ یعنی رائے لکھمینہ کی مملکت کی طرف بڑھنے کی تیاری کر رہا ہے۔"
یہ سنتے ہی اکثر برہمن اور ساہوکار وہاں سے چلے گئے۔ رائے لکھمینہ نے اپنی مملکت کو چھوڑنے میں مصلحت نہ سمجھی۔
اس پیش گوئی کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بختیار خلجی نے لشکر تیار کیا اور بہار سے نکل کر نودیہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔
اٹھارہ ہزار جنگجو سپاہیوں کا لشکر جب آگے بڑھا اور نودیہ کے قریب پہنچنے کو ہوا تو رائے لکھمینہ کی پریشانی لازمی تھی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے تو وہ تنہا کشتی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ خزانہ، حرم، نوکر چاکر، درباری عورتیں سب کچھ بختیار خلجی کے قبضے میں چلے گئے۔
بختیار خلجی نے بادشاہت اختیار کی اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔ اس نے نہایت نفیس تحفے قطب الدین ایبک کی خدمت میں ارسال کیے۔

☆☆☆

غیر مسلم گکھڑوں کو شکست دینے کے بعد شہاب الدین ہندوستان سے غزنی واپس جا رہا تھا۔ جب وہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر ایک مقام پر مقیم ہوا تو کچھ گکھڑوں نے اس کا پیچھا کیا۔ شہاب الدین نے ان کے عزیزوں کو قتل اور خود ان کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا اور وہ اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔
شہاب الدین ایک مقام پر خیمہ زن تھا۔ یہ گکھڑ کسی نہ کسی طرح شاہی خیمے تک پہنچ گئے۔ یہ قاتل شاہی خیمے کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک گکھڑ نے آگے بڑھ کر دربان پر چاقو سے حملہ کیا اور بھاگ نکلا۔ دربان کے زخمی ہوتے ہی چاروں طرف شور مچ گیا۔ شاہی خدمت گار بادشاہ کو تنہا چھوڑ کر زخمی دربان کے گرد جمع ہو گئے۔
قاتل کے ساتھی قریب ہی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ شاہی خیمہ خالی ہے اور تمام شاہی محافظ زخمی دربان کے گرد جمع ہیں تو وہ بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ اس وقت صرف تین ترک غلام تھے جو بادشاہ کے سرہانے کھڑے تھے۔ وہ حملہ آوروں کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے اور حملہ آوروں کو للکارنے کی جرأت تک نہ کر سکے۔ حملہ آوروں نے بادشاہ پر حملہ کر دیا۔
بائیس گہرے زخموں نے بادشاہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔
شہاب الدین کی موت کی خبر پھیلتے ہی اہل لشکر اس کے خزانے کو لوٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ انتشار پھیل

جاتا اور سب ایک دوسرے سے لڑ پڑتے۔ شہاب الدین کے وزیر موید الملک نے بڑی مشکل سے حالات کو قابو میں کیا۔ غوری امراء اور سرداروں سے بات چیت کر کے شاہی خزانے کی حفاظت کی قسمیں لے لیں۔ خزانے کی حفاظت سے مطمئن ہو کر موید الملک نے بادشاہ کی لاش کو بڑے تزک و احتشام سے اٹھایا اور غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

اس وقت امراء اور فوجی سرداروں میں دو مختلف الخیال گروہ تھے۔ ایک ترکی امیروں کا گروہ تھا اور دوسرا گروہ غوری امراء پر مشتمل تھا۔

ترکی امیر شہاب الدین کے بھتیجے سلطان محمود کو جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے جبکہ غوری امراء بہاالدین کی تخت نشینی کے حق میں تھے۔ ہندوستان سے غزنی تک کے راستے میں یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ تلواریں نیام سے باہر آ گئیں۔

موید الملک کی دور اندیشی اور مصلحت کوشی ایک مرتبہ پھر کام آئی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح سب کو آمادہ کر لیا کہ وہ کرمان ہوتے ہوئے غزنی جائیں گے کیونکہ وہاں شہاب الدین کا غلام تاج الدین یلدوز موجود تھا جس کو شہاب الدین نے اپنے آخری زمانے میں علموں شاہی سے سرفراز کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد تاج الدین ہی اس کا جانشین ہو۔ یہ بات اتنی مشہور ہوئی تھی کہ اس کی بیٹیوں تک کو معلوم تھی۔

جب یہ لشکر کرمان کے قریب پہنچا تو تاج الدین یلدوز سلطان کی سواری کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا۔ سواری پر نظر پڑتے ہی تاج الدین نے اپنے آقا کے آداب اور سلام کے لیے گردن جھکائی۔ آقا کے دیدار کے بعد بصد اشتیاق سواری کا پردہ اٹھایا تو سلطان کی جیتی جاگتی تصویر کے بجائے خون میں لتھڑی ہوئی لاش نظر آئی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ فریاد و فغاں کا شور برپا ہوا۔ اسی شور میں یہ قافلہ آگے بڑھا اور غزنی میں داخل ہوا۔

شہاب الدین کی لاش اس عمارت میں دفن کی گئی جو اس نے اپنی بیٹی کے لیے بنوائی تھی۔

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ترکی اور غزنوی امراء کی خواہش تھی کہ شہاب الدین کے بھتیجے سلطان محمود بن غیاث الدین کو فرماں روا بنایا جائے۔ ان امراء نے اس مضمون کا ایک خط بھی سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کیا لیکن سلطان محمود اس جانشینی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے خط کے جواب میں لکھا۔

”مجھے اپنا آبائی وطن فیروز کوہ ساری دنیا سے پیارا ہے اور میرے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ میں اسے چھوڑ کر غزنی آنا پسند نہیں کروں گا۔ میرے چچا نے تاج الدین یلدوز کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ آپ لوگ اس کے سر پر تاج شاہی رکھ کر مرحوم کی وصیت کو پورا کریں۔“

ان امراء کو خط لکھنے کے بعد سلطان محمود نے تاج الدین یلدوز کے نام خط آزادی اور حکومت غزنی کا فرمان روانہ کیا۔

سلطان محمود کا فرمان پاتے ہی تاج الدین نے غزنی کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور غزنی کے آس پاس کے شہروں پر قبضہ کر کے سلطنت کے مختلف کاموں میں مشغول ہو گیا۔

قطب الدین ایبک غزنی سے دور دہلی میں بیٹھا ان تبدیلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاج الدین جو اس کا خسر بھی تھا، غزنی کا حکمران بن گیا تھا۔ یہ نئی تبدیلی اس کے لیے خوش آئند تھی لیکن ایک کانٹا بھی دل میں کھٹک رہا تھا کہ وہ خود مختار نہیں ہے۔ تاج الدین کے دل میں ذرا بھی کدورت آئی تو اسے غزنی واپس بلا لے گا۔ وہ اس مسئلے پر اپنی بیوی فاخرہ سے بھی کئی مرتبہ بات کر چکا تھا۔ وہ بھی اسے تسلی دیتی رہی تھی لیکن شاہی مسئلے تسلیوں سے حل نہیں ہوتے۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر تاج الدین نے اسے معزول کرنے کی جسارت کی تو وہ اس کا حکم ماننے سے انکار کر دے گا۔ تاج الدین اس کا آقا نہیں تھا کہ اس کا ہر حکم آنکھیں بند کر کے مان لیتا۔

سلطان محمود بن غیاث الدین اس کشمکش سے غافل نہیں تھا۔ اسے بھی احساس تھا کہ یہ طوفان کسی وقت بھی اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے قطب الدین کو ”ملک“ سے ”سلطان“ بنا دیا۔ آزادی و خود مختاری کے فرمان کے ساتھ چتر اور بادشاہی کے دیگر لوازم بھی اس کے لیے ہندوستان بھجوا دیے۔

وہ ان نوازشات کو وصول کرنے لاہور تک آیا۔ یہیں اس نے اپنی تخت نشینی کی رسومات ادا کیں۔ اپنی خود مختاری کا اعلان عام کر کے لاہور سے دہلی واپس آ گیا۔

تخت نشین ہوتے ہی تاج الدین یلدوز نے ہندوستان کی طرف للچائی ہوئی نظر ڈالنی شروع کر دی تھی لیکن یہ سوچ کر مطمئن بھی تھا کہ ہندوستان بھی اسی کی مملکت کا حصہ ہے جہاں اس کا ایک کارندہ حکومت کر رہا ہے۔ اب جو قطب الدین کی خود مختاری کی خبریں اس تک پہنچیں تو اسے

ہندوستان فتح کرنے کا خیال آیا۔
اسے معلوم تھا کہ تخت نشینی کی رسومات ادا کرنے کے بعد قطب الدین ایبک لاہور سے دہلی واپس چلا گیا ہے۔ یہ پنجاب پر قبضہ کرنے کا ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے پنجاب پر حملہ کر دیا اور وہاں کے حاکم کو شہر سے نکال کر خود لاہور پر قابض ہو گیا۔

قطب الدین نے فوراً لشکر تیار کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ عجیب منظر تھا۔ شہاب الدین کے پروردہ یہ دونوں غلام آزاد ہوتے ہی ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئے تھے۔

تاج الدین کی بہادری ضرب المثل تھی لیکن قطب الدین کے ستارے بھی عروج پر تھے۔ تاج الدین کو اس جنگ میں بری طرح شکست ہوئی۔ وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو کر توران و کرمان کے راستے پہاڑی علاقے میں جا چھپا۔

قطب الدین نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غزنی پہنچا اور وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہاب الدین کی جانشینی کا حق اس طرح ادا کرے گا کہ غزنی کی سلطنت اس کے ہاتھ میں آئے گی۔ تاج الدین جو سلطان شہاب الدین کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا پہاڑی علاقوں میں چھپنے پر مجبور ہو جائے گا۔ قطب الدین بس اتنی رعایت کر سکتا تھا کہ اسے چھپا رہنے دے۔

قطب الدین کو اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کی طرف سے بے خبر ہو کر بزم عشرت سجائے بیٹھا اور ناؤ نوش میں دن رات بسر کر رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اہل غزنی قطب الدین کے مقابلے میں تاج الدین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ فاخرہ بیگم بھی باپ کی مظلومیت پر کڑھتی رہتی تھی۔ دیگر رشتے دار آتے تھے تو فاخرہ کو لعن طعن کرتے تھے۔ فاخرہ خود چاہتی تھی کہ غزنی کی حکومت باپ کو مل جائے اور وہ شوہر کے ساتھ ہندوستان چلی جائے۔

قطب الدین کے امراء میں سے بہت سے تھے جو تاج الدین کو برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ تاج الدین کو قطب الدین کے مقابلے پر آنے کی دعوت دیں۔ البتہ قطب الدین کو بادہ نوشی کے راستے پر لے آئے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے غفلت کے راستے پر جا رہا تھا۔ حسیناؤں کے جھرمٹ اسے سرپٹ دوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس کی عیش پرستی کی خبریں برابر تاج الدین تک پہنچ رہی تھیں پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ چند اکابر امرا نے تاج الدین سے ملاقات کی اور اسے غزنی پر حملے کی دعوت دی۔ تاج الدین پہلے ہی تہیہ کیے بیٹھا تھا۔ اب بہی خواہوں کا خط پاتے ہی اس نے ایک زبردست لشکر تیار کیا اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ قطب الدین عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ جب اس نے دشمن کو سر پر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلیں لیکن اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اتنے زبردست دشمن سے جنگ کرنے کی تیاری کرتا۔

وہ اس وقت اسی محل میں قیام پذیر تھا جہاں اس کی محبت پروان چڑھی تھی۔ اس کے پائیں باغ میں بیٹھ کر اس نے فاخرہ سے گھنٹوں باتیں کی تھیں۔ اسے اس محل کے اس خفیہ راستے کا بھی علم تھا جس سے ہو کر وہ فاخرہ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس نے یہی خفیہ راستہ اختیار کیا۔ کچھ دیر کے لیے شاہی محل گیا اور سیدھا لاہور پہنچا۔

لاہور پہنچ کر وہ خود کو محفوظ ضرور سمجھنے لگا تھا لیکن تاج الدین کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا کہ وہ کہیں لاہور پر حملہ نہ کر دے۔

اس خطرے کا تقاضا تھا کہ وہ لاہور میں قیام رکھے تاکہ دشمن لاہور کی طرف بڑھنے سے باز رہے۔ اس کی موجودگی نے یہ رنگ ضرور دکھایا کہ تاج الدین کو لاہور کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن ایک دشمن ایسا ہے جس سے کسی کو نجات نہیں اور وہ ہے موت۔ موت اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ ایک روز فرشتۂ اجل کو موقع مل گیا۔ وہ چوگان (ایک کھیل جو گھوڑے پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے) کھیل رہا تھا کہ اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا۔ گھوڑے کی زین گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل کر قطب الدین کے سینے پر آ گری۔ اس سے اسے سخت چوٹ آئی اور اسی چوٹ کی تاب نہ لا کر اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ہندوستان پر بیس سال تک حکومت کرنے کے بعد یہ عظیم فرماں روا، جرأت و بہادری اور سخاوت کا یہ شہنشاہ رخصت ہوا۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین۔
تاج الماثر، حسن بن احمد نظامی۔ طبقات ناصری، منہاج سراج

ایفائے عہد

کاشف زبیر

اچھے... اور اپنے گھر کا خواب ہر انسان دیکھتا ہے کیونکہ وہ کسی پناہ گاہ کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا مگر جب زندگی کو نہ کوئی پناہ ملے اور نہ ہی کوئی گاہ اپنی ملکیت نہیں تو ایسے میں دربدری انسان میں بہت سا زہر بھر دیتی ہے... وہ بھی دردر بھٹکتے ہوئے ایسے عذاب میں مبتلا ہوگیا تھا موت سے قبل جس سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ اب اگر اس نے مطلوبہ شخص کو بھی موت کے منہ میں دھکیلا تو کیا غضب کیا۔

قسطوں میں مکان فروخت کرتے والوں کی زندگی کا تاوان

میاں عبدالغفور نے زندگی میں بہت سے وقت دیکھے تھے۔ کبھی مشکل کبھی آسان وقت مگر اس وقت کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا جو اس وقت ان پر گزر رہا تھا۔ انہیں بس اتنا یاد تھا کہ وہ رات گئے اپنی تیسری لیکن خفیہ بیوی کے فلیٹ سے نکل کر نیچے پارکنگ میں آئے اور اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے کہ عقب میں کچھ حرکت محسوس ہوئی اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتے ایک کپڑا آ کر ان کے منہ پر جم گیا اور اس سے اٹھتی تیز بو نے لمحوں

میں انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا... یہ فلیٹ ایک بہترین اپارٹمنٹ کمپلیکس کے ساتویں فلور پر تھا اور یہ شہر کا پوش علاقہ تھا۔ یہاں کی خاص بات یہ تھی کہ پڑوسی پڑوسی کو نہ تو جانتا تھا اور نہ ہی اس کے معاملے میں دخل دیتا تھا، اس لیے جب انہوں نے اس ابھرتی ہوئی ماڈل سے شادی کی اور اسے یہاں فلیٹ لے کر دیا تو انہیں اطمینان تھا کہ بات صیغۂ راز میں رہے گی۔ مزید راز داری کی خاطر وہ ڈرائیور اور اپنے گارڈز کے بغیر ہی آتے تھے۔

چینی گڑیا سی مونا ایک ایڈ میں کام کرنے آئی اور میاں صاحب کے دل میں اتر گئی۔ ایڈ ان کے ہی نئے پروجیکٹ کا تھا۔ چار اور پانچ کمروں کے اس سپر لگژری پروجیکٹ میں ایڈ کے مطابق دنیا جہان کی سہولتیں تھیں اور اس کی ابتدائی قیمت ہی ہوش ربا تھی۔ میاں صاحب نے آغاز میں کچھ ہلکے پروجیکٹ کیے تھے مگر اس کے بعد ان کا ہر پروجیکٹ مہنگے سے مہنگا ہوتا چلا گیا تھا۔ قیمت کی مناسبت سے میاں صاحب نے ایڈ تیار کرنے والی کمپنی سے ماڈل بھی ہوش ربا لینے کا کہا تا کہ ایڈ دیکھنے والوں کا دھیان قیمت کی طرف کم جائے مگر میاں صاحب نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایڈ دیکھنے والوں سے پہلے ان کے ہوش اڑ جائیں گے۔ وہ ایسے بے چین ہوئے کہ مونا سے معاہدے کے دوران اس کی ہر شرط پر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں رہا کہ مونا نے ہر معاملے میں اپنے مفاد کا زیادہ خیال رکھا تھا۔ چند پروجیکٹس سے حاصل ہونے والی بے حساب کمائی کی تو کچھ حیثیت ہی نہیں تھی۔ مونا نے ان سے شاندار قسم کا بنگلا حاصل کیا تھا مگر ان کی واحد شرط کے مطابق اسے اس فلیٹ میں رہنا تھا جو میاں صاحب نے اسے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ مونا کا خیال تھا کہ اس نے انہیں ممکنہ حد تک لوٹ لیا ہے مگر مختصر سہاگ رات کے بعد میاں صاحب کو یہ سودا بہت سستا لگا تھا۔ اس کے بعد وہ جب مونا کے فلیٹ سے نکلتے تو خود کو ایسا سرشار اور جوان محسوس کرتے کہ کبھی جوانی میں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی سرشاری میں وہ مارے گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے خود کو ایسی اجاڑ اور ویران جگہ پایا جہاں ہر طرف تعمیراتی ملبا بکھرا ہوا تھا۔ یہاں سیلن اور بدبو تھی اور کیڑے کوڑے اور چوہے دوڑ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں ایک چوہے کی وجہ سے کھلی جو ان کے منہ میں گھسنے پر بضد تھا اور وہ بر وقت ہوش میں آگئے تھے۔ ان کے حرکت میں آتے ہی چوہا اچھل کر ان کے منہ سے ہٹ گیا اور میاں صاحب کے کھلے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ وہ اچھل کر بیٹھ گئے۔ یہاں ایک طرف چھوٹی سی ایمرجنسی لائٹ رکھی تھی۔ میاں صاحب آڑے ترچھے ملبے پر پڑے تھے اور انہوں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ کنکریٹ اور بلاکوں سے بنا ہوا کمرا تھا جس کا فرش کچا تھا۔ یہاں ایسی ویرانی اور وحشت تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد اندر ان کا دل جیسے بیٹھنے لگا تھا۔

”میں..... میں کہاں ہوں؟“

یہ سوال انہوں نے خود سے کیا تھا کیونکہ وہاں ان کی سننے والا اور کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے لائٹ اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا تو انہیں ایک طرف دیوار میں سوراخ دکھائی دیا اس پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں، یہ سلاخیں اصل میں تعمیراتی سریا تھا۔ وہ اس کی طرف جھپٹے اور سلاخیں ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوطی سے کنکریٹ میں پیوست تھیں۔ دیکھنے میں وہ بہت صحت مند اور مضبوط دکھائی دیتے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ تقریباً ساٹھ برس کی عمر اور بے اعتدال زندگی نے انہیں اندر سے کتنا کھوکھلا کر دیا تھا۔

کچھ دیر اس جگہ کا معائنہ کرتے رہے، جب وہ سوچنے کے قابل ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ یقیناً انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ اس شہر غدار میں اب کسی دولت مند کا اغوا ہونا تعجب انگیز بات نہیں رہی تھی۔ بچے کا ذکر اب یوں کوئی نہیں کرتا کہ اس شہر کے بھکاری بھی اس عزت سے محروم نہیں رہے کہ وہ کسی نہ کسی کو بھتا ادا کرتے ہیں۔ تب ہی اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلانے کی جرأت کرتے ہیں۔

اب ایسا لگ رہا تھا کہ بالآخر ان کے حاسدوں کے دل میں ٹھنڈ پڑنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر یہ خیال آنے کے چند منٹ بعد انہیں دوسرا خیال آیا کہ اگر تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس سنسان اور اجاڑ جگہ یوں قید کرنے کی کیا تک تھی۔ کمرے کے واحد سوراخ کے سامنے بھی اسی طرح کنکریٹ کی دیوار تھی۔ سلاخوں کے درمیان بس اتنا فاصلہ تھا کہ وہ اپنا بازو کہنی تک بہ مشکل نکال سکتے تھے۔ میاں صاحب بچپن سے کچھ کاہل اور سست واقع ہوئے تھے۔ تمام غیر ضروری جسمانی حرکات سے وہ شروع سے پرہیز کرتے آئے تھے۔ خاص طور سے ورزش سے پرہیز تھا۔ جب سے انہوں نے بلڈر کا

شعبہ اپنایا تھا تب سے شاذ ہی ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اپنا بنایا ہوا کوئی پروجیکٹ پورا دیکھا ہو۔ وجہ وہی تھی کہ انہیں زیادہ چلنا پھرنا پسند نہیں تھا۔

دن بھر میں ان کی سب سے لمبی واک ...... دو بار ہوتی تھی جب وہ پہلی بار کار سے اتر کر دوسری منزل پر واقع اپنے دفتر تک جاتے تھے اور شام کو وہاں سے واپس کار تک آتے تھے۔ بعض اوقات انہیں بولنے سے بھی سستی آتی تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ نوعمری میں ایک بار انہیں کتے نے صرف اس لیے کاٹ لیا تھا کہ انہوں نے بھاگنے میں سست روی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس زمانے میں کتے کے کاٹے کے چودہ انجکشن لگتے تھے اور وہ بھی پیٹ میں۔ مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ صرف سستی کی وجہ سے چلانے سے رہ جاتے۔ انہوں نے... ممکن حد تک سلاخوں سے صرف ہونٹ باہر کیے اور حلق پھاڑ کر چلائے۔ ”مدد..... کوئی ہے۔“

ان کے حلق سے جو آواز نکلی تھی اس نے خود انہیں حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے حلق سے ایسا گرجدار اسٹیریو ساؤنڈ نکل سکتا ہے۔ آواز کی بازگشت نے خود ان کے کانوں کا امتحان لیا تھا اور ان کے کان کے پردے جھنجھنا گئے تھے جو آج تک بیگم نمبرون کی سمع خراش اور بیگم نمبر دو کفن پھاڑ قسم کی آواز سے بھی نہیں جھنجھنائے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کم سے کم نصف کلومیٹر کے دائرے میں ان کی آواز صاف سنی گئی ہو گی اور لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے ہوں گے۔ اس لیے پہلی آواز کے بعد وہ کچھ دیر چپ ہو کر دم سادھ کر اور کان لگا کر سنتے رہے کہ ابھی لوگوں کے پکارنے کی آواز آئے گی اور شاید انہیں پھر ان کی رہنمائی کے لیے ایک دو بار آواز نکالنی پڑے۔ مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی اور بدستور سناٹا طاری رہا تو انہیں اپنے کانوں پر شبہ ہوا کہ شاید انہیں کوئی نقصان ہوا ہے ان کی اپنی ہی آواز سے۔ اس لیے انہوں نے ایک پتھر اٹھا کر دیوار پر مارا اور اس کی آواز بالکل واضح سنی یعنی ان کے کان بالکل ٹھیک تھے۔ میاں عبدالغفور شروع سے خود کو درست سمجھتے تھے۔ ان کی یہ سوچ ان کے بزنس میں بہت کام آئی تھی اور وہ اسی وجہ سے اتنے اوپر پہنچے تھے مگر یہ سوچ فی الحال ان کے کام نہیں آئی اور ان کا یقین درست ثابت نہیں ہوا کہ ان کی گرجدار آواز سن کر لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑیں گے اور بالآخر انہیں اس قید خانے سے نکال لیں گے۔ انہوں نے دوسری بار آواز نکالی اور جب اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تو ان کا دل ڈوبنے لگا اور تیسری بار نکالنے پر ان کی آواز بھی ڈوبی ہوئی نکلی تھی۔

بچپن سے میاں صاحب کو جس کام سے سب سے زیادہ چڑ تھی وہ گالیاں دینا تھا۔ ان کے خیال میں گالی دینا صرف اخلاقی کمزوری ہی نہیں بلکہ یہ وہ سب سے بیکار کام بھی تھا جو ایک باشعور انسان کر سکتا ہے۔ میاں صاحب ایسے تمام کاموں کے سخت خلاف تھے جن سے کوئی مالی منفعت نہ ہو۔ مگر اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ انہیں گالیاں دینا سخت ناپسند ہے۔ پہلی بار مدد کے لیے پکارتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اس شخص کو گالیاں دے رہے تھے جس نے انہیں اس اجاڑ جگہ بند کیا تھا۔ دوسری بار آواز دیتے ہوئے وہ ان لوگوں کو گالیاں دے رہے تھے جو ان کی آواز سن کر بھی نہیں آئے تھے اور تیسری بار چلاتے ہوئے وہ خود کو گالیاں دے رہے تھے کہ ان کی آواز اتنی ہلکی کیوں تھی کہ کسی کے کان تک نہیں جا رہی تھی۔ تین بار چلانے کے بعد ان کی سانس جواب دے گئی اور وہ باقاعدہ ہانپنے لگے۔ کوئی درجن بھر سانس لینے کے بعد وہ ذرا پرسکون ہوئے۔ یعنی ان کا ذہنی انتشار کم ہوا تھا۔ انہیں پہلی بار خیال آیا کہ اس جگہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ ممکن ہے ایمرجنسی لائٹ کے علاوہ بھی یہاں کچھ ہو۔

کمرا بارہ بائی تیرہ کا تھا اور اس کا فرش کہیں سے نیچا اور کہیں سے اونچا تھا۔ چھت کی بیم اور اس کے کناروں پر لگے ہوئے پلرز خاصے چوڑے تھے۔ میاں صاحب کو لگا کہ وہ کسی بڑی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور والے حصے میں تھے۔ کیونکہ اتنے بڑے پلرز اور بیم صرف بڑی عمارتوں میں ہوتے ہیں تاکہ اوپری منزلوں کا بوجھ سنبھال سکیں۔ یہ دیکھ کر میاں صاحب کی امید پھر سے تازہ ہونے لگی کہ وہ کسی بڑی عمارت میں ہیں جو ظاہر ہے شہر میں یا آبادی میں ہونی چاہیے۔ ایک طرف چند ٹوٹی اینٹیں ایک دوسرے کے اوپر جمع تھیں اور ایمرجنسی لائٹ سب سے اوپر والی اینٹ پر رکھی تھی۔ میاں صاحب نے اسے یہیں سے اٹھایا تھا۔ وہ اس تک آئے اور اب وہ فرش پر روشنی ڈال رہے تھے۔ پہلے انہوں نے اس کاغذ کو نظرانداز کر دیا تھا مگر جب دوسری بار اس پر روشنی ڈالی تو انہیں لگا کہ کاغذ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ انہوں نے کاغذ اٹھایا۔ یہ کسی بچے کی اسکول کی کاپی سے پھٹا ہوا صفحہ تھا اور اس پر پنسل

سے لکھا ہوا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں معافی چاہوں گا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ بڑے آدمی ہیں۔ مشکل میں رہنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ شاید آپ نے برسوں سے کوئی مشکل شاید ہی دیکھی ہو۔ اس صورت میں یہاں رہنا آپ کے لیے یقیناً آسان کام نہیں ہوگا مگر میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ صبر اور تحمل سے کام لیں... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جلد آپ اس مشکل سے نجات حاصل کرلیں گے بس آپ کو ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ شاید آپ کے ذہن میں آرہا ہو کہ میں نے آپ کو یہاں کیوں بند کیا ہے۔ تو میں اس کے لیے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد آپ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے کسی مالی منفعت کے لیے آپ کو یہاں قید کیا ہے تو یہ بات بھی غلط ہے۔ جلد آپ یہ بھی جان جائیں گے کہ آپ یہاں کیوں ہیں۔ آپ کو اگر کچھ کہنا ہے تو اس صفحے کے پیچھے لکھ کر سوراخ سے باہر پھینک دیں۔ لکھنے کے لیے پنسل بھی پاس ہے۔"

تحریر اس سے آگے بھی تھی مگر میاں صاحب نے جلدی سے پہلے پنسل تلاش کی اور وہ اینٹ کے پیچھے پڑی مل گئی۔ یہ بھی کسی بچے کی اسکول پنسل تھی۔ اب میاں صاحب نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ "یہ لائٹ پوری طرح چارج ہے مسلسل استعمال کریں گے تو بیس گھنٹے چل سکتی ہے مگر آپ احتیاط سے کام لیں، میں آؤں گا مگر کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کب تک آؤں گا۔"

میاں صاحب کے ہاتھ میں کاغذ کانپنے لگا۔ اب ثابت ہوگیا کہ کسی نے جان بوجھ کر کسی مذموم ارادے کے ساتھ انہیں یہاں قید کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا اور تب تک انہیں اسی لائٹ کے ساتھ گزارہ کرنا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر لائٹ بند کردی کہ کہیں یہ بند ہو جائے تو انہیں تاریکی میں رہنا پڑے۔ انہیں تاریکی سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اچانک انہیں ایک خیال آیا اور وہ تاریکی میں اچھل پڑے۔ انہوں نے جلدی سے لائٹ آن کی اور اس بار گھبراہٹ میں نہیں بلکہ امید کے ساتھ آن کی تھی اور پھر انہوں نے اپنی تلاشی لی۔ ان کے پاس تین عدد موبائل فون ہوتے تھے۔ ایک جدید ترین آئی فون اور دو عام سے فون جن کی لمبی بیٹری تھی اور وہ ان کی مدد سے کاروباری گفتگو کرتے تھے۔

مگر ان کے جیبوں سے تینوں موبائل غائب تھے۔ صرف ان کا پرس تھا۔ پرس میں ان کی رقم اور دوسری تمام چیزیں موجود تھیں۔ رقم اچھی خاصی تھی۔ تقریباً پچیس ہزار روپے۔ اس کے علاوہ کریڈٹ کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ بھی تھے۔ مگر کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا تھا البتہ ان کی کلائی کی گھڑی بھی غائب تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں بند کرنے والے نے انہیں وقت کی آگاہی سے بھی روک دیا۔ وہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ کتنی دیر سے اس جگہ قید ہیں اور اس وقت باہر کیا وقت ہوا ہے۔ اپنی مکمل تلاشی لے کر وہ مایوس ہو گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھی۔

جب وہ انہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی وہ ان سے کوئی مالی منفعت چاہتا تھا تو پھر اس نے انہیں اس خوفناک جگہ کیوں قید کیا تھا؟ انہوں نے یہی سب کاغذ کی پشت پر لکھا اور کاغذ سوراخ سے باہر ڈالنے جارہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ ان کے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ موسم مناسب تھا اور یہاں سیلن بھی تھی اس لیے ان کا منہ اتنا خشک نہیں ہوا تھا۔ مگر انہیں پیاس لگ رہی تھی۔ انہوں نے نیچے کھانے پینے کا بھی لکھ دیا اور جب کاغذ ڈالنے جارہے تھے تو پھر خیال آیا اور اس بار انہوں نے ایمرجنسی لائٹ کا بھی لکھا کہ اگر اس کی بیٹری ختم ہوگئی تو وہ اندھیرے میں رہ جائیں گے اور انہیں اندھیرے سے بہت خوف آتا ہے۔ انہوں نے کاغذ سوراخ سے باہر ڈال دیا۔ وہاں بیٹھنے کی کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں تھی۔ مگر انہوں نے ایک جگہ موجود صاف بجری کا ڈھیر اس طرح کرلیا کہ وہ بلا تکلیف اس پر بیٹھ سکتے تھے اور ان کا لباس بھی گندہ نہیں ہوتا۔

اس شہر میں ان کے پاس نصف درجن محل نما بنگلے تھے اور اس کے علاوہ بھی بے شمار دولت اور جائداد تھی۔ روپے پیسے اور آسائش کی فراوانی تھی مگر وہ اس وقت مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے تھے اور اس پر خوش تھے کہ ان کے جسم کو تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ پھر انہیں اپنی اولادوں کا خیال آیا کہ وہ ان کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر رہی ہوں گی۔ ان کی بڑی بیگم سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ سب جوان اور شادی شدہ تھے۔ سوائے چھوٹی بیٹی کے جس کی چند مہینے پہلے شادی ہوئی تھی سب صاحب اولاد تھے۔ دوسری بیگم کا اسکور بیٹوں میں بہتر تھا اور اس سے تین بیٹے تھے مگر بیٹی ایک ہی تھی۔ یوں چار کی گنتی برقرار رہی تھی۔ تیسری بیوی سے انہوں نے اولاد کا بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ دو

بیویوں سے ان کی آٹھ عدد اولادیں تھیں اور انہیں مزید کی خواہش نہیں تھی۔

ان کے پانچوں بیٹے جوان تھے اور ان میں سے چار ان کے ساتھ بزنس میں شامل تھے۔ پانچویں نے تعلیم کو ترجیح دی تھی اور وہ آرکیٹیکٹ تھا۔ میاں صاحب نے اسے اپنا بزنس کرا دیا تھا۔ اب وہ اپنی فرم چلا رہا تھا۔ بیگم اول اور دوم ایک ہی بڑے سے بنگلے میں اوپر نیچے کے فلور پر مع اولاد اور ان کی اولاد کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ میاں صاحب انصاف سے ایک ایک دن دونوں کے ساتھ رہتے تھے۔ شروع میں دونوں بیگمات نے مشکل کی تھی جیسے نئی بننے والی مشین کچھ مشکل کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ یوں آپس میں شیر وشکر ہوگئیں جیسے ذرا پرانا ہونے پر مشین کے کھانچے آپس میں فٹ بیٹھ جاتے ہیں اور وہ روانی سے چلنے لگتی ہے۔ بہوؤں کے آنے کے بعد انہوں نے اپنے اختلافات کا رخ ان کی طرف موڑ دیا تھا۔ ایک مختصر وقت کے لیے ان کا اتحاد اپنی ساس کے خلاف بھی وجود میں آیا تھا جو بڑے بیٹے سے ناراض ہوکر میاں صاحب کے پاس چلی آئی تھیں۔ ایک سال وہ میاں صاحب کے پاس رہیں اور اس دوران میں دونوں بیگمات اپنی رنجشیں بھولی رہیں۔

میاں صاحب نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے جھگڑے خود تک رکھیں گی، کیونکہ جس دن انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے اپنے جھگڑے اولاد تک منتقل کیے ہیں وہ اس دن وہ بچوں کو پڑھنے کے لیے کسی بورڈنگ اسکول بھیج دیں گے۔ ایک موقع پر انہوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری بھی کرلی تھی اور سب سے بڑے برخوردار کو شمالی علاقے میں ایک اسکول بھیج رہے تھے مگر دونوں بیگمات نے رو دھو کر ہاتھ پاؤں جوڑ کر انہیں روک لیا اور یقین دلایا کہ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ ان کے بچے ماؤں سے قطع نظر آپس میں شیر وشکر تھے۔ چار ان کے ساتھ کام کرتے تھے اور میاں صاحب کی دی ہوئی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے۔ میاں صاحب نے انہیں اس طرح تربیت دی تھی کہ ان کے بعد انہیں بزنس سنبھالنے اور چلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چاہے وہ مل کر بزنس کرتے یا الگ الگ کرتے۔

گھر کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد انہیں وہی شوق چرایا جو اکثر ضرورت سے زیادہ دولت مند ہو جانے والے مردوں کو چراتا ہے اور انہوں نے تیسری شادی کر لی۔ اس وقت وہ جوان ہی تھے یعنی چالیس برس کے تھے۔ اتفاق سے یہ بھی ماڈل تھی۔ یہ تیسری شادی تین سال چلی اور بالآخر ان کا اس سے دل بھر گیا تو انہوں نے افہام و تفہیم سے طلاق دے دی۔ تیسری بیوی جاتے وقت بھی خوش تھی کیونکہ میاں صاحب نے اسے دل کھول کر دیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی یہ شادی خفیہ رہی تھی۔ وہ مہینے میں دو تین بار چند گھنٹوں کے لیے تیسری بیوی کے پاس ہو آتے تھے۔ وہ بھی خوش تھی کہ اس کی ڈیوٹی یہیں تک محدود تھی۔ وہ چاہتے تو اس سے کہیں کم خرچے میں کوئی عورت عارضی طور پر حاصل کر لیتے۔ مگر اس معاملے میں وہ حدود اللہ کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک صرف اسی عورت کے پاس جانا جائز تھا جو ان کی منکوحہ ہو اور باقی سب ان کے لیے حرام تھیں۔

دوسری بار تیسری شادی انہوں نے ایک سال بعد کی اور یہ سب سے زیادہ عرصے رہنے والی تیسری شادی تھی۔ یہ لڑکی ماڈل نہیں تھی بلکہ میاں صاحب کے دفتر میں کام کرتی تھی اور اس پر ان کا دل آ گیا۔ انہوں نے پیش قدمی کی اور حیران ہوئے کہ وہ فوراً مان گئی۔ اصل میں اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا خود اس نے اپنی رشتے کی خالہ کے گھر پرورش پائی تھی اور اب پڑھ لکھ کر نوکری کر رہی تھی مگر اسے اپنے خالو کی طرف سے خدشہ تھا جو صرف خالہ کے ڈر کی وجہ سے اب تک کھل کر اپنی خواہش کا اظہار نہیں کر رہے تھے ورنہ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی عزت محفوظ رکھے اور اس کی شادی کسی شریف آدمی سے ہو جائے۔ میاں صاحب کو وہ شریف ہی سمجھتی تھی کیونکہ میاں صاحب اپنے دفتر میں کام کرنے والی تمام عورتوں اور لڑکیوں کی عزت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کرواتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دفتر کا ماحول خواتین کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ اسی وجہ سے سمعیہ مان گئی تھی۔

سمعیہ ان عورتوں میں سے تھی جو بیوی بن کر رہنا چاہتی ہیں اور میاں صاحب جب اس کے پاس جاتے وہ تن من سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میاں صاحب اسے مہینے میں چند دن دے دیں مگر ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا اور وہ رفتہ رفتہ فرسٹریٹ ہوتی چلی گئی اور اس شادی کا خاتمہ بھی اسی وجہ سے ہوا۔ میاں صاحب اولاد نہیں چاہتے تھے اور وہ اولاد کی خواہش مند تھی۔ بالآخر دونوں نے محسوس کیا کہ یہ گاڑی اب مزید نہیں چل سکتی اس

لیے اس بار بھی افہام و تفہیم سے طلاق کا فیصلہ ہوا اور میاں صاحب نے اسے بھی بہت کچھ دے کر رخصت کر دیا۔ ویسے بھی وہ اسے بہت کچھ دے چکے تھے اور اب وہ ساری عمر بیٹھ کر کھاتی تب بھی اس کے لیے کافی تھا۔ تیسری بار انہوں نے ایک غلط عورت کا انتخاب کر لیا جو ان کی بیوی بن کر پیٹھ پیچھے دوسرے مردوں سے ملتی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ میاں صاحب اس کی نگرانی کرا رہے تھے۔ وہ ہر تیسری بیوی کی نگرانی کراتے تھے۔ پہلی دو بیویوں نے ان سے بے وفائی نہیں کی تھی۔ تیسری نے کی تو انہوں نے مع ثبوت اسے طلاق نامہ پیش کیا اور وہ جوان سے لے چکی تھی اسی پر اکتفا کر کے چلی گئی۔

البتہ چوتھی بار تیسری بیوی انہیں سب سے مہنگی پڑی تھی اور حقیقت یہ بھی کہ وہ سب سے زیادہ حسین تھی اور انہیں اس عمر میں ملی تھی اس لیے انہیں زیادہ قیمت بھی گراں نہیں گزری تھی۔ میاں صاحب کو باری باری سب کا خیال آ رہا تھا کہ ان کے یوں غائب ہونے پر دوسروں کا کیا ردعمل ہوگا؟ ان کے بیٹے بھاگ دوڑ کر رہے ہوں گے ان کے اور اپنے روابط استعمال کر رہے ہوں گے۔ پولیس میں رپورٹ کرا دی ہوگی۔ ان کی کار یقیناً کہیں کھڑی مل گئی ہو گی اور پولیس اس کی مدد سے اغوا کرنے والے کا پتا چلانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ اگر کار اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں ہوئی تو یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ وہ کس اپارٹمنٹ میں جاتے تھے۔ یہ بات تو گارڈز بھی بتا سکتے تھے۔ اس کے بعد پولیس تیسری بیوی تک پہنچ جاتی اور ان کا پول کھل جاتا مگر اس وقت انہیں پول کھلنے سے زیادہ یہ فکر تھی کہ وہ یہاں سے کیسے آزاد ہوں گے؟

اغوا کرنے والے نے خود تاوان یا انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے اغوا کرنے کی تردید کر دی تھی۔ پھر اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ اس نے انہیں تسلی بھی دی تھی کہ وہ جلد یہاں سے رہا ہو جائیں گے بس انہیں ذرا تحمل سے کام لینا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ذی ہوش شخص کوئی کام... بلا مقصد نہیں کرتا مگر خاصی دیر سوچنے کے بعد بھی انہیں اپنے اغوا کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایسی جگہ قید کرنا جہاں شاید کوئی جانور بھی رہنا پسند نہ کرے۔ الفاظ کے برعکس اس کا عمل کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے کوئی عناد تھا اور اس نے انہیں ذہنی اور جسمانی اذیت دینے کے لیے ایسی جگہ قید کیا ہے اور پھر وہ اسے استہزائیہ انداز میں انہیں تسلیاں بھی دے رہا ہے کہ وہ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا اور وہ جلد آزاد ہو جائیں گے۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ ان کا ایسا کونسا دشمن ہو سکتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کبھی براہ راست دشمنی نہیں پالی تھی۔

حالانکہ بلڈر کا کام جھگڑے والا ہے اس میں شریف آدمی مشکل سے ہی کامیاب ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب سے قبضے کی بہار آئی یہ کاروبار سارے کا سارا بدمعاشوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ان کی وجہ سے کتنے بلڈر اپنے پروجیکٹ ادھورے چھوڑ کر چلے گئے مگر چند ایک بلڈر جو شروع سے صاف کام کرتے آئے تھے، وہ اب بھی کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک میاں صاحب بھی تھے۔ انہوں نے شہر کے اچھے علاقوں میں کوئی درجن بھر پروجیکٹ بنائے تھے۔ انہوں نے کامیابی کا ایک گر پکڑ لیا تھا کہ چیز اچھی بناؤ قیمت خود ملے گی۔ ان کے شروع کے چند پروجیکٹ کامیاب ہوئے تو ان کا نام بنتا چلا گیا اور جب وہ کوئی نیا پروجیکٹ لانچ کرتے تو وہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ جب تک پروجیکٹ بنتا وہ فائل ٹرانسفر سے ہی خاصا کما لیتے تھے اور بعد میں بھی لیز ہونے تک کماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے پاس کمائی کے کئی گر تھے۔ سوراخ کے پاس آہٹ ہوئی تو وہ چونکے اور جلدی سے اٹھ کر روشنی کا رخ اس طرف کر دیا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ وہاں ایک منرل واٹر کی بوتل، ایک چھوٹا پلاسٹک شاپر تھا اور کاغذ میں کچھ لپٹا ہوا اور ویسی ہی ایمرجنسی لائٹ رکھی ہے جیسی ان کے پاس تھی۔ وہ جھپٹ کر سوراخ کے پاس آئے اور چلائے۔

”کون ہے میری بات سنو۔“

مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، خاصی دیر تک پکارنے پر بھی جواب نہیں ملا تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ آنے والا جا چکا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے پانی کی بوتل اٹھائی اور اس کا ڈھکن کھول کر ایک گھونٹ پیا۔ پانی سادہ تھا کیونکہ بوتل کھلی ہوئی تھی اور یقیناً اس میں پانی کہیں سے بھر کر لایا گیا تھا مگر وہ انہیں بہترین منرل واٹر سے بھی اچھا لگا تھا۔ وہ پہلے گھونٹ کے بعد مزید پینے جا رہے تھے کہ انہیں کچھ خیال آیا اور وہ رک گئے۔ انہوں نے ڈھکن لگا کر بوتل احتیاط سے رکھی اور شاپر کا جائزہ لیا اس میں ایک سادہ برگر تھا جو عام ٹھیلوں پر ملتا ہے اور انہوں نے زندگی میں کبھی یہ برگر نہیں کھایا تھا۔ نئی ایمرجنسی لائٹ پوری طرح چارج تھی اور اس کے نیچے اسی طرح کا ایک پرچہ رکھا تھا جس پر اغوا کرنے والے نے پہلے بھی پیغام لکھا تھا۔

انہوں نے کاغذ اٹھایا تو اس پر تحریر خاصی زیادہ نظر آئی اور صفحے کے دونوں طرف تھی۔ وہ چیزیں لے کر اپنی جگہ آگئے۔ انہیں بھوک لگ بھی رہی تھی مگر ان کا فی الحال یہ برگر کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ انہوں نے کاغذ پر ایمرجنسی لائٹ کی روشنی ڈالی اور پڑھنے لگے۔

''میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ میرا مقصد کیا ہے تو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے، نہ مال، نہ دولت اور نہ کچھ اور درکار ہے۔ جہاں تک آپ کی جان ہے تو میں اسے بھی کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جس جگہ قید ہیں وہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اور یہاں آپ کو بہت سی تکالیف ہیں اور شاید آنے والے وقت میں ہوں گی۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کاش میرے پاس اس سے بہتر کوئی جگہ ہوتی تو میں آپ کو وہاں رکھتا مگر میری مجبوری ہے۔ آپ جب تک یہاں ہیں میں آپ کو ہر ممکن سہولت دوں گا۔ مگر یہ بتانا میرے لیے بھی دشوار ہے کہ آپ یہاں سے کب نکل سکیں گے۔ اگر آپ نے صبر و تحمل سے کام لیا تو مجھے یقین ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔''

''فی الحال آپ کے لیے پانی، کھانے اور ایک اضافی ایمرجنسی لائٹ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جب آپ کی پرانی ایمرجنسی لائٹ کا چارج بالکل ختم ہو جائے تو اسے سوراخ کے باہر ڈال دیجیے گا۔ اگلی بار میں آپ کو ایک ایمرجنسی لائٹ اور دے جاؤں گا تاکہ آپ بالکل اندھیرے میں نہ رہ جائیں۔ آپ کو ان چیزوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں ایک عام اور غریب آدمی ہوں کاش کہ میں آپ کے لیے اس سے زیادہ کچھ کر سکتا۔ مگر مجھے امید ہے آپ ان سے گزارہ کر ہی لیں گے۔

''مجھے یہ احساس بھی ہے کہ آپ جیسے صبح سے شام تک نہایت مصروف رہنے والے شخص کے لیے یہاں وقت گزاری کس قدر دشوار ہوگی جب کہ آپ کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ کاش میں آپ کی وقت گزاری کے لیے کچھ مہیا کر سکتا۔ بہرحال پھر بھی اپنی سی کوشش کی ہے اور اس کاغذ پر آپ کے لیے ایک چھوٹی سی کہانی شروع کی ہے امید ہے اس کا اولین حصہ آپ کو پسند آئے گا۔ اگر پسند آئے تو کاغذ پر ہی اپنی رائے لکھ کر باہر پھینک دیجیے گا میں اس کا اگلا حصہ آپ تک پہنچا دوں گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اپنے دل کی بات بھی مجھ سے لکھ کر کر سکتے ہیں۔ اگر میرے پاس آپ کے سوال کا کوئی جواب ہوا تو میں ضرور دوں گا۔ اب آپ کہانی پڑھیں اور پھر مجھے بتائیں کہ آپ کو کیسی لگی۔ ہاں ایک بات ذہن میں رکھیے گا کہ ضروری نہیں ہے کہ یہ صرف کہانی ہو۔''

اس سے آگے کہانی تھی۔

''راشد حامد ایک متوسط طبقے کے خاندان کا سربراہ تھا۔ وہ میونسپلٹی میں کلرک کے طور پر کام کرتا تھا۔ محدود تنخواہ تھی اور وہ حرام کھانے کا قائل نہیں تھا اس لیے گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ بیوی اور دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں بچے اسکول جاتے تھے۔ مکان کرائے کا تھا۔ بجلی، گیس کے بل اور دوسرے اخراجات اتنے تھے کہ مہینے کے آخر میں چٹنی روٹی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ راشد صبح دفتر جانے سے پہلے بچوں کو اسکول چھوڑتا کیونکہ اس کی اتنی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں اسکول وین لگوا کر دیتا۔ دوپہر میں اس کی بیوی جا کر بچوں کو لے آتی تھی۔ ان کی واحد بچت وہ کمیٹی تھی جو وہ ڈالتے تھے اور اس سے جو رقم اکٹھی ملتی اس سے دیگر اخراجات پورے کر لیے جاتے تھے۔ عام طور سے یہ بچت عید پر کام آتی تھی۔ پھر ایک دن راشد کی بیوی سائرہ نے اس سے کہا۔

''ہم کب تک اس طرح کرائے کے مکان میں رہتے رہیں گے؟''

''تو کیا کریں؟''

''اپنے مکان کے لیے کوشش کریں۔''

''کیسے کریں، تم جانتی ہو ہماری مالی حالت کیا ہے؟''

''آپ کوشش کریں، ہم جو کمیٹی ڈالتے ہیں اس سے کوئی فلیٹ بک کرا لیتے ہیں۔''

یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت زمین و جائداد اور فلیٹوں کی قیمت آج کی طرح آسمان کو نہیں پہنچی تھی مگر کم قیمت میں بھی راشد کوئی فلیٹ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی حیثیت ہی اتنی نہیں تھی۔ تب سائرہ نے ہی مشورہ دیا۔ ''ہم کوئی فلیٹ بک کرا لیتے ہیں۔ قسطوں میں رقم دیتے رہیں گے تو اس سے آسانی ہو جائے گی۔''

راشد کو یہ مشورہ مناسب لگا اور اس نے جائزہ لیا کہ اس کی حد کے مطابق اسے فلیٹ کہاں مل سکتا ہے۔ اسے زمین لینے کا خیال بھی آیا مگر ایک تو شہر میں زمین نایاب اور مہنگی تھی اور اگر وہ زمین لے لیتا تو اس کے پاس مکان تعمیر کرانے کے وسائل نہیں تھے۔ اس لیے اسے اور سائرہ کو

فلیٹ ہی مناسب لگا تھا۔ شہر میں وہ فلیٹ جو تکمیل کے آخری یا درمیانی مراحل میں تھے ان میں کوئی فلیٹ دستیاب نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان میں اسے کوئی چھوٹا فلیٹ مل جائے تو جلد کرائے کے مکان سے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور کرائے کی جو بچت ہوگی اس سے باقی رہ جانے والی رقم ادا کر دے گا مگر اسے کہیں کوئی فلیٹ دستیاب نہیں ہوا۔ مجبوراً اسے ایک نئے بننے والے پروجیکٹ میں فلیٹ بک کرانا پڑا تھا۔ یہ زیادہ بڑا فلیٹ نہیں تھا۔ محض چھ سو اسکوائر فٹ پر دو بیڈ لاؤنج کا فلیٹ تھا۔ جس میں دو باتھ روم اور ایک چھوٹا سا کچن تھا لیکن ان کے لحاظ سے یہ کافی تھا۔ البتہ فلیٹ دوسرے فلور پر ملا تھا کیونکہ گراؤنڈ اور فرسٹ فلور کے سارے فلیٹ بک ہو چکے تھے۔

اچھی بات یہ تھی کہ فلیٹ ویسٹ اوپن تھا اور خوب ہوا آتی تھی۔ کل قیمت دو لاکھ بیس ہزار روپے تھی، اس میں اسی ہزار کا قرض بھی تھا۔ بلڈر کو ایک لاکھ چالیس ہزار روپے پانچ سال میں ادا کرنے تھے۔ یعنی ہر سال اٹھائیس ہزار روپے اور ہر مہینے تقریباً سوا دو ہزار روپے ادا کرنے تھے۔ ان کی کل بچت مشکل سے پندرہ سو روپے تھی جو اصل میں کمیٹی کی صورت میں جمع ہو جاتی تھی۔"

یہاں تک پہنچ کر کہانی رک گئی تھی اور نیچے لکھا تھا۔ "باقی آئندہ۔" میاں صاحب جب آخری الفاظ پر پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ کتنے انہماک سے کہانی پڑھ رہے تھے۔ کہانی کا طرز بیان سادہ مگر پراثر تھا اور سب سے بڑھ کر کہانی ان کو اپنے شعبے کے بارے میں لگ رہی تھی اس لیے وہ روانی سے پڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے کاغذ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کچھ پانی اور پیا اور پھر ہچکچاتے ہوئے شاپر سے برگر نکالا جو اگرچہ... ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر مزے کا تھا۔ انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ عام ساٹھیلوں پر بیس پچیس روپے میں ملنے والا یہ برگر اتنے مزے کا بھی ہو سکتا ہے۔ اکثر وہ دفتر میں اپنے نچلے درجے کے ملازموں کو برگر سے لنچ کرتے دیکھتے تھے اور ترس کھاتے تھے کہ بے چارے سستے کے چکر میں ایسی چیزوں سے پیٹ بھر رہے ہیں۔ برگر ختم کر کے انہوں نے ایک ڈکار لی اور دوبارہ بوتل منہ سے لگائی تو ایک ہی سانس میں نصف بوتل خالی کر دی۔

میاں صاحب خوش خوراک تھے۔ صبح ناشتے میں تلے ہوئے دیسی انڈے، بھنی ہوئی کلیجی اور دیسی گھی میں بنے پراٹھے ان کی خوراک تھے۔ دوپہر میں وہ ہلکا پھلکا لیتے تھے۔ کبھی پیزا منگوا لیا اور کبھی کلب سینڈوچ لے لیے۔ البتہ رات کا کھانا وہ ڈٹ کر کھاتے تھے۔ عموماً مٹن ہوتا اور اس کے ساتھ چکن سے بنی کوئی نہ کوئی ڈش ہوتی تھی۔ چپاتی کے ساتھ انہیں سادہ چاول بھی مرغوب تھے۔ کئی سال سے سینے میں جلن کے مریض تھے اس لیے رات سونے سے پہلے دودھ سوڈا لیتے تھے۔ شام کی چائے میں سموسے، رول، بسکٹ اور اسی طرح کی اشیا لازمی ہوتی تھیں۔ دوپہر میں کبھی بھوک کا زیادہ احساس ہوتا تو وہ ملک شیک بھی لیتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ برگر ان کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اس سے صرف اتنا ہوا کہ انہیں تسلی ہو گئی کہ ان کے پیٹ میں کچھ گیا ہے۔ البتہ انہوں نے پانی زیادہ پی لیا تھا اور اس غلطی کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا تھا۔

انہوں نے کچھ دیر بعد کاغذ کے بچ جانے والے حصے پر لکھا۔ "ان چیزوں کے لیے شکریہ... کہانی اچھی لگی... مگر میں اس طرح سے نہیں رہ سکتا... خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔"

پھر انہوں نے ہچکچاتے ہوئے نیچے لکھا۔ "میرا اتنے کم میں گزارہ مشکل ہے۔ امید ہے تم اب زیادہ پانی اور کھانے کو لاؤ گے۔"

پھر کچھ سوچ کر نیچے لکھا۔ "سنو میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گا اگر تم مجھے یہاں سے نکال دو۔ تم نے میرا جو آئی فون لیا ہے اس کی مالیت پچاس ہزار ہے اور میری رولیکس گھڑی کی مالیت اسی ہزار ہے۔ تم یہ بھی رکھ لو اور ایک لاکھ بھی لے لو مگر مجھے یہاں سے نکال دو۔"

انہوں نے کاغذ فوری باہر نہیں ڈالا تھا بلکہ انتظار کرتے رہے جب کئی گھنٹے بعد پہلی ایمرجنسی لائٹ کی روشنی بالکل ہی جواب دے گئی تو انہوں نے اسے کاغذ کے ساتھ باہر ڈال دیا۔ اب انہوں نے دوسری ایمرجنسی لائٹ جلا کر اس طرح رکھی کہ اس کا رخ سوراخ کی طرف تھا۔ میاں صاحب دیکھنا چاہتے تھے کہ آنے والا کس طرح چیزیں لے کر جاتا ہے اور کس طرف سے آتا ہے مگر وہ اسے نہیں دیکھ سکے۔ انہوں نے بجری کا ایک چھوٹا سا کرسی نما حصہ بنا لیا تھا جس پر ان کی تشریف اور کمر کا کچھ حصہ ٹکا ہوا تھا اور باقی کمر وہ کھردری دیوار پر ٹکا کر بیٹھے تھے۔ گھنے بالوں کی وجہ سے ان کا سر دیوار کے کھردرے پن سے محفوظ تھا۔ اس آرام دہ پوزیشن کی وجہ سے انہیں جانے کس وقت نیند آ گئی۔ خاصی دیر سونے کے بعد وہ بیدار ہوئے تو انہیں

شانے میں دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور ان کا گلا خشک تھا۔

جب سے انہیں ہوش آیا تھا یہ پہلا موقع تھا جب یہ مسئلہ ہوا اور انہیں یہ سوچ کر عجیب سا لگ رہا تھا کہ وہ اسی کمرے کو باتھ روم کے طور پر استعمال کریں گے جہاں وہ جانے کتنی دیر سے بند ہیں اور مزید کتنی دیر انہیں یہاں بند رہنا تھا۔ وہ خاصی دیر برداشت کرتے رہے مگر بالآخر معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہوا اور انہوں نے کمرے کے آخری کونے کو استعمال کیا۔

میاں صاحب نے شلوار قمیص پر واسکٹ پہن رکھی تھی، برسوں سے یہی ان کا لباس تھا۔ انہیں کسی قدر گرمی کا احساس ہوا تو انہوں نے واسکٹ اتار دی تھی۔ انہوں نے روشنی میں سوراخ کے باہر ممکنہ حد تک دیکھا۔ تب انہیں پتا چلا کہ سوراخ کے نیچے کوئی دو فٹ کی جگہ تھی۔ آنے والا اسی طرف سے آتا ہوگا۔ انہیں یہ خیال بھی آیا کہ انہیں اسی سوراخ سے لایا گیا ہوگا تو اس پر یہ سلاخیں فوراً تو نہیں لگائی جاسکتی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سلاخیں سیمنٹ بجری کے بجائے کسی اور چیز سے یہاں فکس تھیں۔ انہوں نے ممکنہ حد تک قوت صرف کر کے انہیں ہلانے کی کوشش کی مگر وہ انہیں جنبش دینے میں قطعی ناکام رہے تھے۔ تھک ہار کر میاں صاحب واپس اپنی جگہ آبیٹھے اور سوچتے سوچتے پھر کسی وقت سو گئے۔

اگلی بار جاگے تو ایک بار پھر ان کا گلا خشک ہو رہا تھا اور اس بار انہوں نے باقی ماندہ پانی پی لیا مگر اس سے پیاس صرف کچھ دیر کے لیے دبی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پیاس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا تو انہوں نے سوراخ سے منہ لگا کر چلا کر پانی کے لیے فریاد کی۔ مگر کئی پکاروں کے بعد ان کے گلے کی خشکی میں اضافہ ہو گیا اور دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ واپس اپنی جگہ آبیٹھے۔ انہیں یقیناً یہاں آئے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ نہ جانے کب سے یہاں تھے۔ ان کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔

جیسے جیسے ان کی پیاس بڑھ رہی تھی ان کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ انہیں شروع میں اس آدمی کو بڑی پیشکش کرنی چاہیے تھی۔ ایسی پیشکش جو اسے راضی کر لیتی۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی بہت ہی کم قیمت لگائی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اربوں کے مالک ہیں اور انہوں نے اپنی جان اور آزادی کی کتنی حقیر قیمت لگائی

تھی۔ اس سے زیادہ تو وہ مہینے میں صدقہ خیرات کر دیتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اسے بڑی پیشکش کریں گے۔ مگر یہ پیشکش کتنی ہونی چاہیے۔ پانچ لاکھ...... نہیں دس لاکھ، پھر انہیں یہ بھی کم لگے تو انہوں نے اسے دوگنا کرتے ہوئے بیس لاکھ کرنے کا سوچا۔

جیسے جیسے پیاس بڑھ رہی تھی اسی لحاظ سے وہ دل ہی دل میں قیمت بڑھا رہے تھے۔ جب وہ پچاس لاکھ تک پہنچے تھے تب انہیں سوراخ کے دوسری طرف آہٹ محسوس ہوئی اور سب سے پہلے پانی کی ایک بوتل اندر آئی۔ وہ اس طرف جھپٹے اور ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ ان کے دائیں گھٹنے پر اچھی خاصی چوٹ آئی۔ جب تک اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے سوراخ تک پہنچے تو برگر کا شاپر اور ایمرجنسی لائٹ بھی اندر آچکی تھی۔ یہ دونوں چیزیں سوراخ کی منڈیر پر ٹک گئیں البتہ پانی کی بوتل بڑی تھی وہ نیچے گر گئی اور انہوں نے اسے اٹھاتے ہوئے عجلت میں کہا۔ ''میری بات سنو ابھی مت جانا......'' انہوں نے بوتل کھولتے ہوئے ایک گھونٹ لیا اور پھر چلا کر بولے۔ ''سنو میں تمہیں پچاس لاکھ دوں گا۔ مجھے یہاں سے نکال دو...... تمہیں خدا کا واسطہ ہے...... میری بات سنو......''

وہ سلاخوں سے چمٹ گئے تھے اور بوتل ان کے ہاتھ میں تھی، انہوں نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ اس میں سے ایک قطرہ پانی نہ چھلکنے پائے۔ وہ باہر دیکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر انہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر نیچے کی طرف سے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور جب تک وہ نیچے دیکھتے کاغذ اندر ڈالنے والا ہاتھ غائب ہو گیا تھا اور وہ اس کی بہت معمولی سی جھلک دیکھ سکے تھے۔ میاں صاحب ایک بار پھر چلاتے رہ گئے تھے مگر جانے والا جا چکا تھا۔ انہیں کچھ دور سے ہلکی سی آہٹ سنائی دی جس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں سے دور جا چکا تھا۔ میاں صاحب نے بوتل سے پہلا گھونٹ بے تابی سے لیا۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے اس پانی کو آرام سے کیوں نہیں پیا۔ عجلت میں پانی ان کے خشک منہ کو تر کیے بغیر حلق سے اتر گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اب چوسنے کے انداز میں بوتل سے دو چھوٹے گھونٹ لیے اور پھر اس کا ڈھکن لگا کر واپس رکھ دیا۔

انہوں نے کاغذ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور پھر شاپر اور ایمرجنسی لائٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ آنے والی ایمرجنسی لائٹ پوری طرح چارج تھی اور یہ خاصی چلنے والی لائٹ تھی۔ ان کے پاس جو لائٹ تھی وہ اب تک کام کر رہی تھی اگرچہ اس کی لائٹ مدھم پڑ چکی تھی۔ شاپر میں پہلے کی طرح ایک ہی برگر تھا۔ اب تک پیاس نے پریشان کر رکھا تھا اس کی طرف سے سکون ملا تو انہیں احساس ہوا! کہ وہ شدید بھوکے تھے۔ انہیں پہلا برگر کھائے ہوئے شاید چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے پانی کی طرح برگر میں بھی احتیاط کی اور نصف کھا کر باقی نصف شاپر میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سب سے آخر میں وہ کاغذ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اسے جیب سے نکال کر انہوں نے ایمرجنسی لائٹ کی روشنی اس کی طرف کی اور پڑھنے لگے۔

''میاں صاحب! مجھے آپ کی فکر اور پریشانی کا احساس ہے۔ اسی وجہ سے آپ میری بات پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بار بار مجھے روپے پیسے اور چیزوں کا لالچ دے رہے ہیں۔ حالانکہ میں اللہ کی قسم کھا کر آپ کو کہہ چکا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک روپے کا بھی لالچ نہیں ہے۔ نہ اب اور نہ بعد میں، میں آپ کو ٹھیک ٹھاک اور صحت مند رکھنے کی بھی پوری کوشش کروں گا۔ یعنی آپ کو اتنا پانی اور خوراک ملتی رہے جس سے آپ ٹھیک رہیں۔ شاید آپ کا اضافی وزن گھل جائے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بھی آپ کے لیے ہی اچھا ہوگا۔ آپ نے جو اضافی پانی اور خوراک کی درخواست کی ہے مجھے کہتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ فی الحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو ایک لیٹر پانی اور ایک برگر میں گزارہ کرنا ہوگا۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ آپ کو برگر کے بجائے کچھ اور مہیا کر سکوں۔

''مجھے تسلیم ہے کہ آپ کو یوں اغوا کرنے اور یہاں لا کر قید کرنا بلا مقصد نہیں ہے مگر میرا مقصد وہ ہرگز نہیں ہے جو آپ کے ذہن میں آرہا ہے۔ آپ نے لاکھوں کی پیشکش کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ارب پتی ہیں۔ اگر میں اس سے دس گنا اور تاوان مانگوں تب بھی آپ دیں گے مگر یہ میرا مقصد نہیں ہے۔ اس کا یقین آپ کو بہرحال آجائے گا۔ جہاں تک یہاں سے آپ کی رہائی کا تعلق ہے تو میں پھر کہوں گا آپ کو کچھ صبر سے کام لینا ہوگا۔ صرف صبر سے کام لے کر آپ یہاں سے نکل سکیں گے۔ آپ کو بے صبری کرنے، شور شرابے یا ہوش کھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں نقصان ہو سکتا ہے اس لیے حوصلہ رکھیں اور زندہ رہنے کی کوشش کریں، مجھ سے آپ کے لیے جو ہو سکتا ہے

میں ضرور کروں گا۔ میں نے یہ کہانی اسی لیے لکھی ہے کہ آپ اسے پڑھ کر اپنا کچھ وقت پاس کر سکیں۔ آپ کو اس کا پہلا حصہ اچھا لگا اس لیے دوسرا حصہ پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔

کہانی حصہ دوم۔ ''راشد اور سائرہ اگرچہ جانتے تھے کہ ان کی اتنی حیثیت نہیں ہے لیکن انہوں نے پھر بھی فلیٹ بک کرا لیا۔ انہیں جو الاٹمنٹ فائل بنا کر دی گئی اس میں بے شمار شرائط تھیں۔ مگر فلیٹ بک کرانے والے پروجیکٹ منیجر نے نہایت شیریں لہجے میں انہیں بتایا کہ یہ قواعد وضوابط وشرائط قطعی رسمی کارروائی ہیں اور وہ ان کے لیے دل وجان سے سب کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہوگی کہ انہیں وقت سے پہلے قبضہ مل جائے اور جہاں تک ادائیگی کا تعلق تھا انہیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ سمجھ لیں کہ ان کے پاس جو روپیا تھا وہ کمپنی کے پاس ہی تھا وہ اپنی سہولت کے مطابق آرام سے ادائیگی کر سکتے تھے۔ اس پر راشد نے اس شق کی طرف توجہ دلائی کہ لیٹ پے منٹ پر سرچارج لگے گا۔ تب بھی منیجر نے انہیں پوری تسلی دی تھی کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ دونوں میاں بیوی بکنگ کے بعد خوش خوش واپس آئے تھے۔ طے ہوا تھا کہ وہ ہزار روپے مہینا دیں گے اور سال میں دس ہزار کی ایک قسط دیا کریں گے۔ یہ اگرچہ طے شدہ رقم سے کم تھی مگر منیجر نے انہیں اطمینان دلایا تھا کہ وہ باقی رقم قبضے کے وقت دے سکتے ہیں۔ اس وقت انہیں لگا کہ فلیٹ بس ان کے لیے تیار ہے۔ سائرہ نے راشد سے کہا۔

''آپ کو جو سالانہ انکریمنٹ ملے گا ہم اسے بھی جمع کرتے رہیں گے اور جب تک قبضے کا وقت آئے گا تب تک ہم بقایا رقم بھی جمع کر لیں گے۔''

راشد نے کچھ کہا نہیں مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ جتنی تنخواہ بڑھتی تھی اس سے زیادہ مہنگائی میں اضافہ ہو جاتا تھا اور ان کی چادر پاؤں سکیڑنے کے باوجود دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں یہ سوچنا خواب ہی ہوتا کہ وہ انکریمنٹ کی رقم سے فلیٹ کی آخری ادائیگی کر سکیں گے۔ راشد نے محسوس کیا کہ اسے ہی اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ دوسرے ملازم چار بجے اٹھ جاتے تھے اور افسران تو لنچ کے بعد غائب ہو جاتے تھے مگر راشد ان چند ملازموں میں سے تھا جو اپنا وقت پورا کر کے اٹھتے تھے۔ بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے وہ چھ بجے تک گھر پہنچتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کہیں پارٹ ٹائم کام کر لے تو اسے کچھ اضافی آمدنی ہو جائے اس سے وہ فلیٹ کی قسطیں اور دوسری ادائیگیاں آسانی سے کر سکے گا۔ اسے اضافی آمدنی کی ایک یہی صورت نظر آئی تھی پھر اس نے سائرہ سے مشورہ کیا تو وہ فکر مند ہو گئی۔ ''آپ پہلے ہی تھکے ہارے آتے ہیں۔''

''کیا کریں بچوں کے بھی خرچے ہیں اپنا دل مار سکتے ہیں بچوں کا نہیں۔''

''مگر ملازمت ملے گی کہاں؟''

''کوشش کرتا ہوں جاننے والوں سے بات کرتا ہوں کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔''

راشد نے ملازمت تلاش کی اور سچ مچ اسے مل بھی گئی۔ ایک کاسمیٹک شاپ میں شام کے وقت سیلز مین کی ضرورت تھی۔ سات سے رات دس بجے تک وہاں بہت رش ہوتا تھا اس لیے ایک اضافی آدمی درکار تھا۔ دکان کے مالک دونوں بھائی راشد کو جانتے تھے اور اس کے کردار سے بھی واقف تھے اس لیے اسے رکھ لیا۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی صرف ہزار روپے تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھے۔ پھر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کے آنے سے سیل میں فرق آیا تو تنخواہ بڑھا دیں گے ورنہ اسے اسی تنخواہ پر کام کرنا پڑے گا۔ ایک مہینے بعد انہوں نے تنخواہ چودہ سو روپے کر دی تھی۔ اس میں سے ایک ہزار کی انہوں نے کمیٹی ڈال لی اور باقی گھر کے خرچ میں شامل کرنے لگے۔ اس سے کچھ اخراجات میں آسانی ہوئی تھی۔

اس طرف سے اطمینان کے باوجود دونوں میاں بیوی فالتو اخراجات روک کر فلیٹ کے لیے ادائیگی کا بندوبست کرتے رہے۔ منیجر کے اطمینان دلانے کے باوجود انہیں فکر تھی کہ ادائیگی کمپنی کی دی ہوئی میعاد میں کر دی جائے تا کہ ان پر کوئی ہلکا جرمانہ نہ لگے۔ چار سال میں انہوں نے تقریباً پوری ادائیگی کر دی تھی۔ کچھ معمولی سی رقم رہ گئی تھی جو وہ قبضے کے وقت ادا کر دیتے۔ اس وقت تک اپارٹمنٹ کا اسٹرکچر تیار ہو گیا تھا اور لگ رہا تھا کہ سال بھر میں فلیٹ تیار ہو جائے گا۔ فلیٹ بک کرانے کے پانچویں سال ان کی بیٹی مائرہ جو صرف دس سال کی تھی اسے ہیپاٹائٹس ہو گیا۔ اگرچہ راشد کو سرکاری علاج کی سہولت میسر تھی مگر سرکاری اسپتال میں جس طرح علاج ہوتا ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ پھر بھی کیا کرتے راشد کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ کسی نجی اسپتال میں مائرہ کا علاج کراتا۔ وہ کئی دن اسپتال میں داخل رہی اور اسے ذرا بھی

فرق نہیں پڑا۔ مجبوراً راشد نے اسے ایک نجی مہنگے اسپتال میں داخل کرایا اور صرف داخل کرانے میں اس کی جمع پونجی ختم ہوگئی۔ دفتر سے لون کی درخواست کی اور بڑی مشکل سے اسے لون ملا۔ مائرہ کا علاج شروع ہوا مگر تب تک دیر ہوچکی تھی۔ وہ دو دن اسپتال میں داخل رہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ راشد اور سائرہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک ہفتے میں ان کی ہنستی کھیلتی بچی دنیا سے جاچکی تھی۔

ابھی وہ اس صدمے سے بھی نہیں سنبھلے تھے کہ کمپنی کی طرف سے آخری ادائیگی کا نوٹس آگیا۔ راشد کمپنی کے دفتر پہنچا اور اس نے پوچھا کہ جب فلیٹ مکمل ہی نہیں ہوا ہے تو آخری ادائیگی کا نوٹس کس لیے اور رقم بھی اس کے علاوہ تھی جس کا اس سے معاہدہ ہوا تھا۔ تب اسے بتایا گیا کہ یہ رقم اصل میں یوٹیلٹی کنکشن کی مد میں تھی اور اسے معاہدہ دکھایا گیا جس کے آخر میں باریک سا لکھا تھا کہ جب کمپنی یوٹیلٹی کنکشن چارجز طلب کرے گی تو الاٹی کو اس کی ادائیگی لازمی مقررہ مدت میں کرنی ہوگی، بہ صورتِ دیگر اسے ہر صورت جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ یہ جرمانہ ہزار روپے ماہانہ تھا۔ کنکشن چارجز پچیس ہزار روپے تھے اور راشد مقروض تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اتنی جلدی ادائیگی نہیں کرسکتا۔ اس نے منیجر کو اپنی بیٹی کی موت کا بتایا تو وہ متاثر ہوا تھا۔ اس نے راشد کو تسلی دی کہ وہ آرام سے ادائیگی کرے۔

زخم کیسا ہی کیوں نہ ہو وقت اسے بھر دیتا ہے۔ کچھ عرصہ گزرا تو ان کا بوجھ بھی ہلکا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ دفتر سے لیا ہوا لون کٹ گیا اور قرض ادا ہوا تو انہیں دوبارہ فلیٹ کی بقیہ رقم کی ادائیگی کی فکر ہوئی۔ تب سائرہ نے راشد سے کہا۔ ''ہمیں فلیٹ تو دیکھنا چاہیے اب تو پانچ سال چار مہینے ہوگئے ہیں اسے مکمل ہوجانا چاہیے۔''

وہ دونوں فلیٹ دیکھنے سائٹ پر گئے تو حیران رہ گئے۔ تقریباً ایک سال پہلے فلیٹ جس طرح اسٹرکچر کی صورت میں کھڑا تھا اب بھی وہی حالت تھی اور اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جمی ہوئی مٹی، بند راستے اور وہاں کی ویرانی بتا رہی تھی کہ گزشتہ ایک سال سے کام بند ہے۔ وہاں موجود چوکیدار نے تصدیق کی کہ سائٹ پر ایک سال سے کام رکا ہوا ہے اور اندر کے راستے بھی بلاک لگا کر بند کر دیے گئے ہیں تاکہ بے گھر اور جرائم پیشہ لوگ یہاں اپنا مسکن نہ بنالیں۔ چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ مہینے میں ایک بار مالکان اور کمپنی والے آتے ہیں اور سائٹ کا معائنہ کرکے چلے جاتے ہیں مگر ابھی تک کام شروع ہونے کے

کوئی آثار نہیں ہیں۔''

یہاں تک پہنچ کر کہانی رک گئی اور نیچے لکھا تھا کہ اگر میاں صاحب کو یہ حصہ بھی پسند آیا تو وہ آگے کہانی لکھے گا۔ انہوں نے جو کہنا ہے وہ صفحے پر لکھ کر اسے باہر ڈال دیں۔ ساتھ ہی ڈسچارج ہوجانے والی ایمرجنسی لائٹ اور پانی کی خالی ہوجانے والی بوتل بھی باہر ڈال دیں۔ انہوں نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں لگا کہ جیسے راشد کی جو کہانی ہے اس کا تعلق ان سے بھی ہے۔ اگرچہ انہیں یقین نہیں تھا کہ سچ مچ ایسا ہی ہے مگر کہانی جس انداز میں آگے جارہی تھی اس سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ خاصے غور و خوض کے بعد انہوں نے پنسل سنبھالی اور کاغذ نکالا۔ اس پر لکھنا آسان نہیں تھا کیونکہ کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ انہوں نے پہلے ران پر رکھ کر لکھا تھا مگر ران کی نرم ران پر رائٹنگ بڑی مشکل سے آئی تھی اس بار انہوں نے ایمرجنسی لائٹ استعمال کی اور اس کے شیشے پر کاغذ رکھ کر لکھنے لگے۔ اس سے انہیں آسانی ہوئی تھی۔

''اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آرہا ہے۔ دیکھو اگر تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف ہوئی ہے تو میں دل سے معافی مانگتا ہوں۔ میں ہر طرح کی تلافی کے لیے بھی تیار ہوں۔ تم مجھ کو ایک موقع تو دو۔ میں اپنی ہر خطا مان لوں گا۔ جو تم چاہو گے، میں ویسا ہی کروں گا مگر ایک بار مجھ سے بات ضرور کرو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ تم مجھے ایک بوتل پانی اور ایک برگر دے رہے ہو اور شاید اسی میں مجھے چوبیس گھنٹے گزارا کرنا پڑے گا۔ مگر مجھے تم سے اب کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس ایک بار مجھ سے بات کرلو۔ ہاں تمہاری کہانی اچھی اور اپنی لگی ہے جیسے میں بھی اس کا ایک کردار ہوں اور شاید اسی وجہ سے میں یہاں بند ہوں۔ اگر تم مجھے کسی بھی خواہش کے عوض آزاد کردو تب بھی میں اسے تمہارا احسان سمجھوں گا۔''

میاں صاحب نے پانی کی خالی بوتل اور ایمرجنسی لائٹ جس کا چارج ختم ہوگیا تھا باہر ڈال دی اور اس کے ساتھ ہی کاغذ بھی تھا۔ اب انہیں ایک مسئلہ اور لاحق ہوگیا تھا۔ یہ بھی حاجت تھی مگر دوسری طرح کی اور اس کے نتیجے میں اس محدود جگہ جو سڑاند پھیلتی اس کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ واش روم میں بھی جاتے تو پہلے ائر فریشنر اچھی طرح چھڑک لیتے تھے تاکہ ممکنہ بدبو ان کی طبع نازک پر ناگوار نہ گزرے۔ جب معاملہ برداشت سے باہر ہونے

لگا تو انہوں نے ملبے سے بڑی تلاش کے بعد ایک لکڑی برآمد کی اور پھر اس کی مدد سے ایک کونے میں گڑھا کھودا۔ دل پر جبر کر کے وہ گڑھے میں فارغ ہوئے اور پھر جلدی سے اس پر مٹی ڈال کر اسے بند کر دیا۔ کچھ دیر کے لیے بدبو آئی لیکن پھر سکون ہو گیا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ مسئلہ بھی احسن انداز میں حل ہو گیا۔ اگرچہ اس بار بھی انہیں طہارت نہ ہونے کی وجہ سے الجھن ہوئی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔

برگر کا دوسرا حصہ انہوں نے اس وقت کھایا جب بھوک سے ان کے پیٹ میں کچھ ہونے لگا تھا، اسی طرح وہ پانی بھی بہت احتیاط سے استعمال کر رہے تھے' جب پیاس برداشت سے باہر ہونے لگتی تو وہ چند گھونٹ لے لیتے تھے۔ انہوں نے برگر کھا کر اس کا شاپر پھینکا تو اس کی بو پر چوہے چلے آئے۔ میاں صاحب خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے چوہوں کو کنکریٹ کے ٹکڑے مار کر بھگایا۔ مگر یہ سوچ کر انہیں کپکپی سی آ گئی کہ اگر کسی نے انہیں یہاں سے نہ نکالا اور وہ یہیں مر گئے تو یہی چوہے ان کی لاش کھا کر اسے ڈھانچے میں بدل دیں گے۔

جب پانی کی بوتل اور دوسری ایمرجنسی لائٹ بھی ختم ہونے لگی تو انہیں اندازہ ہوا کہ مزید چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور شاید وہ شخص آنے والا ہے۔ وہ بے تابی سے اس کے منتظر تھے۔ وہ یقیناً پہلے چپکے سے آ کر چیزیں اور کاغذ لے جاتا ہوگا۔ اس کے بعد وہ دوسری چیزیں اور پھر اپنا لکھا ہوا کاغذ لاتا ہوگا۔ وہ منتظر رہے اور پانی و روشنی دونوں ختم ہو گئے۔ بیٹری ختم ہونے سے لائٹ بند ہو گئی اور اب وہ اندھیرے میں تھے۔ خوفزدہ ہو کر انہوں نے خود سے بلند آواز میں بات کرنا شروع کر دی۔ وہ خود کو تسلی دے رہے تھے کہ رہائی اب زیادہ دور نہیں ہے۔ انہوں نے جو بات کی ہے وہ اس شخص کے دل پر یقیناً اثر کرے گی۔ پھر پولیس بھی ان کی تلاش میں ہو گی وہ بھی یہاں تک آ سکتی ہے۔ باتوں کے ساتھ وہ مسلسل پیروں کو بھی حرکت دے رہے تھے انہیں خوف تھا کہ کہیں چوہے نہ ان پر چڑھ آئیں۔ جب وہ ساکت اور خاموش ہوتے تو انہیں لگتا کہ آس پاس کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ پھر سوراخ سے روشنی جھلکنے لگی تو وہ اٹھ کر اس کی طرف لپکے اور گرے بغیر سوراخ تک پہنچ گئے۔

"خدا کے لیے۔" انہوں نے چلا کر کہا۔ "مجھے یہاں سے نکالو، میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔"

مگر جواب میں پہلے پانی کی ایک بوتل اندر آئی، پھر برگر کا شاپر اور آخر میں ایمرجنسی لائٹ آئی، کاغذ اسی پر ربر بینڈ سے لپٹا ہوا تھا۔ لائٹ روشن تھی۔ میاں صاحب نے ایک مردانہ ہاتھ دیکھا۔ یہ کمزور اور معمولی سا ہاتھ تھا جیسا کہ غریب غربا کا ہوتا ہے۔ صاف ستھرا تھا مگر گوشت سے عاری اور محنت کرنے والا ہاتھ تھا۔ وہ چلاتے رہ گئے اور وہ شخص چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میاں صاحب نے تقریباً روتے ہوئے ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر اسے اینٹ پر رکھی اور پھر پانی کی بوتل اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ بھوک تھی مگر ان کا برگر کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے انہوں نے اسے ایسے ہی کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ نہیں اور رکھتے تو چوہے چلے آتے۔ انہوں نے ایمرجنسی لائٹ کے گرد لپٹا ہوا کاغذ اتارا اور اس کا ربر بینڈ بھی احتیاط سے رکھ لیا کہ کہیں کام آ سکتا تھا۔ پھر انہوں نے رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

"میاں صاحب! مجھے خوشی ہے کہ آپ صورت حال کو سمجھ رہے ہیں اور شاید میری مجبوری بھی سمجھ رہے ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی ذات کے لیے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس لیے آپ کے سامنے آنا اور بات کرنا بیکار ہے۔ میرے لیے جب تک ممکن ہے میں آپ کے لیے کھانے پانی کی فراہمی جاری رکھوں گا۔ ممکن ہے مجھے کبھی دیر سویر ہو جائے مگر آپ حوصلہ مت ہاریے گا میں ضرور آؤں گا اور آپ کو یہ چیزیں ضرور ملیں گی۔ جہاں تک کہانی کی بات ہے اس کا آخری حصہ اس کاغذ میں موجود ہے' پہلے آپ یہ پڑھ لیں اس کے بعد آپ جو سوال کریں گے میں اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

اس سے آگے کہانی تھی مگر میاں صاحب نے اسے رکھ دیا۔ ابھی ان کا موڈ نہیں تھا کیونکہ اپنی بات کا جواب نہ پا کر موڈ پورا ہی خراب ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید کسی نفسیاتی مریض کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ٹھیک ہے اس شخص کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو گی۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے مگر سب تو ایسا ردعمل نہیں دکھاتے۔ یہ شخص یقیناً پاگل ہو گیا ہے اور ان سے انتقام لینے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے برگر کھایا اور تھوڑا پانی پیا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے ان کا خاصا وزن گھٹ گیا تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے جو گریہ ان کو

اپنی توند پر پھنستا ہوا لگتا تھا اب وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ان کے کپڑے مکمل طور پر مٹی سے لتھڑ گئے تھے اور جب وہ انہیں ہاتھ لگاتے تو کپڑے کی نرمی کے بجائے مٹی کا کھردرا پن محسوس ہوتا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور بال بھی مٹی میں اٹ گئے تھے۔ مگر اب ان کی توجہ اس طرف کم تھی۔ خاصی دیر بعد انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کاغذ نکالا اور کہانی کا باقی حصہ پڑھنے لگے۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا ہوگا۔

"راشد اور سائرہ پروجیکٹ بنانے والی کمپنی کے دفتر گئے۔ انہوں نے منیجر سے بات کی کہ پروجیکٹ اب تک ویسے کا ویسا ہی کھڑا ہے اور اس میں مزید کوئی کام نہیں ہوا ہے، جبکہ انہیں چار مہینے پہلے قبضہ دے دینا چاہیے تھا۔ اس پر منیجر نے رکھائی سے کہا۔ "لوگوں نے رقم نہیں دی ہے اسی لیے پروجیکٹ پر کام رکا ہوا ہے۔"

راشد نے کہا۔ "لیکن ہم تو تقریباً ساری رقم دے چکے ہیں۔"

"آپ نے کنکشن چارجز ادا نہیں کیے ہیں۔" منیجر نے یاد دلایا۔

"ان کا فلیٹ کی قیمت سے کیا تعلق ہے۔" راشد نے کہا۔ "آپ باقی رقم لیں اور مجھے پکی الاٹمنٹ دیں۔ جب قبضے کا وقت آئے گا اور کنکشن لگیں گے تو میں اس کی رقم بھی دے دوں گا۔"

"ہمیں بجلی، پانی اور گیس کی کمپنیوں کو ابھی ادائگی کرنی ہے۔"

"معاف کیجیے گا میں نے معلوم کیا ہے یوٹیلٹی کنکشن کا بلڈر کی قیمت سے تعلق نہیں ہوتا ہے اور جو قیمت بلڈر طے کرتا ہے اسے لینے کے بعد وہ الاٹمنٹ دینے کا پابند ہوجاتا ہے۔"

"ہمارے پروجیکٹ میں ایسا نہیں ہے۔ مکمل ادائگی کے بغیر کسی قسم کا الاٹمنٹ نہیں دیا جائے گا۔" منیجر نے صاف انکار کیا۔ اس پر راشد اور سائرہ نے کمپنی کے مالک سے ملنے کو کہا تو ان کی ملاقات اس سے بھی کرا دی گئی اور اس نے راشد اور سائرہ کو یقین دلایا کہ پروجیکٹ جلد مکمل ہوگا اور انہیں قبضہ دے دیا جائے گا۔ اس نے واجبات کی ادائگی پر اصرار نہیں کیا اور انہیں یہ یقین بھی دلایا کہ ان پر کوئی جرمانہ عائد نہیں کیا جائے گا۔ اس سے ملاقات کر کے وہ دونوں کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ اس نے یقین دلایا تھا کہ مالی مسائل کی وجہ سے کام رکا ہوا تھا مگر اب وہ جلد اسے شروع کرے گا اور فلیٹ ایک سال کے اندر مکمل کر کے الاٹیوں کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ ایک مہینے بعد راشد نے سائٹ کا چکر لگایا تو اسے کام بدستور ویسا ہی نظر آیا۔ مزید دو مہینے بعد اس نے پھر چکر لگایا تو بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔

وہ اور سائرہ پھر کمپنی کے دفتر گئے تو وہاں نہ تو منیجر ملا اور نہ ہی کمپنی کا مالک تھا۔ منیجر کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نوکری چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جب کہ مالک اپنا علاج کرانے کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ نئے منیجر کا تقرر نہیں ہوا تھا اور باقی عملہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا وہ جب جاتے انہیں اسی قسم کی کہانیاں سننے کو ملتیں۔ بہ مشکل ایک بار کمپنی کے مالک سے بات ہوئی تو اس نے پھر وہی وعدے وعید کرتے ہوئے جلد پروجیکٹ فنش کرنے کی یقین دہانی کرائی مگر کام وہیں رکا رہا۔ سال گزرا اور پھر سالوں گزر گئے۔ وہ بھی کتنے چکر لگاتے، تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ راشد اپنی رقم واپس لینا چاہتا تھا مگر جب اسے بتایا گیا کہ ادا کی ہوئی رقم کا تیس فیصد کاٹ کر باقی رقم تین قسطوں میں واپس کی جائے گی اور ہر قسط چھ مہینے بعد دی جائے گی تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ سائرہ نے بھی یہی کہا کہ اب انہیں فلیٹ ہی چاہیے، چاہے وہ دس سال بعد ملے یا بیس سال بعد۔

بیٹی کے بعد اب ایک ہی بیٹا عبدالواحد تھا جو ان کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا مگر اسے ایک عام سے سرکاری کالج میں داخلہ ملا تھا۔ اچھے نجی کالج میں داخل کرانے کی سکت نہیں تھی۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ اس سرکاری کالج میں اس کا بیٹا کس صحبت میں رہے گا اور کتنا بگڑ جائے گا۔ واحد کے لال دانت تو پہلے ہی نظر آنے لگے تھے۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ وہ سگریٹ پینے لگا تھا اور کالج کا بیشتر وقت کالج کے بجائے اس کے سامنے ایک بدنام ہوٹل میں گزارتا تھا۔ پڑھائی میں دلچسپی کا یہ حال تھا کہ پہلے ہی سال وہ سوائے ایک پرچے کے باقی تمام پرچوں میں فیل ہو گیا تھا۔ راشد نے اسے فوری کالج سے اٹھا لیا۔ کیونکہ اس کالج میں جا کر وہ بگڑ گیا تھا۔ سائرہ نے اسے مشورہ دیا کہ اسے کسی نجی اور اچھے کالج میں داخل کرائے جہاں اسے اچھی صحبت مل سکے اور وہ تعلیم میں دلچسپی لے۔ راشد نے ایسا ہی کیا۔ اگرچہ اچھے نجی کالجوں کی فیسیں اچھے پرائیویٹ اسکولوں سے کم نہیں تھیں اور دیگر اخراجات بھی خاصے تھے مگر بیٹے کا مستقبل بنانے

کے لیے اس نے یہ کڑوا گھونٹ پینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں چھ مہینے کی فیس ایک ساتھ جاتی تھی' اس نے کسی نہ کسی طرح پہلے سمسٹر کی فیس ادا کر دی۔

انہیں فلیٹ بک کرائے دس سال ہونے کو آئے تھے اور دو سال سے وہ سائٹ پر بھی نہیں گیا تھا مگر اب اسے خیال آیا کہ جا کر دیکھے ہو سکتا ہے کہ فلیٹ مکمل ہو گیا ہو اور وہ اسے حاصل کر کے وہ رقم بچا سکتا تھا جو ہر مہینے کرائے میں جا رہی تھی اور اب یہ اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ اگر یہ بچ جاتی تو وہ بہ آسانی واحد کے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتے تھے۔ راشد دفتر سے آتے ہوئے پروجیکٹ کی سائٹ پر پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ پروجیکٹ نہ صرف مکمل ہو گیا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا یہاں لوگ رہ رہے تھے۔ بالکونیوں پر گرلز تھیں اور بیشتر بالکونیوں میں کچھ نہ کچھ رکھا ہوا تھا۔ نیچے دکانیں بھی مکمل کی تھیں اور مین گیٹ پر گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے تصدیق کی اور بتایا کہ فلیٹ ایک سال پہلے آباد ہوئے تھے اور اب تو ستر فیصد فلیٹوں میں لوگ آ چکے تھے یا انہوں نے کرائے پر دے دیے تھے۔ راشد خوش ہوا مگر ساتھ ہی فکرمند بھی ہوا کہ انہیں کیوں علم نہیں ہوا۔ ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے مکان تبدیل کیا تھا اور اس پتے کی تبدیلی کی اطلاع کمپنی کو نہیں دی گئی شاید اسی لیے وہ انہیں مطلع نہیں کر سکی۔ اس نے گھر آ کر سائرہ کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی اور اگلے ہی دن وہ دونوں کمپنی کے دفتر گئے۔ مگر جب انہوں نے اپنی فائل پیش کی اور نئے منیجر نے اس کا ریکارڈ چیک کیا تو معذرت خواہ لہجے میں بولا۔

''آپ کی الاٹ منٹ منسوخ ہو چکی ہے۔''

''منسوخ ہو چکی ہے مگر کیوں؟'' وہ بےتاب ہو گئے تھے۔ ''جب ہم پوری رقم دے چکے تھے۔''

''آپ نے کنکشن چارجز نہیں دیے تھے اور آپ کو دو بار نوٹس جاری کیا گیا مگر آپ نے وصول نہیں کیا اور وہ واپس آ گیا۔ قواعد کے مطابق آپ کی الاٹمنٹ منسوخ کر دی گئی۔''

دفتر کے ریکارڈ میں دونوں خطوط بھی تھے جن پر کوریئر کمپنی کی طرف سے وصول نہ کرنے کی اسٹیمپ لگی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر منیجر سے اور پھر کمپنی کے مالک سے لڑتے رہے مگر اس نے بتایا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تنگ آ کر راشد نے پوچھا۔ ''میں نے جو رقم دی تھی اس کا کیا ہوگا؟''

کمپنی کے مالک نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ابھی ہمارے پروجیکٹ میں کچھ فلیٹ سیل ہونے سے رہ گئے ہیں جب ان کی سیل بھی مکمل ہو جائے گی تب آپ کی رقم آپ کو بیس فیصد کٹوتی کے بعد یک مشت واپس کر دی جائے گی۔''

سائرہ نے کہا کہ جو فلیٹ رہ گئے ہیں' ان میں سے کوئی دے دیا جائے تو کمپنی مالک نے بتایا کہ اب ان فلیٹوں کی قیمت بڑھ کر ساڑھے سات لاکھ ہو گئی ہے اور وہ بھی یک مشت ادا کرنے ہوں گے۔ ساڑھے سات لاکھ ان کی اوقات سے بہت زیادہ تھے۔ انہوں نے ایک لاکھ چالیس ہزار ادا کیے تھے اور اب اسے ایک لاکھ بارہ ہزار واپس ملتے جب کہ دیکھا جائے تو روپے کی قیمت آدھی رہ گئی تھی۔ لیکن یہ رقم مل جاتی تو وہ انٹر ہونے تک اپنے بیٹے کے تعلیمی اخراجات سے بے نیاز ہو جاتے۔ اس کے بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ راشد نے کمپنی کے مالک کو اپنی مجبوری بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے بقایاجات ابھی ادا کر دے مگر مالک نے معذرت کر لی اور ساتھ ہی اسے تسلی دی کہ فلیٹ بہت تیزی سے سیل ہو رہے ہیں اس لیے وہ جلد ان کی رقم ادا کر سکے گا۔ انہیں بس کچھ عرصے انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ صبر کر کے واپس آ گئے۔ ابھی واحد کی اگلی فیس دینے میں چند مہینے باقی تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان چند مہینوں میں انہیں رقم واپس مل جائے گی۔ دیکھا جائے تو قصور ان کا بھی تھا جو انہوں نے کمپنی کو پتے کی تبدیلی سے آگاہ نہیں کیا اور یوں فلیٹ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر اب ان کی رقم واپسی میں بھی بندر آنا کانی کر رہا تھا۔

ایک مہینے بعد راشد نے چکر لگایا تو اسے بتایا گیا کہ اب بھی سارے فلیٹ سیل نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے کچھ عرصے اور انتظار کرنا ہوگا۔ دوسرے مہینے وہ پھر مالک سے ملا اور اس نے راشد کو پھر وہی دلاسا دیا کہ وہ حوصلے اور صبر سے کام لے اس کی رقم جلد اسے مل جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے حالات کا رونا بھی رویا کہ اگر اس کی جیب اجازت دیتی تو وہ دے دیتا۔ اس پروجیکٹ نے اسے برباد کر دیا تھا۔ ایک مہینے بعد جب واحد کے اگلے سمسٹر کی فیس جمع کرانے کا مرحلہ آیا تو وہ پھر گیا۔ اس بار بھی اسے ٹہلا دیا گیا۔ اس نے کالج سے مہلت حاصل کی اور یہ مہلت بھی گزر گئی اسے رقم نہیں ملی۔ اب وہ جاتا تو اسے منیجر سے بھی ملنے کا موقع نہیں ملتا

تھا اور کمپنی کے مالک کے بارے میں اسے پتا چلتا کہ وہ ان دنوں دفتر نہیں آ رہا ہے۔

فیس جمع نہ کرانے پر کالج نے واحد کا داخلہ منسوخ کر دیا اور وہ جو ایک بار پھر پڑھائی اور بہتری کی طرف مائل تھا، مایوس ہو گیا۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا اس نے پھر باہر جانا شروع کر دیا اور کچھ عرصے بعد اس نے پھر ان ہی آوارہ گرد دوستوں کو اپنا لیا جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے کالج میں داخل کرایا گیا تھا۔ جب ماں باپ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ الٹا ان سے جھگڑتا کہ وہ کیا کرے۔

تنگ آ کر راشد نے اسے کام پر لگانا چاہا مگر اس نے اس میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں کام پر لگتا چند ہفتے کام کرتا اور پھر کسی بہانے گھر بیٹھ جاتا۔ آوارہ گردی بڑھی تو وہ غلط کاموں میں پڑ گیا۔ نشہ کرنے لگا اور جب اسے گھر سے رقم ملنا بند ہوئی تو اس نے چوریاں شروع کر دیں۔ راشد کو اس کے کرتوتوں کا پتا چلا تو اس نے واحد کو گھر سے نکال دیا۔ مگر سائرہ اور راشد پر اس کی بربادی کا گہرا اثر ہوا تھا۔ سائرہ بیمار رہنے لگی اور پھر اچانک ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر دنیا سے گزر گئی۔ آج راشد اکیلا ہے کیونکہ دنیا میں اس کا واحد سہارا خود بے سہارا ہو کر کہیں لاوارث نشے کی حالت میں پڑا ہے اور ہو سکتا ہے اس دنیا سے ہی گزر گیا ہو۔ بے شمار چکر لگانے کے بعد بھی اسے رقم نہیں ملی اور پھر اسے رقم کی ضرورت ہی نہ رہی۔''

میاں صاحب نے کہانی ختم کر کے گہری سانس لی۔ یہ کہانی ان کے لیے اجنبی نہیں تھی، وہ خود بارہا ان مراحل سے گزر چکے تھے۔ جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تو کامیابی کا ایک خاص گُر دریافت کیا۔ یعنی وہ پروجیکٹ اچھے بناتے تھے۔ مگر جان بوجھ کر پروجیکٹ تاخیر کا شکار کرتے تھے۔ لوگوں سے رقم لے کر پروجیکٹ مکمل کر لیتے اور اسٹرکچر بنا کر پھر کام روک دیتے اور اس بہانے کوشش کرتے کہ لوگوں سے پوری رقم نکلوا لیں۔ جن سے پوری رقم مل جاتی، بعد میں وہ ان کو الاٹ منٹ دے دیتے تھے مگر جو ادائیگی میں دیر کرتے، ان سے کچھ نہیں کہتے تھے اور جب مارکیٹ چڑھتی اور وہ پروجیکٹ تیزی سے مکمل کرتے اور ان لوگوں کی الاٹ منٹ منسوخ کر دیتے جو ادائیگی بروقت نہیں کر پاتے تھے، اس طرح تقریباً ستر فیصد پروجیکٹ دوبارہ ان کے قبضے میں آ جاتا۔ وہ کئی گنا داموں پر فلیٹ سیل کرتے اور لوگوں کی رقم تاخیر سے خاصی کاٹ کر ادا کرتے تھے۔

ویٹریات

''ویٹر! دو گھنٹے ہو گئے ہیں، آخر کھانا کب لگے گا؟''

''سر! بس باورچی لکڑیاں لینے گیا ہے، آ جائے تو فوراً تازہ کھانا پکا کر پیش کر دیا جائے گا۔''

٭٭٭

''ویٹر! بل لاؤ۔''

''سر! آپ ملا کر یا علیحدہ دیں گے؟''

٭٭٭

''ویٹر! کھانا کھانے کے بعد مجھے چکر کیوں آ رہے ہیں؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر، بل تو ابھی میں نہیں لایا۔''

مرسلہ۔ الیلی، کراچی

٭٭٭

ایک آدمی زور زور سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اندر سے آواز آئی۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

آدمی نے کہا۔ ''ہاں میں شادی شدہ ہوں۔''

آواز آئی۔ ''ٹھیک ہے تم نے پہلے ہی بہت سزا پائی ہے تم اندر آ جاؤ۔''

اتنے میں ایک دوسرا آدمی بھاگتا ہوا آیا اور دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

آدمی بولا۔ ''ہاں میں نے دو شادیاں کی تھیں۔''

اندر سے آواز آئی۔ ''تم جا سکتے ہو کیونکہ یہ جنت ہے پاگل خانہ نہیں۔''

مرسلہ۔ ناصر علی صدیقی

عباسیہ ٹاؤن رحیم یار خان۔

اسی وجہ سے وہ آغاز میں قیمت بھی زیادہ نہیں رکھتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ بکنگ کرالیں اور جب وہ پروجیکٹ میں تاخیر کرتے تو اس کی قیمت خود بہ خود مزید گر جاتی اور وہ اس کا اور بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ گری ہوئی قیمت اور تکمیل میں تاخیر سے بہت سے لوگ فلیٹ منسوخ کرا دیتے تھے اور وہ ان کی رقمیں کاٹ کر قسطوں میں دیتے تھے۔ اپنے پیسوں کے لیے آنے والوں سے ایسے وعدے کرتے جو عام طور سے پورے نہیں ہوتے تھے۔ شاید ان کے وعدوں کا کوئی شکار اس حد پر آگیا تھا، اس نے انہیں اس جگہ قید کر دیا اور اب ان سے وہی کھیل کھیل رہا تھا جو وہ اس کے ساتھ کھیل چکے تھے۔ یہ سوچ کر ہی ان کا دل بیٹھنے لگا کہ کہانی والا راشد ہی اصل میں انہیں یہاں قید کرنے والا ہے۔ اس کا تو گھر ہی اجڑ گیا اور وہ اس کا ذمے دار انہیں سمجھ رہا تھا۔ اس صورت میں وہ انہیں کبھی یہاں سے آزاد نہیں کرے گا۔

پیٹ میں ہونے والی اینٹھن رہ رہ کر انہیں یاد دلا رہی تھی کہ وہ بھوکے تھے پھر انہوں نے برگر نکال کر کھایا۔ بے دلی کے باوجود وہ پورا برگر کھا گئے۔ وہ سوچتے رہے اور پھر انہوں نے کاغذ کے بچ جانے والے حصے پر لکھنا شروع کیا۔ اب پنسل کا سکہ بھی آخری حد تک گھس گیا تھا اور اس سے لکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح تحریر مکمل کر لی۔ انہوں نے لکھا۔

’’میں نے تمہاری کہانی پڑھی اور اب میں سمجھ گیا ہوں۔ راشد تم ہی ہو اور تم نے میرے پروجیکٹ میں فلیٹ بک کرایا تھا۔ مجھے تم یاد نہیں ہو لیکن پروجیکٹ میں جانتا ہوں۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا جیسا تم نے لکھا ہے۔ میں نے تقریباً دس سال میں جا کر اسے فنش کیا تھا اور اس وقت تک اس کی ویلیو کئی گنا بڑھ گئی تھی، اس لیے میں نے اسے بہت اچھی قیمت پر بیچا تھا۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی اور تمہارا ایسا نقصان ہوا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی لیکن تم میرے ساتھ جو کر رہے ہو اس کا بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو جائے۔ تم مجھے اسی طرح یہاں قید رکھو گے، چوبیس گھنٹے میں ایک بوتل پانی اور ایک برگر دے دو گے تاکہ میں مروں نہیں، زندہ رہوں اور اذیت سے گزرتا رہوں۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے جھوٹے وعدے کر رہے ہو جیسے وعدے میں نے کبھی تم سے کیے تھے۔ نہ میں اپنے وعدے پورے کر سکا اور نہ تم کرو گے۔ تم اپنی بات کر چکے ہو اس لیے اب کاغذ پنسل کی ضرورت نہیں ہے۔ میری پنسل کا سکہ گھس گیا ہے میں بھی دوبارہ نہیں لکھ سکوں گا۔‘‘

میاں صاحب نے کاغذ بند ہو جانے والی ایمرجنسی لائٹ پر ربربینڈ سے لپیٹ کر اسے اور خالی بوتل کو سوراخ کے باہر ڈال دیا تھا۔ اب وہ تن بہ تقدیر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے روشنی بھی بند کر دی تھی۔ اب انہیں تاریکی سے خوف نہیں آ رہا تھا، وہ خود کو ذہنی طور پر آمادہ کر چکے تھے کہ اس جگہ سے نکلنا انہیں کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئے اور جب ان کی آنکھ کھلی تو سوراخ کی منڈیر پر پانی کی بوتل، تازہ چارج کی ہوئی ایمرجنسی لائٹ اور برگر کا شاپر موجود تھا۔ انہوں نے پہلے اطمینان سے کھایا پیا اور پھر کاغذ کھول کر دیکھا اور پڑھنے لگے۔ اس نے لکھا تھا۔

’’میاں صاحب! آپ پھر غلط سمجھ رہے ہیں، میں پھر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں آپ کو یہاں ہمیشہ کے لیے قید نہیں رکھنا چاہتا لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ آپ کی رہائی میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں میں آپ کو یہ یقین ضرور دلاتا ہوں کہ آپ آزاد ہوں گے۔ آج نہیں تو کل یا آنے والے کسی دن بھی آپ یہاں سے نکل کر اپنے گھر جا سکیں گے۔ اس کے لیے آپ کو صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ اگر آپ خود کو نقصان نہ پہنچائیں تو یہاں زندہ اور سلامت رہیں گے۔ جہاں تک کہانی کی بات ہے تو میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے اور آپ کی کچھ وقت گزاری کا سامان بھی کیا ہے۔ مگر اب آپ کو اپنا وقت خود کاٹنا ہوگا اور انتظار کرنا ہوگا۔ جیسے بہت سے لوگوں نے بہت سا انتظار کیا تھا۔ آپ نے ٹھیک کہا آپ کو اب جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جب آؤں گا تو آپ نے جو کہنا ہو زبانی بھی کہہ سکتے ہیں۔‘‘

میاں صاحب نے کاغذ توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور زیر لب بولے۔ ’’جھوٹ بولتا ہے کیا مجھ جیسے جھوٹے کو جھوٹ کی پہچان بھی نہیں ہے؟‘‘

☆☆☆

یہ بہت بڑا پروجیکٹ تھا، اس سنگل ٹاور پر مشتمل پروجیکٹ میں نیچے دو فلور پر مشتمل شاپنگ مال تھا جو گراؤنڈ اور میزنائن فلور پر تھا۔ اس سے اوپر دو فلور کی پارکنگ تھی اور پھر دس فلور لگژری اپارٹمنٹس کے لیے مخصوص تھے۔ عمارت عرصے سے تقریباً مکمل حالت میں کھڑی تھی مگر

بلڈرز اور متعلقہ سرکاری حکام کے مخصوص مسائل کی وجہ سے اب تک اس کے الاٹیوں کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا۔ میزنائن فلور کے اندر کا کچھ حصہ ابھی نامکمل تھا اور وہاں کام ہوتا تھا مگر باقی ساری بلڈنگ مکمل ہوگئی تھی۔ صبح کا وقت تھا کچھ دیر میں دو گاڑیاں وہاں آکر رکیں اور ان سے اس پروجیکٹ کا مالک اور دوسرے افراد اترے...... انہیں دیکھ کر مین گیٹ پر موجود چوکیدار دوڑا آیا۔ اس نے سلام کیا اور پروجیکٹ منیجر نے اس سے کہا۔

''کیا حال ہیں بابا...... آج سے پروجیکٹ پر کام شروع ہوگیا۔ کچھ دیر میں مزدور اور سامان آنے والا ہے۔''

چوکیدار خوش ہوگیا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے سرکار۔''

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' مالک نے پوچھا۔

''نہیں سرکار، مسئلہ کیا ہونا ہے۔ ہوتا تو آپ کو فوراً فون نہ کرتا۔''

منیجر کے ساتھ آنے والا سائٹ سپروائزر چوکیدار کے ساتھ پروجیکٹ کے اندر گراؤنڈ فلور پر آیا، اس نے اینٹوں سے بند ہونے والی جگہوں کے بارے میں کہا۔ ''ان سب کو آج ہی کھلوانا ہے تین دن بعد پروجیکٹ کا افتتاح ہے، اس وقت تک سب فنش ہوجائے گا۔''

''کیوں نہیں جی۔'' چوکیدار بولا۔ ''میری ضرورت ہے تو میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں ورنہ دروازے پر جاتا ہوں۔''

''ہاں تم دروازے پر جاؤ اور جب بندے آئیں تو ان کو یہاں بھیج دینا۔''

چوکیدار جو سفید بالوں اور ڈاڑھی والا بوڑھا آدمی تھا، وہ گیٹ کے ساتھ بنی اپنی چوکی میں آیا۔ وہاں اس کا سامان بھی تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے وہیں رہتا تھا۔ اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور اس کے ساتھ وہاں رکھی دو ایمرجنسی لائٹیں اٹھائیں اور وہاں سے نکل گیا۔ اس کا رخ سڑک کی طرف تھا اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ آدھے گھنٹے بعد مزدور اور دوسرے لوگ آگئے۔ سپروائزر نے انہیں سب سے پہلے بند جگہیں کھولنے کا حکم دیا اور خالی جگہوں پر لگائی ہوئی اینٹیں نکالی جانے لگیں۔ مالکان اور دوسرے لوگ اس وقت اپارٹمنٹس کا جائزہ لینے اوپر گئے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے بعد جب مزدور اندر کی دیواریں توڑ رہے تھے تو انہیں ایک دیوار میں موجود سوراخ پر سریا لگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسے توڑ رہے تھے کہ دوسری طرف ایک برہنہ آدمی دکھائی دیا، جب انہوں نے وہاں روشنی ڈالی تو وہ چیخنے چلانے لگا تھا۔

وہ روشنی سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا اور چلا رہا تھا مگر اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ بالکل وحشی ہو رہا تھا۔ یہ حیرت انگیز انکشاف تھا کہ پروجیکٹ کے اندرونی حصے میں ایک آدمی قید تھا، اس کی اطلاع فوری مالک کو دی گئی۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔ اس دوران میں اس آدمی کو باہر نکال لیا گیا تھا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ کوئی اس کی طرف جاتا تو وہ اچھل پڑتا تھا اور... بہ مشکل اسے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا اور وہاں شدید بدبو تھی کیونکہ وہ جانے کب سے وہاں قید تھا اور پورا کمرا آلائش سے بھرا ہوا تھا۔ مالک نے چوکیدار کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا کیونکہ وہی یہاں کا ذمے دار تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ غائب تھا۔ یہاں آنے جانے کا راستہ تھا جو دو دیواریں توڑ کر بنایا گیا تھا اور یہ حصہ بالکل اندر کا تھا اس لیے اگر قید آدمی چیختا تب بھی اس کی آواز باہر نہیں جاسکتی تھی۔

یہ معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہاں قید شخص اصل میں معروف بلڈر میاں عبدالغفور تھا جو سات مہینے پہلے غائب ہوا تھا اور اس کے بارے میں شبہ تھا کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کرلیا گیا ہے مگر کسی نے اس کے گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا۔ کئی مہینے گزرنے کے بعد اس کے گھر والے اس کی زندگی کی طرف سے مایوس ہوگئے تھے۔ دو دن بعد ایک معروف نجی اسپتال میں میاں صاحب نے پہلی بار ہوش و حواس میں پولیس کو اپنا بیان دیا اور انہوں نے یہ کہا کہ وہ بالکل نہیں جانتے کہ انہیں کس نے وہاں قید کیا تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔ پولیس نے چوکیدار کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس پتے پر نہیں ملا جو اس نے یہاں ملازمت کرتے وقت لکھوایا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ ایکسپائر ہوچکا تھا اور اس نے دوبارہ شناختی کارڈ بھی نہیں بنوایا تھا۔ میاں صاحب کو ذہنی اور جسمانی طور پر ٹھیک ہونے میں تقریباً ایک مہینا لگا تھا اور وہ ایک مہینے بعد پہلی بار دفتر آئے تو ملازمین نے ان کا استقبال کیا تھا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی انہوں نے اپنے بیٹوں اور کمپنی کے اہم افسران کو میٹنگ میں طلب کرلیا اور ان سے کہا۔

''جاری پروجیکٹس پر پوری طرح کام شروع کر دیا جائے۔ ہمیں بہر صورت الاٹیز کو مقررہ وقت پر قبضہ دینا ہے۔''

سودائے جنوں

چھٹا حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

ویتنامی آفیسر کوچ جن کو شاید صدمے نے پاگلوں کی طرح خود کلامیہ انداز میں بڑبڑانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی کہ ایک عام آدمی سے زیادہ اسے آبدوز کی متوقع تباہی کا اندازہ تھا۔ مگر عابد کے بشرے پر بھی اس کی متوحش بڑبڑاہٹ سن کر تشویش کے گہرے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ silos کے چیمبر سے بہ دستور نارنجی دھواں خارج ہو رہا تھا اور سب کی دہشت زدہ سی نظریں اس فرش بوس آدمی پر مرکوز تھیں جس کے منہ سے نیلے رنگ کا جھاگ خارج ہو رہا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑے فرش پر گرا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ باقی لوگ بدحواس ہو کر بھاگنے لگے جبکہ عابد نے دیکھا کہ کوچ جن اور اس کا ساتھی والٹ کے ایک کونے کی طرف لپکے تھے۔

عابد نے نائمہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عابد کو اندازہ تھا کہ اس نازک اور سنگین تر صورت حال میں فقط کوچ جن ہی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جو اسے تحفظ دے سکے۔

اس کی عقابی نظروں نے دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے جس چیمبر میں گھسے تھے اس کی پیشانی پہ "ایمرجنسی ایگزٹ لاجسٹک سیل" درج تھا اور اس کے دروازے سے قدرے سر جھکا کر ہی اندر داخل ہوا جا سکتا تھا، لہٰذا جیسے ہی کوچ جن کا ساتھی اپنے افسر کے عقب میں اندر داخل ہوا تو اس نے جلدی سے اپنے عقب میں چیمبر کا دروازہ بند کرنے کی کوشش چاہی مگر تب تک عابد بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک لات بند ہوتے دروازے کو رسید کر ڈالی۔ دروازہ اس آدمی کے منہ پہ بجا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی آواز برآمد ہوئی تھی۔ عابد اسے مزید دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا، نائمہ اس کے عقب میں تھی۔ کوچ جن کے مضروب ساتھی کو عابد نے مزید سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی ہیوی گن کا کندا اس کی پیشانی پر رسید کر دیا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ عابد نے دیکھا، سامنے فولادی ہینگروں سے "کیمیکل گیس ماسک" جھول رہے تھے۔ یہ مخصوص قسم کے تھوبڑا نما ماسک تھے جس کے .... "تھوتھنے" پر گول فلٹر لگا ہوا تھا۔ یہ ماسک کسی بھی قسم کی زہریلی گیس کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے پہنے جاتے تھے۔ کوچ جن نے رک کر خوف زدہ سی نظروں سے عابد کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں اس سے بولا۔

"د.....دیکھو.....م...... مجھے مارنے سے تم بھی نقصان میں رہو گے۔ اس آبدوز کو تباہ ہونے سے اب کوئی نہیں بچا سکتا، بہتر یہی ہے کہ اس کے تباہ ہونے سے پہلے ہم زندہ سلامت نکل جائیں اور یہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔"

عابد نے نظریں سکیڑ کر غور کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ حالات کی سنگینی اور یقینی موت سے بچنے کے لیے وہ دشمن کے ساتھ مفاہمت پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار تھے، ممکن تھا کہ بعد میں غنیم کی صورت دھوکا دہی بھی کی جا سکتی تھی، لیکن اس وقت اہم سوال اپنی اپنی زندگی بچانے کا تھا۔

"یہ موت کتنی بھیانک ہو گی۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جلدی بولو۔"

اسے سوچتا پا کر کوچ جن نے دوبارہ عابد کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔ "مجھے منظور ہے، لیکن دھوکے کی صورت میں تمہیں... بھی نہیں بخشوں گا۔" عابد نے کہا۔

"میں ایسی بھیانک موت نہیں مرنا چاہتا اور اس وقت مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔ اسے بچانے کی خاطر میں اپنے جانی دشمن سے بھی سمجھوتا کرنے کو تیار ہوں۔ کیا اب مجھے اپنا کام شروع کر دینا چاہیے؟"

اس نے آخر میں استفسار یہ کہا تو عابد برماتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شروع کر سکتے ہو، بشرطیکہ اس میں دھوکا نہ ہو۔"

کوچ جن نے اس سلسلے میں مزید تمہید دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"لو، سب سے پہلے یہ پہن لو تاکہ ہم زہریلی گیس سے بچے رہیں۔" اس نے باری باری ان کی طرف وہ گیس ماسک اچھالے، جسے کیچ کر کے عابد اور نائمہ نے اپنے چہروں پہ چڑھا لیے۔ عابد، کوچ جن کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اسے بہ دستور اپنی نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایسے فیصلہ کن اور سنگین لمحات تھے، جہاں ایک پل کی بھی غفلت، پل کے پل انہیں قعرفنا میں دھکیل دے گی۔

سب سے آخر میں کوچ جن نے ماسک پہنا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دیوار گیر آئرن کیبنٹ کھولی۔ عابد چند قدم اس کے پاس سرک آیا تاکہ اس کی حرکات و سکنات کا پوری تسلی کے ساتھ جائزہ لے سکے۔ وہ کیبنٹ دراصل ایک پینل تھا۔ وہاں کچھ سوئچ، بٹن اور چھوٹے لیور نصب تھے۔ کوچ جن چند ثانیے ان کے ساتھ کھیلتا رہا، پھر اس کی طرف مڑا اور بولا۔

"میں نے بجلی سے چلنے والی ایک کشتی کا سسٹم آن کر دیا ہے مگر ایک قباحت ہے۔"

''وہ کیا؟'' عابد نے اس کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھ کر پوچھا۔ وہ بولا۔

''ہم میں سے کسی ایک کو یہاں رکنا پڑے گا۔''

''کیوں؟''

''اس لیور کا پلگ ان سسٹم خراب ہو گیا ہے، اسے اس وقت تک دبائے رکھنا پڑے گا جب تک کہ وہ الیکٹرک پاور بوٹ اس آبدوز سے الگ نہیں ہو جاتی۔''

عابد مخمصے کا شکار نظر آنے لگا۔ بولا۔ ''کون یہاں رکنا پسند کرے گا؟ جبکہ یہ آبدوز کسی بھی وقت جہنمی قبر میں بدلنے والی ہے۔''

''ابھی تباہی پھیلنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اگرچہ اس کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن ایسا تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ ایسے موقع پر نہ تم مجھ پر بھروسا کرو گے نہ میں جبکہ مجھے الگ رکھ کر تم دونوں جلدی سے کوئی ایک فیصلہ کر لو۔'' کوچ جن نے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ عابد اور نائمہ دم بہ خود سے کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تقدیر نے ایک بار پھر ان دونوں کو ایک عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔

یہ بالکل ویسا ہی امتحان تھا جیسا حیفہ کی بندرگاہ میں ان دونوں کو پیش آ چکا تھا۔

☆☆☆

ان سب کی خوشی دیدنی تھی۔ اپنے سینئر اور بہادر ساتھی محسن کو زندہ سلامت پا کر لیلیٰ اور باقر سمیت ان کے تینوں ساتھی علی ارسلان، عبداللہ اور شفیق احمد کے حوصلے بلند ہونے لگے تھے۔ پھر جب محسن نے انہیں بازغہ کے متعلق بتایا کہ یہ سب اسی لڑکی کی دلیری اور بلند حوصلے کے رہین منت ہے تو وہ سب بازغہ سے بھی متاثر ہوئے اور اس کا تہ دل سے شکریہ بھی ادا کیا ساتھ ہی محسن نے انہیں یہ بھی بتایا کہ بازغہ اب مسلمان ہو کر ان کے ساتھ ایک مجاہدہ کے روپ میں شامل ہو چکی ہے تو وہ سب اسے پرتحسین نگاہوں سے دیکھنے لگے اور ان سب کی آنکھوں سے اس کے لیے عقیدت و احترام جھلکنے لگا۔

لیلیٰ کا اب خیال تھا کہ محسن چونکہ کافی زخمی تھا، اسی لیے اسے بیت صفانہ کے ٹھکانے پر چھوڑنا زیادہ بہتر تھا۔ وہاں اس کے خاطر خواہ علاج و معالجے کے لیے انتظامات بھی موجود تھے۔ جبکہ محسن ان کے اہم مشن میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ تو دوبارہ ابھی اور اسی وقت ان کے ساتھ ''ٹارگیٹڈ تیونائی'' آپریشن میں بھی شریک ہونا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ایک کمانڈر کی حیثیت سے لیلیٰ نے اسے اپنے ہمراہ مشن میں ساتھ لے جانے سے یکسر منع کر دیا۔ ناچار محسن کو اپنی لیڈر کے حکم پر سر جھکانا پڑا مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ محسن اور بازغہ کو بیت صفانہ کے ٹھکانے تک کون لے کر جاتا؟ بالآخر قرعہ فال لئیق کے نام نکلا۔ اسے یہ ذمے داری سونپی گئی۔ اس پر محسن نے اعتراض کرتے ہوئے لیلیٰ سے کہا۔

''عزیزی لیلیٰ! یہ مناسب نہ ہو گا کہ محض میری وجہ سے آپ کے اس اہم مشن کا ایک کمانڈو کم پڑ جائے۔ آپ لوگوں کی وجہ سے ہمارے سر پر لٹکتا ہوا فوری خطرہ ٹل چکا۔ بہتر ہو گا کہ میں اور بازغہ خود ہی بیت صفانہ کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔'' لیلیٰ نے اس سے اختلاف کیا اور سنجیدہ لہجے میں محسن سے بولی۔

''نہیں عزیزم! آپ ہمارے وطن اور اس گروپ کا سرمایہ ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے بعد صحت یابی کے آپ اس سے زیادہ اہم مشن میں ہمارے کام آ سکتے ہیں، اسی لیے ابھی آپ کا بہ خیر و سلامت بیت صفانہ پہنچنا زیادہ مناسب ہو گا۔''

اس کے بعد محسن اور بازغہ کو تھوڑا بہت زادِ راہ دے کر ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ لئیق کے ہمراہ بیت صفانہ کی جانب رخصت کر دیا اور خود اب یہ چار مجاہدوں کا ٹولہ تیونائی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب محاق کی رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو رہی تھی اس وقت یہ چاروں تیونائی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور اب انہیں یہاں پہنچ کر پہلے سے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہی سبب تھا کہ یہ چاروں ایک مقام پر رکے اور کاغذی نقشہ کھول کے بیٹھ گئے۔ لیلیٰ اور باقر نقشے پر جھکے ہوئے تھے جبکہ علی ارسلان اور عبداللہ ان کے قریب دائیں بائیں کھڑے چوکس نظروں سے گرد و پیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انفرا ریڈ دوربینوں والی بھاری گنیں تھیں، جن کی مدد سے وہ گاہے بگاہے دور و نزدیک تاریک صحرا کا جائزہ بھی لیتے تھے۔

چند منٹوں تک نقشے کا معائنہ کر چکنے کے بعد یہ آگے روانہ ہو گئے۔

اندر اسٹیٹ میں داخل ہونے کے لیے انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا، اس مقام پر ڈیوڈ اسٹار کی ایک سینٹرل کمانڈ پوسٹ تھی۔ ان کی معلومات کے مطابق یہاں ایک کیپٹن رینک کا اسرائیلی افسر اس اہم پوسٹ کی کمانڈ

کر رہا تھا۔ ڈیوڈ اسٹار سمیت پوری اسٹیٹ کا داخلی و خارجی چارج اسی پوسٹ پر انحصار کرتا تھا۔

''اس پوسٹ کو تباہ کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مکار دشمن نے اس اہم پوسٹ کو ایسے خاص ٹیکنیکل خطوط پر استوار کیا ہے کہ اس کی تباہی سے ہمارا گوریلا ٹرپ فیل ہو کر رہ جائے گا۔'' لیلیٰ نے پرنٹڈ میپ کے رول کو دوبارہ پھیلاتے ہوئے پُرفکر لہجے میں بتایا۔ باقر بہ غور نقشے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی اس کا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ابھی اس نے لیلیٰ کی مشورہ طلب گفتگو پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ علی ارسلان لیلیٰ سے بولا۔

''اسٹیٹ میں داخلے کے لیے ہمیں ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ ہم اس پوسٹ پر حملہ کریں؟ اسے چھیڑے بغیر بھی تو ہم نسبتاً کوئی اور محفوظ راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟''

اس کی بات پر لیلیٰ ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولی۔

''ہماری (زبیدہ اور محسن وغیرہ کی) پچھلی مہم کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہم نے (انہوں نے) اس پوسٹ کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اگرچہ ہمارا حملہ کامیاب تھا لیکن اس پوسٹ کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہم جیتی ہوئی بازی ہار بیٹھے تھے۔ اسی پوسٹ نے بروقت اپنا کردار نبھاتے ہوئے نئی کمک بلالی تھی اور یوں ہماری جیتی ہوئی بازی ہار میں بدل گئی تھی۔ کیونکہ یہ پوسٹ ایک طرح سے ہائی کمان اور ڈیوڈ اسٹار کے درمیان پل کا کام کرتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، اس پوسٹ کو تباہ کرنا ضروری ہے ورنہ ڈیوڈ اسٹار پر حملہ کرنے کی ہماری مہم اکارت چلی جائے گی۔''

''یقیناً!'' لیلیٰ نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

باقر جس نے ابھی تک اس گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا، پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''گویا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی ڈیوڈ اسٹار پر حملے سے زیادہ اس پوسٹ کو تباہ کرنا ازبس ضروری ہوگا لیکن ہمارا حملہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اسے تباہی کا نشان بنانے کے بجائے خاموشی سے غیر فعال کر دیا جائے۔''

''ہاں! یہ پری پلاننگ انتہائی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ انجام دینا ہوگی ہمیں، ورنہ اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ ہماری اصل مہم ''ٹارگٹ ڈیوڈ اسٹار'' کی کامیابی کا انحصار اسی پری پلان پر ہے۔'' مذکورہ کمانڈ پوسٹ کی اہمیت بتانے کے بعد لیلیٰ نے پیش قدمی کا حکم دیا۔

خاموش رات اپنے جوبن پر تھی۔ آسمان پر ستاروں کی قندیلیں روشن تھیں۔ حدنگاہ پھیلا ہوا صحرا خاموش تھا اس کی فضا خنک ہو رہی تھی۔ یہ چاروں اپنے گرد و پیش پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مطلوبہ منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ ایک حد کراس کرنے کے بعد لیلیٰ نے اپنے ساتھیوں کو ریڈیو وائرلیس استعمال کرنے پر پابندی لگادی تھی۔ وہ ایک طرح سے ریڈ زون میں داخل ہو چکے تھے اور کسی بھی قسم کے لاسلکی رابطے کے سگنل کیچ کیے جا سکتے تھے۔ اسرائیل نے سیٹلائٹ سمیت دیگر جدید ٹیکنالوجی امریکا کے تعاون سے ہی حاصل کی تھی۔ ان چاروں کفن بردوش مجاہدوں کا یہ پیدل سفر ایک مقام پر رک گیا۔ لیلیٰ نے انفرا ریڈ دوربین سے ایک ذرا گرد و پیش کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے باقر کو مخصوص اشارہ کیا۔ باقر نے فوراً مطلوبہ سمت کی طرف دیکھا۔ وہاں چند ننھے ٹیلوں کے علاوہ ایک بڑا اور دوسرا نسبتاً چھوٹا دھبا دکھائی دیا۔

''کیا ہم اپنے پری پلان ٹارگٹ کے قریب ہیں؟'' باقر نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے لیلیٰ سے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز جوش سے مترشح تھی۔

''ہاں!'' لیلیٰ کا مختصر جواب تھا۔ باقر نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور پھر یہ لوگ آگے بڑھے۔ حسن علی کی معلومات کے مطابق جس راستے پر یہ کمانڈ پوسٹ کی جانب بڑھ رہے تھے، وہاں ایک مورچا تھا۔ جس کے اندر پانچ انتہائی تربیت یافتہ اسنائپر شوٹرز تعینات تھے۔ جو دور سے ہی ٹیلی اسکوپ ویژن کے ذریعے کسی بھی مشکوک شے کو حرکت کرتے دیکھ کر خاموشی سے گولی کا نشانہ بنا ڈالتے تھے۔

مطلوبہ مقام کے قدرے قریب پہنچ کر لیلیٰ نے سب کو ریت پر لیٹ جانے کا حکم دیا اور اب انہوں نے آگے کا اختتامی سفر جو کسی بھی وقت ان کے لیے ''آخری سفر'' بھی ثابت ہو سکتا تھا، اسی طرح لیٹ کر ہی سینے اور کہنیوں کے بل طے کرنا تھا۔ آگے لیلیٰ تھی اس کے بالکل برابر میں علی ارسلان تھا۔ لیلیٰ کے پیچھے عبداللہ اور اس کے برابر میں باقر تھا۔ یہ چاروں اسی طرح دو دو کی صورت میں آگے پیچھے ایک ہی ڈائریکشن میں رینگتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔

ان کے پاس صرف دو ٹیلی اسکوپک گنیں تھیں جن پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ رینگتے ہوئے آگے بڑھنے میں تھکن کا احساس نسبتاً زیادہ ہوتا تھا اور منزل بھی کافی دوری پر معلوم ہوتی تھی مگر یہ ایک صبر آزما عمل ہوتا تھا اور اس کے

نتائج بھی خاطر خواہ نکلنے کی امید ہوتی تھی۔ پھر یہاں تو معاملہ اسنائپرز شوٹنگ کا تھا۔ جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت خاموش گولی ان میں سے کسی ایک کو یا پھر تلے اوپر چاروں کو چاٹ سکتی تھی۔

لیلیٰ اپنے ساتھیوں کو بڑی احتیاط سے آگے لیے بڑھ رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ تھوڑی دیر کو رک بھی جاتی تھی اور پھر پیش قدمی شروع کر دیتی۔

وہ اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کے کافی حد تک نزدیک پہنچے تو لیلیٰ نے یہاں کچھ دیر توقف کیا۔ اس نے پہلے ہلکی سرگوشی میں تینوں کو اپنی جگہ ساکت رہنے کا حکم دیا اور خود دوربین آنکھوں سے لگائی اور جیسے ہی اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کمانڈ پوسٹ کے مورچے سے اس نے ایک شعلہ سا لپکتا دیکھا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے خود کو دائیں جانب سرکا دیا۔

ٹھیک اسی مقام پر ''زٹ'' کی سنسناتی ہوئی آواز ابھری جدھر محض کچھ سیکنڈ پہلے وہ موجود تھی۔ دوربین نکالنے کی اضافی حرکت لیلیٰ کو مہنگی پڑنے والی تھی۔ اسی خدشے کے پیش نظر اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کو ''بے حس و حرکت'' رہنے کی تلقین کی تھی اور صرف خود یہ رسک لیا تھا۔ سب کے چہروں پہ یکلخت سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کے دل سینوں میں تیزی سے دھڑکنے لگے تھے، کچھ پتا نہیں تھا کہ دوسری گولی کب اور کسے چاٹ جاتی؟

''لیلیٰ! تم ٹھیک ہو؟'' باقر نے ہولے سے سرگوشی کی۔ اس کی آواز میں تشویش ہلکورے لے رہی تھی۔

''ششش......'' جواباً لیلیٰ نے اسے خاموش اور سب کو اپنی جگہ سپاٹ رہنے کی تلقین کی تھی اور خود اس نے حرکت کے دوران ہی اپنی دوربار ٹیلی اسکوپ گن (اسنائپر) سیدھی کر لی تھی۔ اب اس کی ایک آنکھ ٹیلی اسکوپ کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جس پر انفرا ریڈ لینس نصب تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہلکی سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو ذرا تسلی بھی دے ڈالی۔

''دشمن نے صرف حرکت کرتی شے پر گولی چلائی ہے۔ ہماری مزید ذرا سی بھی حرکت ان کے اس مغالطے کو درست ثابت کر سکتی ہے کہ اس نے دور صحرا میں کسی رینگتے ہوئے ... جانور کو نہیں، بلکہ انسان کو دیکھا ہے۔''

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگلا فائر نہیں ہوگا؟'' باقر نے پوچھ لیا۔

''میں یہی دیکھنے کے لیے انہیں نظروں میں لیے ہوئے ہوں۔'' لیلیٰ نے جواب دیا۔

''مجھے چار سر دکھائی دے رہے ہیں۔ دشمن کی نظریں اسی مقام پر ثبت ہیں۔''

تھوڑا وقت مزید گزر گیا۔ مورچا بند شاید مطمئن ہو گئے تھے۔ لیلیٰ نے پھر انہیں دھیرے دھیرے پیش قدمی کا حکم دیا۔ پھر ایک مطلوبہ مقام پر لیلیٰ نے باقر کو بھی اپنی ٹیلی اسکوپ سیدھی کرنے کا کہہ ڈالا اور خود بھی اپنی آنکھ لگا دی۔ تب معاً ہی اسے باقر کی جوش سے تمتماتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

''لیلیٰ! مجھے دو افراد ایک جیپ میں آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، مجھے اجازت دو میں انہیں موت کے گھاٹ......''

''نہیں!'' لیلیٰ نے اسے منع کر دیا۔ ''انہیں آنے دو، وہ یقیناً اسی طرف آئیں گے۔ وہ شاید اپنا کوئی شبہ دور کرنا چاہتے ہوں گے۔''

یہ لوگ جس مقام پر پہنچ کر رکے تھے، اس سے کوئی چند فرلانگ کے فاصلے پر وہ مورچا تھا۔ گویا یہ چاروں اس وقت موت کے دہانے پر تھے۔ کسی بھی وقت ان پر فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ یہاں اسرائیلیوں نے اریب قریب کی خودرو جھاڑیاں کاٹ ڈالی تھیں تاکہ قریب آتا کوئی دشمن ان کی آڑ نہ لے سکے، لیکن وہ صحرا میں تقریباً روز بننے والے ان چھوٹے بڑے ٹیلوں اور ناہموار سطح کو برابر کرنے میں بہرحال ناکام ہی رہے تھے، جن کی آڑ اب ان چاروں کو میسر آ چکی تھی اور شاید اسی ''خرابی'' نے انہیں اپنی کچھار سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، باقر لیلیٰ کی چال سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے اسے ہوشیار کرنے کی غرض سے دھیمی آواز میں کہا۔

''لیلیٰ! میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو، مگر یہ مت بھلا دینا کہ ان دونوں کو ہم اتنی آسانی سے شکار کر لیں گے، ان دونوں پر مورچے میں بیٹھے ہوئے ان کے باقی ساتھی نظر ضرور رکھے ہوئے ہوں گے۔''

''گڈ! تم نے بالکل صحیح سوچا ہے۔'' لیلیٰ نے توصیفی لہجے میں کہا اور آگے بولی۔

''میرے ذہن میں بھی یہ بات ہے۔ انہیں آنے دو۔ جب یہ قریب آ جائیں گے تو علی اور عبداللہ ان دونوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے، جبکہ میں اور تم ان کے باقی مورچا بند ساتھیوں کو ہٹ کریں گے۔'' پھر وہ ہلکی سرگوشی میں علی ارسلان سے مخاطب ہو کے بولی۔ ''تم سن رہے ہو نا علی؟''

''جی ہاں، عزیزی لیلیٰ! میں سمجھ گیا۔'' وہ جواباً جوش سے تھرائی ہوئی آواز میں بولا تو لیلیٰ نے اپنے منصوبے کی

وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا۔

''مگر ایک بات دھیان میں رہے کہ تم دونوں نے صرف اس صورت میں ہی فائرنگ کرنا ہوگی، جب ہمارے نشانے چونک جائیں، کیونکہ ٹیلی اسکوپ گن سے قریب آتے ہوئے دشمن پہ اس قدر جلدی دوبارہ گولی نہیں چلائی جاسکتی تب تک وہ سنبھل جاتے ہیں، تب تم دونوں اپنی گنوں سے ان پر برسٹ فائر کردینا۔'' علی اور عبداللہ نے اثبات میں اپنے سر ہلا دیے۔

پھر انہوں نے تیزی سے مگر نہایت محتاط انداز میں اپنی پوزیشنیں بدل ڈالیں۔ چند ثانیے پھر اپنی جگہ یہ بے حس وحرکت رہے، کچھ نہ ہوا تو لیلیٰ نے باقر کو الرٹ رہنے کا حکم دے ڈالا اور پھر یہ چاروں دم سادھے ان دونوں دشمنوں کے ذرا قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

اب ان کی پوزیشن اس طرح تھی کہ لیلیٰ اور باقر جنہوں نے بروقت مورچا بند تین دشمنوں کو یکے بعد دیگرے خاموشی سے نشانہ بنانا تھا، ذرا پیچھے ہٹ گئے، جبکہ علی اور عبداللہ آگے کی طرف آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ لیلیٰ اور باقر کا نشانہ چوکنے کی صورت میں انہوں نے جیپ میں ان کی طرف آتے ہوئے ان دو دشمنوں کو مار گرانا تھا، جب وہ ان کی فائرنگ رینج میں... آجاتے۔ وقت اب گویا بھاری سل کی طرح سرکنے لگا تھا۔ لیلیٰ اور باقر نے اپنی اپنی گن کی ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگا کر مورچے کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ ان میں طے تھا کہ جیسے ہی انہیں تینوں شکار دکھائی دیں گے یہ بیک وقت دو کو نشانہ بنانے کے بعد تیسرے کو بھی اڑا دیں گے۔ اس دوران انہوں نے جیپ کو بھی نظروں میں لیا ہوا تھا۔ جس میں دو اسرائیلی سوار، اسی طرف ہی چلے آرہے تھے اور منصوبے کے مطابق علی ارسلان اور عبداللہ نے انہیں اپنی رائفلوں سے نشانہ بنانا تھا۔

معاً لیلیٰ کو قریب، باقر کی سرگوشی سنائی دی۔

''مورچے میں دو شکار تو بہ دستور دکھائی دے رہے ہیں لیکن تیسرا نہیں نظر آرہا۔ جبکہ جیپ قریب آتی جارہی ہے، گولی چلانے میں زیادہ انتظار نہیں کیا جاسکتا۔''

''مورچے والے ہمارے دونوں شکار، اپنے جیپ والے دو ساتھیوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں، تیسرا شاید کسی اور جگہ مصروف ہو۔'' لیلیٰ جواباً بولی۔ ''گولی چلانا پڑے گی، ریڈی۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔ شوٹ۔''

دونوں کی رائفلوں نے بیک وقت جھٹکا لیا۔ ان کی آنکھیں ہنوز ٹیلی اسکوپ لینس پر تھیں، تب ہی انہوں نے مورچابند ان دونوں دشمنوں کے سر غائب ہوتے دیکھے، ان کا نشانہ ٹھیک لگا تھا۔

''باقر! تم اسی پوزیشن میں رہو گے، اور ان کے مورچا بند تیسرے ساتھی کو نظر آنے کی صورت میں ہٹ کرو گے۔ میں اب ذرا ان جیپ والوں کی خبر لیتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے لیلیٰ نے اپنی ٹیلی اسکوپ کے اینگل سیکشن میں، تیزی سے ان کی طرف آتی ہوئی جیپ کو زوم کیا۔ اس کی حتی الامکان سعی یہی تھی کہ علی اور عبداللہ کو فائرنگ کا موقع نہ ملے اور یہ معاملہ وہ اپنی اسنائپر سے ہی ''خاموشی'' کے ساتھ نمٹالے۔ بصورت دیگر رائفلوں کی گھن گرج ان کے گوریلا مشن کو مشکل میں ڈال سکتی تھی۔

جیپ کی ونڈ اسکرین سے لیلیٰ کو وہ دونوں اگلی نشستوں میں براجمان نظر آگئے۔ لیلیٰ نے پل کے پل فیصلہ کیا کہ پہلے ڈرائیور کو نشانہ بنانے کے بجائے ساتھ بیٹھے ہوئے اس کے ساتھی کو ہٹ کرے اور پھر اس نے یہی کیا۔ لبلبی پر اس کی انگلی ذرا تھرکی اور پھر اس نے جیپ کی ونڈ اسکرین پر مکڑی جیسا جال بنتے اور جیپ کو لہراتے ہوئے محسوس کیا۔ اپنے برابر میں بیٹھے ساتھی کا ہولناک حشر دیکھ کر ڈرائیور کا ہاتھ یقیناً اسٹیئرنگ پر لرزا تھا۔ ونڈ اسکرین ڈبل فریم والی تھی۔ تربیت یافتہ ہونے کے باوصف، ڈرائیور کے لیے یہ سب غیر متوقع ہی تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب تک وہ سنبھلتا، لیلیٰ اسے دوسری گولی داغ چکی تھی۔ اب لیلیٰ نے اپنی آنکھ ٹیلی اسکوپ سے ہٹائی، چاروں نے دیکھا، جیپ کسی شرابی کی طرح ڈولتی ہوئی الٹ گئی اور ریت پر خاصی دور تک قلابازیاں کھاتی، ایک مقام پر دھنس گئی۔ اس کے چاروں ٹائر گھوم رہے تھے۔

''آگے بڑھو! جلدی۔'' لیلیٰ کی جوش میں ڈوبی آواز ابھری تھی، اور پھر یہ چاروں مورچے کی طرف لپکے۔ تھوڑی دیر بعد ہی کمانڈ پوسٹ کے اس اہم مورچے پر ان کا قبضہ ہوچکا تھا، مگر ہنوز پانچواں دشمن ان کے لیے معما بنا ہوا تھا وہ ابھی تک انہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ جبکہ حسن علی کی معلومات کے مطابق کمانڈ پوسٹ کے اس اہم مورچے پر پانچ اسرائیلی اسنائپر شوٹرز تعینات تھے۔

☆☆☆

جنرل آئزک فرناش کی جنون میں، اپنے ہی اعلیٰ اسرائیلی افسروں کو بے دریغ ہلاک کر ڈالنے کی شکایت لے کر جب موساد کے بارق شمعون نے ہگانہ کے آئزر مین

بیری سے ملاقات کی ٹھانی تو اسے خود بھی یہ حقیقت معلوم نہیں تھی کہ بیری کا بھی یہی وتیرہ تھا۔ اپنے کاز کے سلسلے میں بیری بھی اپنے لوگوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔

بہر طور، بارق شمعون اپنے ذاتی فور سیٹر طیارے سیسنا میں لیوودم کی طرف روانہ ہو گیا، جیسا کہ مذکور ہوا ہگانہ کے چیف آئزر مین بیری کی پر تعیش اور محل نما رہائش گاہ یروشلم کے جنوب میں لیوودم نام کی پہاڑیوں میں واقع تھی۔ یہ رہائش گاہ "وائٹ کیسل" کے نام سے موسوم تھی۔

وائٹ کیسل ایک قدیم وجدید فن تعمیر کا شاہکار ہی نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ براؤن تھا اور یہ نسبتاً سطح مرتفع پر واقع تھی اور اس کے گرد و پیش اور وقوع کو بڑی بڑی ہیوی مشینوں کے ذریعے خاصے بڑے رقبے تک، بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ سطح مستوی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ نیچے پام، اسٹرابیری، خوش رنگ پھولوں اور بانس کا گھنا جنگل نظر آتا تھا۔

"وائٹ کیسل" کی عمارت خاصے بڑے رقبۂ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔

یہ واقعی ایک کیسل کی شکل کی ہی عمارت تھی جس کے چھ ٹاور تھے۔ دو ٹاور دیوہیکل مین گیٹ کے ذرا پیچھے دائیں بائیں بنے ہوئے تھے اور گیٹ کے دو موٹے گول ستونوں کے اوپر چنگھاڑتے ہوئے درندوں کے پتھریلے مجسمے تھے جبکہ گیٹ کی پیشانی پر بڑا سا قدیم طرز کا گھڑیال بھی نصب تھا۔ باقی دو ٹاور، اوپر عمارت کے وسط میں اور آخری ایک ٹاور عقب میں ایستادہ تھا، جو نسبتاً طویل بھی تھا۔

کیسل کے اطراف میں گھاس کا میدان اور خوب صورت باغ تھا اور بلند و بالا، تراشیدہ تنوں والے درخت تھے سامنے ایک ایسی کھلی چوڑی سڑک تھی جو بیک وقت چھوٹے سے رن وے کا بھی منظر پیش کرتی تھی۔

یہ جگہ بادی النظر میں کسی راجے مہاراجے کی تاریخی عشرت گاہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ایک طرف دو بھاری گاڑیوں کے علاوہ نئے ماڈلز کی تین کاریں سفید رنگ کی آہنی ریلنگ کے عقب میں کھڑی تھیں۔ انہی میں ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی مرسیڈیز بھی شامل تھی۔ کچھ مخصوص چست وردیوں میں مسلح افراد چوکس کھڑے نظر آتے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ کیسل کے گرد پانچ فٹ بلند چار دیواری بھی تھی اور اس کے اندر کے مناظر کی الگ ہی "شان" تھی۔ احاطے کی دیوار کے گیٹ سے گرینائٹ کی ایک پختہ روش نکل کر سامنے رن وے جیسی سڑک سے جا ملتی تھی اور یہی سڑک تقریباً چار کلومیٹر کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نیچے جنگل میں اترتی دکھائی دیتی تھی۔

بارق شمعون کا طیارہ اسی رن وے پر اترا تھا۔ پائلٹ کو اندر موجود رہنے کا حکم دینے کے بعد جب وہ مختصر قدچوں والی خودکار سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترا تو اسی وقت ایک ٹو سیٹر فور وہیل وہاں آن پہنچی۔ یہ چھوٹی گاڑی ایسی ہی تھی جو عموماً گالف کے میدان میں نظر آتی ہے۔ اس میں صرف ڈرائیور اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا تھا۔ بارق شمعون جلدی سے اس کے برابر میں خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

آنے سے پہلے بارق نے آئزر مین کو اطلاع کر دی تھی۔ وہ یہاں اس سے پہلے بھی دو تین بار آ چکا تھا۔ ماسوائے خفیہ ایجنسی کے چند اعلیٰ اسرائیلی افسران کے، کسی کو آئزر مین بیری کی اس ذاتی رہائش پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح منتخب اداروں کے صرف صدر اور وزیر اعظم ہی یہاں آ سکتے تھے، یا پھر۔۔۔ وہ جو اس کے "خاص" مہمان ہوتے تھے مگر یہ سب ملاقاتیں لازماً پہلے سے طے شدہ ہوتی تھیں، جب تک آئزر مین بیری سے ملاقات کے لیے اس سے ٹیلیفونک رابطہ نہیں ہو پاتا، کوئی ادھر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خواہ وہ "گریٹا برمن" ہی کیوں نہ ہوتا۔ فقط اسرائیلی صدر اس پابندی سے مستثنیٰ تھا۔

ٹو سیٹر احاطے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو سامنے دھاک بٹھاتی وائٹ کیسل کی عظیم الشان عمارت مزید واضح ہو گئی۔ یہاں بھی چند مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔

وقت دن کا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا، کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی تھیں اور نیچے جنگل میں عجیب سی خاموشی طاری تھی۔

سامنے بڑا سا بیضوی سوئمنگ پول تھا جس کے شفاف پانی سے ہلکے سبز رنگ کا فرش صاف نظر آتا تھا۔ قریب ایک بڑی سی چھتری تلے تین فولڈنگ چیئرز اور ایک اسی طرح کی میز بچھی ہوئی تھی جبکہ پول کے بالکل کنارے ذرا فاصلے سے دو آرام دہ لاؤنج چیئرز بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں دو سیمیں بدن حسینائیں مختصر ترین بکنی لباس میں نیم دراز تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سن گلاسز تھے، ایک حسینہ اپنے مرمریں نیم عریاں جسم پر آفٹر سن لوشن کا مساج کر رہی تھی۔ ایک چھچھلتی سی نگاہ بارق پر ڈالی تھی، بارق آگے بڑھا تو اسے پول کے شفاف پانی میں ایک تیرتے ہوئے "فلوٹنگ ایزی لاؤنج" میں آئزر مین بیری (جونیئر) صرف نیکر میں نیم دراز دکھائی دیا۔ اس کے گرد سینے تک شفاف پانی میں کھڑی

چار نیم عریاں حسینائیں اسے لبھانے میں مصروف تھیں۔ ایک نے شراب کی بڑی سی بوتل تھام رکھی تھی۔

کچھ کے ہاتھ میں ادھ بھرے پیگ بھی تھے، جبکہ آئزر مین کے ہاتھ میں بھی ایک بلوریں پیگ جگمگا رہا تھا اور اس کے ساتھ نیم دراز ایک سانولے رنگ کی مگر پُرکشش حسینہ بھی لیٹی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ میں بھی شراب کی ادھ بھری بوتل تھی۔ وہ آئزر مین کے ساتھ بوس و کنار میں مصروف تھی۔

بارق ہولے سے کھنکھارا تھا۔ ہنسی کی پھلجھڑی سی چھوٹی اور آئزر مین اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنے تیرتے ہوئے فلوٹنگ کے گرد کھڑی طرح دار حسیناؤں کو اشارہ کیا اور وہ یکدم دائیں بائیں ہو کر جل پریوں کی طرح پانی میں تیرتی ہوئی دور چلی گئیں۔ جبکہ وہ سانولی حسینہ ہنوز اس کے ساتھ چپکی رہی، اس کے گداز ہونٹوں پر دلنشیں مسکراہٹ تھی۔

”ٹیسی ڈارلنگ! جسٹ اے منٹ۔“ آئزر مین نے بڑی محبت سے اس سے کہا۔ وہ کچھ زیادہ منہ چڑھی تھی۔ تاہم اپنے آتشیں لبوں کا ایک آخری بوسہ اسے دے کر اس نے ”فلوٹنگ“ سے بڑے قیامت خیز انداز میں لڑھکنی کھائی اور شفاف پانی میں جل پری کی تیرتی ہوئی دور نکل گئی۔

”بیٹھو! میں آتا ہوں۔“ آئزر مین نے بارق سے کہا اور وہ واپس پلٹ کر چھتری تلے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گیا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد آئزر مین بھی وہیں آ کر اس کے سامنے والی کرسی سنبھال کے بیٹھ گیا۔ ایک سنہری بالوں والی دلکش لڑکی اپنے بھیگے بھیگے سیم تن جسم کو ہوش ربا بل دیتی، وہاں آن دھمکی۔ اس نے ایک ٹرے تھام رکھی تھی، جس پر دو خالی پیگ اور ایک وائن کی بوتل تھی۔ وہ ان کے درمیان بچھی میز پر رکھنے کے بعد اسی طرح قیامت خیز چال کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ آئزر مین بیری نے بہ غور بارق شمعون کے سپاٹ چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک بھنچی ہوئی ہنکاری خارج کر کے بولا۔

”جنرل آئزک فرناش کی لگام آخر کس کے ہاتھ میں ہے؟“

”اوہ!“ آئزر مین نے کچھ سمجھنے والے انداز میں اپنی بھویں اچکائیں۔ پھر بولا۔ ”ایسا کیا کر دیا اس نے؟“

بارق شمعون نے دانستہ پہلے جنرل فرناش کی ناکامیوں کے قصوں سے آغاز کیا اور بولا۔ ”تیونائی حملے اور اہم فلسطینی مجاہدوں کے زندہ بچ کے نکل جانے پر وہ شاید اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے، ذرا ذرا سی غلطی پر وہ ہمارے اہم افسروں کو بلا دریغ گولی مار دیتا ہے۔ اپنی ناکامیوں کا بدلہ اسے اپنے ہی ساتھیوں کے بجائے دشمنوں سے لینا چاہیے۔“

اس کی بات سن کر آئزر مین بیری کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بڑی سنگ دلانہ سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ اب پوری طرح سے بارق شمعون کے آنے اور اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ اسی وقت ٹیسی نام کی وہ متناسب الاعضا جسم کی مالک ”بلیک کوئن“ ٹائپ دوشیزہ، مختصر ترین لباس میں ملبوس، پنسل ہیل سینڈل پہنے تھرکتی لچکتی، ان کے قریب آ گئی۔ بارق اس وقت اپنے اور آئزر مین کے درمیان کسی تیسرے فرد کی موجودگی نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ ٹیسی نے دونوں کے لیے ایک ایک پیگ بنایا، انہیں تھمایا اور اسی طرح تھرکتی لچکتی خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ بارق نے بے اختیار گہری سانس لی۔ وہ اب آئزر مین کے بولنے کا منتظر تھا اور اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہسکی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

”جنرل فرناش کی ناکامیاں اپنی جگہ لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

بالآخر آئزر مین نے کہا۔ ”جنگ کی بساط میں کون سا مہرہ کب ناکارہ بنتا ہے، خود میں بھی اسے ہٹا دینے کا قائل ہوں، ورنہ وہ دیگر کارآمد مہروں کے لیے رکاوٹ کا باعث بننے لگتا ہے۔ جنرل آئزک فرناش میرے اسی مقولے پر عمل کرتا ہے۔ میرے اس کیسل میں ایک تہ خانہ ہے، یعنی ایک پورا سلاٹر ہاؤس ہے، اس میں تمہیں دشمنوں سے زیادہ اپنوں کی نشانِ عبرت بنی لاشیں نظر آئیں گی۔“

پھر اس نے ایک نظر قلعہ نما عمارت کو دیکھا اور فوراً بارق شمعون کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔ ”بارق! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یہاں اپنی اس قلعہ نما عمارت کو عشرت گاہ بنائے بیٹھا ہوں؟“

”نہیں، یور ہائنس! ایسی بات تو نہیں۔ پوری یہودی قوم آپ پر فخر کرتی ہے۔“ بارق شمعون فوراً مؤدبانہ انداز میں کہا مگر آئزر مین نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی اور آگے بولا۔

”یہ وائٹ کیسل ہے۔ یہ صرف آئزر مین بیری جونیئر کی رہائش گاہ ہی نہیں بلکہ اس کا دفتر بھی ہے اور ہیڈ کوارٹر بھی۔ مجھے یہاں سے نہ صرف پورے اسرائیل کے چپے چپے کی خبر

ملتی ہے بلکہ امریکا سمیت ہمارے ٹارگٹڈ ممالک میں اس وقت کون کہاں اور کس ٹیبل پر کھانا کھا رہا ہے اس کی بھی۔"

"اس میں کوئی شک نہیں، یور ہائنس!" بارق کا لہجہ ایکا ایکی نہ صرف مؤدبانہ ہو گیا تھا بلکہ وہ اپنے اندر اب ایک نامعلوم سے خوف کا ہلکا ہلکا ارتعاش بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اب وہ اندر ہی اندر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اس نے یہاں آ کر غلطی کی تھی۔

"وائٹ کیسل کے بطن سے تمہاری موساد جیسی نہ جانے کتنی ایجنسیاں یہاں ترتیب پاتی ہیں اور مکڑی کے جال کی طرح ہمارے وسیع تر مفادات کے لیے پوری دنیا میں پھیلا دی جاتی ہیں۔"

"تو ذاؤٹ، سر!" بارق کو اپنی پیشانی پر ننھی ننھی بوندوں کا احساس ہونے لگا، اس دوران اس نے وسکی کے چند گھونٹ بھر لیے۔

"بارق! تم مجھ سے جو کہنے آئے تھے وہ میں سن چکا۔ لنچ کرو گے میرے ساتھ؟" آئزر مین نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا، بارق جانتا تھا کہ آئزر مین مختصر اور مدلل بات کرنے کا عادی تھا، لہٰذا اس کے یہ کہنے کا صاف مطلب تھا کہ وہ اب یہاں سے دفع ہو جائے۔

"میری یہ خوش قسمتی ہوتی لیکن میں آپ کا قیمتی وقت مزید برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اب اجازت لوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بارق شمعون کے جانے کے تھوڑی دیر بعد آئزر مین "وائٹ کیسل" میں اپنے کمرائے خاص کے اندر تنہا موجود تھا۔ یہ کمرائے خاصا بڑا تھا۔ یہاں سے وہ اپنی ہگانہ آرمی اور اس کی دو کاؤنٹر انٹیلی جنس شن بیتھ اور الیا بیتھ کو ہدایات جاری کیا کرتا تھا۔

ایک بڑی سی میز پر سپر کمپیوٹر اور دیگر کمیونیکیشن کے آلات نصب تھے۔ ایک ایسے ہی آلے پر اس نے امریکی خارجہ میں گھس بیٹھی اپنی کاؤنٹر انٹیلی جنس الیا بیتھ کے زونل چیف فوہاگ سے رابطہ کیا۔

اس نے اسے خاطر خواہ رپورٹ دیتے ہوئے بتایا۔

"امریکا اور اس کے اتحادی عراق پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر میں واشنگٹن اور وائٹ ہاؤس کو آپ کی ڈکٹیشن دے چکا ہوں کہ پہلے عراق میں بغاوت کا بیج پھوٹنے دیا جائے۔ اس کے بعد کام اور آسان ہو جائے گا۔"

"گڈ!" آئزر مین بولا۔ "لیکن خیال رہے سی آئی اے کے ساتھ جن عراقی جرنیلوں نے وفاداری نبھائی ہے انہیں نکالنے کا بندوبست پہلے ہونا چاہیے، یہ آگے بھی ہمارے کام آتے رہیں گے، جبکہ صدر کے وفاداروں کو چن چن کے امریکی افواج اور ان تنگ آئے ہوئے باغیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتروا دو اور ان باغیوں میں اپنے آدمی بھی ہونے چاہئیں۔"

فوہاگ نے اثبات میں جواب دیا تو آئزر مین نے لمحہ بھر کے خاموش وقفے کے بعد دوبارہ تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"آپریشن ڈارک اسالٹ کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ بھی خاطر خواہ انداز میں جاری ہے۔ اس سلسلے میں فرانس اور ڈنمارک کے کچھ اخباری مالکان کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔"

"گڈ! زیادہ سے زیادہ اس اہم مشن پر توجہ رکھی جائے۔" آئزر مین خبیثانہ لہجے میں بولا۔ "بلکہ کوشش کرو، جو ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اسے وہاں کی حکومت کی طرف سے ایوارڈ بھی دلوایا جائے۔ یہ مسلمانوں کے دینی جذبات سے کھیلنے پر سہاگہ والا کام ہو گا۔ اپنی افرادی قوتوں کو بھی بروئے کار لاؤ، بالخصوص عراق اور پاکستان میں۔ اس سے تمام مسلم ممالک اندرونی انتشار اور اشتعال کا شکار ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ پوری دنیا اس کی زد میں آئے گی۔" آئزر مین کی بکواس سن کر دوسری طرف سے فوہاگ نے اثبات میں ہی جواب دیا تھا۔

اس سے بات کرنے کے کچھ ہی سیکنڈوں بعد شن بیتھ کی مادام میڈوسا اس سے مؤدبانہ انداز میں مخاطب تھی۔ اس نے اپنی اب تک کی ساری رپورٹ دے چکنے کے بعد آخر میں ایک انکشاف بھی کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا "ٹارگٹڈ پرسن" ڈاکٹر کمال اپنے دو فیلوز، حماد اندال اور جیکی کے ساتھ عراق گیا تھا اور وہاں وہ پھنس گئے ہیں۔

یہ اطلاع آئزر مین کے لیے خاصی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی تھی۔ اس اہم اطلاع پر وہ کئی ثانیے کے لیے اپنے پتلے پتلے بدہیئت ہونٹ بھینچے، پرسوچ انداز میں بیٹھا رہ گیا، جبکہ دوسری جانب مادام میڈوسا خاموشی کے ساتھ اس کے بولنے کی منتظر رہی، اس کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اسے درمیان میں ٹوکنے یا کچھ بولنے کی کوشش کرتی، چنانچہ جب آئزر مین کی دوسری طرف سے آواز ابھری تو وہ اسی طرح الرٹ تھی۔

"یہ بہت اہم خبر ہے، لیکن اس میں تشویش کا بھی

ایک پہلو ہے۔ خیر! میں دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی بھاری بھرکم ...... کرسی سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا... کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ یہاں سے وہ وائٹ کیسل سے باہر اور نیچے ترائیوں کے دلکش جنگلاتی اور پہاڑی مناظر کا نظارہ کرتا رہا، پھر پلٹ کر کمرے کے دروازے سے باہر نکلا اور ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔

یہ کمرا بھی چھوٹا نہ تھا مگر یہ ذرا مستطیل نما تھا مگر سوائے گنتی کے فرنیچر کے اور کچھ نہ تھا، البتہ دائیں بائیں دو شیشے کے دروازے نظر آتے تھے۔ یہ دروازے نہیں بلکہ لفٹ کے خلا تھے جو کیپسول کی شکل کے تھے۔ دونوں کا کام ایک ہی تھا، یعنی اوپر نیچے لے جانا۔ وہ ایک لفٹ میں داخل ہو گیا اس کے ذریعے وہ نیچے گراؤنڈ فلور اور پھر وہاں سے انڈر گراؤنڈ اتر گیا۔

لفٹ کا دروازہ ایک تہ خانے نما کمرے میں ہی کھلا تھا۔ کمرا صاف ستھرا اور خاصا بڑا تھا۔ یہاں دیواروں پہ بڑی بڑی تصاویریں آویزاں تھیں۔ ان میں کچھ تو آئزر مین کے پرکھوں کی تھیں اور ایک تصویر تو اس کے دادا آئزر مین بیری کی تھی جبکہ باقی تصویریں، کچھ عجیب ہی معلوم ہوتی تھیں جن کا تعلق جنگ عظیم کے دور سے تھا، جس میں یہودیوں کی خاصی تعداد کو ہٹلر کے سامنے دوزانو کھڑا دکھایا گیا تھا، دوسری تصویر میں سارے یہودی قیدی برہنہ دکھائے گئے تھے جبکہ تیسری تصویر میں ان سارے یہودی قیدیوں کو ایک بڑے سے سیلن زدہ ہال میں کچھ اس طرح دکھایا گیا تھا کہ ان پر کوئی زہریلی گیس چھوڑی گئی تھی اور انہیں ایک دوسرے کے اوپر گرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اگلی تصویر میں ان سب کی لاشیں کھردرے فرش پر آڑی ترچھی گری پڑی تھیں۔ آئزر مین کچھ دیر تک ان تصاویر کو سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں گرینڈ پا نے کیوں ان تصویروں کو سنبھالنے کی وصیت کر رکھی تھی۔" اس کے بعد وہ سر جھٹک کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔

یہاں دیواروں پر دو بڑی اسکرینیں نصب تھیں، ان کے سامنے الگ الگ دو بڑی میزیں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر بھی مختلف چینل اور اسی قسم کے کمیونیکیشن کے آلات نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک میز کے سامنے والی بھاری بھرکم کرسی پر براجمان ہو گیا اور ایک بٹن دبا کر اس نے ایک اسکرین روشن کر دی۔ اس میں موساد اور ڈیوڈ اسٹار کے علاوہ دیگر اسرائیلی خفیہ ایجنسیز کے ہیڈ کوارٹرز کی سی سی فوٹیج نظر آنے لگیں، گویا وہ یہاں آرام سے بیٹھا ان کی... کارکردگی اور ہونے والی اہم خفیہ میٹنگز کو سیٹلائٹ اور سپر کمپیوٹر کی مدد سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سب مناظر بھی جو وہاں پیش آ چکے تھے اور وہ بھی جو گزر چکے تھے۔ اور اس کی اس "حرکت" کا کسی کو علم نہ تھا۔ ان سب کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے تھوڑی دیر بعد وہ ایک لاسلکی رابطے کے ذریعے ہاٹ لائن پر امریکی صدر کو تیل پیدا کرنے والے دنیا کے دوسرے نمبر پر اسلامی ملک عراق پر قبضے کی پیشگی مبارکباد دے رہا تھا۔

☆☆☆

پالرموکی بندرگاہ پر اترنے سے ذرا ہی دیر پہلے زبیدہ اپنی مختصر تیاری کے بعد چک سے جا ملی تھی۔ چک، زبیدہ کو یوں کچے دھاگے سے بندھا چلا آتا دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وعدے کے مطابق دونوں نے اکٹھے ناشتا کیا تھا۔ اس کے بعد اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ پالرموکی بندرگاہ اتر گئے۔ زبیدہ کے ساتھی منصوبے کے مطابق اسے واچ کر رہے تھے اور یہی کچھ چک کا ساتھی روجر بھی کر رہا تھا۔ ایک مقررہ وقت پر اور چک کی ہدایت کے مطابق، روجر نے چک اور ڈیبی (زبیدہ) کو جوائن کرنا تھا مگر ابھی اسے چک کی جانب سے ایسا کوئی گرین سگنل نہیں ملا تھا۔

ادھر چک کے لیے ایک اہم مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ایک طرف زبیدہ کو مجبوراً "کوانڈو مذاکرات" کے سلسلے میں اعتماد میں لیا تھا اور دوسری طرف اسے اپنے ساتھی روجر سے متعلق بھی آگاہ کرتا تھا، لہٰذا ایک ہوٹل میں دونوں نے قیام کیا۔

گزشتہ شب چک اور روجر نے ڈیبی (زبیدہ) کو "کوانڈو مذاکرات" کے سلسلے میں "رام" کیے رکھنے تک اپنا ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کچھ قباحتیں بھی تھیں، مثلاً ڈیبی مذاکرات کے دوران ان سے بدول بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کرمنل اور گینگسٹر کے درمیان پھنس گئی ہے، مگر تب تک ڈیبی کے لیے پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا لیکن کوانڈو میں چونکہ وہ مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر ہوگی اس لیے ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائے گی۔ مذاکرات نمٹانے کے بعد ان کی ایک "فینیشن" ختم ہو جائے گی اور تب اگر ڈیبی نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو دونوں اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیں گے۔ وہ ان کے ساتھ ہوگی، ایک کمزور چڑیا پر قابو پانا ان کے لیے کیا مشکل ہوگا؟ لیکن اس سارے لائحہ عمل کی

نوبت ہی نہ آسکی تھی، کیونکہ گزشتہ شب جب زبیدہ نے چھپ کر ان دونوں کی گفتگو سنی تھی تو اس نے بھی اپنے منصوبے کو مزید آسان بنانے کی غرض سے ترمیم کر ڈالی تھی۔ لہٰذا پارموکی بندرگاہ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں مختصراً قیام کیا گیا تو چک اس سے بولا۔ ''ڈیبی! میں تمہیں ایک خوبصورت جزیرے کی سیر کروانا چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھو یہ میرے کام کی مجبوری بھی ہے، لیکن مجھے یقین ہے تم بالکل بھی بوریت محسوس نہیں کرو گی۔'' اس کی بات سن کر زبیدہ کو اپنے وجود میں سنسنی کا احساس ہونے لگا۔ منزل گویا خود چل کر اس کی جانب آرہی تھی۔ وہ بولی۔

''بیکراں سمندر میں پھیلے جزیروں کی سیر تو میرا ایک دیرینہ خواب ہے ...... کب اور کون سے جزیرے کی طرف جانے کا ارادہ ہے تمہارا؟''

چک کو تسلی ہوئی، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بہت جلد اور شاید آج ہی مگر......''

کہتے کہتے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو زبیدہ نے ایک دلکش سی مسکراہٹ اس پر نچھاور کرتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔ ''مگر کیا ڈیئر؟ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں؟''

''میری ایک مجبوری ہے ڈیبی! کیا تم مجھے تھوڑا فیور دے سکتی ہو؟''

''یقیناً!'' زبیدہ نے بہ یک جنبش کہا تو وہ بولا۔

''دراصل میں جس کمپنی کے لیے کام کرتا ہوں، وہ بلڈنگ کنسٹرکشن کا کام کرتی ہے۔ یہاں کچھ جزیرے ایسے بھی ہیں جو بعض امراء کی ذاتی ملکیت بھی کہلاتے ہیں۔ وہ اپنے جزیرے میں کچھ تعمیراتی کام کروانا چاہتے ہیں۔ کوانڈو آئی لینڈ بھی ان میں سے ایک ہے۔ کمپنی کو انہوں نے ایک تعمیراتی ٹھیکا دیا ہے، بس اسی سلسلے میں ان سے مذاکرات کے لیے جارہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھی بھی تھا، مگر بدقسمتی سے اس کی طبیعت راستے میں خراب ہوگئی۔ وہ ساتھ نہ آسکا، مگر مجھ سے اس نے یہ گزارش بھی کی کہ میں اس کی خبر کمپنی کو نہ ہونے دوں۔ وہ میرا کولیگ تھا اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہمارا ویسے بھی فرض بنتا تھا لہٰذا میں اکیلا ہی آگیا، لیکن مذاکرات میں کم از کم دو افراد کا شامل ہونا ضروری تھا، اسی لیے میری نظرِ انتخاب روجر پر پڑی۔ میں اسے کچھ کمیشن دوں گا۔ مذاکرات کے بعد میں اس کی چھٹی کردوں گا، پھر صرف تم اور میں ہوں گے اور سیر سپاٹے ہوں گے۔'' وہ آخر میں زبیدہ کی طرف دیکھ کر چالاکی سے مسکرایا تو زبیدہ نے بھی ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے ترمیم شدہ منصوبے کے مطابق چک سے کہا۔

''بہت دردسری والا کام ہے تمہارا۔ خیر...... ایک بات بتاؤ چک! کیا تم اپنے اس کام سے خوش ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''اگر تم میرا ہمیشہ کے لیے ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میرے ذہن میں ایک منصوبہ آتا ہے۔''

اس کی بات سن کر چک کی آنکھوں میں یکدم ایک معنی خیز چمک ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''ڈیبی ڈارلنگ! تم مجھے اپنا غلام سمجھو، تمہاری طرح میں بھی تو تنہائی کا مارا ہوا ہوں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی ایک سچے ہمسفر کی ضرورت ہے۔''

طوعاً و کرہاً ڈیبی، یعنی زبیدہ کو بڑی گرمجوشی کے ساتھ اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھانا پڑا تھا۔ جسے چک نے فوراً تھام لیا۔ زبیدہ نے آہستگی سے اپنا ہاتھ دوبارہ کھینچ لیا اور اپنے چہرے پر دانستہ گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی۔

''چک! سچی بات یہ ہے کہ میں اب اپنی اس تنہا زندگی سے اکتا چکی ہوں کہنے کو تو میں شادی شدہ ہوں مگر اصل میں میری کوئی میرڈ لائف نہیں ہے۔ میں اب اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنے ہسبینڈ سے طلاق کی صورت میں مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ مگر میں نے اس کا بھی حل سوچ لیا ہے۔ بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو؟''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں ...... چک جھٹ سے بولا۔ ''ڈیبی ڈارلنگ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے منصوبہ کیا ہے تمہارا؟''

زبیدہ بولی۔ ''تمہیں ایک ڈراما کرنا ہوگا، مجھے اغوا کرنے کا تم میرے ہی سیل فون سے میرے شوہر کو فون کر کے تاوان کی صورت میں بھاری رقم کا مطالبہ کرو گے، جو امریکن ڈالر کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے تم سے رہائی دلانے کے لیے بہ آسانی ایک بڑی رقم دے دے گا۔ اس کے بعد میں اس بورنگ شخص پر لعنت بھیج کر تمہارے ساتھ نکل جاؤں گی جہاں تم چاہو گے۔''

چک پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں بھی ہو رہا تھا کہ یہاں تو ساری تدبیریں خود ہی سیدھی ہوئی جارہی تھیں۔ اس کا منصوبہ تو اب بغیر کسی سقم کے خود ہی آسان ہو چلا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ سونے کی چڑیا خود ہی ان کی مشکل آسان

کرتے ہوئے ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے تیار تھی۔ ظاہر ہے، رقم لینے کے بعد چک کا ارادہ ڈیبی کو بھی بڑے آرام سے دھوکا دینے کا تھا۔ اس نے محبت جتانے کے لیے ریشہ خطمی ہونے کی کوشش کرتے ہوئے زبیدہ کو بے اختیار اپنے قریب کر کے اس کا بوسہ لینے کی کوشش چاہی تھی مگر زبیدہ بڑی چالاکی اور ایک ادا کے ساتھ اسے طرح دے گئی اور بولی۔

''لو ڈیئر! ابھی مجھے یہ سب ذرا آکورڈ محسوس ہوگا۔ پہلے معاملہ طے ہو جانے دو اس کے بعد تو......'' اس نے دانستہ معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو چک کو بھی محتاط ہونا پڑا۔

نظریۂ ضرورت اور وقت کی چال کو سمجھتے ہوئے منصوبے کو بڑی چابک دستی کے ساتھ ٹھیک وقت پر آگے بڑھانا زبیدہ کے ذہن رسا کا کمال ہی تھا۔ وہ یہ سب پہلے بھی چک سے کہہ سکتی تھی مگر اس طرح کی جلد بازی چک یا اس کے ساتھی روجر کو کسی قسم کے شبہے میں ڈال سکتی تھی جبکہ روجر پہلے ہی اپنے ساتھی کے اس منصوبے سے کچھ غیر مطمئن بھی نظر آرہا تھا۔

زبیدہ کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ ان دونوں مافیائی... گماشتوں کی سوچ جرائم سے شروع ہو کر جرائم پر ہی ختم ہوتی ہے لہٰذا وہ اسے تیار حلوا سمجھ کر کھانے کی کوشش کریں گے اور جب تک وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی راہ ہموار کر چکی ہوگی۔

اس گفتگو کے بعد چک اب ڈیبی کی طرف سے سو فیصد مطمئن ہو چکا تھا کہ اب یہ سونے کی چڑیا کہیں نہیں جائے گی۔

اس نے آج ہی کوانڈو روانہ ہونے کا قصد کر ڈالا اور اپنے بارے میں بھی ڈیبی کو سچ سچ بتا دیا کہ اس کی اپنی حقیقت کیا تھی اور وہ خود بھی اس جرائم پیشہ زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ محض خانہ پری کے لیے وہ کوانڈو جانا چاہتا تھا تاکہ باس کو مطمئن کر سکے وغیرہ، نیز اپنا منصوبہ اس قدر آسان جاتا دیکھ کر اس کے ذہن میں اب اپنے ساتھی روجر کے لیے بھی فتور نے سر اٹھایا تھا، وہ اسے بھی راستے سے ہٹانے کے بارے میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا، وہ ڈیبی اور اب روجر... کو بھی چونا لگانے کی سوچ رہا تھا اور اکیلا سب ہڑپ کرنے کے لالچ میں مبتلا ہو گیا تھا، جبکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر اسے چونا لگانے کے لیے پر تولے بیٹھی تھی۔

دونوں دوپہر تک مذکورہ ہوٹل میں رہے۔ دونوں نے اکٹھے لنچ کیا، پھر چک، ڈیبی کو لے کر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب روجر بھی ان کے ہمراہ تھا مگر وہ بار بار جانے کیوں زبیدہ کو ذرا پر تشکیک نظروں سے دیکھے بھی جا رہا تھا جبکہ زبیدہ کو بھی اس کی طرف سے کچھ کھٹک سی ہونے لگی تھی۔ اس دوران وہ واش روم جانے کے بہانے سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خفیہ ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھیوں کو ایک ایک پل کی خبر سے بھی آگاہ کرتی جا رہی تھی۔

چک کے اصل ٹھکانے سے مراد وہ مقام تھا، جہاں سے انہوں نے کوانڈو کی جانب روانہ ہونا تھا۔ اس دوران زبیدہ نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے مافیائی باس چیک ڈوکر سے اپنے سیل فون پر مؤدبانہ انداز کی گفتگو بھی کیے جا رہا تھا اور دوسری جانب سے ملنے والی ہدایت پر عمل کرنے کا بھی فدویانہ جواب دے رہا تھا۔

وہ مقام ایک کھاڑی تھی، جو نسبتاً ایک ویران جگہ پر تھی۔ باقی علاقہ ساحلی تھا۔ قریب ایک چوبی ہٹ بنا ہوا تھا۔ یہ خاصا بڑا ہٹ تھا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ یہ تفریح کرنے والوں کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ سامنے حدنگاہ بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ایک بوٹ بھی یہاں لنگر انداز نظر آئی تھی۔ ہٹ میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ یہ چاروں بظاہر عام اور غیر مسلح نظر آتے تھے لیکن درحقیقت یہ چاروں انتہائی تربیت یافتہ اسرائیلی ایجنٹ تھے جو یہاں تعینات کیے گئے تھے۔ ممکن تھا ایسے کئی اور ہٹ بھی کچھ فاصلے پر واقع ہوں۔ یہ اندازہ زبیدہ نے یہاں پہنچ کر اور ان کی گفتگو سن کر لگایا تھا۔

کیونکہ ہٹ کے باہر ہی انہیں ذرا دیر کے لیے کھڑے رہنے کو کہا گیا تھا، اس کے بعد اندر آنے کا حکم ملا تھا۔

ایک کمرے میں ان کے ساتھ سوالات کیے گئے تھے۔

زبیدہ اندر سے محتاط تھی مگر بظاہر وہ خود کو ایک عام سی عورت ظاہر کیے ہوئے تھی۔

''یہ کون ہے؟'' زبیدہ کے متعلق ایک سوال پوچھا گیا تو اس کا چک نے ہی جواب دیا۔

''یہ میری گرل فرینڈ ہے، ڈیبی......''

''مگر ہماری معلومات کے مطابق صرف دو افراد کو مذاکرات کے لیے آنا تھا، تیسرے کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی؟'' ایک نسبتاً دراز قامت اور کرخت چہرے والا ان کے ساتھ سوالات کر رہا تھا، یہ اعتراض اس نے ہی اٹھایا تھا۔

''اس میں گنجائش رکھنے کی کیا بات ہے؟'' چک نے منہ بنایا۔

"ہم لوگ دوستانہ ماحول میں مذاکرات کرنے آئے ہیں۔ چوری چھپے نہیں آئے ہیں اور خود کو مکمل طور پر تمہارے حوالے کر چکے ہیں، تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو ہمارے پاس ماسوائے دو عام پستولوں کے اور کچھ نہیں ہے۔"

لمبے تڑنگے اسرائیلی کے باقی تینوں ساتھیوں نے اپنی بھاری گنیں نکال لی تھیں۔

"اس طرف آجاؤ تم تینوں۔" اسی لمبے قد والے نے سپاٹ لہجے میں تحکمانہ کہا۔ اس وقت ان کی دم ان کے ہاتھ میں تھی اور یہی وجہ تھی کہ چک اور روجر کو یہاں روانہ کرنے سے پہلے ان کے پاس چیک ڈ کر اس نے انہیں سمجھا کے بھیجا تھا کہ وہ ان سے کسی معاملے میں بھی دباؤ کا شکار نہ ہوں لہٰذا جب انہیں ایک دوسرے کمرے میں لایا گیا تو چک کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ وہاں انہیں ایک اسکینر سے گزارا گیا۔ چک اور روجر تو کلیئر کر دیے گئے تھے مگر زبیدہ کی کلیئرنس کے سلسلے میں الارم بج اٹھا تھا اور پھر وہی معاملہ کھڑا ہو گیا، یعنی زبیدہ کو چاروں اسرائیلیوں نے "مشکوک" قرار دے ڈالا۔

"تمہاری ساتھی ادھر ہی رکے گی۔ تم دونوں جا سکتے ہو۔"

"ہرگز نہیں، یہ میری گرل فرینڈ ہے، میں اسے خود سے علیحدہ نہیں کر سکتا، بصورت دیگر ہم بھی نہیں جائیں گے۔"

چک نے بگڑ کر کہا، روجر الجھا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ تب اس نے اپنے ساتھی چک سے کہا۔ "میرا خیال ہے معاملے کو خوامخواہ الجھانے کی ضرورت نہیں چک! ڈیمی کو یہاں چھوڑ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں۔"

"تم خاموش رہو، روجر! یہ میرا اور میری گرل فرینڈ کا معاملہ ہے۔" چک نے اس سے ناگواری سے کہا۔

اسی دوران لمبے آدمی کی ایک ساتھی عورت نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کچھ کہا تھا، جس پر اس نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی تھی۔ پھر وہ چک کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مجھے اس کے لیے خصوصی احکامات لینا پڑیں گے۔" اور چک نے فقط اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی تھی۔

وہی عورت جس نے لمبے کے کان میں سرگوشی کی تھی، وہ اپنے ایک ساتھی مرد کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہاں چند ثانیے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ان تینوں کو ایک لمبی سی بنچ نما کرسیوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے وہ مذکورہ دو ساتھی، دوسرے کمرے میں شاید ہائی کمان سے ا سکی رابطہ کرنے کی غرض سے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی واپسی ہوئی، لمبے نے فوراً ان کی طرف دیکھا تھا۔ چک بہ ظاہر بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زبیدہ البتہ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پاس اگرچہ سوائے ایک خفیہ ٹرانسمیٹر کے کوئی اور شے نہیں تھی، جو اس نے اپنے بالوں میں "ہیئر پن" کے طور پر لگا رکھی تھی جو اسکینر میں نہیں آسکی تھی، جبکہ اسکینر صرف خفیہ آتش گیر ہتھیار کو ہی ٹریس کر سکتا تھا۔

انہوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی، اس کے بعد ان تینوں کو روانگی کی اجازت مل گئی۔

زبیدہ نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تینوں اسی بوٹ میں سوار ہو گئے۔ ان کے ہمراہ انہی چاروں مرد، عورت میں سے ایک کپل سوار ہوا تھا۔ بوٹ کھلے سمندر کی جانب تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ زبیدہ نے نمایاں طور پر ایک بات محسوس کی تھی کہ چک اور روجر کے ساتھ اسرائیلیوں کا رویہ بڑا اکھڑ اور روکھا سا تھا۔ وجہ ظاہر تھی کہ یہ معاہدہ جو بھی ان کے درمیان طے پانے جا رہا تھا، وہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہی تھا۔ یعنی بلیک میلنگ اور راز کو راز میں رکھنے کا معقول بھتا۔

بہرطور، کوانڈو آئی لینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے زبیدہ اپنے وجود میں ایک پرجوش سی سنسنی محسوس کرنے لگی تھی اور اب وہ کسی ایسے موقع کی منتظر تھی کہ اپنے باقی ساتھیوں سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے انہیں گائیڈ لائن دینے کی کوشش کرتی۔ جلد بازی بنا بنایا کام بگاڑ سکتی تھی، اسی لیے احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھی۔

موٹر بوٹ اب گہرے پانیوں میں آ چکی تھی۔ کوانڈو تک مزید کتنا سفر باقی تھا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ بوٹ خاصی رفتار کے ساتھ سمندر کے پانی کو چیرتی اور اپنے پیچھے جھاگ کی موٹی لکیر چھوڑتی آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اوپر کھلا آسمان تھا جہاں آبی پرندوں کے جھنڈ فضا میں "قائیں قائیں" بکھیر رہے تھے۔

سہ پہر کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ زبیدہ کے محتاط اندازے کے مطابق، بوٹ کا سفر تقریباً نصف گھنٹے تک جاری رہا تھا، پھر اس نے ایک قوس کی صورت میں طویل موڑ کاٹا اور مزید لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد انہیں سامنے کسی جزیرے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ایک موٹی لکیر کی صورت میں کوانڈو آئی لینڈ کا ساحل، دھیرے دھیرے قریب آتا جا رہا تھا۔ پام اور

ناریل کے لانبے، جھنڈ دار درختوں کی ایک قطاریں ساحل کے ساتھ ساتھ نیم قوس کی صورت دور تک چلی گئی تھی۔ گھنا جنگل اور اس کے پس منظر میں سبزے سے ڈھکی پہاڑی چوٹیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

مزید قریب پہنچنے پر انہیں ساحل پر ایک بند جیپ کھڑی دکھائی دی جس کے گرد چار مسلح افراد کھڑے ان کی بوٹ پر نظریں جمائے، چوکس کھڑے تھے۔ یہ اسرائیلی خفیہ اسپائی اسٹیشن تھا جدھر اسرائیل بحیرہ روم سے ملحقہ اور اریب قریب کے اسلامی ممالک پر برتری حاصل کرنا چاہتا تھا اور ان کی جاسوسی نقل وحرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے سمندر کے راستے فلسطینی حریت پسندوں کو جانے والے امدادی جہازوں کو بھی وہ بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔

اسرائیل کے اس ناپاک اور منحوس خفیہ منصوبے نے ایک عرصے سے مجاہدین اور فلسطینیوں کو جانے والی امداد کو روک رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ زبیدہ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے اس مشن کی اہمیت کا اچھی طرح سے اندازہ تھا اور انہوں نے اسے اپنی جانوں پر کھیل کر بھی کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کا عزم صمیم کر رکھا تھا۔

موٹر بوٹ ابھی ساحل سے چند ناٹیکل میل دور تھی کہ اچانک عرشے پر کھڑے چک اور روجر کے سیل فون پر بیک وقت میسیج ٹون کی مخصوص بپ بجی۔ دونوں نے ہی اپنے سیل فون نکال کر اسکرین پر آنے والے میسیج پر نگاہ ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے ان دونوں کے چہرے دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گئے۔ اور ادھر اسی وقت اسرائیلی جوڑے کو بھی ان کے خفیہ واچ ٹرانسمیٹر پر کوئی خفیہ پیغام موصول ہوا تھا اور ان کے بشروں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوتی چلی گئی۔ جبکہ زبیدہ ان کی یہ کیفیات دیکھ کر بری طرح ٹھٹکی تھی اور نہ جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو۔

☆☆☆

رات کے اس پہر سعد بے کے یہ منحوس خبر لانے کی اگرچہ کم از کم شائل اندال کو پوری امید تھی لیکن اسے اس قدر جلدی یہ سب ہونے کی توقع قطعاً نہیں تھی۔ پہلے تو سعد بے کی بات پر شائل کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ مگر اب مزید دیر کی کوئی گنجائش بھی نہیں بچی تھی۔

''معزز آقا! بغداد پر ایک بار پھر تاریخ کا وہ بے رحم کلہاڑا اچل چکا ہے، جو اپنوں کی غداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امریکی سی آئی اے کے راتب خور جرنیلوں نے، جن میں جنرل واحد بھی شامل ہے، صدر اور اس کے بیٹوں کو طویل عرصے تک بے وقوف بنائے رکھا۔ جس پر اندھا اعتماد کیا جاتا تھا، کمال مکاری سے انہوں نے پہلے صدر اور اس کے بیٹوں سے دوست دشمن کی شناخت کی تمیز چھین لی۔ اب آپ جیسے دوست دشمن ٹھہرے ہیں آقا! جب حکمرانوں سے یہ شناخت چھن جائے تو تباہی و بربادی مقدر ہو جاتی ہے۔''

سعد بے یہ سب بتاتے ہوئے روہانسا ہو رہا تھا۔ وہ حویلی کے پائیں باغ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، یہاں اندھیرے اور روشنی کا سنگم تھا۔ شائل اندال سوچ میں پڑ گیا۔

''آقا! سوچنے کا وقت .....'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گیٹ پر سماعت شکن دھماکا ہوا۔ ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ پھر ابھی یہ لوگ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ سعد بے چھلنی ہو کے گرا، شائل اندر کی جانب دوڑا تو عقب سے ایک تڑتڑاتے ہوئے برسٹ نے اس کا بھی تعاقب کیا۔ کچھ گولیاں اسے لگیں۔ وہ گرا مگر پھر اٹھ کر اندر گرتا پڑتا دوڑا اور پھر گرا۔ اس اثنا میں کئی دھماکے اور گولیوں کی گھن گرج سے جاگ پڑے تھے اور حواس باختہ ہو رہے تھے۔ شائل چلا چلا کر سب کو کسی راستے سے بھاگنے کا کہہ رہا تھا اور پھر اس نے بھی دم توڑ دیا۔

حماد اندال، ڈاکٹر کمال احمد اور جینی بھی ہراساں تھے لیکن جلد ہی حماد اور کمال نے خود پر قابو پایا۔ حویلی کے وفادار مسلح پہرے دار، باغیوں اور لٹیروں کی مقدور بھر تعداد کے باوجود ڈٹے رہے اور اہل خانہ کو نکل بھاگنے کا موقع فراہم کرتے رہے۔

بالآخر عراق پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کا حملہ ہو چکا تھا۔

عالمی افق پر ایک بار پھر خون مسلم کی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ سازش اغیار ایک بار پھر اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث پروان چڑھنے لگی تھی۔

امریکا درپردہ ''اسرائیل'' کی بقا کے لیے خون مسلم سے اس کی پرورش کرنے لگا تھا اور امریکا کا یہ من چلا بچہ کس طرح اپنے گریٹر اسرائیل پروگرام میں اپنے ''آوارہ باپ'' کی طاقت کو مسلم امہ کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔

عراق پر مکمل قبضے کے بعد، ایک کے بعد دوسرے اسلامی ملک پر قبضہ کرنا امریکا کے وسیع پروگرام میں شامل ہے۔ وہ خطہ جس میں کم وبیش ایک ارب نفوس رہتے ہیں اور

جسے "عالم اسلامی" کہا جاتا ہے، اس کا سیاسی نقشہ بالضرور تبدیل ہونا چاہیے۔ اب سابقہ "سائیکس پیکو" معاہدے کے مندرجات تبدیل ہوں گے۔ اگرچہ خود سائیکس پیکو معاہدے کے تحت جو مسلم اکثریت والے ممالک آزاد ہوئے تھے، وہ فوجی، لسانی اور جغرافیائی لحاظ سے اس طرح برطانیہ، فرانس اور امریکا نے تقسیم کیے تھے کہ یہ کمزور ممالک ان کے "مقاصد" کے سامنے کبھی نہ جم سکیں۔

امریکا کا دوسرا مقصد خام تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا ہے۔

تیسرا مقصد اسرائیل کی بقا کی ضمانت اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے، نیز دریائے نیل سے دریائے فرات تک کی اراضی تک اسرائیل کی رسائی کرانا۔

عراق میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 112 بلین بیرل خام تیل پایا جاتا ہے، جو سعودی عرب کے بعد دوسرا اہم منبع ہے۔ امریکا اپنے "خشک کنوئیں" خلیج کے تیل سے بھرتا جارہا ہے اور اس محفوظ تیل کو کسی شدید ضرورت کے علاوہ استعمال نہیں کرتا تاکہ صنعت کاری پر وہ اکیلا قابض ہوجائے اور تمام ممالک صنعتی مواد کے لیے اس کے محتاج ہوں۔
... خام تیل کے حصول کے لیے امریکا ہر اقدام کرنے پر تیار رہتا ہے۔

امریکا نے اس اظہار میں کبھی تجاہل نہیں برتا کہ خام تیل جہاں بھی پایا جاتا ہے وہ دراصل اس کی ملکیت ہے۔

امریکا نے ہی عرب ممالک کو دباؤ میں رکھنے کے لیے اسرائیل کے قیام کی داغ بیل ڈالی تھی۔ عرب ممالک میں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کے بجائے امریکا نے کردار ادا کرنا تھا۔ بعدازاں صیہونی عقل، امریکا کے عیسائیوں پر ایسی حاوی ہوئی کہ آقا اپنے ہی غلام کے ماتحت ہوگیا۔

دنیا کے طول وعرض میں اسلامی بیداری کی لہر نے بے شمار غافل مسلمانوں کو جھنجوڑ کر بیدار کردیا ہے۔ ان گنت اسلامی تنظیمیں اپنے طریقہ کار کے مطابق دنیا بھر میں فعال ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے اور منزل اسلامی خلافت کا قیام ہے اور اسی منزل میں صیہونیوں کو اپنی موت نظر آرہی ہے۔ اور وہ اسی لہر کو پوری قوت کے ساتھ دبانا چاہتے ہیں۔ دونوں ملکوں کا بس اس بات پر ایمان ہے کہ فریقین کے درمیان مسئلہ جغرافیائی حد بندی کا نہیں بلکہ ایک کے وجود اور دوسرے کے نابود ہونے کا مسئلہ ہے۔

اسلامی بیداری کی ابتدا بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے شروع ہوئی، پچاس کی دہائی میں اس میں پختگی آگئی اور اس پختہ اسلامی بیداری سے ہی مغربی ممالک سخت خائف ہیں۔ چنانچہ دہشت گردی کے عنوان سے امریکا اور اسرائیل دراصل اس اسلامی بیداری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ صرف مسلمان ہی اسرائیلی وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ ہی کسی غیر مسلم کی حکمرانی قبول کرتے ہیں۔

اسی اسلامی بیداری کے فعال ہونے کا خدشہ اسرائیل کا پہلا وزیراعظم بن گوریان اس طرح کرتا ہے۔ "مجھے ڈر ہے کہیں اسلامی بیداری کی یہ لہر اسرائیل اور اس کے ہمنواؤں کو لے نہ ڈوبے۔"

عہد اور سیف کا یہودی نژاد امریکی مصنف اپنی کتاب ... میں اس خطرے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "اسرائیل کے قیام میں اس بات کو یقینی سمجھا گیا ہے کہ ایک نہ ایک دن عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرلیں گے۔ اس ماحول کو سازگار کرنے کے لیے عرب ممالک کے شدت پسندوں کا خاتمہ ناگزیر ہے۔"

"مغرب کے لیے اسلام کا خطرہ اشتراکیت سے بڑھ کر ہے۔ اشتراکیت جیسی بھی ہے اس کا خمیر مغربی ممالک سے اٹھا ہے اور اس میں کسی موقع پر لچک آسکتی ہے، لیکن اسلام کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے صرف تلوار کی زبان استعمال ہوسکتی ہے۔"

اسرائیل کی خفیہ تنظیم کا سربراہ ارون یاریف لکھتا ہے۔

"میرے خیال میں عرب اپنی موجودہ طاقت کے ساتھ اسرائیل کے لیے خطرہ نہیں ہیں، ہاں اگر بنیاد پرست کسی انقلاب کے نتیجے میں ان ممالک پر قابض ہوجاتے ہیں تو پھر یہ ایک سنجیدہ خطرہ بن سکتے ہیں، لیکن عرب ممالک کے موجودہ حکمران ہمارے دوست ہیں اور ان سے اس ابھرتے ہوئے خطرے کو دبانے کی امید کی جاسکتی ہے۔"

صدر جمی کارٹر نے اپنے ایک بیان میں اسلامی بیداری کے خطرے پر یوں اظہار خیال کیا تھا۔ "دنیا بھر میں اسلامی تنظیموں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو وائٹ ہاؤس نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی پیش بندی کے لیے امریکا اور اس کے دوست مسلم حکمران مشترکہ طور پر حکمت عملی مرتب کریں، تاکہ دنیا میں کسی جگہ اسلامی انقلاب رونما نہ ہوسکے۔ امریکا کسی صورت میں اسلام کے شدت پسندانہ عمل کو برداشت نہیں کرے گا۔"

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر یہ مختصر سا قافلہ، آہوں اور سسکیوں کے ساتھ دو گاڑیوں میں سوار، بغداد سے یعقوبہ کی

طرف کا عزن تھا۔

ڈر، خوف، ہراس، عصمت دری اور قتل عام جیسے اندیشناک دسوسے ان کے... ہم رکاب تھے۔ ایک سرخ آندھی تھی جس نے گویا آن کی آن میں پورے عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ایک گاڑی چھوٹی بند وین تھی جبکہ دوسری کار۔ وین آگے تھی اور اس میں احمد حمادی اور اس کی ہونے والی بیوی حبیبہ (حماد اندال کی بہن) اس کا باپ جمشید حمادی اور ماں حماد اندال کی ماں ام کلثوم (جواب بیوہ ہو چکی تھی) دو ملازم سوار تھے جبکہ کار میں حماد اندال، ڈاکٹر کمال احمد، جینی اور ایک عمر رسیدہ ملازم سوار تھے۔ ان سب کے چہرے متوحش اور ستے ہوئے تھے، سب سے زیادہ حماد دکھی تھا۔ اس کے لیے یہ سب کسی اچانک نازل ہو جانے والی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس کی آنکھیں ہنوز ڈبڈبائی ہوئی تھیں، وہ چشم تصور میں بار بار اپنے باپ کی خون سے لت پت لاش دیکھ رہا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا اور کمال اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ جو اسے بار بار حوصلہ اور تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا، مگر درحقیقت وہ خود بھی کم پریشان نہ تھا تشویش اس کے چہرے سے بھی نمایاں طور پر مترشح تھی۔ جبکہ عقبی سیٹ پر بیٹھی جینی کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کا حلق تک سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا، کمال سے زیادہ وہ تشویش زدہ ہو رہی تھی، وہ غیر ملکی تھی اور فرنگن بھی، اسے ان حالات کا کب تجربہ تھا؟ اس کے برابر میں عمر رسیدہ ملازم ریاض بیٹھا تھا۔ یہی حال اگلی گاڑی میں موجود افراد کا تھا، سب سے زیادہ متاثر حماد، اس کی بہن اور ماں ہوئے تھے، اسی لیے دکھی بھی زیادہ وہی تھے۔ حبیبہ کے تو آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ باپ کے اس طرح بہیمانہ انداز میں جاں بحق ہونا، اسے بری طرح غم زدہ کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے باپ سے بے حد محبت کرتی تھی، اس کی لاڈلی بھی یہی تھی۔

اس کی ماں ام کلثوم بھی رو رو کے اپنی آنکھیں سرخ کیے بیٹھی تھیں۔ اسے اس کی سمدھن یعنی احمد حمادی کی ماں حاجراں نے سنبھالا ہوا تھا۔ جبکہ حبیبہ کو اس کا ہونے والا شوہر احمد تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شادی کا گھر پل کے پل ماتم میں بدل گیا تھا۔

حویلی میں ہلا بولنے والوں سے متعلق حماد اندال اور اس کے سسر جمشید حمادی کی رائے کچھ مختلف تھی۔

حماد کے مطابق اس کے باپ کو منافقت کی سیاست نہیں آتی تھی۔ شائل اندال کا شمار صدر عراق کے وفاداروں میں ہوتا تھا۔ اگرچہ دیگر وفادار "وقت کی چال" کو سمجھتے ہوئے بعث پارٹی کے علاوہ بھی مخالف پارٹی سے راہ و رسم رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ جانتے تھے کہ صدر کے پکے وفادار کون تھے اور انہیں ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔ جبکہ اس کے سسر جمشید حمادی کا خیال تھا کہ شائل اندال کو ہلاک کروانے میں عاقبت نااندیش جرنیلوں کا ہاتھ تھا۔

عراق میں امریکی اور اس کے سپر اتحادی ملکوں کے حملے کے نتیجے میں عراق میں چھپے لٹیروں کو بھی بغاوت کی آڑ میں لوٹ مار کرنے کی کھلی چھوٹ مل چکی تھی۔ ان میں زیادہ تر امریکی فوجی اور عراق میں بسنے والے غیر مسلم بھی تھے اور وہ لوگ بھی جو عراقی صدر کے مخالف دھڑے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔

بہر طور اس مختصر قافلے کا سفر جاری تھا اور ان کی منزل بعقوبہ تھی۔ حماد اور ڈاکٹر کمال وغیرہ بڑی مشکلوں سے حویلی کے خفیہ راستے سے فرار ہو کے نکلے تھے اور سیدھا جمشید حمادی کے گھر پہنچے تھے۔ چونکہ شائل اندال کی وفاداری پر "مہر تشکیک" ثبت کر دی گئی تھی اسی لیے اس سمیت اس کے عزیز رشتے داروں پر یہی عتاب نازل کیا جانے والا تھا۔ اسی لیے جمشید حمادی کو بھی سب کچھ چھوڑ کر ان کے ساتھ نکلنا پڑا تھا، یوں بھی اس وقت بغداد کے حالات کچھ اس نہج پر تھے کہ سردست کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔

عراق کے آسمان پر جنگ کے بادل برسنا شروع ہو چکے تھے۔ امریکا اور اس کی بری اور فضائی افواج اپنے اتحادیوں سمیت سرزمین عراق پر تیزی سے قابض ہونے لگی تھیں۔ لٹیروں کو دانستہ گل کھلانے کے مواقع فراہم کیے جا رہے تھے اور جس ٹولے کو جہاں موقع مل رہا تھا وہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ بلکہ اب تو ان لٹیروں میں بھی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ امریکی، اس کے اتحادی بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ مار آستین بھی تھے۔ اس کے بعد بڑے لٹیروں (امریکا اور برطانیہ) کی باری آنے والی تھی جو عالمی سطح پر بڑے دھڑلے کے ساتھ عراق کے تیل پر ہاتھ صاف کرنے والے تھے۔

بہر طور ان کا ارادہ بعقوبہ سے اربل اور پھر موصل نکلنے کا تھا۔ موصل میں حماد کا ننھیال تھا، بڑی مشکل سے ٹیلی فونک رابطہ ہوا تھا ام کلثوم کا اپنے بھائیوں سے۔ ماں باپ تو عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے، دو بھائی اور ایک بہن زندہ تھے، تینوں شادی شدہ تھے اگرچہ وہاں بھی حالات ٹھیک نہیں تھے لیکن نسبتاً کچھ بہتر تھے، وہاں قبائلی سسٹم تھا

اور وہاں کے سردار مل جل کر درمیانی راہ نکالے ہوئے تھے اور اپنے علاقے کی از خود حفاظت کے ساتھ ساتھ مزاحمت پر بھی عمل پیرا تھے۔ تاہم ابھی ان کی منزل دور تھی۔ ان کے پاس زادِ راہ کی کمی نہیں تھی، البتہ فیول ان کے پاس محدود تھا اور اصل پریشانی کی وجہ بھی تھی ان کے لیے۔

تھوڑی دور اور سفر کرنے کے بعد، بالآخر فیول بچانے کی یہی تدبیر نکالی گئی کہ بیک وقت دو گاڑیوں میں سفر کرنے کی "عیاشی" کے بجائے ایک ہی گاڑی پر سفر کیا جائے چنانچہ یہی کیا گیا، ایک تاریک مقام پر گاڑیاں اس مقصد کے لیے روک دی گئیں۔ کار سے حماد اور ڈاکٹر کمال وغیرہ اتر کے وین میں آبیٹھے اور کار کا جتنا بھی بچا کھچا پیٹرول تھا، وہ ایک ربڑ.... پائپ کے ذریعے وین کی ٹینکی میں منتقل کیا جانے لگا۔ یہ کام دونوں جوان ملازم کرنے لگے۔

اس ضرورت کے پیش نظر اس مختصر قافلے کو بیچ تاریک صحرا میں کچھ دیر کے لیے رکنا پڑا تھا۔ صحرا میں رات اتر آئی تھی۔ فضا خنک تھی، شکر تھا کہ تیز ہوائیں نہیں چل رہی تھیں ورنہ ریت کا طوفان ان کے لیے الگ مسئلہ کھڑا کر دیتا۔ کمال، حماد اور جینی اسی کار کے قریب، جسے یہ لوگ یہیں چھوڑ کے آگے روانہ ہونے والے تھے، کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جینی کو زیادہ پریشانی لاحق تھی، لیکن چونکہ اس وقت بھی پریشان اور تشویش زدہ تھے اسی لیے وہ اپنی فکر کو ظاہر کرنے سے گریز کرنے کی ہی کوشش کر رہی تھی لیکن ڈاکٹر کمال سے اس کا ہراس اور ژولیدگی چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اگرچہ اس کا احساس حماد کو بھی تھا لیکن جب کمال نے جینی کو تسلی دینی چاہی تو بے اختیار جینی کا من ڈبڈبا گیا اور وہ رو پڑی۔ کمال تو خود پریشان سا ہو گیا، البتہ حماد نے ہی جینی سے ازراہِ تشفی کہا۔

"جینی! پلیز، حوصلہ رکھو، یقین کرو خود مجھے اپنی اور اپنے لوگوں سے زیادہ تمہاری اور کمال کی ہی فکر لاحق ہے کیونکہ تم دونوں ہمارے مہمان تھے مگر بدقسمتی سے ہم بھی اس وقت بے خانماں و برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں خود بھی تم دونوں سے بہت شرمندہ ہوں۔"

"نن.... نہیں .... مم... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" جینی قدرے خود بھی شرمندہ سی ہوتے ہوئے فوراً بولی۔

"درحقیقت میں کبھی ایسے جنگی حالات سے نہیں گزری تھی اور پھر یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور دل دہلانے والے انداز میں ہوا تھا کہ میرا ذہن ابھی تک اس لرزہ خیز حقیقت کو قبول ہی نہیں کر رہا کہ یہ سب واقعی ہو چکا ہے۔ دیکھا جائے تو ہم سے زیادہ تم پر جینی پر اور تمہاری ماں پر قیامت ٹوٹی ہے۔ انکل کا اس طرح مرڈر ہونا، مجھے واقعی بہت دکھی کر گیا ہے۔"

"آئی ایم سو سوری۔ ایکسٹریملی سوری حماد!"

کمال نے بھی آزردگی کے ساتھ حماد کے دکھ کو شیئر کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ بولا۔ "جینی ٹھیک کہہ رہی ہے حماد! ہم سے زیادہ اس وقت تم لوگوں پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔" تھوڑے توقف کے بعد کمال نے دوبارہ اس سے کہا۔

"کیا سمجھتے ہو حماد! تم لوگوں نے موجودہ صورت حال میں جو لائحہ عمل تیار کیا ہے، وہ کس حد تک سودمند اور محفوظ ہو سکتا ہے ہمارے لیے؟" جواباً وہ ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

"یقیناً، امید تو یہی ہے کیونکہ موصل ہمارے لیے نسبتاً نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ وہاں سے تم دونوں کو بہ آسانی عراق کی پرآشوب جنگی فضا سے باہر بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ موصل سے ایک برادر اسلامی ملک ترکی کی سرحد بہت قریب ہے۔"

حماد کی اس بات پر جینی اور کمال کو قدرے ڈھارس ہوئی تھی، تاہم کسی فوری خیال کے تحت ڈاکٹر کمال نے اس سے پوچھا۔

"کیا ہمیں، میرا مطلب ہے جینی اور مجھے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنا پڑے گی؟"

"نہیں۔" حماد نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "میرا نہیں خیال کہ تم دونوں کے لیے ایسا کوئی مسئلہ ہو۔ مجھے امید ہے میرے ماموں یہ کام بہ احسن وخوبی انجام دے ڈالیں گے۔"

"اور تم لوگ کیا ادھر ہی رہو گے؟ عراق میں ہی؟" کمال نے پوچھا۔

"ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ لائحہ عمل تو موصل پہنچنے کے بعد ہی طے پائے شاید۔"

اسی وقت احمد حمادی نے انہیں آواز دے کر بلا لیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہی اندیشوں اور خوف و ہراس کی فضا میں ان کا سفر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ سب پیٹرول کی قلت کی وجہ سے ایک ہی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

"وقت نہیں ہے، جلدی فیصلہ کرو۔" دفعتاً کوچ جن کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

عابد اور نائمہ دونوں ابھی بھی ایک دوسرے کے سلسلے میں کسی بھی مخمصے کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ بجز اس کے

کہ کوئی تیسرا فرد درمیان میں نہیں آجاتا۔ یہاں بھی کچھ یہی صورت حال تھی۔ اگر یہاں معاملہ صرف نائمہ کا ہوتا تو عابد بلا تامل خود کو ہر خطرے کے لیے پیش کر دیا کرتا تھا لیکن اب اگر وہ خود یہاں ایمرجنسی ایگزٹ لاجسٹک سیل کے چینل پر کھڑے ہونے کی ذمے داری سنبھالتا اور نائمہ کو کوچ جن اور اس کے ساتھی کے ساتھ بھیج دیتا تو بھی اس میں خطرہ تھا کہ وہ نائمہ سے دھوکا کر سکتے تھے۔ اگرچہ نائمہ انہیں گن پوائنٹ پر ہی لیے ہوئے ہوتی، باوجود اس کے عابد اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا وہ بہر حال ان کے مقابلے میں اتنی تربیت یافتہ نہ تھی، دونوں مکار یہودی اسے ''ہاتھ'' دکھا سکتے تھے۔

یہی حل اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ خود ان دونوں کے ساتھ الیکٹرک پاور بوٹ تک رسائی حاصل کرے اور نائمہ یہاں چینل بورڈ پر اپنی مختصر ڈیوٹی انجام دے اور بعد میں نائمہ بھی ان سے آن ملے۔ یہاں بھی کھڑے رہنا، نائمہ کے لیے خطرے سے کم نہ تھا مگر نسبتاً اس میں کم خطرہ تھا۔

کسی متوقع خطرے کے پیش نظر عابد نے کوچ جن سے درشت لہجے میں کہا۔ ''اس سارے گورکھ دھندے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟ یعنی میں کب اور کیسے اپنی ساتھی (نائمہ) کو دوبارہ اپنے ساتھ دیکھوں گا؟''

''صرف دس منٹ کا کھیل ہوگا، یا اس سے بھی کم۔'' کوچ جن نے جواب دیا۔

''تم وہاں لگے ایک انٹرکام کے ذریعے اپنی ساتھی کو بلا سکتے ہو۔''

اس کے بعد عابد نے نائمہ کو چند ضروری ہدایات دیں اور جب عابد نائمہ سے جدا ہونے لگا تو اچانک نائمہ نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عابد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''عابد! ایک وعدہ کرو مجھ سے۔ اگر خدانخواستہ ہم پر کوئی ایسا کڑا وقت آئے تو تم، میری فکر کرنے کے بجائے صرف اپنے مشن کو ہی ترجیح دو گے، مجھے نہیں۔ کرو وعدہ عابد! وقت کم ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اگرچہ نائمہ کی آواز کسی جذبے تلے مرتعش سی تھی، مگر آہنگ سے ایک عزم صمیم کی سختی بھی نمایاں تھی۔ عابد کا اندر جھیر جھیر سا ہونے لگا، مگر پھر جیسے دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر اور اس کا نرم و نازک ہاتھ ہولے سے تھپتھپا کر بولا۔

''ہاں! نائمہ، میں وعدہ کرتا ہوں۔'' اس کے بعد... اس نے اسے گن تھما کر پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

نائمہ، کوچ جن کی ہدایت کے مطابق چینل کے سامنے ایک..... لیور پکڑے کھڑی ہوگئی۔ کوچ جن کے ہاتھ پر لمحے بھر کو سلوٹیں ابھریں اور پھر غائب ہو گئیں، جنہیں دونوں نہ دیکھ سکے تھے۔

سیل سے رخصت ہوتے وقت عابد اور نائمہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ نائمہ اسے حوصلہ دینے کی غرض سے ہولے سے مسکرائی تھی جبکہ عابد کو اس کی مسکراہٹ کی تہ میں چھپے کسی اندیشاک وسوسے کی تلچھٹ بھی چھپی محسوس ہوئی تھی۔

ان تینوں کے جانے کے بعد نائمہ سیل میں تنہا رہ گئی تو اس کی عابد کے لیے حوصلہ افزا مسکراہٹ میں چھپی ہلکی تشویش، عابد کے جاتے ہی پوری طرح اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی۔ عابد کی سنگت میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ ہر غم ہر خطرے سے خود کو بے نیاز سی محسوس کرتی تھی۔ مگر جہاں اس کا ساتھ عابد سے ٹوٹتا، چاہے عارضی سہی، وہ یک دم ... عدم تحفظ کا شکار ہونے لگتی تھی۔ اسے خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ اب تک عابد کی سنگت میں رہتے ہوئے، نوع بہ نوع خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ شاید اس کی ذات کی عادی ہوگئی تھی۔

حالات دگرگوں اور نازک گھڑیوں کی ساجھے داری نے شاید اب ان دونوں کو یک جان دو قالب میں ڈھال دیا تھا۔ حالانکہ نائمہ نے ایک بہادر لیڈی رپورٹر کی حیثیت سے تن تنہا بھی، کم وبیش ایسے ہی حالات کا مقابلہ کیا تھا، وہ ایک انٹرنیشنل لیول کی رپورٹر تھی مگر اب اسے کیا ہوگیا تھا؟ کہیں یہ ان کڑے وقتوں میں، اندر ہی اندر، چپکے چپکے، خانہ دل کے کسی گوشہ نہاں میں پنپنے والے ان نومیدہ جذبات کے گل وگلزار ہونے کی نوید تو نہیں تھے؟ جس نے ان دونوں کو تعلق خاطر کی ایک غیر مرئی ڈور میں جکڑ لیا تھا؟ شاید یہی کچھ تھا۔

وہ اور زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔ سیل میں وہ تنہا تھی اور اس کی محدود آہنی فضا میں ابھرنے والی مدھم سائیں سائیں اسے ہولناک سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ شدت کے ساتھ منتظر تھی کہ کب..... انٹرکام پر عابد کی آواز ابھرتی ہے اور وہ کب اس منحوس قید خانے جیسے سیل سے نکلتی ہے؟

ایک ایسے ہی چھوٹے دروازے سے یہ تینوں یعنی عابد، کوچ جن اور اس کا ساتھی، گزرتے ہوئے ایک تنگ سی سرنگ نما راہداری میں آگئے۔ عابد کا خیال نہیں تھا کہ کوچ جن یا اس کا ساتھی، اس نازک وقت میں اسے ''ہاتھ'' دکھانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ اب وقت صرف اسی قدر ہی باقی بچا تھا کہ جس قدر جلدی ہوسکے اس جہنمی آبدوز سے باہر نکلا جائے۔

عابد ان دونوں کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ان دونوں کے پیچھے چل رہا تھا۔

☆☆☆

آبدوز میں ریڈ ایمرجنسی نافذ ہوچکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ مال ومنال بچانے کے بجائے اب صرف اپنی جان بچائی جائے۔ لیکن کپتان پریمانن اپنی اس محبوب آبدوز کو تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آبدوز اسرائیلی بحریہ کے لیے کتنا بڑا فخر تھی نہ صرف یہ بلکہ پورے اسرائیل کے لیے بھی ایک قومی سرمائے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ یہ آبدوز محض ایک آبدوز ہی نہیں، ایک چلتا پھرتا ایٹمی ری ایکٹر بھی تھی۔ اس کی تباہی اسرائیلی بحریہ کا بہت بڑا نقصان تھی جس کی تلافی دنوں، مہینوں میں نہیں ہوسکتی تھی۔

اسے رہ رہ کر دشمنوں کے ان دونوں ساتھیوں (عابد اور نائمہ) پر طیش آرہا تھا، جو اس کھربوں روپوں کی اہم ترین آبدوز آگوسٹا 291 کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ اسے اب یوں لگ رہا تھا جیسے دشمنوں کا یہ جوڑا چیونٹی بن کر ان کی سونڈ میں آن گھسا ہو۔

وہ انہیں ابھی تک فلسطینی حریت پسندوں کا ساتھی سمجھے ہوئے تھا، حالانکہ ایسا تھا نہیں، اگرچہ اس کا راز ایک تھا نیز حالات کے دھارے نے ہی نہیں بلکہ اپنے فلسطینی مسلم بھائیوں کی مدد کی خاطر بھی عابد اور نائمہ اب ان کے اس نیک مقصد میں شامل ہوچکے تھے۔ یہ بلاشبہ ہر مسلم ملک کا اجتماعی فریضہ بھی بنتا تھا یوں تو اب تک فلسطینی گروپوں کو ان کے بارے میں معلوم ہو ہی چکا تھا اور وہ عابد اور نائمہ کے اس بہادر ''جوڑے'' کو فلسطینیوں کا گمنام ہمدرد سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔

اسرائیلی کپتان پریمانن کے پاس اس وقت اس کا نائب کیپٹن پیٹرنوت موجود تھا، جو اسے یہ بتا کر مزید طیش میں مبتلا کیے ہوئے تھا کہ اب ویپن آفیسر سے کوئی رابطہ نہیں ہو پارہا ہے۔ نیز مذکورہ سیل (والٹ 3) تک ان کی ابھی تک رسائی بھی ناکام رہی ہے، اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جو کمانڈوز بھیجے گئے تھے، ان میں کئی، ان دونوں مجاہد جوڑے کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔

"پیٹر! تم کیا اب تک گھاس کاٹ رہے ہو؟" کپتان پریمائن باؤ لے کتے کی طرح اپنے نائب پر چلایا۔

"جو خرابی، وہ دو گھس بیٹھے دشمن پیدا کر چکے ہیں، کیا اسے دور نہیں کیا جاسکتا؟" پیٹرنوت نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

"یہ سب تمہاری غلط حکمتِ عملی اور بلاوجہ کی ہٹ دھرمی سے ہوا ہے مسٹر پریمائن! ہم مذاکرات کی آڑ میں کمانڈو ایکشن کر کے ان دونوں پر بہ آسانی قابو پاسکتے تھے۔ مجھے ویپن آفیسر کوچ جن نے ساری صورت حال کے بارے میں بریف کردیا تھا۔ مگر افسوس آپ کو خطرناکی کا اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ اس وقت کوچ جن خود ان کے رحم و کرم پر تھا اور دشمن جوڑے (عابد، نائمہ) نے والٹ تھری کا پمپ چلانے سے نہ صرف انہیں روکے رکھا تھا بلکہ اس کے ایک ساتھی نے ایٹمی ری ایکٹر کو آن آف کرنے والا کریک بھی توڑ ڈالا تھا، جبکہ آپ سے غلطی یہ ہوئی کہ آپ ابھی تک یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ان کو بھی اپنی جان کا خوف ہوگا، جبکہ یہ مجاہد سرفروش ہوتے ہیں۔ اپنے کاز اور مقصد کے سامنے یہ اپنی جانوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔"

موقع ایسا تھا ورنہ کپتان پریمائن اپنے نائب کی اس کڑی جوابی کارروائی کا نہایت برہمی سے جواب دیتا اور یوں بھی اس کا نائب کوئی ایسی غلط بات... نہیں کہہ رہا تھا، جھلا کر بولا۔

"کیپٹن پیٹرنوت! یہ وقت اب آپس کی لڑائی کا نہیں ہے۔ کچھ کرو، کسی طرح سے اس قیمتی آبدوز کو تباہ ہونے سے بچانے کی کوئی تدبیر کرو۔"

"اب کسی تدبیر کا وقت نہیں رہا سر!" پیٹرنوت بولا۔

"بلکہ اپنی جان بچا کر ادھر سے نکل جائیں یہی بہت ہے۔"

"تمہیں بھاگنے کی پڑی ہے؟ کیا منہ لے کر جاؤ گے تم اپنے ملک (اسرائیل) پوری قوم (یہودی) ہم پر لعنت پھٹکار کرے گی۔ ہم پر مقدمہ ہوجائے گا، کورٹ مارشل بھی ہوسکتا ہے۔" پریمائن دہاڑا۔

"غلطی آپ سے ہوئی ہے، ہم سب مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔" پیٹرنوت نے یہ جواب دے کر کپتان پریمائن کے تن بدن میں آگ لگادی۔ وہ اپنے نائب کی طرف بڑی ہولناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"اوہ..... اگر یہ بات ہے تو پھر کوئی بھی اس آبدوز سے باہر نہیں جائے گا۔ اور اگر اپنی جان بچانی ہے تو اس آبدوز کی خرابی کو دور کرنے کے لیے سب کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔" یہ کہہ کر پریمائن اپنے پینل بورڈ کی جانب بڑھا نائب پیٹرنوت پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر جیسے وہ اس کی حرکت سمجھ گیا اور اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔

وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا پریمائن کی طرف لپکا۔

"تم..... تم..... ذلیل آدمی! یہ ..... یہ ..... نہیں کرسکتے۔" پیٹر چلایا۔ جبکہ پریمائن پینل بورڈ پر اپنا کام ختم کر کے اس کی طرف مڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آرہا تھا جس کی نال کا رخ پیٹر کی طرف تھا۔ اگلے ہی لمحے دھماکا ہوا۔ نال سے دھواں خارج ہونے لگا، جبکہ پیٹرنوت ایک کربیہ انگیز چیخ مار کے اپنا سینہ پکڑے فرش پر گر گیا اور تڑپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اسی وقت پریمائن نے مائک پر اعلان کردیا کہ کوئی بھی آبدوز سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس نے ایگزٹ یعنی نکاسی کے تمام دروازے بہ شمول ایمرجنسی ڈورز سیلف کوڈز ڈال کر لاک کردیے ہیں۔ جان بچانا چاہتے ہو تو اس کے ساتھ آبدوز کی خرابی کو دور کرنے کے لیے اس کے سیل فائیو کا رخ کرو۔

☆☆☆

بدقسمتی سے یہی وہ موقع تھا جب ادھر عین اس وقت عابد اور کوچ جن الیکٹرک پاور یوٹ کو بلاسٹک چیمبر سے نکالنے کے بعد آبدوز کے "بفر روم" میں آچکے تھے۔ دونوں نے اب اپنے چہروں پر چڑھے ہوئے تھوبڑا نما ربٹ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) اتار کر پھینک دیے تھے۔ یہاں نیورو گیس کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ادھر کوچ جن کا ساتھی ایک اور لیور کو مخصوص مدت میں گرانے کے لیے اندر کھڑا رہ گیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب پریمائن نے آبدوز کے تمام نکاسی کے دروازے کوڈز لگا کر لاک کردیے تھے۔

کوچ کے اس ساتھی کا نام پارکر تھا، اس نے جیسے ہی باہر سے کوچ کا اشارہ پا کر لیور چھوڑا اور باہر آنے کی کوشش چاہی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازہ لاکڈ ہو چکا تھا۔ وہ دہشت زدہ رہ گیا اور پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

ادھر بفر روم کی جھکی ہوئی چھت سے کوچ نے ایک انٹرکام کا ریسیور اچک کر عابد کی طرف بڑھا دیا۔ عابد نے فوراً ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اندر محبوس نائمہ سے رابطہ کیا کہ وہ اب لیور چھوڑ کر فوراً بفر روم کا رخ کرے۔ اس کی راہنمائی کے لیے اس نے اسے راستہ سمجھا

دیا تھا جو چنداں مشکل نہ تھا۔ ابھی انہیں اس ہولناک حقیقت کا اندازہ ہی نہ تھا کہ آبدوز آگوسٹا 291 کے جنونی کپتان پریمانن نے تمام ایمرجنسی ڈورز لاک کروا لیے ہیں۔

☆☆☆

پاور بوٹ ان کے سامنے تھی، یہ ایک بند کیپسول کی شکل کی چھوٹی آبدوز تھی جو ایک طاقت ور بیٹری سے چلتی تھی۔ اس کے اندر صرف پانچ افراد ہی سما سکتے تھے۔

بوٹ ایک خود کار آہنی ہینگر کے ذریعے چھت کی دیوار سے نیچے اتاری گئی تھی، جس کے فرش پر سمندر کا پانی پھیلا ہوا تھا اور سامنے بھی پانی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا تھا۔

اب عابد کو نائمہ کے آنے کا پوری شدت اور بے چینی سے انتظار تھا، جبکہ کوچ جن کو اپنے ساتھی پر حیرت ہوئی جو کہ ان سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ ابھی تک کیوں اندر تھا؟ اس کی پیشانی پر ان گنت سلوٹیں نمودار ہو گئیں اور دوسرے ہی لمحے جب اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش چاہی تو وہ ہکا بکا سا رہ گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''اوہ..... یہ..... کیسے ہو گیا؟''

''کیا ہوا؟'' عابد نے چونک کر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

''دروازہ اندر سے لاک ہو گیا ہے۔'' کوچ جن نے جیسے دھماکا کیا اور یکلخت عابد کے چہرے پر تاریک سائے اترتے چلے گئے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔

''نک..... کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ مم..... میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اس نے اپنے پستول کا رخ کوچ جن کی طرف کرتے ہوئے چلا کر کہا، وہ یہی سمجھا تھا کہ کوچ جن نے ہی کوئی چالاکی کی ہے، مگر کوچ جن تب تک دروازے کی ایک سائیڈ پر لگے چھوٹے سے ڈیجیٹل آپریٹر پر لگے نمبروں والے بٹنوں کو تیزی سے پنچ کرنے میں مصروف تھا۔ مگر ہر بار اس ڈیجیٹل آپریٹر کی اسکرین پر سرخ رنگ میں ''LOCKED'' لکھا ہوا ابھر آتا۔ بالآخر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے عابد کے سامنے ایک اعصاب شکن انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ دروازہ اب کبھی نہیں کھل سکتا۔ اسے کوڈ لگا کر اندر سے بند کر دیا گیا ہے۔'' یہ سن کر عابد کو یوں لگا جیسے یہ ایٹمی آبدوز قبل از وقت ہی ایک دھماکے سے پھٹ گئی ہو۔ اس کے منہ سے بے ربط نکلا۔

''نک..... کس نے..... نک..... کیا یہ؟..... نک..... کیسے..... ہوا یہ؟ کہیں..... تت..... تم نے تو نہیں کیا کچھ؟'' الفاظ جیسے اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔

''میرا بھلا کیا قصور ہے؟ میں تو خود تمہارے ساتھ ہوں میرا اپنا ساتھی بھی تو اندر رہ گیا ہے۔'' کوچ جن بولا۔ ''یہ سب اندر سے ہی کیا گیا ہے، شاید کمیونیکیشن روم سے۔''

''مگر کیوں؟ کیوں ایسا کیا گیا ہوگا؟ اس وقت تو سب کو اپنی جانیں بچانے کی پڑی ہوگی؟''

''یہ یقیناً اس خبطی کپتان پریمانن کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سب لوگ اس وقت اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہوں گے مگر پریمانن یہ نہیں چاہتا ہوگا، وہ اپنی آبدوز کو تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم خود بھی تو اب تک اس پاگل جنونی کپتان کے بارے میں اندازہ قائم کر چکے ہوگے۔''

''اب اس کا حل کیا ہے؟ جلدی بتاؤ۔'' عابد نے اس کی بات کاٹ کر عجلت میں کہا، اس کی سانس مارے وحشت کے پھول رہی تھی، جیسے وہ طویل مسافت طے کر کے آیا ہو۔

''مم..... میری ساتھی اندر ہے۔ میں اس کے بغیر کبھی بھی اس منحوس آبدوز سے رخصت نہیں ہوں گا۔ یہ بات اچھی طرح سے کان کھول کے سن لو کوچ!'' عابد غم و غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ایک خوفناک اور متوقع اذیت ناک دکھ سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں اور جیسے اس کی چشم تر میں نائمہ کا حسرت زدہ چہرہ بار بار رقصاں ہو رہا تھا۔ گویا کہہ رہی ہو۔

''الوداع میرے محبوب! ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ بس! میرے وعدے کا پاس رکھنا، جو وقت رخصت میں نے تم سے لیا تھا کہ عابد! ایک وعدہ کرو مجھ سے..... اگر خدانخواستہ ہم پر کوئی ایسا کڑا وقت آئے تو تم، میری فکر کرنے کے بجائے صرف اپنے مشن کو ہی ترجیح دو گے، مجھے نہیں۔ کرو وعدہ عابد! وقت کم ہے۔''

اور..... وقت واقعی کم تھا۔ آج اسے صحیح معنوں میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ نائمہ سے کس قدر شدید محبت کرنے لگا تھا۔

''اس کا کوئی حل نہیں رہا اب۔'' معاً کوچ جن کی آواز اس کی دم بہ خود سماعتوں سے ٹکرائی۔ ایسے میں عابد کو اس کی آواز بڑی سنگ دل، بڑی بے رحم لگی تھی۔ وہ آگے بولا۔

''یہ نان مینوئل اور بائی کوڈنگ لاکڈ ہیں۔ اسے اب کوئی نہیں کھول سکتا، سوائے اس کے جس نے اسے لاک کیا
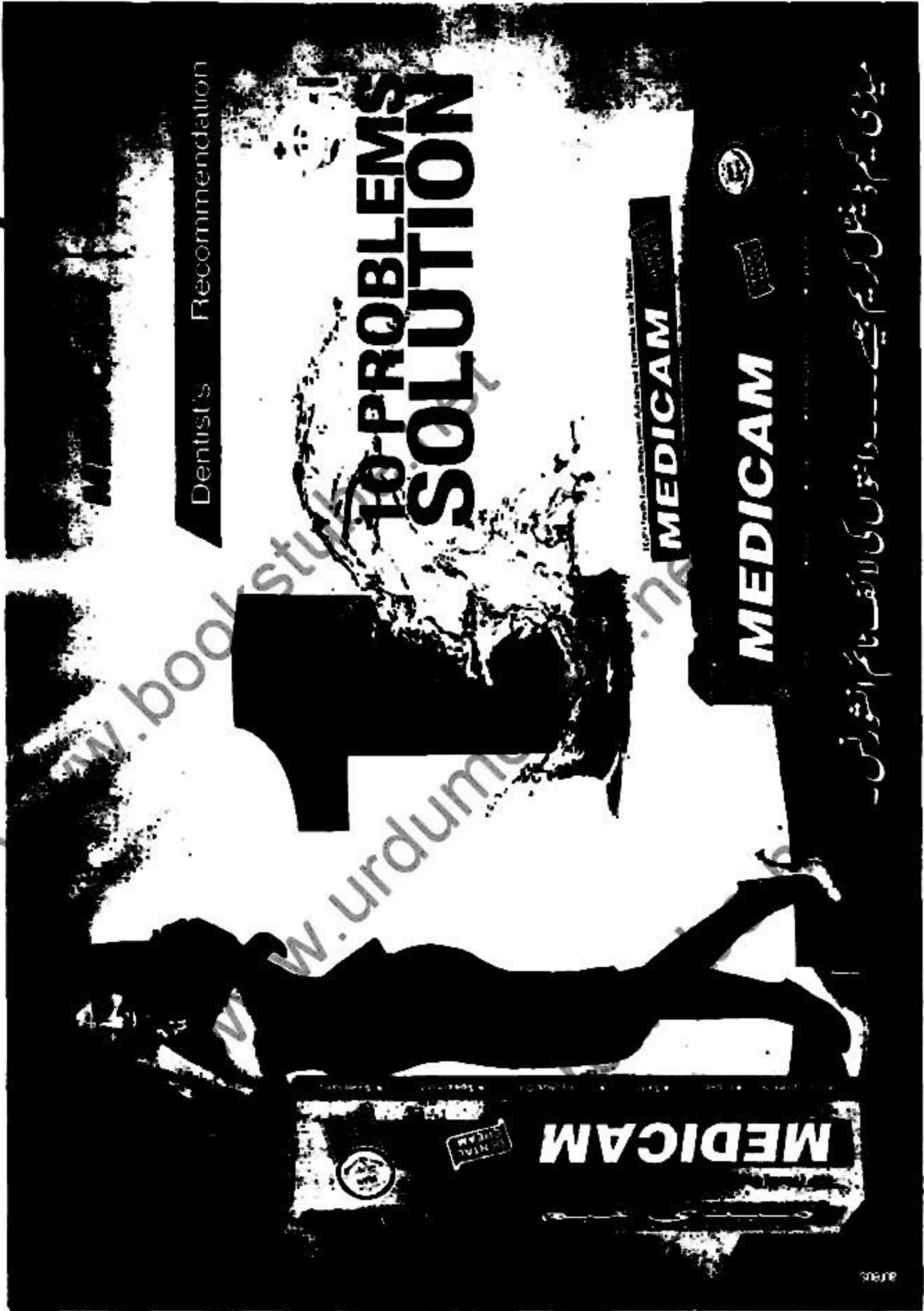
Dentist's Recommendation
1
10 PROBLEMS
SOLUTION
MEDICAM
MEDICAM
MEDICAM
میڈی کیم ڈینٹل کریم جیسے ۔۔۔ دانتوں کی لائف ٹائم انشورنس ۔

ہے۔ دیکھو! وقت بیتا جا رہا ہے۔ جلدی کرو۔"

کوچ جن گھبرانے لگا مگر عابد جیسے پاگل سا ہونے لگا تھا۔ عین لب بام، وہ نائمہ سے اس طرح جدا ہونے کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا دل کیا روح تک یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ وہ اس طرح نائمہ کو اس منحوس آبدوز میں چھوڑ کر چلا جائے جو کسی بھی وقت جہنمی بننے والی تھی لیکن ایسے میں اس کے وعدے کے الفاظ بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ اچانک کوچ جن نے اس کی کیفیات میں گم ہونے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر وار کیا۔ پستول عابد کے ہاتھ سے نکلا اور جمع شدہ پانی میں کہیں غائب ہوگیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے عابد کے جبڑے پر ایک زوردار گھونسے کی شکل میں دکھایا۔

فرش پر سیلن ہونے کی وجہ سے عابد سنبھل نہ سکا اور چند قدم لڑکھڑا کے پھسل کے گر پڑا۔ اس پل کوچ جن نے... بہ سرعت کیپسول نما موٹر بوٹ آبدوز کی جانب پیش قدمی کی اور اس کی چھت والی سمت پر جست بھری جدھر ایک حصہ سلائڈ ہو چکا تھا۔ وہ اس کے راستے اندر داخل ہوا تو عابد نے بھی اسے فرار ہوتے دیکھ کر کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی طرح چھلانگ لگائی۔ جس سے کوچ جن اندر کنٹرول سیٹ سنبھالنے کے بعد چھت والا دروازہ بند کر رہا تھا، تب تک عابد بھی گویا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

دروازہ سلائڈ ہوا مگر عابد نے اپنے جسم کو بوٹ کے مختصر خلا میں اس طرح پھنسا دیا کہ دروازہ پورا نہ بند ہو سکا۔ اور یہ بات واضح تھی کہ جب تک دروازہ پورا بند نہ ہوتا، کیپسول بوٹ کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا تھا۔

فرار ہونے کے عین آخری لمحات میں اس ناکامی پر کوچ جن مارے وحشت کے جنوں خیز انداز میں غرانے لگا اگرچہ وہ بوٹ اسٹارٹ کر چکا تھا مگر ناچار اسے کنٹرول سسٹم سے توجہ ہٹا کر عابد کے مقابلے میں آنا پڑا۔ اس نے عابد کے ساتھ زور آزمائی شروع کر دی اور اس پر تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگا۔ عابد کو بیک وقت دو محاذوں پر ڈٹے رہنا تھا ایک طرف وہ دروازہ بند نہیں ہونے دینا چاہتا تھا دوسرے وہ کوچ جن سے بھی نبرد آزما ہو رہا تھا۔ وہ شاید اس کی فرار کی کوشش ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ لہٰذا دونوں کے درمیان زور آزمائی جاری تھی۔ کوچ نے عابد کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دبوچی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پکڑے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جس نے عابد کے وجود کو خلا میں اٹکائے رکھا تھا۔ کوچ بھی جسمانی لحاظ سے عابد کے مقابل ہی تھا۔ صرف قد سے مار کھاتا تھا، مگر جسم اس کا خاصا گٹھا ہوا تھا۔ زور آزمائی کے دوران دونوں کی غراہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ عابد کو کوچ کی انگلیوں کے ناخن اپنی گردن میں پیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے اور دم بھی گھٹ رہا تھا۔ ناچار اس نے اپنے ایک ہاتھ کو روف کی چوکھٹ سے ہٹایا اور خود پر جھکے ہوئے کوچ کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے کراہ سی برآمد ہوئی، مگر اس مکار شخص نے عابد کی گردن نہ چھوڑی، البتہ اس کا ایک مقصد حل ہوگیا۔ اس حملے سے عابد کا توازن بگڑ گیا، اور کوچ نے اسے بہ آسانی اندر دھکیل دیا۔ عابد بوٹ کے اندر ایک حصے میں جا پڑا، اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی، اس دوران کوچ بھی اندر داخل ہو کے ایک بٹن دبا چکا تھا۔

ہلکی سرسراہٹ کی آواز ابھری تھی اور یک بیک دو عمل وقوع پذیر ہوئے۔ ایک تو روف کا دروا۔ وہ سلائڈ ہو کے بند ہوگیا دوسرے عابد بوٹ کے جس حصے میں گرا تھا، وہ یک دم ایک شیشے کی دیوار سے پارٹیشن ہوگیا۔ یعنی اب کوچ جن اور عابد کے درمیان شیشے کی دیوار حائل ہوگئی تھی۔ فوری طور پر عابد، کوچ جن کی اس چال کو نہ سمجھ سکا۔ جب وہ اپنے آگے سیٹ پر موجود کوچ پر جھپٹا تو اسی شیشے کی مذکورہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ تب اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اسے دشمن، ایک جگہ پر محبوس کر چکا ہے۔

اسی لمحے ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری اور بوٹ میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ بغرر دم کے فرش پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھی اور کھلے پانی میں اتر گئی۔ عابد جنونیوں کے سے انداز میں چیخنے لگا اور ساتھ ہی اپنا سر شیشے کی دیوار پر مارنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ یا تو وہ شیشہ توڑ ڈالتا یا پھر اپنا سر پاش پاش کر ڈالتا۔ دونوں میں کوئی ایک مرحلہ شاید قریب تھا کہ اچانک عابد والے پارٹیشن میں کوئی گیس سی بھرنے لگی۔ عابد کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا، وہ کھانستے کھانستے بے حال سا ہونے لگا اور اس کا سر بھی چکرانے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ کنٹرول سیٹ پر بیٹھے ہوئے کوچ نے عابد کے حصے میں کوئی گیس چھوڑ دی تھی۔ جس وقت عابد کی آنکھیں غنودگی کے باعث بند ہونے کے قریب تھیں، اس نے شیشے کے پار کوچ جن کو دیکھا جو ذرا گردن موڑے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے مکروہ چہرے پر بڑی بھیانک مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس کے بعد عابد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہی یہ کیپسول نما موٹر بوٹ آبدوز سمندر کی گہرائیوں میں سفر کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ آگوسٹا 291 سے دور ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

انٹرکام پر عابد کا پیغام پاتے ہی جیسے نائمہ نے سکون کا سانس لیا اور لیور چھوڑ کر وہ عابد کے بتائے ہوئے آبدوز کے بفر روم والے حصے کی طرف دوڑی تھی۔ بھاری گن اس کے ہاتھ میں تھی اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ بے رحم تقدیر، عابد اور اس کے درمیان، کیسے نازک موقع پر ایک اذیت ناک جدائی کا سفاک کلہاڑا چلا چکی تھی۔

ادھر کوچ جن کا پھنسا ہوا ساتھی پارکر، آبدوز کے اسپیکر پر کپتان پریمانن کا وہ پیغام سن چکا تھا اور اس کا چہرہ بھی ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ مایوس ہو کر وہ پلٹا تو اس کے تن بدن میں عابد اور بالخصوص اس کی ساتھی نائمہ کے لیے نفرت کی ایک لہری ابھری کیونکہ انہی دونوں کی وجہ سے یہ سب لوگ ایسے خطرناک حالات کا شکار ہو گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اسے بہرحال اس بات کی خوشی تھی کہ ان دونوں اہم دشمنوں میں سے ایک دشمن بھی اسی آبدوز میں ان کی طرح محبوس ہو چکا تھا۔

اب بفر روم کے دروازے پر زور آزمائی کرنا عبث تھا، کچھ سوچ کر وہ تیزی سے پلٹا۔ وہ نائمہ پر قابو پانا چاہتا تھا، تاہم اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری گن بھی تھی۔ دفعتاً اسے سامنے بل کھاتی تنگ اور نیچی چھت والی راہداری سے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ وہ یکدم دیوار کے ساتھ لگ کر، دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا اس نے سامنے سے نائمہ کو دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔

نائمہ کو دشمن (پارکر) کی گھات کا اندازہ تک نہ تھا کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھے ہوئے تھی کہ عابد نے کوچ جن اور پارکر کو اب تک گن پوائنٹ پر اپنے تابع کر رکھا ہوگا اور اسی جھونک میں وہ ذرا موڑ کاٹ کر جیسے ہی بفر روم کے دروازے کے قریب بڑھی پارکر نے فقط اپنی ایک ٹانگ نائمہ کی راہ میں اڑا دی اور وہ اس سے الجھ کر منہ کے بل فرش پر آرہی۔ بے اختیار نائمہ کے حلق سے ایک چیخ خارج ہوئی۔ گن اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ ربٹ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) بھی اس کے چہرے سے اتر گیا۔ شکر تھا کہ ابھی وہ زہریلی نیورو گیس یہاں تک نہیں پھیلی تھی،، اس کا اخراج ابھی سیل تھری تک ہی محدود تھا۔ تاہم حفظ ماتقدم کے تحت انہیں بھی کوچ جن کے اس عمل کی پیروی کرنا پڑی تھی۔ بہرطور، پارکر اس پر بھوکے شکرے کی طرح جھپٹا تھا۔

نائمہ وقتی طور پر حواس باختہ ہو گئی تھی مگر پارکر کے جھپٹتے ہی اس نے خود کو اس کی گرفت سے بچانے کی سعی بھی کی تھی۔ پارکر نے نفرت سے اپنے دانت بھینچتے ہوئے نائمہ کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی تھی مگر بروقت ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے نائمہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ پارکر کا گھونسا فرش پر پڑا اور مارے تکلیف کے اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی۔ نائمہ نے پھر اسے سنبھلنے نہیں دیا اور اسے ایک طرف دھکیل کر پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی گن اٹھانے کو دوڑی۔ پارکر نے اس کی ٹانگ دبوچ لی۔ وہ پھر منہ کے بل گرنے لگی مگر اس بار وہ محتاط تھی۔ اس نے خود کو کسی چوٹ سے بچانے کے لیے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے بچایا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکے ہوئے تھے۔ ایک ٹانگ پارکر نے دبوچ رکھی تھی۔ نائمہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے اپنے وجود کا بوجھ ڈال کر دوسری ٹانگ فرش سے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے پارکر کے چہرے پر رسید کر دی جو خاصی زوردار ثابت ہوئی۔ اس ضرب نے پارکر کے چہرے سے بھی ربٹ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) اتار پھینکا، ادھر گرفت کمزور پڑتے ہی اس نے زور لگا کر اپنی ٹانگ چھڑائی اور پھر گن اٹھانے کو لپکی، جیسے ہی اس نے گن اٹھائی پارکر بھی وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا مگر تب تک نائمہ نے گن اچک لی تھی اور نال اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے لٹھ کی طرح گن گھمائی اور اس کا کندا پارکر کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ ”بھچاک“ کی آواز ابھری اور پارکر کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ وہ کراہ نما چیخ کے ساتھ گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

نائمہ اس اعصاب شکن معرکے کے بعد چند لمحے دیوار کے سہارے کھڑی گہری گہری سانس خارج کرنے لگی پھر احتیاط کے پیش نظر اس نے اپنا ماسک اٹھا کر اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب آخر ہوا کیا تھا؟ اس کے اندازے کے مطابق پارکر کو عابد اور کوچ جن کے ساتھ اس وقت بفر روم میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا یہ وہاں سے کسی وجہ کے باعث واپس پلٹ آیا تھا؟ مگر کیوں؟ پھر عابد

اور کوچ کدھر تھے؟ وہ متفکر سی ہونے لگی بہر طور اس نے باتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر وہاں دروازہ بند پا کر وہ گھبرا سی گئی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ بند تھا۔ اس نے پیہم کوشش کر ڈالی۔ دروازہ نہ کھلا تو اس نے چلا چلا کر عابد کو پکارنا شروع کر دیا مگر جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ ہانپنے لگی۔ اس کے دل و دماغ میں تشویش کی لہری اٹھی سو طرح کے اندیشناک وسوسے اس کے اندر سر اٹھانے لگے۔ کیا عابد کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا ہوا اور عین آخری لمحات میں کوچ جن اس کے ساتھ کوئی چال چلنے میں کامیاب ہو چکا تھا؟ اگر بدقسمتی سے ایسا ہوا بھی تھا تو پھر خود عابد کہاں تھا؟ کہیں خدانخواستہ اسے کوئی جانی نقصان تو نہیں پہنچا؟ اس نے فوراً عابد کی سلامتی کے لیے زیر لب دعائیہ کلمات ادا کیے اور دوسرا خیال اس کے پرسوچ ذہن میں یہی ابھرا کہ ممکن ہے اسے ایسا کوئی موقع نہ مل سکا ہو اور وہ اس کے ساتھ کیے گئے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خود ہی نکل گیا ہو؟ یہ سوچ کر نائمہ کے اندر فطری طور پر ایک کسک سی جاگی مگر صرف ایک لمحے کے لیے...... پھر اس نے پرعزم ہو کے خود کو موجودہ حالات کے لیے تیار کیا کہ اب آگے جو کچھ کرنا تھا، اسے اکیلے ہی کرنا تھا۔ وہ پلٹی اور ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

اسے اندازہ تھا کہ اس وقت آبدوز ایسے حالات کا شکار تھی کہ عملے کو اپنی یا آبدوز بچانے کی فکر لاحق تھی اور اس کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سب لوگ یقیناً دوسری طرف مصروف ہوں گے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا، کپتان پریمانن کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ کوچ جن آبدوز سے کوچ کر چکا تھا اور دشمن بھی نہیں پکڑے جا سکے تھے اب تک۔

نائمہ محتاط روی سے چلتی ہوئی ایسے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچی جس کے اندر سے کپتان پریمانن کی گونجیلی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ دم سادھے سننے لگی۔

☆☆☆

کپتان پریمانن کا ایسی صورت حال اور ایسے مسائل سے نمٹنا اس کی ملازمت کا حصہ تھا۔ لہٰذا وہ جانتا تھا کہ اسے ان پرخطر حالات کو مات دینے کے لیے اپنا سارا علم بروئے کار لانا ہوگا۔ آبدوز کے الارم چیخ رہے تھے، اس کی ضد اور حکم کے سامنے پورا عملہ اب اس کے ساتھ تھا۔ وہ چند ایکسپرٹ کو اپنے ساتھ لے کر سیل تھری کی طرف بھاگا۔ سیل کے ساتھ بنی ہوئی سیڑھی چڑھا اور اوپر جا کر کنٹرول پینل کی طرف لپکا۔ اس نے جلدی سے کنٹرول پینل پر پمپ چلانے کا بٹن دبا دیا اور دوسرے ہاتھ سے الارم کا بٹن بند کر دیا۔ چیختے ہوئے الارم اس وقت اس کے اعصاب کو بری طرح چٹخانے کا سبب بن رہے تھے مگر الارم بند نہیں ہوئے تھے۔ وہ حیران سا ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے کنٹرول پینل کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس نے دھیان لگایا مگر یہ الارم وہ نہیں تھا جو پہلے بج رہا تھا بلکہ یہ دوسرا الارم تھا۔ اس نے ایک بار پھر کنٹرول پینل کی طرف دھیان سے دیکھا۔ کیمیاوی لیک کی نشاندہی کرنے والی سرخ رنگ کی سوئی خطرے کے زون کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ سمندر کا پانی ایک ایٹمی میزائل سے لیک ہونے والے کیمیکل سے مل رہا تھا اور کسی وقت بھی ایٹمی میزائل پھٹ سکتا تھا۔ سیل تھری میں نائٹرک ایسڈ بن رہا تھا جسے آخر کار میزائل میں سرایت کر جانا تھا۔ گویا سمندر کے اس مقام پر رات کے اس درمیانی پہر وار ہیڈ لے جانے والا ایٹمی میزائل راکٹ پھٹ جانے سے تباہی کا منہ کھلنے والا تھا۔

اس کے ساتھی عملے کو کچھ زیادہ ''اچھے'' کی امید نہ تھی، ان کے خیال کے مطابق کپتان پریمانن پاگل ہو چکا تھا اور یہ ساری کوشش عبث ہی کر رہا تھا مگر نائب کپتان پیٹر نوت کا حشر دیکھ کر ان میں ویسے بھی اعتراض کرنے کی جرأت نہیں رہی تھی۔

بہر طور پریمانن نے انٹرکام مائیکروفون پکڑ لیا اور جلدی جلدی اعلان کرنے لگا۔ ''ٹیوب نمبر تین اور چار میں سمندری پانی داخل ہو رہا ہے اور یہاں گیس بن رہی ہے۔ خبردار! کوئی بھی سیل تھری کا رخ نہ کرے۔''

آبدوز کو گہرے پانیوں سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی گئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ اس کوشش میں آبدوز کو واضح طور پر ایک جھٹکا محسوس ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اٹھی بھی رہی اس وقت پریمانن کا ایک ہاتھ اس سرخ بٹن پر تھا جس پر جلی حروف میں تین لکھا تھا، اس کا سرخ رنگ کا ہینڈل بھی تھا جو تین نمبر ٹیوب کا ڈھکن کھولتا تھا۔ وہ بٹن دبا کر ڈھکنا کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران کیمیکل کے ری ایکشن سے بننے والے دھوئیں کی نشاندہی کرنے والا الارم بجنے لگا۔ میزائل روم کا عملہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں گیس پوری آبدوز میں نہ پھیل جائے، میزائل روم کے راستوں کے ڈھکن بند کر دیے گئے۔ پریمانن انٹرکام کے ذریعے پریشان عملے کو اب تسلیاں دینے لگا مگر اس کی

آواز کا کھوکھلا پن اس کی لرزتی آواز سے صاف عیاں تھا۔ جبکہ وہاں سب لوگ آنے والے خوفناک خطرے سے پوری طرح باخبر تھے۔

آبدوز سطح آب کی طرف اٹھنے کی حالت میں تھی اور اس کا منہ اوپر کی طرف ہو چکا تھا۔ اسی لیے آبدوز کے اگلے حصے میں سے دھماکے کی آواز ابھری۔ وہاں موجود سب کی دہشت کے مارے چیخیں نکل گئیں، ایک نے چلا کر کپتان سے کہا۔

”تم ایک پاگل جنونی انسان ہو، اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔ ہم سب لوگ کوئی معمولی انسان یا مسافر نہیں ہیں، بلکہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے ٹاپ پروفیشنل ہیں۔ ہم زندہ رہیں گے تو ایسی بیسیوں آبدوزیں بنالیں گے۔ تم اپنی ہٹ دھرمی سے ہمیں ضائع کر دو گے۔ یہ ملک و قوم اسرائیل کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔“

پریمانن نے اس شخص کو پہلے تو خشمگیں نظروں سے گھورا پھر کچھ سوچ کر تحمل سے بولا۔ ”تم لوگ بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ میں پہلے بھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا کر چکا ہوں۔ مجھے امید ہے..... دشمنوں نے ہماری سونڈ میں گھس کر جو گل کھلایا ہے، میں اس پر قابو پالوں گا، بس! تم سب میرا ساتھ دو، میرے پاس اس کا ایک اور حل ہے۔ جب جسم کا کوئی اعضا بےکار ہو جاتا ہے تو اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اس کا زہر پورے جسم کو متاثر کرنے کا سبب نہ بنے۔ جو میزائل خرابی کا باعث بن رہا ہے میں اسے فائر کرنے والا ہوں، جانتے ہو کہاں؟“

آخر میں اس کا لہجہ ہولناک ہو گیا۔ وہاں موجود سب اس کی طرف یک ٹک دیکھنے لگے۔ وہ آگے بولا۔ ”میں اس میزائل کو لیبیا کی بندرگاہ بن غازی پر داغنے والا ہوں، کیونکہ فی الوقت، فلسطینی مجاہدین کی سب سے زیادہ امداد کا ذریعہ یہی اسلامی ملک ہے اور اسی بندرگاہ کے راستے جہازوں میں ان کے لیے امداد... لاد کر حیفہ یا فلسطین لائی جاتی ہے۔“

یہ سن کر سب کو کافی حوصلہ ہوا اور سب نے پریمانن اور گریٹر اسرائیل کے حق میں نعرہ بلند کیا۔ دروازے سے لگی سرتاپا سماعت بنی نائمہ اس یہودی کپتان پریمانن کے ناپاک عزائم جان کر ایک لمحے کو لرز اٹھی مگر دوسرے ہی پل نائمہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر اپنے اس پختہ عزم کا اعادہ کیا کہ وہ اس یہودی کپتان پریمانن کو کسی ایسے ناپاک ارادے میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ چاہے اس

مکڑی اپنے جالے میں

کیوں نہیں پھنستی...؟

مکڑی کے جسم میں چھوٹی چھوٹی نلکیاں یا ٹیوبیں ہوتی ہیں جنہیں تار بنانے والے اعضا کہتے ہیں۔ ان ٹیوبوں میں سے وہ رقیق مادہ نکلتا ہے جو ہوا لگنے سے تار یا دھاگا بن جاتا ہے۔ مکڑی انہی دھاگوں سے جالا بنتی ہے۔ یہ دھاگے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک دھاگا لیس دار ہوتا ہے۔ مکھی، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے اسی دھاگے میں پھنستے ہیں جبکہ دوسرا دھاگا لیس دار نہیں ہوتا۔ مکڑی جالے پر چلتی ہے تو اسی دھاگے پر چلتی ہے، اس لیے وہ اس جالے میں نہیں پھنستی۔ اگر کبھی غلطی سے مکڑی کا پاؤں اس لیس دار دھاگے پر پڑ جائے تو اس کا جسم دھاگے سے چپک جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے جسم سے تیل جیسا ایک مادہ نکالتی ہے جس سے اس کا جسم دھاگے سے چھوٹ جاتا ہے۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

پرچہ

باپ لڑکے سے۔ ”آج تمہاری ٹیچر کی طرف سے مجھے پرچہ ملا ہے۔“

لڑکا۔ ”ابو آپ بےفکر ہو جائیں۔ میں امی کو نہیں بتاؤں گا۔“

مرسلہ: کاشف حسین، کراچی

کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

☆☆☆

صحرا میں سفر کرتے ہوئے..... رات کا آخری پہر آن پڑا تھا۔ لیتنی اپنے زخمی امیر محسن اور نومسلم بازغہ کو، جس کا اب اسلامی نام محسن نے بانو رکھا تھا، بیت صفانہ کی طرف گامزن تھا۔

پو پھٹنے تک یہ تینوں اپنے محفوظ ٹھکانے تک پہنچ چکے تھے۔ لیتنی انہیں یہاں چھوڑنے کے کچھ گھنٹوں کے بعد اکیلا تیونائی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

گروپ کے ساتھیوں نے محسن اور بالخصوص بازغہ (جواب بانو تھی) کو کھلے دل سے اپنے ٹھکانے پر خوش آمدید کہا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے مطابق محسن کا خاطر خواہ علاج کیا جانے لگا تھا اور بانو (بازغہ) بھی پوری تن دہی کے ساتھ اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

اس دوران بانو نے محسوس کیا کہ محسن کا چہرہ کچھ اترا اترا سا رہنے لگا تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا تھا کہ شاید بیماری کے باعث اور کچھ حالات نے محسن کے ذہن پر منفی اثر ڈالا تھا۔ بالآخر اس نے ایک روز پوچھ ہی لیا۔ بہت پیار سے اس نے محسن سے کہا۔ ''محسن! کیا بات ہے؟ تم کچھ اداس سے نظر آنے لگے ہو؟ کیا مجھ سے کچھ غلط ہوگیا ہے؟''

محسن اس کی بات پر چونکا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے بانو کے معصوم سے دلکش چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''نہیں بھلا تم سے مجھے کیا شکایت ہوسکتی ہے۔'' پھر اس کے چہرے پہ پھیکا پن سا اتر آیا اور وہ اسی لہجے میں آگے بولا۔ ''بانو! مجھے بس ایک قلق سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے ساتھی اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور میں یہاں آرام کر رہا ہوں۔ یہی بات مجھے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جارہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے محسن کا چہرہ نہایت آزردہ نظر آنے لگا۔

بانو سے اس کے اندر کا یہ دکھ دیکھا نہ گیا۔ تڑپ کر بولی۔ ''محسن! میں اللہ تعالیٰ سے ہر روز تمہاری صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ آپ کو مکمل اور جلد سے جلد صحت عطا فرمائے اور آپ ایک بار پھر دشمنوں کے خلاف سربکف ہوجائیں اور آپ کی ہر اس مہم میں، خود میں بھی آپ کے شانہ بشانہ رہوں۔''

''آمین!'' محسن زیر لب بولا۔

''ثم آمین!'' بانو نے بھی دھیرے سے اور سچے دل سے کہا تھا۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے، فلسطینی مجاہدوں کے کمانڈنگ اینڈ میجر گروپ ''غضب خدا'' کے سربراہ خلیل الوزیر کے اسرائیلیوں کے ہاتھوں بہیمانہ قتل (شہادت) کے بعد اب اس کی ڈور ان کے نائب یاسر العربی کے ہاتھوں میں آگئی تھی، جو ایک پختہ العمر اور دراز قامت عرب فلسطینی مجاہد تھے، اور کچھ عرصہ قبل انہوں نے تل کرم میں ایک مسلم تاجر کے مکان کے تہ خانے میں، تحریک آزادی فلسطین کے مختلف گروپس، بہ شمول پی ایل ایس او، الجہاد اور پی فرنٹ وغیرہ کی ایک اہم میٹنگ کال کی تھی۔

اس اہم میٹنگ میں اسرائیلیوں اور بالخصوص ان کی مکڑی کے جال کی طرح پھیلی ہوئی خفیہ ایجنسیوں موساد، ڈیوڈ اسٹار، اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس، ہگانہ آرمی اور کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنسیز۔ الیا بیتھ اور ''شن بیتھ'' وغیرہ کے کالے کرتوتوں کا راز فاش کرتے ہوئے نئی حکمت عملی بتائی تھی، جس کے مطابق متذکرہ بالا فلسطینی تنظیموں کو الگ الگ ان کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف مہمات پر روانہ کردیا گیا تھا۔

جبکہ خود اپنے ذمے یاسر العربی نے ہگانہ کے سربراہ، بانی اور یہودی قوم کے موروثی ہیرو، آئزر مین بیری جونیئر کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، چونکہ یہ نسبتاً مشکل اور پرخطر مہم تھی، نیز اس کے مقابلے میں گھاگ اور انتہائی تربیت یافتہ فلسطینی کمانڈوز کی ٹیم کا شامل ہونا ضروری تھا، جو خود بھی ایک بڑی افرادی قوت کی حامل ہوتی۔ لہٰذا یاسر العربی نے یہ اہم ترین مہم اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔

بڑی جانفشانی اور صبر واستقامت اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر یاسر کے ایک خفیہ گروپ نے ہگانہ آرمی اور آئزر مین کے ٹھکانے ''وائٹ کیسل'' کا پتا چلایا تھا۔ یہی نہیں اس کی دو کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنسیز، الیا بیتھ اور شن بیتھ کا بھی کہ وہ کہاں کہاں بیٹھ کر گل کھلاتی پھر رہی تھیں اور دونوں ایجنسیاں ہی درحقیقت ہگانہ کے دو ایسے بازو تھیں جن کے باعث ہی ہگانہ قائم تھی۔ اگر یہ دونوں بازو کاٹ دیے جاتے تو ہگانہ کو سنبھلنے میں کافی وقت لگتا اور تب تک اس کا صفایا بھی کیا جاسکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ''غضب خدا'' خود ان دنوں فلسطین کے اندرونی معاملات اور کچھ ہنگامی حالات جیسے مسائل میں الجھی ہوئی تھی، جن سے یاسر العربی کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ یہودیوں کو ایک سازش کے تحت فلسطینی علاقوں میں بسانا اور فلسطینی عوام کے لیے خود ان کی زمین ان پر تنگ کرنا اور بعض کو ڈرا دھمکا کر مکاری اور چال بازی سے اپنی ہی املاک اونے پونے یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور کرنا، یہ وہ گمبھیر مسائل تھے جس سے یاسر العربی سخت فکرمند تھے۔ اس کے لیے انہوں نے عالمی سطح پر بھی صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اپنے طور پر بھی وہ یہودیوں کی اس سازش کو ناکام بنانے میں مصروف تھا۔

''غضب خدا...'' چونکہ تحریک آزادی فلسطین میں مجاہدین کا سب سے بڑا گروپ تھا، اس پر اسی حساب سے زیادہ مسئلے اور ذمے داریاں عائد تھیں۔ یہی سبب تھا کہ بیرونی معاملات کے مشن اور مہمات میں غضب خدا نے دیگر گروپوں کو مصروف کر رکھا تھا۔

ہگانہ کا قلع قمع کرنے کے لیے یاسر العربی خود بھی تیار تھا۔ لہٰذا اسی دوران جب اس کے کسی ساتھی نے اسے محسن اور بازغہ (بانو) کے بارے میں بتایا کہ وہ آج کل بیت

صفانہ میں موجود ہیں تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یاسر العربی، محسن کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے گروپ میں ایک نڈر، جوشیلا اور بہادر نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور شہید خلیل الوزیر کے بعد اپنے گروپ کی باگ اس کے ہاتھوں میں تھی (آج کل گروپ کی قائم مقام لیلیٰ آفندی تھی) یاسر کو یہ بھی معلوم تھا کہ محسن آج کل زخمی حالت میں تھا۔ بہرطور اس نے محسن کے نام ایک پیغام لکھا اور اپنے ایک ساتھی کو قاصد بنا کر بیت صفانہ کی طرف روانہ کر دیا۔

☆☆☆

ڈیوڈ اسٹار اسٹیٹ کی اہم کمانڈ پوسٹ پر لیلیٰ، باقر اور ان کے ساتھی، اگرچہ کامیابی سے اپنا قبضہ قائم کر چکے تھے مگر پانچویں اسرائیلی شوٹر کا پراسرار "غیاب" ان کے لیے بے چینی کا باعث بنا ہوا تھا۔

"اس پانچویں دشمن کو تلاش کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔" لیلیٰ نے پرغور لہجے میں کہا۔

باقر بولا۔ "ممکن ہے وہ یہاں سرے سے موجود ہی نہ ہو ہم بلاوجہ اس کی تلاش میں اپنا وقت ضائع کریں۔ ہمیں اپنی مہم جاری رکھنی چاہیے۔" باقر کی بات پر علی نے بھی گویا توثیق کرتے ہوئے لیلیٰ سے کہا۔

"یہی مناسب رہے گا عزیزی لیلیٰ! کیونکہ کمانڈ پوسٹ پر ہم زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے، یہ ہمارے مشن کے لیے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے بھی خطرناک اقدام ہوگا۔"

لیلیٰ ہونٹ بھینچے سوچنے لگی۔ پھر اس نے پیش قدمی کا حکم دے ڈالا۔ کمانڈ پوسٹ کے مورچے کی منڈیروں پر اب صبح کاذب کی سنہری کرنیں پڑنے لگی تھیں۔ یہ سب ایک درمیانے سائز کے کمرے میں موجود تھے۔ پانچویں دشمن کو انہوں نے بہت تلاش کیا تھا، بالآخر یہ چاروں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اب اپنی اسنائپرز گنیں کھول کر اپنی کمانڈو کٹس میں ڈال کر ہیوی گنیں تھام لیں۔

کمانڈ پوسٹ پر قبضے کے بعد یہ سب ایک طرح سے اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ سامنے خاردار باڑھ تھی جس میں خطرناک ہائی فریکوئنسی والٹیج دوڑ رہی تھی۔ بائیں جانب صحرائی میدان تھا جبکہ دائیں جانب جنگل تھا۔ وہ اسی رخ پر آگے بڑھے۔

☆☆☆

گزشتہ ناکام مہم سے، بہ خیر و عافیت واپسی کے بعد لیلیٰ اور باقر کو یہاں کا سارا نقشہ ازبر تھا، باوصف اس کے حسن علی کی کھجوروں کے فارم والی رہائش گاہ سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنا ہوم ورک بھی کر رکھا تھا اور ان کا مشن صرف ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ہی تباہ کرنا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بڑے اسرائیلی شیطان، نہایت سفاک اور ننگ انسانیت اور ہزاروں بے گناہ فلسطینیوں کے قاتل جنرل آئزک فرناش کو بھی واصل جہنم کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے اور اس بار بالخصوص لیلیٰ اور باقر نے تہیہ کر رکھا تھا، وہ اب ناکام نہیں ہوں گے، بلکہ مشن پورا کرنے کے لیے وہ اپنی جانوں پر بھی کھیل جانے سے دریغ نہیں کریں گے۔

بہرطور، یہ چاروں دن کی روشنی پوری طرح پھیلنے سے پہلے پہلے اسٹیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس بار انہوں نے ہیڈ کوارٹر پر نقب لگانے کے بجائے، سب سے پہلے اسٹیٹ کا رخ کیا تھا اور یہاں وہ ایک رہائشی کالونی میں موجود تھے۔ یہاں انہیں کچھ مخصوص وردی پوش اسرائیلیوں کی آمدورفت دکھائی دی تھی یہاں دو کیٹیگریز کی رہائشی کالونیاں تھیں، ایک آفیسرز کالونی اور دوسری اسٹاف یعنی کوارٹرز کالونی تھی۔

ایک مربوط حکمت عملی کے تحت، ان چاروں نے سب سے پہلے ہیڈ کوارٹر کے اندر داخل ہو کر وہاں خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم نصب کرنے تھے اور اسی دوران جنرل آئزک فرناش کو بھی تلاش کر کے جہنم واصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

اس بار تیونائی آپریشن کو "اسالٹ" کے بجائے مکمل طور پر "کمانڈوز" کی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یعنی جو کچھ کرنا تھا، خفیہ طور پر کرنا تھا۔

چنانچہ یہ چاروں چھپتے چھپاتے اپنے اصل ٹارگٹ، یعنی ڈیوڈ اسٹار کی عمارت کی طرف بڑھنے لگے، جو یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھی اور انہیں صاف نظر بھی آ رہی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق یہ اندر داخل ہونے کا بہترین وقت اور موقع تھا۔ صبح ہو رہی تھی اور ایسے میں فطری طور پر ہر کوئی "السایا" ہوا سا ہوتا تھا۔

ڈیوڈ اسٹار کی عمارت چونکہ ایک بڑی اسٹیٹ کے اندر ہی تھی، مگر باوجود اس کے وہاں پہرا نظر آتا تھا لیکن اب لیلیٰ وغیرہ کو خاطر خواہ طریقے سے گھات مل چکی تھی۔ اسی لیے وہ محتاط روی کے ساتھ اپنی پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے۔ کسی کے یہاں شاید تصور میں بھی نہ ہوگا کہ چار فلسطینی کمانڈوز اس وقت ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ میں دندناتے پھر رہے تھے۔ وقت متقاضی تھا کہ بہ سرعت ہیڈ کوارٹر کے اندر داخل ہوا جائے۔۔ بصورت دیگر کسی وقت بھی یہاں کمانڈ پوسٹ کے مورچے سے

متعلق اطلاع پہنچ سکتی تھی اور پھر کوئی بعید نہ تھا کہ آنا فانا پورے اسٹیٹ میں ان کی ڈھنڈیا پڑ جاتی۔

ہیڈ کوارٹر کے قرب و جوار میں کچھ چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ لیلیٰ کی عقابی نگاہیں تیزی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور دفعتاً وہ چونکی۔ اس نے ایک آدمی کو ایک قریب کھڑے ٹرک کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ ٹرک نسبتاً الگ تھلگ مقام پر کھڑا تھا۔ اس سے محض چند قدموں کے فاصلے پر یہ چاروں ایک چبوترا نما دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ ٹرک کو دیکھ کر لیلیٰ کے ذہن طباع میں ایک امید افزا کھٹک ابھری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آدمی ہیڈ کوارٹر کے جس حصے سے نمودار ہوا تھا اس کا اس نے اوپر اٹھنے والا بڑا سا دروازہ دوبارہ گرا یا نہیں تھا، جس کا مطلب لیلیٰ کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ یہ آدمی اس ٹرک کو کسی ضرورت کے پیش نظر اسٹارٹ کر کے اندر لے جانے کا ہی ارادہ رکھتا تھا۔

چنانچہ لیلیٰ پیش قدمی روک کر بہ غور اس کی طرف تکنے لگی، وہ آدمی اپنے حال میں جھومتا جھامتا ٹرک میں سوار ہوا اور اسے اسٹارٹ کر کے دو تین بار ایکسلریٹر دبا کر ریس دینے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے لیلیٰ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ ٹرک کچھ اس انداز میں ریورس کیا جانے لگا کہ اس کا رخ مذکورہ راستے کی طرف ہو گیا تب اچانک لیلیٰ نے سرسراتی سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ ٹرک تھوڑا بیک ہوا اور تب تک یہ چاروں کمانڈوز محتاط روی سے جھکے جھکے چھپتے ہوتے ٹرک کی طرف بڑھے۔ اس دوران انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ ڈرائیور کی نظر ان پر نہ پڑے، کیونکہ بیک ہوتے ٹرک کا ڈرائیور سائڈ مررسے انہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹرک رک کر جیسے ہی کھلے گیٹ کی طرف آگے بڑھا یہ چاروں اس کے اندر سوار ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ٹرک اندر تھا مگر دروازہ ویسے ہی کھلا رہا۔ تاہم نسبتاً اب یہ باہر کے مقابلے میں یہاں کچھ محفوظ تھے۔ پھر بھی احتیاط کا دامن سنبھالے رکھتے ہوئے، نہایت پھرتی کے ساتھ لیلیٰ کے اشارے پر علی اور عبداللہ تیزی سے حرکت میں آئے اور انہوں نے ڈرائیونگ کیبن میں گھس کر ڈرائیور کو ٹھکانے لگانے کا کام نمٹا دیا...

عمارت کے اندرونی گوشے میں داخل ہونے کا راستہ دکھائی دے گیا جو ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ بہت تیزی اور گربہ قدمی سے انہوں نے یہ راہداری طے کی تھی۔ اس کے بعد یہ عمارت کے اندر پوری طرح سے داخل ہو چکے تھے۔ ان کی حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ کسی سے ٹاکرا ہوئے بغیر یہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام نمٹا کے نکلنے اور جنرل فرناش کو تلاش کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کریں۔

یہاں ابھی چہل پہل کم ہی نظر آرہی تھی اسی لیے بہت تیزی کے ساتھ یہ اپنا کام نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ عمارت کے اہم اور خفیہ گوشوں میں خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم فٹ کیے جانے لگے۔ ایک موقع پر لیلیٰ جب باقر کے ہمراہ ہیڈ کوارٹر کے وار روم کے اندر دو عدد بم فٹ کر کے واپس پلٹنے لگی تو اچانک اس کی نگاہ دو اسرائیلیوں پر پڑی جو آپس میں ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور لیلیٰ کو دیکھتے ہی پہلے تو ان کے سر پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے بیک وقت اپنے ہولسٹروں سے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی، لیکن لیلیٰ نے اپنی کمانڈو کٹ کے کاندھے والے بیلٹ سے ایک چھرا نکالتے ہی ان کی طرف اچھال دیا جو سیدھا ایک کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ تیورا کر گرا، دوسرا پستول نکال چکا تھا اور اس کی نال کا رخ لیلیٰ کی طرف کیے ہوئے ہی تھا کہ لیلیٰ نے یہاں بھی بجلی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بھی اپنی آستین میں چھپا ہوا چاقو پھینک کر ہلاک کر ڈالا۔ لیلیٰ کے ساتھ علی آن ملا تھا۔ دونوں نے ان کی لاشوں کو کسی کونے میں دبکا دیا۔

ذرا دیر بعد باقر اور عبداللہ بھی اپنا کام نمٹا کر ان کے ساتھ آن ملے۔ ٹھیک اسی وقت انہیں وہاں افراتفری محسوس ہوئی۔ یہ چاروں بری طرح ٹھٹکے اور ان کے بشروں پہ تشویش کے آثار نمودار ہو گئے مگر دوسرے ہی لمحے لیلیٰ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی یہاں ہم پر کسی کو شبہ نہیں ہوا ہو گا لیکن کمانڈ پوسٹ پر ہمارے قبضے کا واقعہ ضرور آشکار ہو گیا ہو گا اور اسے جلد یا بدیر آشکار ہونا ہی تھا۔ یہ زیادہ دیر ویسے بھی چھپا نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے کہ وہاں سے ہیڈ کوارٹر کا ہر وقت رابطہ رہتا ہو گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیلیٰ! لیکن ابھی ہمارا کام مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہمیں باوجود کوشش کے جنرل آئزک فرناش کہیں

دکھائی نہیں دیا ہے۔" باقر بولا تو لیلیٰ نے کہا۔

"میں نے بھی اسے یہاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے بھی نہیں ملا۔ حالانکہ اسے ہلاک کرنے کا یہ سنہری موقع تھا کیونکہ ہمارا کمانڈو آپریشن اب تک کامیابی سے ہمکنار رہا ہے اب یہاں ویسے بھی ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں آفیسرز کالونی کا رخ کرنا پڑے گا...... آؤ۔"

چاروں اپنے ہاتھوں میں گنیں تھامے۔۔۔ اسی راستے کی طرف لپکے جدھر سے آئے تھے۔ اسی وقت سائرن بج اٹھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ دشمنوں کو ان کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہ لوگ اندر داخل ہو چکے ہیں لہٰذا اب انہوں نے بھی ذہنی طور پر خود کو جنگ کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اسی وقت دوڑتے بھاری قدموں اور زور زور سے بولنے کی بھی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ انہیں تسلی تھی کہ یہ اپنا کام کر چکے تھے اور دشمن ان کے "کام" کی بھنک بھی نہیں پا سکیں گے کہ کچھ دیر بعد یہاں کیسی خطرناک تباہی پھیلنے والی تھی۔ ہر ایک منٹ بعد دوسرا اور تیسرا بم پھٹنے والا تھا۔ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈکوارٹر کی تباہی کا مطلب اسرائیل اور موساد کا ایک بڑا جنگی نیٹ ورک سبوتاژ ہونا تھا۔ یہ اسرائیل کا ایک بہت بڑا نقصان ہوتا مگر انہیں جنرل آئزک فرناش کی بھی تلاش تھی۔ یہ چاروں اب تک بڑی مربوط پلاننگ اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی تگ و دو میں مصروف کار تھے۔ ابھی ان کے مشن کا آخری اور اہم مرحلہ باقی تھا اور وہ تھا جنرل فرناش کا خاتمہ۔

تہائی آپریشن کی نئی حکمت عملی کے تحت انہوں نے کسی سے بھی الجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اپنا کمانڈو ایکشن جاری رکھا تھا۔ یہ چاروں اب کسی سے الجھے بغیر اس عمارت سے باہر نکل جانا چاہتے تھے لیکن اب تا دیر یہ صورت حال ویسی نہیں رہ سکتی تھی۔ کہیں نہ کسی مقام پر ان کا سامنا اسرائیلی فوجیوں سے ہو سکتا تھا لیکن یہ سب عمارت میں عنقریب ہونے والے دھماکوں کے بعد ہوتا ان کے لیے زیادہ مفید ہوتا، کیونکہ اس وقت اسرائیلی فوجی بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتے۔ مگر بم پھٹنے کے انتظار میں لیلیٰ اور باقر وغیرہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا عمارت سے اب جلد از جلد نکلنا از بس ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ ذرا دیر بعد یہاں پھیلنے والی خوفناک تباہی کی زد میں یہ لوگ بھی آ سکتے تھے۔ عمارت سے باہر نکلنے کے لیے اب ان کے پاس صرف دس منٹ تھے۔

چاروں نے اپنے ہاتھوں میں گنیں تھامے ہوئی تھیں اور یہ زد میں آنے والے کسی بھی اسرائیلی فوجی کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے لیے تیار تھے۔

گیراج والے راستے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے اسی ٹرک میں باہر نکلنے کا ارادہ کیا اور عبداللہ نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ علی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ لیلیٰ اور باقر نے ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف چھلانگیں لگا کر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اگلے ہی لمحے ٹرک اسٹارٹ ہوا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔

اب کسی بھی وقت ان کا اسرائیلی فوجیوں سے دوبدو خونریز ٹاکرا ہونے والا تھا۔ ان کے اعصاب تن گئے تھے۔ ٹرک گیراج سے نکلا اور اس کا رخ طے شدہ منصوبے کے مطابق آفیسرز کالونی کی طرف تھا۔ باہر موجود اسرائیلی پہلے تو ٹرک کو دیکھ کر یہی سمجھے تھے کہ اس میں ان کے ساتھی ہوں گے مگر جلد ہی انہیں اپنا خیال رد کرنا پڑا۔ انہوں نے چلا کر ٹرک روکنے کا حکم دیا۔ عبداللہ ٹرک کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔ اسرائیلی فوجیوں نے اپنی گنوں کا رخ اس طرف کیا، مگر اس سے پہلے ہی ٹرک کے عقبی حصے کے آہنی جنگلے کی آڑ سے لیلیٰ اور باقر نے ان پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیے۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور کئی اسرائیلی فوجی کربناک انگیز چیخیں مارتے ہوئے گرے۔ باقیوں نے دائیں بائیں ہو کے اپنی جانیں بچانے کی کوشش چاہی مگر ان پر عبداللہ کے ساتھ بیٹھے علی نے فائرنگ کر دی۔ راستہ ذرا دیر کے لیے صاف ہوا تو عبداللہ نے ٹرک کا رخ آفیسرز کالونی کی طرف موڑ لیا۔ ان کا زیادہ دیر ٹرک میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، لہٰذا ایک مقام پر لیلیٰ نے ٹرک رکوا کر سب کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ یہاں سب سے پہلے انہوں نے ایک بنگلا نما مکان میں نقب لگانے کی کوشش کی۔ چونکہ یہ کالونی اسٹیٹ کے اندر ہی تھا اسی لیے یہاں شاید گارڈز وغیرہ کی ضرورت کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ چند اکا دکا لوگ ہی نظر آئے تھے جو انہیں دیکھ کر چونکے تھے۔ تاہم فائرنگ اور شور کے باعث کالونی میں بھی ہلچل سی مچ گئی تھی۔ رہی سہی کسر ان چاروں نے ہوائی فائرنگ کر کے پوری کر ڈالی۔ مگر جلد ہی کچھ بنگلوں سے مسلح افراد کا جتھا نمودار ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک زبردست سماعت شکن دھماکا ہوا اور ان کے پیروں تلے جیسے زمین لرز گئی۔ کئی بنگلوں کی کھڑکیوں کے شیشے چٹخنے کی سمع خراش آوازیں سنائی دیں۔ مسلح افراد کا جتھا بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار

ہوگیا۔ان چاروں نے ان کی بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر بیک وقت کئی برسٹ فائر کرڈالے۔ وہ تتر بتر ہوگئے۔ان چاروں نے مذکورہ بنگلے کا گیٹ توڑا۔اسی وقت ہیڈکوارٹر کی عمارت میں دوسرا لرزہ خیز دھماکا ہوا اور یوں ہر ایک منٹ بعد یکے بعد دیگرے دھماکوں سے ڈیوڈ اسٹار کی یہ پوری اسٹیٹ بری طرح لرزنے لگی۔ ہر طرف بارود، شعلے اور گردوغبار کا طوفان سا مچ گیا تھا۔دونوں رہائشی کالونیاں چونکہ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈکوارٹر سے تقریباً ملحقہ تھیں اسی لیے یہاں کے بنگلوں پر بھی شعلوں اور جلتے ہوئے ٹکڑوں کی بارش ہوئی۔آگ اور شعلوں کی خوفناک تباہی اس کالونی کو بھی اپنی زد میں لینے والی تھی جس کے باعث یہاں بھی تیزی سے آگ پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔لیلیٰ اور باقر وغیرہ نے اسٹیٹ کے یہودیوں کی سہانی صبح غارت کرڈالی تھی۔ان کے تیونائی مشن کا نصف سے زیادہ مرحلہ کامیابی سے ہمکنار ہوگیا تھا۔اب انہیں اپنے اصل شکار جنرل آئزک فرناش کی تلاش تھی۔

لیلیٰ نے جس بنگلے میں ہلا بولا تھا، وہ کسی کیپٹن رینک کے ایک اسرائیلی آفیسر کا گھر تھا۔نیم پلیٹ پر کیپٹن میل ہنٹ لکھا ہوا لیلیٰ نے دیکھ لیا تھا، یہاں وہ اپنی دو نوجوان بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔دھماکوں کی آوازوں پر وہ اپنا اسلحہ نکالنے کی کوشش میں تھا کہ یہ چاروں دروازے توڑتے ہوئے اس کے سر پر جا پہنچے اور ان سب کو ایک کمرے میں لے جاکر گن پوائنٹ پر لے لیا۔اسرائیلی کیپٹن کی بیوی اور دونوں بیٹیاں بری طرح ہراساں تھیں مگر کیپٹن میل ہنٹ کی آنکھوں سے تشویش کے علاوہ پرغیظ جوش کی سرخی بھی نظر آتی تھی۔وہ ایک پینتالیس پچاس سالہ درمیانے گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ رنگ سانولا تھا۔آنکھیں قدرے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جن سے غضب کا کینہ جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

لیلیٰ کے اشارے پر علی اور عبداللہ نے کیپٹن ہنٹ کی بیوی اور دونوں بیٹیوں کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر انہیں ایک بڑے صوفے پر بٹھا دیا اور ساتھ ہی وہ دونوں ان کے دائیں بائیں گنیں تانے چوکس کھڑے ہوگئے تھے۔جبکہ کیپٹن میل کو لیلیٰ اور باقر نہتا کرچکے تھے۔اسے سامنے کھڑا کردیا گیا تھا اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”کیپٹن! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔جنرل آئزک فرناش کا ٹھکانا بتاؤ؟ جلدی......“

لیلیٰ نے اس کی طرف گھورتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔

”تم لیلیٰ آفندی ہونا؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے، کیپٹن میل نے اس کی طرف بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو لیلیٰ نے مارے طیش کے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنی گن کا کندا اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔وہ تکلیف سے کراہ کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا اور پشت پر دونوں ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور فرش پر گر گیا۔اس کے منہ سے خون بہنے لگا ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔صوفے پر ڈری سہمی بیٹھی اس کی بیوی اور دونوں بیٹیاں وحشت کے مارے چیخ پڑیں۔

”پلیز پلیز! میرے پاپا کو چھوڑ دو۔پلیز! انہیں مت مارو۔“ کیپٹن میل کی بیٹیاں، روتے ہوئے لیلیٰ کی منتیں سماجتیں کرنے لگیں۔

لیلیٰ نے یک دم خوف ناک نگاہوں سے کیپٹن میل کی دونوں نوجوان بیٹیوں کی طرف دیکھا اور زخمی ناگن کی طرح پھنکار کے بولی۔

”کیا تم نے اس وقت بھی اسی طرح اپنے پاپا سے رو رو کر بھی منتیں کی تھیں، جب وہ اور ان کے ساتھی، ہزاروں بے گناہ اور نہتے فلسطینیوں، عورتوں اور معصوم بچوں پر بمبار طیاروں سے وحشیانہ گولہ باری کررہے تھے؟ ٹی وی تو تم دیکھتے ہی ہوگے، اس وقت بھی دنیا بھر کے چینلز میں یہ سب دکھایا جارہا ہے کہ اسرائیل نے آبادیوں والی جگہوں پر نہتے بے گناہ فلسطینیوں پر کیسی قیامت صغریٰ مچائی ہوئی ہے۔ ہاں؟ جواب دو اس کا۔“ جوش غیظ سے لیلیٰ کا خوبصورت چہرہ بری طرح بگڑ کے رہ گیا۔دونوں لڑکیوں سے کوئی جواب نہ بن پڑا، ان کے منہ پر جیسے گھگھیاں لگ گئیں۔مگر ان کی ماں یعنی کیپٹن میل ہنٹ کی بیوی نے ذرا ہمت کرکے مکاری سے لیلیٰ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ل... لیکن...... ہم نے تم لوگوں کے بارے میں بھی سنا ہے کہ تم لوگ عورتوں اور بچوں پر ظلم نہیں کرتے پچھلی بار کے حملے کی میں خود بھی گواہ ہوں جب......“

”تم نے ٹھیک سنا ہے مکار عورت!“ لیلیٰ نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔پھر اسے ڈرانے کی غرض سے بولی۔”مگر ہر بار ایسا نہیں ہوگا، اس لیے کہ تم لوگوں کے وحشیانہ ظلم و بربریت نے چنگیز خاں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شیطان بھی تم سے پناہ مانگتا ہوگا۔یہ جنگ کسی ایک آدمی کی نہیں ہے، ہم پر اس وقت لاکھوں بے

گناہوں کی آہوں اور سسکیوں کا قرض لدا ہوا ہے۔ اب ہم تم لوگوں کی اس جذباتی بلیک میلنگ میں نہیں آنے والے۔'' پھر وہ پلٹی اور فرش بوس کیپٹن میل کی طرف متوجہ ہو کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولی۔

''تم نے مجھے ٹھیک پہچانا یہودی کتے! میں اسرائیلیوں کی موت لیلیٰ ہی ہوں، پہچان لو مجھے اچھی طرح سے اور اب میرے سوال کا جواب دو، وہ نسل خنزیر جنرل فرناش اس وقت کہاں چھپا بیٹھا ہے؟'' لیلیٰ نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ کے جنوں خیز لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا اور..... یاد رکھو..... تت..... تم یہاں سے زندہ نکل کر نہیں جا سکتے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

باہر دھماکوں کی بازگشت جاری تھی اور بارود کی بو یہاں تک محسوس ہونے لگی تھی۔ کئی گھر آتش زدگی کی بھی لپیٹ میں آنے لگے تھے۔ یہاں بھی باہر کھلے صحن میں لپکتے ہوئے جلتے آوارہ ٹکڑے گرنے کی آوازیں ابھری تھیں۔

ایسے میں لیلیٰ نے بھی بڑے کھردرے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، ہمارے پاس بھی فضول وقت نہیں ہے جو تم پر ضائع کریں۔'' یہ کہتے ہوئے لیلیٰ نے علی اور عبداللہ سے تحکمانہ کہا۔

''ان سب کو ایک ساتھ اندر کمرے میں بند کر دو۔ یہ خود تیزی سے پھیلتی ہوئی آگ میں جل مریں گے۔ ہم آگے چل کر کسی اور کو نشانہ بناتے ہیں، اس وقت ہمارا راستہ بالکل صاف ہے..... ہری اپ۔''

لیلیٰ کے اس نفسیاتی حربے نے خاطر خواہ اثر دکھایا تھا، کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس یہودی کیپٹن کی ساری ہٹ دھرمی اور اکڑفوں ناک کے راستے بہہ نکلی..... وہ ترنت بولا۔

''ٹھ..... ٹھہ..... ٹھہرو..... ٹھہرو۔ م۔ میں بتاتا ہوں۔ وہ..... اس وقت بنگلہ نمبر اے تیرہ میں ہے۔ جو یہاں سے دائیں جانب ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' لیلیٰ نے کسی جوش کا مظاہرہ کیے بغیر کہا اور دوبارہ علی اور عبداللہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تم دونوں ادھر ہی رکو گے۔ میں اور باقر بنگلا نمبر اے تیرہ کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں اگر اس کا بتایا ہوا پتا جھوٹ ثابت ہو تو ہم تمہیں ٹرانسمیٹر پر بتا دیں گے پھر تم ان سب کو اسی کمرے میں بند کر کے ہماری طرف نکل آنا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی تو اچانک کیپٹن میل لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''ٹھہ..... ٹھہ..... م..... میں نے تمہیں..... جھوٹ بولا تھا۔'' اس کی بات پر لیلیٰ کے گداز ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ وہ آگے بولا۔ ''ہماری زندگی کی ضمانت دو پہلے۔''

''ضمانت تو ہماری زندگیوں کی بھی نہیں ہے۔ ہم خود اپنے سروں پر کفن باندھے نکلے ہوئے ہیں، وقت ضائع مت کرو۔ ہمارا اصل شکار صرف جنرل فرناش ہے۔ جلدی بولو مگر جھوٹ نہیں۔ یاد رہے میرے دو ساتھی ادھر ہی میرے حکم کے منتظر رہیں گے۔''

''تب پھر۔'' کیپٹن میل کی بیوی نے بھی اپنے شوہر کو اکسایا۔ ''ڈارلنگ! سچ بتا دو انہیں۔ ان کے سر پر اس وقت خون سوار ہے، یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

بالآخر کیپٹن میل نے لیلیٰ کو جنرل فرناش کے ٹھکانے کا پتا بتا دیا۔ جسے سن کر لیلیٰ اور اس کے تینوں ساتھی چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

☆☆☆

''دھوکا.....''

بے اختیار چک کے منہ سے نکلا تھا، جبکہ کسی فوری خطرے کے پیش نظر روجر نے احتیاطاً ایسا کوئی جملہ اپنے منہ سے نکالنے سے اجتناب ہی برتا تھا لیکن کوئی ایسی خوفناک گڑبڑ ہو چکی تھی جس کے بھیانک نتائج کسی وقت بھی نکلنے والے تھے۔ کم از کم زبیدہ کو یہی اندازہ تھا اور ہوا بھی یہی۔ اسی وقت بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسرائیلی جوڑے نے اپنی گنوں کا رخ ان کی طرف موڑتے ہی فائر کھول دیا۔ گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری تھی۔ چک کا جسم چھلنی ہو کر بوٹ سے گہرے سمندر میں آ رہا۔ جبکہ زبیدہ اور روجر نے خطرے کو محسوس کرتے ہی بیک وقت سمندر میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور ایک زوردار چھپاکے سے دونوں سمندر میں گرے تھے۔ گولیوں نے ان کا بھی تعاقب کیا تھا مگر اسپیڈ بوٹ کی وجہ سے کسی اور باعث نشانہ خطا گیا تھا۔ بوٹ آگے جا کر دوبارہ واپس مڑی۔ روجر کو کم از کم زبیدہ سے ایسی پھرتی کی توقع نہ تھی۔ وہ اسے اب تک عام عورت ہی سمجھے ہوئے تھا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ زبیدہ ایک انتہائی تربیت یافتہ فلسطینی لیڈی کمانڈو تھی۔ کیونکہ زبیدہ نے بھی اسی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا جس کا روجر کر چکا تھا۔

دونوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے سمندر میں چھلانگیں تو لگا دی تھیں لیکن اب بھی یہ دونوں خطرے میں ہی تھے۔

یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ کوئی عام انسان نہیں تھے اگر زبیدہ ایک تربیت یافتہ فلسطینی کمانڈو تھی تو روجر بھی

جرائم کی دنیا کا پرانا گینگسٹر تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر خود کو بچانے کی تگ ودو میں مصروف کار تھے۔ زبیدہ کی سمجھ میں سروست یہی آیا تھا کہ اس اچانک کا یا کلپ کی وجہ کوئی اچانک ہی تھی، وہ کیا تھی؟ اس کے بارے میں وہ ابھی لاعلم تھی، البتہ وہ روجر کے بارے میں کہہ سکتی تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ جانتا تھا، جبکہ اس کا ساتھی چک مارا جاچکا تھا۔ خود ان کی بھی جانوں پر بنی ہوئی تھی۔

''ہم اگر اسی طرح ڈبکیاں لگاتے رہے تو ان سے نہیں بچ پائیں گے۔ بوٹ واپس آرہی ہے۔'' زبیدہ نے ایک ڈبکی لگانے کے بعد دوبارہ سطح آب پر ابھرتے ہوئے کہا۔

روجر بھی قریب ہی تھا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں۔''

''میری بات غور سے سنو!'' زبیدہ بولی۔

''تم کسی طرح انہیں چکمہ دیتے رہو۔ اتنی دیر میں، میں بوٹ میں سوار ہو کر ان پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''کیا؟ یہ تم کرو گی؟'' روجر اس کے مشورے پر بھونچکا رہ گیا۔ شاید اسے حیرت تھی کہ ڈیبی (زبیدہ) عام سی عورت اس خطرناک صورت حال میں بھلا کیا کر سکتی تھی؟

ادھر زبیدہ دانت پیس کر بولی۔ ''وقت ضائع نہ کرو..... جلدی.....'' اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی۔ اسی وقت بوٹ سے ان پر برسٹ داغا گیا۔ دونوں نے بیک وقت غوطہ لگایا۔ پھر روجر نے زبیدہ کی ہدایت پر فوراً عمل کیا اور تیزی سے تیرتا ہوا وہ کبھی سطح آب پر آتا اور پھر غوطہ لگا کر دوسری طرف ابھر کے اسرائیلی جوڑے کو اپنی جھلک دکھاتا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہونے لگتے مگر زبیدہ جانتی تھی کہ روجر زیادہ دیر تک یہ خطرناک رسکی کام انجام نہیں دے سکتا اور کسی بھی وقت گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آسکتا تھا۔ اسی لیے وہ بھی اسی قلیل موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سمندر کے اندر ہی ایک لمبی ''تاری'' مار کے بوٹ کے قریب جا پہنچی اور ابھری تو اس سے جھولتے ہوئے ایک موٹے رسے کی مدد سے وہ اندر جا کودی۔ اس کی طرف اس اسرائیلی جوڑے کی پشت تھی۔ درمیانی فاصلہ محض چند قدموں کا تھا۔ ادھر روجر نے اپنی جان داؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ زبیدہ محتاط روی مگر تیزی کے ساتھ ان پر پیچھے سے جھپٹی۔ عورت تو اس کے ایک ہی دھکے سے سمندر میں جا گری تھی جبکہ مرد نے اس کی ٹھوکر سے خود کو گرتے گرتے بچا تو لیا تھا مگر اس کوشش میں اس کی گن سمندر میں جا گری تھی۔ وہ دانت پیس کر غراتے ہوئے اس پر جھپٹا۔ وہ زبیدہ کو چک کی گرل فرینڈ کی حیثیت سے ایک عام سی عورت ہی سمجھے ہوئے تھا مگر زبیدہ نے نرت بھاؤ دکھاتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا، جو اس نے اپنی تربیت کے دوران ریت کی گیلی بوری پہ مار مار کے ہتھوڑے کی طرح فولاد جیسا مضبوط بنا رکھا تھا...... یہی گھونسا تان کر اس نے اسرائیلی دشمن کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ برآمد ہوگئی اور وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا اور عرشے کی ریلنگ سے جا ٹکرایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی مگر زبیدہ نے اسے موقع نہیں دیا اور ایک زوردار لات اس کے سینے پر بھی رسید کر ڈالی وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ریلنگ سے الٹ کر گہرے سمندر میں جا گرا۔

''حیرت انگیز۔'' اچانک اس کے عقب سے بھرپور استہزائی آواز ابھری۔ زبیدہ پلٹی اور بے اختیار اس کے حلق سے گہری سانس خارج ہوگئی۔ وہ روجر تھا۔ جو موقع پاتے ہی بوٹ پر چڑھ آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن نظر آرہی تھی۔

''مجھے پورا شبہ تھا تم پر کہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آرہی ہو۔'' روجر نے زبیدہ کو بھرپور نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو زبیدہ قدرے ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، ہم ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ تمہیں بوٹ چلانی آتی ہے؟ اسے کنٹرول کرو۔ ساحل قریب ہے، دشمن کسی بھی وقت یہاں آسکتے ہیں۔'' روجر نے ساحل کی طرف دیکھا جو زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں کچھ مسلح افراد کھڑے دکھائی دیے تھے۔ روجر کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ پھر وہ ہونٹ بھینچے کیبن کی طرف لپکا۔ زبیدہ اس کے عقب میں تھی۔

اس نے دیکھا روجر بوٹ کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوران زبیدہ کے دل و دماغ میں یہی کھد بد ہو رہی تھی کہ وہ روجر سے پوچھنے کی کوشش کرے کہ آخر یہ سب اچانک کیسے اور کیوں ہوا تھا؟ آخر ان کے سیل فون پر ایسا کون سا میسج آیا تھا جس کی بنا پر حالات یکدم ہی خطرناک صورت اختیار کرتے چلے گئے تھے؟

دفعتاً زبیدہ کی نگاہ کیبن کی کھلی کھڑکی کے پار پڑی اور یکلخت اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کوانڈو آئی لینڈ کے ساحل سے دو عدد گن شپ اسپیڈ بوٹ طوفانی رفتار سے ان کی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں۔

(جاری ہے)

جہالت مآب

الوضیا اقبال

کچھ لوگ لکیر کے فقیر بن کر رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں چاہے ان کے قدموں میں دنیا جہان کی دولت ڈھیر ہو جائے، لوگ ہاتھ باندھ کر صبح و شام سلامی پیش کریں یا کسی حکومت کا سربراہ ہی کیوں نہ بنا دیا جائے ایک ٹھوکر میں سب کچھ خاک میں ملا دینا گویا اسے اپنے لیے ایک اعزاز اور شجاعت کی علامت سمجھتے ہیں جبکہ وہ غفلت میں انتہائی حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ... وہ پیدائشی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

جہالت مآب ایک غریب سلطان کی بے وقوفیوں کا ماجرا

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور نظریں چوراہے کے وسط میں جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی حیرت ناک منظر نے اسے مسحور کر رکھا ہے۔ وہ خاکی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا جس پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے جوان چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ سر کے بال گرد آلود ہو رہے تھے۔ اس کے بوسیدہ جوتے بھی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ داہنے ہاتھ میں چھوٹے سائز کا ایک پرانا سا سوٹ کیس تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دور دراز کا سفر کر کے آرہا ہے۔

وہ شہر کا مرکزی علاقہ تھا اور کاروباری اوقات ہونے کی وجہ سے فٹ پاتھ پہ لوگوں کا اور سڑک پر ٹریفک کا... بے پناہ رش تھا۔ راہ گیر اس شخص کو حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے جو فٹ پاتھ پر کھڑا چوراہے کے وسط میں کسی نادیدہ منظر پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑاتے تو انہیں وہاں سے گزرتے ہوئے ٹریفک کے اور لوگوں کے کچھ نظر نہ آتا۔

لوگ اس سے ٹکراتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کاروباری علاقے میں لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ غیر متعلقہ باتوں میں الجھیں۔ بڑے شہروں میں لوگ مشینوں کی طرح اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ مشینیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہیں جن کی نہ آنکھیں ہوتی ہیں، نہ کان اور نہ جذبات و احساسات۔

شہر کی اس بھری پُری مصروف فٹ پاتھ پر چلتی پھرتی، جیتی جاگتی مشینوں کے درمیان ایک آدمی بھی آگیا تھا جو ابھی مشین نہیں بن سکا تھا۔ وہ ان مشینوں کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

شہر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، زندگی کتنی ہی مشینی کیوں نہ ہو جائے مگر ہر آدمی مشین نہیں بن سکتا۔ ہر جگہ کچھ بے فکرے ضرور ہوتے ہیں جو کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔

مشینی انداز میں کام کرنے والوں کے اسی اژدحام میں وہاں سے کچھ من چلے بھی گزرے۔ انہوں نے جب ایک دیہاتی آدمی کو اس انداز میں فٹ پاتھ پر کھڑے دیکھا تو دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی چوراہے کے وسط میں کوئی عجیب منظر تلاش کرنے کی جستجو کی۔ جب وہاں کچھ نظر نہ آیا تو ایک من چلے نے آواز لگائی۔

”کھسکا ہوا لگتا ہے۔“

”کھسکا ہوا نہیں، دیہاتی ہے، دیہاتی۔“ ایک اور من چلا بولا۔

”شہر کی رونق دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ ذرا عادی ہو جائے تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن یہ شہر آیا کیوں ہے؟“ ایک اور من چلے نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”اس کی لیلیٰ کھو گئی ہے شاید، اس کی تلاش میں شہر آیا ہوگا۔“

من چلوں کی ٹولی اس کے قریب سے گزر گئی مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس کی محویت بدستور قائم تھی۔

شہر کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ فٹ پاتھ سے لوگ گزر رہے تھے۔ ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ان کے تعاقب میں ہو اور وہ اسے جل دے کر نکل جانا چاہتے ہوں۔ چوراہے کے وسط میں نصب ٹریفک سگنل مخصوص وقفوں سے اپنے رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ دفعتاً سڑک پر مخالف سمت سے ایک چمکتی دمکتی کار ٹریفک سگنل کی سرخ روشنی کے مقابل آکر رکی۔ کار کی عقبی نشست پر ایک ادھیڑ عمر کا تومند شخص بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں فٹ پاتھ پر گزرتے ہوئے لوگوں پر پھسل رہی تھیں۔ معاً اس کی نگاہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے اس دیہاتی پر پڑی اور گویا جم کر رہ گئیں۔ اس کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔

”گاڑی سامنے والی فٹ پاتھ سے لگا کر روک دینا۔“ ادھیڑ عمر شخص نے ڈرائیور سے کہا۔

”جی صاحب۔“ ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا اور سگنل لائٹ کے سبز ہوتے ہی اس نے گاڑی مطلوبہ مقام پر لے جا کر روک دی۔

”ادھر کونے پر ایک شخص کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں سوٹ کیس ہے، ذرا اسے بلا لاؤ۔“ ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

ڈرائیور گاڑی سے اتر کر اس شخص کے قریب پہنچا۔ وہ ابھی تک چوراہے کو گھورے جا رہا تھا۔ اسے مخاطب کرنے سے قبل ڈرائیور نے ایک نظر چوراہے پر ڈالی۔ وہاں ٹریفک سگنل اور ٹریفک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے کندھے جھٹکے اور اس سے بولا۔

”اے، تمہیں صاحب بلا رہے ہیں۔“

اس شخص کی محویت نہیں ٹوٹی۔ اس کی نظریں بدستور چوراہے کے وسط میں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ڈرائیور کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسبتاً اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”اونچا سنتے ہو کیا...... میں نے کہا صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔“

اس بار وہ شخص چونکا۔ اس نے سفید وردی میں ملبوس ڈرائیور کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس کی نظریں تو ڈرائیور پر مرکوز تھیں لیکن اس کی آنکھوں کے تاثر سے اندازہ ہوتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ اب بھی حاضر نہیں ہے۔

”وہ جھوٹ نہیں بولتے۔“ اس نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا یوں جیسے خود سے ہی مخاطب ہو۔

ڈرائیور جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اس شخص سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" ڈرائیور قدرے خوف زدہ انداز میں بولا۔ "میں تم سے کہہ رہا ہوں، تمہیں صاحب بلا رہے ہیں اور تم جواب دے رہے ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔"

"ہاں، وہ جھوٹ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔" وہ شخص دھیلے کے سے انداز میں بولا۔ "لیکن اس بار شاید کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

ڈرائیور خوف زدہ انداز میں کار کی طرف پلٹ گیا اور ادھیڑ عمر شخص سے بولا۔ "یہ شخص تو پاگل معلوم ہوتا ہے جناب۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہیں صاحب بلا رہے ہیں، وہ جواب میں کہہ رہا ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہیں جھوٹ سے سخت نفرت ہے اور یہ کہ اس بار کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیا؟" ادھیڑ عمر شخص کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے پھر وہ دروازہ کھول کر کار سے اتر گیا۔

"ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔"

نوجوان دیہاتی شخص کی نظریں کار پر مرکوز تھیں۔ اس نے کار سے ایک ادھیڑ عمر شخص کو اترتے دیکھا۔ اس نے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ کار سے اتر کر نوجوان کے نزدیک پہنچا۔

"تم اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہو؟" اس نے نوجوان کے قریب پہنچ کر نرم لہجے میں کہا۔

نوجوان عالم بے اختیاری سے اپنے ہوش و حواس میں واپس آچکا تھا۔ "جی ہاں۔" اس نے قدرے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "مگر آپ کون ہیں؟"

"مجھے سلمان شیرازی کہتے ہیں۔" ادھیڑ عمر شخص اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"اقبال...... اقبال سیفی۔" اس نے سلمان شیرازی کا اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ملازمت کی تلاش میں شہر آئے ہو؟" سلمان شیرازی نے مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کردیے جانے پر ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے قدرے جھینپے ہوئے انداز میں پوچھا۔

اقبال کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نظر آئی۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اس نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"اوہ، یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ آؤ، ذرا تفصیلی بات چیت رہے گی۔" سلمان شیرازی اس کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"لیکن......" اقبال سیفی جھجکا۔

"آؤ، آؤ...... ممکن ہے میں تمہارے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کرسکوں۔"

"ملازمت کا بندوبست تو ہو بھی چکا ہے جناب۔"

"کہاں؟" سلمان شیرازی نے حیرت سے پوچھا۔

"سیٹھ منو بھائی لوہے والے کے پاس۔"

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"چھوٹے سرکار نے فون پر ان سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے سیٹھ کے نام ایک رقعہ بھی لکھ کر دیا ہے۔"

"اس کا پتا معلوم ہے تمہیں؟"

"نہیں...... لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" سلمان شیرازی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اس کے پاس بھی لے چلوں گا۔" اقبال کے انداز میں اب بھی جھجک تھی لیکن وہ مزید کچھ کہے بغیر سلمان شیرازی کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گیا۔

"ڈکی کھولو۔" سلمان شیرازی نے ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور نے ڈکی کھولی۔ اقبال نے اپنا سوٹ کیس ڈکی میں رکھا اور خود کار کے اگلے دروازے کی طرف بڑھا۔ سلمان شیرازی پہلے ہی عقبی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔

"ادھر ہی آجاؤ بھئی، پچھلی سیٹ پر۔" سلمان شیرازی نے کہا۔

"اچھا نہیں لگے گا جناب۔" اقبال نے جواب دیا۔

"آپ بڑے آدمی ہیں اور میں......"

"فضول باتوں میں مت پڑو اور پچھلی نشست پر ہی آجاؤ۔"

"آپ کا اصرار ہے تو یوں ہی سہی۔" اقبال نے بے بسی سے کہا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"گھر واپس چلو۔" سلمان شیرازی نے کہا اور پھر اقبال کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "ہاں تو میاں اقبال......"

"اگر آپ مجھے سیفی کہیں تو مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔"

"کیوں، کیا اقبال تمہارا نام نہیں ہے؟"

"ہے تو سہی لیکن یہ نام میرے والدین نے رکھا تھا، اس کے بعد کسی بزرگ نے اس میں سیفی کا ٹکڑا لگا دیا۔ اس

کے بعد سے مجھے صرف سیفی کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے۔ اب تو کوئی بھی مجھے اقبال نہیں کہتا۔''

''خیر تو سیفی میاں، یہ بتاؤ تمہاری تعلیم کیا ہے؟''

''تعلیم کہاں جناب۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔''والدین نے تو بہت کوشش کی مگر میرا دل ہی نہیں لگ سکا پڑھائی میں۔''

''پھر بھلا تمہیں مزدوری کے علاوہ اور کیا مل سکے گی؟''

''مزدوری کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔'' سیفی نے کہا۔ اس کے لہجے سے قدرے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' سلمان شیرازی سنبھالا لے کر بولے۔'' میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس طرح تمہاری آمدنی.....''

''وضاحتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جناب۔'' سیفی نے ترش روئی سے کہا۔'' آپ کا لہجہ منہ سے بول رہا تھا۔ ویسے آپ بے فکر رہیے، میں ڈرائیونگ جانتا ہوں۔''

سلمان شیرازی نے اسے پُرستائش انداز میں دیکھا۔ وہ بڑی صاف گوئی سے گفتگو کر رہا تھا۔ کار میں بیٹھنے کے آداب سے واقف ہونے کا مطلب تھا کہ وہ شہری زندگی سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس میں منافقت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اکھڑپن سے گفتگو کی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے افسوس ہے..... سچ پوچھو تو میں مزدوروں کو برا نہیں سمجھتا لیکن جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس کے اثرات سے خود کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اس کے برعکس مجھے تمہاری صاف گوئی سے خوشی ہوئی..... مگر تمہاری گفتگو سے تو پتا نہیں چلتا کہ تم پڑھے لکھے نہیں ہو؟''

''آپ بلاتکلف مجھے جاہل کہہ سکتے ہیں۔ جو شخص بھی ان پڑھ ہو وہ جاہل کہلائے گا۔ ہلکے الفاظ استعمال کرنے سے کچھ فرق تو پڑنے سے رہا۔''

''میں شہری آب و ہوا کا جانور ہوں بھئی۔'' سلمان شیرازی کھسیانے انداز میں بولے۔''سخت الفاظ استعمال کرنا گراں گزرتا ہے۔''

''صرف منہ پر۔'' سیفی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اور پیٹھ پیچھے تو سب کچھ کہنا جائز ہے۔'' سلمان شیرازی نے اسے تحیرانہ انداز میں دیکھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب۔'' سلمان شیرازی کو اس طرح اپنی جانب دیکھتے پاکر سیفی گڑبڑا کر بولا۔

''شاید میری بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے۔''

''اگر میں تمہیں جاہل کہوں تو تمہاری دل آزاری نہ ہوگی؟''

''ہرگز نہیں جناب..... ایک جاہل کو جاہل ہی کہا جائے گا۔''

''تمہارے خیال میں ہر شخص کا انداز فکر یہی ہوتا ہے۔ یعنی ہر ان پڑھ شخص خود کو جاہل کہے جانے پر برا نہیں مانے گا؟''

''مجھے نہیں معلوم..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''عام طور پر لوگ حقیقت سننا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ بہت احتیاط سے منتخب کرنے پڑتے ہیں۔''

''جی ہاں، چھوٹے سرکار بھی یہی کہتے ہیں کہ حقیقت تلخ ہوتی ہے۔''

''چھوٹے سرکار کون ہیں؟''

''ہمارے گاؤں کے زمیندار کے بیٹے۔''

''گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''چاند پور۔''

''اوہ تم چودھری اللہ دتہ کے لڑکے کی بات کر رہے ہو۔''

''آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟'' سیفی نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہمارے تعلقات بہت پرانے ہیں۔'' سلمان شیرازی نے کہا۔''ادھر برسوں سے میرا جانا نہیں ہوا ورنہ میں ہر سال شکار کھیلنے کی غرض سے چاند پور ضرور جایا کرتا تھا۔''

''وہاں تو بہت بڑے بڑے لوگ شکار کھیلنے آتے ہیں جناب..... چودھری صاحب کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔''

''تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ مالک ہیں جی چاند پور کے۔ ہم ان ہی کا نمک کھاتے ہیں۔ میرے والد ان کی زمینوں پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔''

''تم کیوں نہیں کرتے کھیتی باڑی؟''

''نہ تو کھیتی باڑی میں میرا دل لگتا ہے اور نہ ہی یہ میرے بس کا کام ہے۔''

''تمہاری عمر بیس برس سے تو زیادہ ہی ہوگی؟'' سلمان شیرازی نے پوچھا۔

''جی ہاں، میری عمر بائیس سال ہے۔''

''اتنا عرصہ تم کیا کرتے رہے..... میرا مطلب ہے نہ تو تم نے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی زراعت کا پیشہ اختیار کیا؟''

''جب میرے والد نے دیکھا کہ پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تو انہوں نے مجھے چودھری صاحب کی حویلی میں ملازم رکھوا دیا۔ چھوٹے سرکار مجھ سے کچھ ہی بڑے ہیں۔ انہیں میری باتیں بہت پسند تھیں۔ مجھ میں ان کی دلچسپی دیکھ کر چودھری صاحب نے مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے شہر آئے تو میں نے چودھری صاحب کی خدمت شروع کر دی۔ خدمت کیا تھی جناب، بس میرے سپرد ملازموں کی نگرانی کا کام تھا۔ چھوٹے سرکار تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تو انہوں نے پھر سے مجھے اپنا مصاحب بنا لیا۔''

''تم گاؤں کے رہنے والے ہو، تعلیم یافتہ بھی نہیں ہو اس کے باوجود گفتگو بہت اچھی کرتے ہو۔''

''جی ہاں، یہ چھوٹے سرکار کی صحبت کا کمال ہے۔ انہوں نے ٹوک ٹوک کر میری زبان درست کروا دی۔ پندرہ سال میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔''

''اور یہ تمہارے چھوٹے سرکار کیسے آدمی ہیں؟ جس انداز میں تم ان کا تذکرہ کرتے ہو، اس سے تو پتا چلتا ہے کہ تم انہیں بہت پسند کرتے ہو؟''

''وہ بڑے جولانی اور ہرفن مولا قسم کے آدمی ہیں جناب۔ بہت خوش اخلاق اور نفس تھ..... انہیں بہت سی چیزوں کا شوق ہے۔ شکار کا شوق تو خیر انہیں ورثے میں ملا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی وہ بہت سے کھیلوں کے شوقین ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی دلچسپیاں بھی جاری رکھیں۔ وہ بڑے شوقین مزاج آدمی ہیں جناب۔''

''تمہارے چھوٹے سرکار نے تمہیں کوئی کھیل نہیں سکھایا؟'' سلمان شیرازی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''انہیں دو کھیل بہت پسند ہیں جناب، شطرنج اور برج..... برج تو تاش کا کھیل ہے اور بہت مشکل ہے اس لیے میری سمجھ میں نہیں آسکا البتہ شطرنج کھیلنا انہوں نے مجھے سکھا دیا ہے۔''

''اوہو، تو تم شطرنج بھی کھیل لیتے ہو..... کون سی کھیلتے ہو، دیسی یا انٹرنیشنل؟''

''چھوٹے سرکار نے مجھے دونوں ہی طریقوں سے کھیلنا سکھایا ہے۔''

''تم دونوں میں زیادہ اچھی شطرنج کون کھیلتا ہے؟''

''شروع شروع جب میں نے کھیلنا سیکھا تھا تو وہ مجھے بہ آسانی ہرا دیتے تھے لیکن اب ٹکر کا مقابلہ ہوتا ہے۔''

''اور کیا کیا شوق ہیں تمہارے چھوٹے سرکار کے؟''

''جی وہ ہاتھ بھی دیکھتے ہیں اور.....''

''تمہارا مطلب ہے پامسٹری؟''

''جی ہاں وہی اور زائچے بھی بناتے ہیں۔''

''کمال ہے۔'' سلمان شیرازی حیران ہو کر بولے۔ ''کبھی انہوں نے تمہارا ہاتھ بھی دیکھا؟''

''جی ہاں......اور دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ کہتے تھے، مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ یہ کسی بہت بڑے آدمی کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے چھوٹے سرکار پامسٹری سے واقف نہیں۔''

''خیال تو میرا بھی یہی ہے۔'' سیفی نے کہا۔ ''لیکن ہاتھ دیکھنے کے بعد انہوں نے میرا زائچہ بھی بنایا تھا۔ زائچہ دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ حیران ہوئے۔ کہنے لگے تمہارے زائچے میں تو راج یوگ موجود ہے۔ میں نے پوچھا راج یوگ کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ راج یوگ صرف ان لوگوں کے زائچوں میں پایا جاتا ہے جو حکمران بنتے ہیں۔''

''کیا......!'' سلمان شیرازی بری طرح چونکے۔

''مجھے بھی ان کی بات سن کر بڑے زور کی ہنسی آئی تھی لیکن انہوں نے کہا تھا کہ بہ ظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے لیکن یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ تم ایک نہ ایک روز ضرور حکمران بنو گے۔''

''حیرت ہے۔'' سلمان شیرازی بڑبڑائے۔

''آپ تو بہت سنجیدہ نظر آرہے ہیں جناب حالانکہ یہ بات سن کر آپ کو ہنسی آنی چاہیے تھی۔''

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ کیا تم نے نظام سقہ کے بارے میں بھی نہیں سنا جسے ایک دن کے لیے بادشاہت مل گئی تھی؟''

''چھوٹے سرکار نے بھی مجھے یہی مثال دی تھی۔'' سیفی نے کہا۔ ''کیا تمام پڑھے لکھے لوگ ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں؟''

''نہیں، ہر آدمی کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے لیکن جب امکانات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں اکثریت کا انداز فکر ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیں کہ علم نجوم واقعی کوئی چیز ہے اور راج یوگ زائچوں میں موجود ہوتا ہے تو یقیناً نظام سقے کے زائچے میں یہ راج یوگ شروع سے ہی موجود رہا ہوگا...... ممکن ہے تمہیں بھی ایسا کوئی موقع مل جائے۔''

''مجھے!'' سیفی ہنسا۔ ''اول تو اس کا امکان ہی نہیں ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ مجھے ایسا کوئی موقع مل سکتا ہے تو آپ یقین کریں کہ میں وہ موقع

ضائع کردینا ہی پسند کروں گا۔"

"لیکن زائچے میں راج یوگ کی موجودگی کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم وہ موقع ضائع نہیں کرسکو گے۔"

"جی۔" سیفی نے آنکھیں پھاڑ کر سلمان شیرازی کو گھورا۔ "کیا آپ یہی گفتگو کرنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لائے تھے؟"

"ہاں...... ارے نہیں بھئی، لاحول ولاقوۃ...... تم نے اس طرح اچانک سوال کیا کہ......" کار سلمان شیرازی کے وسیع وعریض بنگلے کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر رک چکی تھی۔

"آؤ۔" سلمان شیرازی کار سے اترتے ہوئے بولے۔ "اندر سکون سے بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"میرا سوٹ کیس جناب۔" سیفی ڈکی کی طرف بڑھا۔

"سوٹ کیس بھی آجائے گا۔"

سیفی، سلمان شیرازی کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بنگلا تو شاندار تھا ہی لیکن ڈرائنگ روم کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ سیفی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس کے لیے تو چودھری اللہ دتہ کی حویلی دنیا کی سب سے خوب صورت کوٹھی تھی لیکن اب یہ کوٹھی دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ چودھری اللہ دتہ کی حویلی کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ سلمان شیرازی کوئی بے حد امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔

"بیٹھ جاؤ بھئی، کھڑے کیوں ہو۔" سلمان شیرازی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سیفی بڑی احتیاط سے صوفے پر بیٹھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کے بوجھ سے کہیں صوفہ نہ ٹوٹ جائے۔

"ہاں تو سیفی میاں۔" سلمان شیرازی بھی ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گے کہ وہاں فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تم چوراہے پر کیا دیکھ رہے تھے؟"

"میں بتا تو دوں جناب۔" سیفی جھجک کر بولا۔ "لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ایک بار پھر آپ کی دل آزاری نہ ہوجائے۔"

"میری دل آزاری بھلا کیوں ہونے لگی۔" سلمان شیرازی نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔ "اس چوراہے سے بھلا میرا تعلق ہی کیا ہے؟"

"آپ بھی تو شہر میں ہی رہتے ہیں۔"

"اوہ، گویا وہ کوئی ایسی بات ہے جو شہر والوں کے خلاف ہے؟"

"جی ہاں اور آپ بھی شہر والوں میں شامل ہیں۔ ممکن ہے آپ کو میری بات ناگوار گزرے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں ہے، تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔ چاہے مجھے اچھا لگے یا برا۔"

"چھوٹے سرکار نے مجھے بتایا تھا کہ شہر میں چونکہ گاڑیاں تعداد میں بہت زیادہ ہوتی ہیں لہٰذا انہیں کنٹرول کرنے کے لیے چوراہوں کے وسط میں یا تو سپاہی کھڑا ہوتا ہے یا پھر رنگین روشنیوں والے سگنل نصب ہوتے ہیں جن میں جلنے والی روشنیوں کے مطابق باری باری مختلف اطراف کی سڑکوں کا ٹریفک رکتا اور چلتا رہتا ہے......" سیفی بولتے بولتے رک گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ آگے کیا کہے۔

سلمان شیرازی اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"تو تم اتنی محویت کے عالم میں ٹریفک سگنل کو دیکھ رہے تھے؟" انہوں نے کہا۔

"جی نہیں بلکہ میں تو سر عام قانون کی دھجیاں اڑتے دیکھ رہا تھا۔ شہر کے تعلیم یافتہ باشعور لوگ قانون کی دھجیاں بکھیر رہے تھے۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ٹریفک کے بارے میں جتنے بھی قوانین بتائے تھے، ان میں سے ایک پر بھی عمل نہیں ہو رہا تھا۔ نارنجی رنگ کی روشنی ہوشیار ہونے کی علامت ہے اور جب سبز روشنی جل جائے تو گاڑیوں کو چلنا چاہیے لیکن یہاں یہ عالم تھا کہ ہر شخص پر چند لمحوں کا انتظار بار تھا۔ سب کی کوشش یہی تھی کہ نارنجی بلب روشن ہونے سے پہلے ہی گاڑی چلا دے۔ چھوٹے سرکار نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہر سگنل کے سامنے سڑکوں پر سفید رنگ کی لائنیں بنی ہوتی ہیں۔ جب ٹریفک رکا ہوتا ہے تو ان لائنوں کے درمیان سے لوگ سڑک پار کرلیتے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ نہ تو گاڑیاں چلانے والوں کو اور نہ ہی پیدل چلنے والوں کو ان لائنوں کا احترام تھا۔ سفید وردی میں ملبوس ٹریفک کا ایک سپاہی چوراہے کے ایک کونے پر ان سب باتوں سے بے نیاز کھڑا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ چھوٹے سرکار نے غلط بیانی کی تھی یا......" سیفی خاموش ہوگیا۔

سلمان شیرازی مضطربانہ انداز میں صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرش پر بچھے ہوئے دبیز قالین پر ٹہلنے لگے۔

"میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، آپ برا مان جائیں گے۔" سیفی نے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ رک کر بولے۔ "میں نے بالکل بھی برا نہیں مانا بلکہ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔"

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" سیلی نے پوچھا۔
"میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ شہر میں نو وارد کوئی قانون پسند شہری ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوگا...... بہر حال اب تم آرام کرو۔ کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"
"کہاں چلنا ہوگا؟"
"میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں...... کرو گے؟"
"مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کے کسی کام آسکا۔"

☆☆☆

سلمان شیرازی کا تعلق جزیرہ ابریز سے تھا۔ نواب وجیہہ الدولہ نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہ جزیرہ خرید لیا تھا۔ پچیس مربع میل رقبے پر یہ جزیرہ اس وقت قطعاً غیر آباد تھا۔ نواب وجیہہ الدولہ نے اس جزیرے کا نام آب ریز رکھا تھا جو کثرتِ استعمال سے اب صرف ابریز رہ گیا تھا۔ یہ نواب وجیہہ الدولہ کی خوش قسمتی تھی کہ ابریز کی زمین بہت زرخیز تھی۔ انہوں نے وہاں آکر بسنے والوں کے لیے خصوصی مراعات کا اعلان کیا۔ انہوں نے ابریز کو آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے انتقال کے بعد بیٹے شہیہ الدولہ نے ان کا مشن جاری رکھا۔ تقسیم کے بعد حکومت نے اس جزیرے کی آزاد حیثیت برقرار رہنے دی تھی، لہٰذا شہیہ الدولہ کی راہ میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوئی۔ اس جزیرے کے باشندوں نے تین بڑے پیشے اپنائے۔ زراعت، ماہی گیری اور کاروبار۔ ملازم پیشہ لوگ بھی تھے مگر ان کی تعداد کم تھی۔ ابریز کے قانون کے مطابق کسی کا پیشہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، حصولِ تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی تھا۔ جزیرے کی آبادی اگرچہ چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی مگر وہ سب کے سب تعلیم یافتہ تھے۔

ابریز پر ہوٹل خاصی تعداد میں تھے۔ یہ ہوٹل ان سیاحوں کی وجہ سے قائم ہوئے تھے جن کی ایک بڑی تعداد کو جزیرے کی زرخیزی اور شادابی ابریز کی طرف کھینچ لاتی تھی۔ جزیرے میں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی مگر وہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے اجازت لینی پڑتی تھی۔

شہیہ الدولہ نے کئی شادیاں کیں مگر لاولد رہے اور انتقال کر گئے۔ اگر ان کے کوئی اولاد ہوتی تو اسے جزیرے کا نیا حکمران بنا دیا جاتا لیکن ان کے لاولد انتقال کر جانے کے باعث یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اب جزیرے کا حکمران کون ہو؟ ان کی وصیت پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے نیا حکمران منتخب کرنے کی ذمے داری سپریم کونسل کے سپرد کی ہے۔ اس کام کے لیے سپریم کونسل کو چالیس روز کی مہلت دی گئی تھی۔ نئے حکمران کے لیے وصیت میں صرف ایک ہی شرط رکھی گئی تھی کہ وہ کسی امتیازی خصوصیت کا حامل ہو۔

سپریم کونسل جزیرہ ابریز کے سات اعلیٰ دماغوں پر مشتمل تھی۔ ساتوں اراکین اعزازی تھے اور انہیں صرف اسی صورت میں طلب کیا جاتا تھا جب کوئی انتہائی اہم نوعیت کا مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ شہیہ الدولہ کے جانشین کے انتخاب کے لیے سپریم کونسل نے کئی ناموں پر غور کیا مگر کوئی بھی شخص امتیازی خصوصیت کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا۔

سلمان شیرازی بھی سپریم کونسل کے ممبر تھے۔ سپریم کونسل کے اجلاس میں فیصلہ ہوا تھا کہ سپریم کونسل کا ہر ممبر شہیہ الدولہ کے جانشین کے لیے کسی موزوں امیدوار کی تلاش جاری رکھے گا اور چالیسویں روز حتمی فیصلے کے لیے اس کا نام سپریم کونسل کے سامنے پیش کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد چالیسویں روز تک کے لیے سپریم کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تمام اراکین اپنے اپنے کاموں پر واپس چلے گئے تھے۔ وہ تمام لوگ یا تو بہت بڑے کاروباری لوگ تھے یا پھر حکومت کے اہم عہدوں پر فائز تھے۔

یوں تو سپریم کونسل کے ہر رکن نے کوئی مناسب جانشین تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن کامیابی صرف سلمان شیرازی کے حصے میں آئی۔ اس نے اقبال سیلی کو شہر کے ایک مصروف چوراہے پر ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا دیکھا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ کوئی دیہاتی احمق ہے۔ اس نے سوچا کہ اس سے گفتگو کر کے دیکھ لے۔ ممکن ہے وہ اس میں ایسی کوئی صفت تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جسے امتیازی خصوصیت قرار دے کر سپریم کونسل جزیرہ ابریز کا حکمران مقرر کر دے۔ سلمان شیرازی اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ جب تک جزیرہ ابریز کا نیا حکمران منتخب نہ ہو جائے، سپریم کونسل کے تمام اراکین کی جانیں مصیبت میں پھنسی رہیں گی۔

اقبال سیلی اسے انتالیسویں روز ملا تھا۔ اس وقت تک سلمان شیرازی تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی مناسب شخص تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو سکے گا لیکن سیلی سے گفتگو کر کے وہ حیران رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے قدرت کے غیبی ہاتھ نے اس کی مدد کی ہو۔ سیلی بلاشبہ شہیہ الدولہ کا جانشین بننے کا پوری طرح اہل تھا۔

اگلے ہی روز سپریم کونسل کا اجلاس ہونا تھا۔ سلمان شیرازی نے سیلی کو اپنی شہری کوٹھی میں ٹھہرایا اور اگلے روز صبح

ہی اسے ساتھ لے کر جزیرہ ابریز پہنچ گیا۔ ابریز کی سرسبزی وشادابی تو خیر قدرتی عطیہ تھی لیکن انسانی ہاتھوں نے اس سرسبزی کو جو ترتیب اور سلیقہ بخشا تھا اسے دیکھ کر سیفی مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر نام کو بھی گرد نظر نہیں آرہی تھی۔ ٹریفک اگرچہ کم تھا مگر چوراہوں پر خودکار سگنل نصب تھے اور سب سے بڑھ کر جس چیز نے سیفی کو حیران کیا وہ یہ تھی کہ یہاں قانون کی پابندی نظر آرہی تھی۔

''جزیرہ ابریز کے لوگ قانون پسند ہیں۔'' سلمان شیرازی نے اس کی حیرانی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''جی!'' سیفی چونک کر بولا۔ ''جی ہاں، میں یہی دیکھ رہا تھا کہ یہاں ابھی تک کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا۔''

''یہاں کبھی پولیس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔'' سلمان شیرازی کا لہجہ فخریہ تھا۔

''کیا آپ مجھے کسی اور دنیا میں لے آئے ہیں؟'' اقبال سیفی نے متحیرانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں، جزیرہ ابریز بھی اس مملکت میں شامل ہے لیکن اس کی ایک الگ حیثیت ہے۔ یہاں کے باشندوں پر سارے ملکی قوانین لاگو ہوتے ہیں لیکن یہاں عدالتیں نہیں ہیں۔ محکمۂ پولیس نہیں ہے، یہاں کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، دیانت دار اور قانون پسند ہے۔''

''کیا آپ مجھے یہی سب کچھ دکھانے کے لیے یہاں لائے تھے؟'' سیفی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' سلمان شیرازی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں یہاں لانے کی وجہ کچھ اور بھی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔''

سیفی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس عظیم الشان محل کو دیکھا جس کے احاطے میں ان کی کار داخل ہو رہی تھی۔ وہ سیاہ پتھروں سے تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت تھی جس کے اندازِ تعمیر سے وقار اور دبدبہ جھلکتا تھا۔ محل کی بیرونی دیواروں پر بڑی نفاست سے چنبیلی کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔ سیاہ دیواروں کے پیش منظر میں چنبیلی کی بیلوں پر سفید رنگ کے کھلے ہوئے پھول آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ احاطے کے گیٹ پر غیر مسلح باوردی دربان موجود تھا جس نے کار کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ محل کے وسیع احاطے میں شاندار سبزہ زار تھا جس پر کئی ملازمین مصروف کار دکھائی دے رہے تھے۔ عمارت کی پیشانی پر سفید رنگ کے جلی حروف میں ''قصر یاسمین'' تحریر تھا۔

ان کی کار دو طرفہ سبزہ زار کے درمیان سے گزرتی ہوئی محل کے داخلی دروازے پر جا رکی۔ سیفی نے کار سے اتر کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے شدید مرعوبیت جھلک رہی تھی۔

''آؤ۔'' سلمان شیرازی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ سلمان شیرازی کے عقب میں چلتا ہوا محل میں داخل ہو گیا۔ کچھ راہداریوں سے گزر کر سلمان شیرازی ایک جگہ رک گیا۔ راہ داری کے دونوں طرف آمنے سامنے دروازے تھے۔ ایک پر انتظار گاہ اور دوسرے پر کانفرنس ہال تحریر تھا۔ کانفرنس ہال کے دروازے پر باوردی دربان موجود تھا۔

''سب لوگ آگئے؟'' سلمان شیرازی نے دربان سے پوچھا۔

''جی ہاں جناب۔'' دربان نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، انہیں انتظار گاہ میں بٹھاؤ۔'' سلمان شیرازی نے سیفی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور خود کانفرنس ہال میں داخل ہو گیا۔

دربان نے انتظار گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ ''تشریف لائیے جناب۔'' اس نے سیفی سے کہا۔

سیفی جھجکتا ہوا انتظار گاہ میں داخل ہوا اور نہایت اطمینان سے ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ سلمان شیرازی نے اسے حالات سے بے خبر رکھا تھا۔ سیفی نہیں جانتا تھا کہ سلمان شیرازی کون ہے اور اس میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ محل کے سارے ملازمین نے اسے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی اہم حیثیت کا حامل ہے لیکن ایک معمولی آدمی میں اس قدر دلچسپی...... اس نے جھنجلا کر سوچنا بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد انتظار گاہ کا دروازہ کھلا اور سلمان شیرازی اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں چھ مزید افراد اندر آئے۔ وہ سب ذی حیثیت معلوم ہوتے تھے۔ سیفی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''مبارک ہو جناب۔'' سلمان شیرازی گرم جوشی سے بولا۔ ''آپ کا انتخاب عمل میں آگیا ہے۔''

''کک...... کیسا انتخاب؟'' سیفی ہکلا کر بولا۔

''اوہ معاف کیجیے گا جناب ...... مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میں نے آپ کو صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا ہے۔'' سلمان شیرازی شرمندہ ہو کر بولا۔ ''دراصل گزشتہ دنوں ابریز کے حکمران کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ لاولد تھے۔ اگر ان

کے کوئی اولاد ہوتی تو نئے حکمران کا جھگڑا نہ پڑتا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جانشین کسی ایسے شخص کو بنایا جانا تھا جو کسی امتیازی خصوصیت کا حامل ہو۔ سپریم کونسل اس بات پر متفق ہے کہ آپ ہی ہمارے مطلوبہ فرد ہیں۔"

"مجھ میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟" سیفی نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

"آپ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود قانون پسند ہیں۔ ہماری نظروں سے ایسا کوئی آدمی نہیں گزرا۔"

"کیا غیر تعلیم یافتہ ہونا کوئی جرم ہے؟" سیفی جھنجلا گیا۔

"میں سمجھا نہیں جناب؟" سلمان شیرازی نے کہا۔

"اس جرم میں تو آپ لوگ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔"

"یہ تو ایک اعزاز ہے جناب۔"

"اور اگر میں یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کردوں تو؟"

"تو آپ کو زبردستی یہ اعزاز قبول کرنا پڑے گا۔" سلمان شیرازی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ان سب نے اپنے سروں کو تائیدی جنبش دی۔

سیفی حواس باختہ ہوگیا۔ یا تو وہ لوگ اس کے ساتھ مذاق کررہے تھے یا پھر وہ پاگل تھے۔ کسی کو زبردستی حکمران بنادینا پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ انکار کردیتا یا یہ اعزاز قبول کرلیتا۔ وہ ایک اجنبی جزیرے میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ یہاں کے لوگ کس قسم کے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ساتھ مذاق کیا جارہا ہو لیکن اگر یہ مذاق تھا تو بے حد سنجیدگی سے کیا جارہا تھا اور اگر وہ لوگ سنجیدہ تھے تو بھی یہ بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ لوگ یہاں مکمل طور پر بااختیار تھے جبکہ سیفی بے بس تھا۔

"ٹھیک ہے جناب، مجھے منظور ہے۔" اس نے بالآخر ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا نا۔" سلمان شیرازی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"آپ مجھے بتائیے کہ میری حیثیت کیا ہوگی؟"

"سپریم کونسل نے آپ کو جزیرے کا سربراہ منتخب کیا ہے جناب۔" سلمان شیرازی بولا۔ "آج سے آپ جزیرہ ابریز کے مطلق العنان فرماں روا ہوں گے۔"

☆☆☆

سیفی کو تین عدد مشیروں کے حوالے کردیا گیا تھا۔ وہ تینوں ہی خبطی قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کی بھی عمر چالیس سے کم نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور ان کے نام بڑے بڑے بادشاہوں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ قیصر، کسریٰ اور پرویز۔ انہوں نے چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر نہ صرف سیفی کو پورے محل کی سیر کروادی بلکہ اسے موٹی موٹی باتوں سے بھی آگاہ کردیا تھا۔

سیفی کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ محل کے سارے ملازمین اس سے مؤدبانہ انداز میں بات کررہے تھے۔ اس وقت اس کے جسم پر شاہانہ لباس نظر آرہا تھا جو شاہی درزی نے ہنگامی طور پر اس کا ناپ لے کر تیار کیا تھا۔ مشیروں کے کہنے کے مطابق مزید ملبوسات کی تیاری کا کام جاری تھا۔ اس کے پیروں میں سنہری کام والے سلیم شاہی جوتے تھے اور وہ قصر یاسمین کے دیوانِ خاص میں سربراہ کے لیے مخصوص مخملی زرنگار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں مشیر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

سیفی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کی یہ بات یاد تھی کہ سربراہ بننے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی کوئی معمولی سی ملازمت کرلے۔ اس لیے کہ سربراہانِ مملکت پر کڑی پابندیاں ہوتی ہیں۔ انہیں سرکاری بکھیڑوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اپنے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔

اس کا ذہن بڑی دیر سے ایک لفظ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ لفظ سلمان شیرازی نے بولا تھا اور سیفی نے پہلے کبھی وہ لفظ نہیں سنا تھا۔ اگر وہ گاؤں میں ہوتا تو چھوٹے سرکار سے مطلق العنان کے متعلق پوچھ لیتا مگر یہاں کس سے پوچھتا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ مشیروں سے پوچھ لے اور پھر وہ فوراً ہی اپنے خیال پر عمل بھی کر بیٹھا۔

"مطلق العنان کسے کہتے ہیں؟"

تینوں مشیروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قیصر گلا کھنکھار کر بولا۔ "یہ لفظ اپنے حاکم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مکمل طور پر بااختیار ہو اور کسی کو جواب دہ نہ ہو۔" سیفی نے ایک طویل سانس لی گویا وہ اپنے افعال کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہوگا۔

"مگر آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟" پرویز نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

"تم مشیر ہو۔" سیفی حقارت آمیز انداز میں بولا۔ "مشیر کو تو بے حد ذہین ہونا چاہیے۔ تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ جب کوئی آدمی کوئی بات پوچھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے وہ بات معلوم نہیں ہے...... یا تمہارے خیال میں میں تمہارا امتحان لے رہا تھا؟"

"جج...... جناب۔" پرویز ہکلا کر رہ گیا۔

سیفی کسی خیال میں کھو گیا تھا۔ تینوں مشیروں کے

چہروں کی رنگت اڑ گئی تھی۔ وہ اس اندازِ گفتگو کے عادی نہ تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ بہت شائستگی سے گفتگو کی گئی تھی۔ ادب، تہذیب، تمیز اور قانون پسندی...... یہی تو جزیرہ ابریز کے باشندوں کا طرۂ امتیاز تھا۔

"ہمارا تاج کہاں ہے؟" دفعتاً سیفی نے کسی خیال کے تحت چونک کر پوچھا۔

"اس کے لیے تو باقاعدہ ایک رسم ہوگی۔ جشنِ تاج پوشی منعقد ہوگا اور عوام کے سامنے آپ کو تاج پہنایا جائے گا۔" کسریٰ نے کہا۔

"اور وہ جشنِ تاج پوشی کب ہوگا؟" سیفی فیصلے لہجے میں بولا۔

"تاریخ تو جنابِ والا خود منتخب فرمائیں گے۔" قیصر نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم سوچیں گے۔"

"لیکن جناب! آپ اپنے لیے کوئی لقب تو منتخب فرمالیں۔" پرویز بولا۔

"لقب!" سیفی بولا۔ "کیا حکمران کا نام کافی نہیں ہوتا؟"

"نام تو عام لوگوں کے بھی ہوتے ہیں۔" قیصر نے جواب دیا۔ "اور یہ بات طے ہے کہ حکمران عام آدمیوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہ امتیاز القاب کے ذریعے مزید اجاگر کیا جاتا ہے۔"

"ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لقب ایسا ہو جو کسی امتیازی خصوصیت کو اجاگر کرتا ہو۔"

"اگر لقب واقعی کسی خوبی کو اجاگر کرتا ہو تو سونے پہ سہاگا ہے۔" قیصر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" سیفی نے مطمئن انداز میں کہا۔ "ہم اپنے لیے جہالت مآب کو بطور لقب منتخب کرتے ہیں۔"

"گگ...... کیا فرما رہے ہیں حضورِ والا؟"

"ہم نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا ہے۔"

"ل...... لیکن جناب لقب تو ایسا ہونا چاہیے جو کسی خوبی کو اجاگر کرتا ہو۔" قیصر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تمہارے خیال میں جہالت کوئی خوبی نہیں ہے؟" سیفی غرایا۔

قیصر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کسریٰ اور پرویز بھی بوکھلائے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"م...... میں...... گگ...... کیا عرض کروں۔" قیصر ہکلا کر رہ گیا۔

"تم بتاؤ۔" سیفی ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کا لہجہ بدستور خراب تھا۔

"جنابِ والا بہتر سمجھتے ہیں۔" کسریٰ نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"کیا بہتر سمجھتے ہیں؟" سیفی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ عالی مرتبت کے لیے کون سا لقب مناسب رہے گا؟"

"یہ ہماری بات کا جواب تو نہیں۔" سیفی کی آواز بلند ہوئی۔ "ہم نے پوچھا تھا، جہالت خوبی ہے کہ نہیں؟ ہمیں اس کا جواب چاہیے۔"

"م...... مجھے نہیں معلوم جناب۔" کسریٰ بہ وقت تمام بولا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔

"ہوں۔" سیفی غرایا۔ "اور تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے پرویز کی طرف دیکھا۔

پرویز اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ ایک مصیبت میں پھنس چکے ہیں لیکن اس نے بڑی تیزی سے نہ صرف صورتِ حال کا تجزیہ کرلیا تھا بلکہ اس نے ایک ممکنہ جواب بھی گھڑ لیا تھا۔

"کسی سربراہ کے لیے یقیناً یہ ایک خوبی ہے جناب۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" سیفی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"ہمارے ملک کی پچاسی فیصد آبادی جاہل ہے جناب۔" اس نے محققانہ انداز میں جواب دینا شروع کیا۔ "اور تعلیم یافتہ طبقہ صرف پندرہ فیصد ہے۔ گویا جہلاء اکثریت میں ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ اقلیت میں ہیں۔ اقلیتی طبقے کے کسی فرد کو ہرگز یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ملک کی اکثریت پر حکومت کرے لیکن ہمیشہ اقلیت، اکثریت پر حکمران رہی ہے لہٰذا اگر کوئی جاہل برسرِ اقتدار آجائے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اکثریت کے نمائندے کی حیثیت سے یہ لقب اختیار کرلے۔"

سیفی پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھور رہا تھا۔ "ہم جزیرہ ابریز پر ہیں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"آپ درست فرما رہے ہیں جناب۔" پرویز نے تیزی سے کہا۔ "میں نے پورے ملک کی بات اس لیے کی تھی کہ جزیرہ ابریز بھی اسی ملک کا ایک حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اسے ایک آزاد ریاست کی حیثیت حاصل ہے تاہم اس کی یہ حیثیت کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ ملکی اعداد و شمار میں ابریز کے اعداد و شمار بھی شامل ہوتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خود کو

پورے ملک پر پھیلا کر گفتگو کرنے سے گریز کریں۔"

سیفی خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن جھانک رہی تھی۔ شاید پرویز کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی تھی۔ اس نے سیفی کو اپنی پہلے دار گفتگو میں الجھا لیا تھا۔ سیفی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا پھر یکایک اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمکنے لگیں۔

"تم لوگ پرویز کی بات سے متفق ہو؟" اس نے قیصر اور کسریٰ سے پوچھا۔

ان دونوں کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ اس نظریے سے اتفاق کریں۔ انہوں نے اپنے سر اثبات میں ہلا دیے۔

"بس تو آج سے ہی ہمیں جہالت مآب کہہ کر پکارا جائے گا۔" سیفی نے حکم صادر کیا۔ وہ تینوں کچھ نہ بولے۔

"اعلان کروا دو کہ ابریز کے ہر باشندے کے لیے گنجا ہونا لازمی ہے۔ یہ حکم فوری طور پر نافذ کیا جاتا ہے۔"

"جی!" ان تینوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ان کے منہ مارے حیرت کے کھل گئے تھے۔

"روزانہ صبح گھر سے باہر نکلنے سے قبل ہر ایک کے لیے سر کا شیو کرنا لازمی ہوگا۔ سر پر کچھ اوڑھنے کی ممانعت ہوگی اور چکنی کھوپڑی پر تیل کی ہلکی سی مالش بھی کرنی ہوگی تاکہ چندیا چمکتی رہے۔"

وہ تینوں اچھل پڑے۔ وہ اسے اس انداز میں دیکھ رہے تھے جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

"کیا خیال ہے؟" سیفی مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے بھی اس کی ذہنی جھلاہٹ جھلک رہی تھی۔ انہوں نے بےبسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیے۔ کچھ بولنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

"پتا نہیں ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" قیصر دیوانِ خاص سے باہر نکلتے ہی بولا۔

"مصیبت تو بہت معمولی سا لفظ ہے۔" کسریٰ کراہا۔ "اس کے لیے تو کوئی نیا لفظ تلاش کرنا پڑے گا۔"

پرویز کو ہنسی آ گئی۔ "اب دیکھو کل سے ہمیں ٹنڈ کروانا پڑے گی۔" اس نے کہا۔

"تمہاری ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔" قیصر بگڑ گیا۔ "تم نے لقب والے معاملے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اس کے بعد سے ہی وہ شیر ہو گیا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" پرویز متحیرانہ لہجے میں بولا۔ "تم نے بھی اس کی مخالفت کر کے کون سا تیر مار لیا تھا۔"

"درست بھی۔" کسریٰ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہم کو مل کر اس مشکل سے نکلنے کا کوئی حل سوچنا پڑے گا۔"

لیکن اس مسئلے کا کوئی حل انہیں نہ سوجھ سکا اور انہیں شاہی فرمان کا اعلان کروانا ہی پڑا۔

سیفی کے لیے اس ماحول میں گزارہ کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ وہ آزاد فضاؤں کا باسی تھا اور یہاں کی مصنوعی فضا میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن گلو خلاصی کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہاں کی ہر چیز اسے وحشت میں مبتلا کر رہی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اس سے وہاں کے پرتکلف کھانے بھی نہ کھائے جا رہے تھے۔ اس کی خواب گاہ بہت آراستہ و پیراستہ تھی۔ نرم بیڈ پر وہ سونے کے لیے لیٹا تو بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے ہر صورت میں یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی تدبیر سوچنا تھی، ورنہ وہ چند ہی روز میں پاگل ہو جاتا۔

بہت رات گئے اسے نیند آئی تھی لیکن آنکھ حسبِ معمول صبح پانچ بجے ہی کھل گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وہ تیار ہوا تو صرف چھ بجے تھے۔ اس نے تالی بجائی۔ ملازم وغیرہ کو بلانے کے لیے وہاں یہی طریقہ رائج تھا۔

وہ چند منٹ انتظار کرتا رہا مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ تالی بجائی اور اونچی آواز میں بولا۔

"کوئی ہے؟"

اس بار بھی کوئی نہ آیا۔ وہ جھنجلا کر خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر کوئی موجود نہیں تھا جبکہ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی خدمت کے لیے ہر وقت ایک ملازم موجود رہا کرے گا۔ وہ آگے بڑھا۔ کافی دیر تک قصر یاسمین کی غلام گردشوں میں چکرانے کے باوجود اسے کوئی نظر نہ آیا۔

"بہت غیر ذمے دار لوگ ہیں۔" وہ ناگواری سے بڑبڑایا۔ "مجھے تو کہا تھا کہ محل میں ہر وقت پہرے دار موجود رہتے ہیں لیکن یہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہے۔"

وہ مختلف راہ داریوں میں چکراتا ہوا محل کے داخلی دروازے تک جا پہنچا۔ دروازے پر دو پہرے دار موجود تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور سر پر لگے ہوئے تیل کے باعث ان کی چندیاں چمک رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹینشن ہو گئے۔

"سب لوگ کہاں مر گئے؟" اس نے دہاڑ کر پوچھا۔

"جی وہ اپنے سر منڈوانے گئے ہیں۔" ایک پہرے دار نے جواب دیا۔

"کیا!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "سب ایک ساتھ چلے گئے؟"

"جی ہاں جناب۔" وہی پہرے دار دوبارہ بولا۔ "سب کو سر منڈوانے تھے اس لیے نائی کے پاس کافی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔"

اس کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ اس نے تو یہ فرمان اس لیے جاری کیا تھا تاکہ وہ لوگ پریشان ہو کر اسے معزول کر دیں لیکن انہیں تو ذرا بھی پروا معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے احتجاج کیا جائے گا لوگ فریاد کریں گے اور وہ اپنی بات پر اٹل رہے گا۔ کچھ دیر وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا پھر سنبھل کر بولا۔

"جاؤ، نائی سے کہو کہ باورچی کا سر پہلے مونڈ دے۔ ہم ناشتا پہلے کریں گے۔"

وہ پلٹ کر اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ چونکہ محل کے ملازم ہیں لہٰذا ان کی ہمت نہ ہوتی ہوگی کہ اس کی حکم عدولی کر سکیں۔ ابر جزیرے کے عام باشندے یقیناً اس کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیں گے۔ سپریم کونسل کو اس جانب متوجہ کیا جائے گا اور اس کی جگہ نیا حکمران منتخب کر لیا جائے گا۔ یوں اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

وہ ایسے ہی پریشان کن خیالات میں الجھا رہا۔ اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ صبح سویرے ناشتا کرنے کا عادی تھا اور یہاں تو اس کا رات کا کھانا بھی تقریباً گول ہی ہو گیا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اٹھا اور خواب گاہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باورچی اپنی چمک دار منڈی ہوئی کھوپڑی سمیت اسی طرف آرہا تھا۔

"ناشتا تیار ہے حضور والا۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"چلو، جلدی کرو۔" وہ تیز قدموں سے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ناشتا میز پر چن دیا گیا تھا۔ اس نے متحیرانہ انداز میں میز کی طرف دیکھا جہاں انواع و اقسام کی چیزیں نظر آرہی تھیں مگر ناشتا ندارد تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں باورچی کی طرف مڑا۔

"کک... کہاں، کیا ہے جناب؟" باورچی بوکھلا گیا۔

"یہ۔" وہ میز کی طرف اشارہ کر کے دہاڑا۔

"م..... میں سمجھا نہیں سرکار۔"

"میں نے ناشتا لگانے کو کہا تھا۔" سیفی غصیلے لہجے میں بولا۔

"ن..... ناشتا ہی تو ہے سرکار۔" باورچی گھگھیایا۔

"اس میں کون سی چیز ناشتا ہے؟" سیفی آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

"یہ انڈے کا حلوا ہے، ابلے ہوئے انڈے ہیں، سکے ہوئے توس ہیں، مکھن، جام، جیلی وغیرہ۔"

"خاموش رہو۔" سیفی بھنا کر بولا۔ "تم باورچی ہو؟ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ناشتا کیا ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں ہٹاؤ یہاں سے اور جا کر پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بنا کر لاؤ۔"

باورچی سر پٹ ہو گیا۔ کچھ اور ملازم ٹنڈ کروا کے واپس آگئے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی میز صاف کر دی۔ سیفی خونخوار انداز میں ان سب کو گھورتا رہا پھر تھوڑی ہی دیر بعد چار عدد پراٹھوں اور چار انڈوں کے آملیٹ کا صفایا کر کے اس نے طویل ڈکار لی۔

چائے پی کر اس نے دیوانِ خاص کا رخ کیا۔ تینوں مشیر وہاں اس کے منتظر تھے۔ ان کے سر بھی منڈے ہوئے تھے اور سر پر لگے تیل کی وجہ سے ان کی کھوپڑیاں چمک رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر سیفی مسکرایا۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے انہیں چڑا رہا ہو۔

"کیا حال ہے دوستو؟" وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہیں جناب۔" انہوں نے بیک آواز میں جواب دیا۔

سیفی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان تینوں کا ہی انداز مؤدبانہ تھا۔ وہ مایوسانہ انداز میں اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" اس نے ہاتھ ہلا کر ان سے کہا۔

وہ بیٹھ گئے۔ قیصر نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "آپ اپنی آج کی مصروفیات کی تفصیل سیکریٹری کو نوٹ کروا دیں جناب۔"

"سیکریٹری کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں موجود ہے جناب۔" وہ ایک دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اسے بلاؤ۔" سیفی نے بے نیازی سے کہا۔

قیصر خود ہی اٹھ کر اس دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر دو بار ہلکی سی دستک دے کر اس نے دروازہ کھولا۔ "آپ کو جہالت مآب یاد فرما رہے ہیں۔" اس نے

بڑے سکون سے کہا اور اپنی نشست پر واپس آ گیا۔
ذرا ہی دیر بعد دیوانِ خاص میں سیکریٹری کا نزول ہوا۔ اسے دیکھ کر سیفی سانس تک لینا بھول گیا۔ سیکریٹری کا انڈے کے مانند شفاف سر دیگر لوگوں کی طرح چمک رہا تھا لیکن سیفی کی حیرانی کا باعث اس کا لباس تھا۔ اس نے سفید ساڑی زیبِ تن کر رکھی تھی۔ پیروں میں اونچی ایڑی والے سینڈل تھے اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی نظر آ رہی تھی۔ سیکریٹری کے ہاتھ میں پیڈ اور پنسل موجود تھے۔
"فرمایئے جناب۔" اس نے سیفی کی نشست کے قریب رک کر سریلی آواز میں کہا۔
سیفی اچھل پڑا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
"یہ لیڈی سیکریٹری ہیں جناب۔" قیصر نے جواب دیا۔ "آپ انہیں اپنی مصروفیات نوٹ کروا دیں۔"
"تمہارے بال کیا ہوئے؟" سیفی نے خود پر قابو پاتے ہوئے سیکریٹری سے پوچھا۔
"شاہی فرمان کے مطابق......"
"ابے گدھو! یہ تم نے کیا کیا۔" وہ مشیروں کی طرف مڑ کر دہاڑا۔
"ہم نے کیا کیا ہے جناب؟" کسریٰ ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ "آپ ہی کا تو فرمان تھا......"
"وہ صرف مردوں کے لیے تھا۔"
"آپ نے وضاحت نہیں کی تھی۔" کسریٰ بولا۔ لہجہ بدستور ناخوشگوار تھا۔
"تم نے وضاحت طلب کر لی ہوتی۔" وہ جھنجلا کر بولا۔
"ہمیں کیا معلوم کہ آپ کے دل میں کیا ہے۔"
"نکل جاؤ یہاں سے۔" غصے کی زیادتی سے اس کی آواز بھرا گئی۔ "آپ بھی جائیں۔" ان کے جانے کے بعد اس نے سیکریٹری سے کہا اور سر پکڑ کر کرسی پر گر گیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ابریز کی ہر عورت اب تک گنجی ہو چکی ہو گی۔ اس نے ابریز کے باشندوں کو تنگ کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا، اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس دلدل سے نکلنے کی وہ جتنی کوشش کرے گا، اتنا ہی اس میں دھنستا چلا جائے گا۔
وہ سوچتا رہا...... سوچتا رہا اور بالآخر اس کے ذہن میں ایک خیال آ ہی گیا۔ اس نے اپنے مشیروں کو طلب کر لیا۔
"ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔" سیفی فیصلے انداز میں بولا۔ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے لیے کوئی نیا مشیر مقرر کریں گے تم لوگ نااہل ہو۔"
"ہم بھی یہی کہنا چاہتے تھے جناب کہ ہم سے اب مزید یہ ملازمت نہیں ہو سکے گی۔"
"جب تک نئے مشیر کا تقرر نہیں ہو جاتا، تم ہی لوگ مشیر رہو گے۔"
"نیا مشیر کب تک مقرر ہو جائے گا؟"
"مشکل یہ ہے کہ وہ چاند پور میں ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے رابطہ کیسے قائم کریں؟"
"اس کا نام کیا ہے جناب؟" پرویز نے پوچھا۔
"ماسٹر خیر دین...... وہ وہاں کے ہائی اسکول میں ٹیچر ہے۔"
"ہائی اسکول میں فون تو ہو گا جناب؟" قیصر بولا۔
"ہاں، ہے تو سہی مگر ہمیں اس کا فون نمبر معلوم نہیں ہے۔"
"یہ کون سی بڑی بات ہے جناب۔" کسریٰ نے کہا۔ "اگر اجازت ہو تو ابھی معلوم کر لوں؟"
"کیسے معلوم کرو گے؟" سیفی نے حیرانی سے پوچھا۔
"ٹیلی فون ڈائریکٹری سے چاند پور کا کوڈ نمبر دیکھ کر وہاں کے ایکسچینج سے معلوم کروں گا۔" کسریٰ نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے، معلوم کرو۔" سیفی نے بے چینی سے کہا۔
ماسٹر خیر دین اس سے تین سال بڑا تھا لیکن پڑوسی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی بہت گہرے دوست تھے۔ سیفی کا دل تو پڑھائی میں لگتا نہیں تھا اس لیے وہ ان پڑھ ہی رہ گیا لیکن خیر دین پڑھائی کا رسیا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس کی مسلسل محنت رنگ لائی اور اب وہ اسکول ٹیچر تھا۔ چاند پور جیسے قصبے میں اسکول ٹیچر ہونا بڑی بات تھی۔ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے لیکن سیفی کے لیے وہ اب بھی خیر دین ہی تھا۔ وہی بچپن والا خیر دین، یہ اور بات ہے کہ دوسروں کی طرح اس نے بھی اسے ماسٹر خیر دین کہنا شروع کر دیا تھا۔
کسریٰ دیوانِ خاص کے ایک کونے کی ٹیبل پر رکھے ہوئے فون سے الجھا ہوا تھا۔ چاند پور ٹیلی فون ایکسچینج سے اس کا رابطہ ہو گیا تھا۔ اس نے آپریٹر سے نمبر پوچھ کر ایک پرچے پر نوٹ کیا اور فون بند کر کے سیفی کی طرف لوٹ آیا۔
"فون نمبر مل گیا جناب۔" اس نے سیفی کی طرف پرچہ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"میں اس کا کیا کروں؟" سیفی نے کہا۔ "تم یہ نمبر ملا

کر ماسٹر خیر دین سے میری بات کرواؤ...... اور ہاں، یہ بھی بتاؤ کہ اگر وہ یہاں آنے پر رضامند ہو جائے تو اسے بلانے کی کیا صورت ہوگی؟"

"اس کی فکر نہ کریں جناب۔" کسرٹی بولا۔ "اگر وہ رضامند ہو جائیں تو انھیں یہاں بلوا لیا جائے گا۔"

کسرٹی دوبارہ فون کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد مطلوبہ نمبر مل گیا۔ دوسری طرف موجود شخص کو ہولڈ کروا کر وہ سیٹی کی طرف مڑا۔

"نمبر مل گیا ہے جناب...... آپ بات کر لیجیے۔"

سیٹی اٹھ کر فون کی طرف بڑھا۔ "تم لوگ باہر جاؤ۔" وہ ریسیور کسرٹی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔

"ہیلو، چاند پور ہائی اسکول...... دیکھیے میں سیٹی بات کر رہا ہوں۔ مجھے ماسٹر خیر دین سے بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے انتظار کرنے کو کہا گیا۔ تینوں مشیر دیوانِ خاص سے باہر جا چکے تھے۔ سیٹی ریسیور کانوں سے لگائے منتظر کھڑا تھا۔

"میں ماسٹر خیر دین بات کر رہا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد ریسیور سے آواز ابھری۔

"اوہ! ماسٹر خیر دین، میں سیٹی ہوں...... تم خیریت سے ہو؟"

"ہاں میں خیریت سے ہوں۔ کیا تم شہر سے بات کر رہے ہو؟"

"میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں ماسٹر خیر دین......"

"کس مشکل میں پھنس گئے ہو؟"

"فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟"

"تم کیسی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہو سیٹی۔ بھلا میں تمھارے پاس کہاں آؤں گا۔ پھر مجھے اسکول سے چھٹی بھی لینی پڑے گی۔"

"تم اسکول سے فوراً چھٹی لے لو۔ میں تمھیں خود ہی بلوا لوں گا۔"

"خدا ہی جانے تم کیا چاہتے ہو۔" ماسٹر خیر دین کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ "بہرحال میں کل سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتا ہوں...... ایک ہفتہ کافی رہے گا؟"

"کافی رہے گا ماسٹر خیر دین، بس کل صبح تیار رہنا۔"

سلسلہ منقطع کر کے اس نے مشیروں کو اندر بلا لیا۔ "وہ راضی ہو گیا ہے۔" اس نے ان سے کہا۔ "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ کل صبح تیار رہے۔"

"ٹھیک ہے جناب، کل شام تک وہ یہاں جزیرے پر پہنچا دیے جائیں گے۔"

"اب ہم جزیرہ ابریز کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون سی گاڑی نکلوا دی جائے جناب...... اگر آپ پسند فرمائیں تو کھلی چھت والی کار میں سیر کا صحیح لطف آئے گا۔" پرویز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سیٹی بولا۔ "اور تم ہمارے ساتھ ہی چلو گے۔"

وہ ایک شاندار کار تھی۔ اس پر خصوصی نشانات لگے ہوئے تھے۔ پرویز نے اسے بتایا کہ یہ گاڑی صرف ابریز کے حکمران کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی اور یہ گاڑی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ابریز کی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر عجیب منظر تھا۔ ہر شخص خواہ مرد ہو یا عورت، گنجا تھا۔ ہر ایک نے سر پر تیل کی مالش کر رکھی تھی۔ سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی چندیا عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔

ماسٹر خیر دین نے آنے کا وعدہ کر لیا تھا لہٰذا سیٹی کے دل و دماغ سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہاں سے اس کے چھٹکارے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لے گا۔ وہ تھا ہی اتنا عقل مند آدمی۔

کافی دیر سیر کرنے کے بعد وہ قصرِ یاسمین کی طرف پلٹ آیا۔ راستے میں لوگوں نے اسے دیکھ کر خوشی کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ بعض مقامات پر لوگوں نے جمع ہو کر جہالت مآب زندہ باد کے نعرے بھی لگائے تھے۔ سیٹی کو ان کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اسے دیکھ کر کم از کم سرد مہری کا تو مظاہرہ کریں۔ آخر وہ ان کو بالجبر گنجا کروانے کا ذمے دار تھا۔ محل میں پہنچنے سے قبل ہی وہ پرویز کے لیے نئی ہدایات جاری کر چکا تھا جس کے تحت عورتوں کے لیے گنجا ہونا ضروری نہیں تھا۔ دوسری ہدایت اس اعلان کے لیے تھی کہ آئندہ سے جزیرہ ابریز کا ہر باشندہ الٹے جوتے پہنا کرے گا۔

پرویز کار سے اترا تو اس نے الٹے جوتے پہن رکھے تھے۔ ڈرائیور نے بھی فوراً اس حکم پر عمل کیا تھا۔ محل کے ملازمین نے انھیں تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھا اور جب انھیں پتا چلا کہ یہ جہالت مآب کا نیا فرمان ہے تو انھوں نے بھی الٹے جوتے پہن لیے۔ قیصر اور کسرٹی نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔

"ہم سمجھ گئے ہیں بھائی۔" قیصر اسے دیکھ کر بولا۔ "یہ

جہالت مآب کا نیا حکم ہوگا۔'' ان دونوں نے پرویز کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنے اپنے جوتے الٹ لیے تھے۔

''اگر اسی طرح روز ایک فرمان جاری ہوتا رہا تو چند ہی روز بعد ہم لوگ کارٹونوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔'' پرویز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''اس وقت کون سا کارٹون سے کم ہیں۔'' کسریٰ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

''شکر کرو کہ بات صرف بالوں اور جوتوں تک ہی محدود ہے۔'' قیصر نے کہا۔ ''اگر کہیں بات دھوتی اور بنیان......''

''خدا کے واسطے خاموش رہو۔'' پرویز نے خوف زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ''اگر کہیں جہالت مآب کے کانوں میں ایسی تجویز کی بھنک پڑ گئی تو خدا جانے کیا ہوگا۔''

''ابھی تو دیکھتے رہو، کل ماسٹر خیر دین بھی تشریف لا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی آمد سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔'' کسریٰ بولا۔

''ٹھیک کہتے ہو بھائی۔'' قیصر نے بے چارگی سے کہا۔ ''جزیرہ ابریز کے باشندوں کا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔''

اگلے روز سہ پہر کے وقت ماسٹر خیر دین جزیرے پر پہنچ گیا۔ سیفی نے محل کے دروازے پر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ماسٹر خیر دین کی آنکھوں میں حیرت تھی لیکن اس نے دوسرے لوگوں کے سامنے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ سیفی اسے سیدھا اپنی خواب گاہ میں لایا۔

''پہلے تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ پھر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔'' سیفی نے کہا۔

''میں حیران ہو ہو کر بے ہوش ہونے کے مرحلے تک پہنچ گیا ہوں اور تمہیں نہانے دھونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔'' ماسٹر خیر دین ناراضی سے بولا۔

''حیرانی کس بات پر ہو رہی ہے؟'' سیفی ہنس کر بولا۔

''کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔'' خیر دین نے کہا۔ ''جو شخص مجھے لینے چاند پور پہنچا تھا، اس کا سر منڈا ہوا تھا اور اس کے پیروں میں الٹے جوتے تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ کوئی پاگل ہے لیکن اس کا لباس اور بات چیت کا انداز میرے اس خیال کی نفی کر رہے تھے پھر اس نے تمہارا حوالہ دیا تو میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ اب جزیرے پر آ کر دیکھا تو ہر ایک کا یہی حال ہے اور تمہارے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر تو میں انگشت بدنداں ہوں۔ آخر یہ گاؤں چھوڑتے ہی تمہاری کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟''

سیفی نے اسے اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔

پورے واقعات سنانے کے بعد بولا۔ ''اب تم مجھے یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔ میں ایک پل بھی یہاں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

ماسٹر خیر دین اسے بڑے غصیلے انداز میں گھور رہا تھا۔ ''تمہیں پہلے ہی مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔ یہ حماقتیں پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ہم...... میں نے سوچا تھا شاید یہ لوگ نالاں ہو کر میری جان چھوڑ دیں گے۔''

''ایک تعلیم یافتہ اور ایک جاہل میں یہی فرق ہوتا ہے۔ تم نے جو حرکتیں کیں، وہ کوئی جاہل ہی کر سکتا تھا۔''

''تو کیا میں خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟'' سیفی جھنجلا گیا۔

وراثت

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ''میری ساس کی پرنانی کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ نانی کی عمر ایک سو پندرہ سال تھی۔ میری ساس کی ماں ایک سو دس سال تک زندہ رہی۔ ہر آنجہانی خاتون کی عمر میں مرتے وقت پانچ سال کی کمی ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے میری ساس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک سو پانچ سال کی عمر پائے گی۔ ڈاکٹر بھی کہہ رہے ہیں کہ اس خاندان میں طویل عمری وراثت میں چلی آ رہی ہے۔''

دوست نے پوچھا۔ ''کیا تم ساس کی لمبی عمر سے پریشان ہو؟''

وہ شخص لمبی آہ بھر کے بولا۔ ''ہاں، ساس کی وجہ سے بھی اور بیوی کی وجہ سے بھی۔ اگر میری بیوی سو سال تک زندہ رہی تو میرا کیا ہوگا؟ یہ بڑھی چڑیل تو مجھے ہلکان کرتی رہے گی۔''

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی بلوچی بستی، بہاولپور

رام کہانی

ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے اور بیوی سے بولے۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اتنی دیر تک کہاں رہا تھا؟''

بیوی بولی۔ ''بالکل اندازہ لگا سکتی ہوں تا ہم تم اپنی کہانی بھی سنا ڈالو۔''

انتخاب۔ یاسر علی، کراچی

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ جوابی کارروائی پر اتر آئے تو کیا ہوگا؟ تم اس پوزیشن میں تو نہیں ہو کہ ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرو۔“

”میں یہ بھی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میری اصل حیثیت کیا ہے۔ کہیں مجھے صرف دکھاوے کا حکمران تو نہیں بنایا گیا۔“

”اور کوئی طریقہ نہیں تھا یہ معلوم کرنے کا؟“

”جو ہو گیا اسے جہنم میں جھونکو...... مجھے یہ بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟“

”تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں ہرگز اس کی مدد نہ کرتا لیکن یہ صرف بچپن کی دوستی ہے جس کی خاطر میں تمہاری حماقتوں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔“

”تو کیا گلو خلاصی کا کوئی طریقہ تمہاری سمجھ میں آ گیا ہے؟“ سیفی نے اسے متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس بارے میں غور کرنا پڑے گا۔“ خیر دین نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ سپریم کونسل کے ارکان کہاں ہیں؟“

”وہ تو اسی روز واپس چلے گئے تھے۔“ سیفی نے بتایا۔

”کہاں واپس چلے گئے تھے؟“ خیر دین نے چونک کر پوچھا۔

”وہ ابریز کے باشندے ضرور ہیں لیکن یہاں مستقل طور پر رہتے نہیں ہیں۔ جب سپریم کونسل کا اجلاس ہوتا ہے تبھی یہاں آتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں۔“

”او، تم نے یہ بات پہلے نہیں بتائی تھی۔“

”اس بات کی اہمیت ہی کیا تھی؟“ سیفی نے بے پروائی سے کہا۔

”پھر تم نے اپنی عقل لڑائی۔“ خیر دین نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اب نہیں لڑاؤں گا۔“ سیفی شپٹا گیا۔ اسے خدشہ ہوا کہ کہیں ماسٹر خیر دین پھر ناراض نہ ہو جائے۔

”تم پر یہاں کس قسم کی پابندیاں ہیں؟“

”ابھی تک تو مجھے کوئی پابندی نظر نہیں آئی۔“ سیفی نے بتایا۔

”کوئی پابندی نہیں؟“ ماسٹر خیر دین حیران ہو کر بولا۔ ”پھر تم یہاں کر کیا رہے ہو؟“

”کیا کر رہا ہوں۔“ سیفی خفگی سے بولا۔ ”بتا تو چکا ہوں کہ ان لوگوں نے مجھے زبردستی یہاں کا حکمران بنا دیا ہے۔“

”او خدا کے بندے۔“ خیر دین اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”زبردستی حکمران بنا دیا تھا تو کیا ہوا...... کوئی انہوں نے اب تمہیں باندھ تھوڑا ہی رکھا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ سیفی اسے حیرت سے دیکھ کر بولا۔

”اگر اتنے ہی عقل مند ہوتے تو کب کے یہاں سے نکل چکے ہوتے۔ خیر اب میری باتیں غور سے سنو۔“ ماسٹر خیر دین اسے تفصیلات بتاتا رہا اور سیفی حیرت سے منہ پھاڑے اسے گھورتا رہا۔

”واقعی میں بہت بے وقوف ہوں۔“ خیر دین کے خاموش ہونے پر سیفی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے ناحق تمہیں زحمت دی۔“

”بس اب تم فوراً میرے کہنے کے مطابق عمل شروع کر دو۔“ خیر دین اس کا شانہ تھپک کر بولا۔ ”اب میں نہانا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد سیفی دیوانِ خاص میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے تینوں مشیروں کو طلب کر لیا تھا۔

”آپ لوگ تشریف رکھیے۔“ سیفی نے ان سے کہا تو ان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیل گئے۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگ بدستور ہمارے مشیر رہیں گے۔“ ان کے بیٹھنے کے بعد سیفی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گفتگو کا یہ نیا انداز ان کے لیے اچنبھے کا باعث تھا پھر کسریٰ سنبھل کر بولا۔ ”اگر ہماری درخواست قبول کر لی جاتی تو بہتر ہوتا۔“

”آپ لوگ شاید ابھی تک ناراض ہیں۔“ سیفی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمیں افسوس ہے کہ خراب ذہنی کیفیات کے باعث ہم سے کچھ زیادتی ہو گئی تھی۔ ہم آپ سے اس کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جناب؟“

”ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ لوگ ناراض نہ ہوتے تو کبھی ملازمت چھوڑنے پر اصرار نہ کرتے۔“

”ہمیں مزید شرمندہ نہ کریں جناب۔“ کسریٰ بولا۔ ”ہم بدستور آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔“

”اور نئے مشیر کا کیا ہوگا جناب؟“

”وہ ہمارے ذاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرے گا۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“

”جناب والا بہتر سمجھتے ہیں۔“ کسریٰ سر جھکا کر بولا۔

”ہم ایک نجی دورے پر جانا چاہتے ہیں۔“ سیفی نے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں۔“

”بہتر ہے جناب لیکن رسم تاج پوشی کا کیا رہے گا۔ لوگ بڑی بے چینی سے منتظر ہیں۔“

''رسمِ تاج پوشی کی تاریخ کا اعلان ہم واپس آ کر کریں گے۔'' سیفی نے کہا۔

''اور جناب والا کی واپسی کب تک ہوگی؟'' پرویز نے پوچھا۔

''ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے ہماری واپسی تک آپ لوگ یہاں کے مختار رہیں گے۔ اپنی واپسی تک کے لیے ہم اپنے جاری کردہ دونوں فرمان منسوخ کرتے ہیں۔ اب آپ لوگ اپنی مرضی کے مطابق جوتے پہن سکتے ہیں۔''

''یہ کیسا انقلاب آگیا؟'' دیوانِ خاص سے باہر نکلتے ہی قیصر نے کہا۔

''ہاں ہے تو حیرت انگیز بات..... بس اچانک ہی کایا پلٹ ہوگئی۔'' کسریٰ بولا۔

''میرا خیال ہے یہ نئے مشیر کا کمال ہے، وہ جہالت مآب کا دوست ہے۔ اس نے انہیں سمجھایا ہوگا کہ مفت کی حکمرانی کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔'' پرویز نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ممکن ہے۔'' کسریٰ بڑبڑایا۔ ''لیکن یہ سکون کہیں کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو۔''

''بدفال منہ سے نکالنے سے گریز کرنا چاہیے۔'' قیصر ناصحانہ انداز میں بولا۔

☆☆☆

''کہو کیا رہا؟'' ماسٹر خیر دین نے سیفی کے واپس آتے ہی پوچھا۔

''کام ہوگیا۔'' سیفی نے کہا۔ ''کل ہم اپنے نجی دورے پر روانہ ہوجائیں گے۔''

''بہت اچھے۔'' خیر دین بولا۔ ''اس دورے پر کون کون تمہارے ہمراہ ہوگا؟''

''صرف میرا ذاتی مشیر اور میں۔''

''تو پھر ابھی سے تیاری کرلو۔''

''تیاری کیا کرنی ہے، میرا سوٹ کیس تو ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔ اسے اٹھالوں گا اور جن کپڑوں میں یہاں آیا تھا ان ہی میں واپس بھی جاؤں گا۔''

اس رات سیفی کو نیند نہیں آئی۔ تمام رات وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور صبح چھ بجے ہی تیار ہوگیا۔

''میرا خیال ہے نکل چلیں۔'' اس نے ماسٹر خیر دین سے کہا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔'' خیر دین نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''اتنی صبح نکلنے پر کوئی مشکوک بھی ہوسکتا ہے۔ خود کو پرسکون رکھو۔ تمہارے کسی انداز سے عجلت ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ ہم آٹھ بجے روانہ ہوں گے۔''

آٹھ بجے تک کا وقت بھی اس نے کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیا پھر وہ قصرِ یاسمین سے روانہ ہوگئے۔ تینوں مشیر اور اس کی لیڈی سیکریٹری اسے الوداع کہنے آئے تھے۔ سیفی کے کہنے پر اس کے لیے ایک پرائیویٹ اسٹیمر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ نجی دورے کے لیے اس نے سرکاری لانچ استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا۔

''آپ اپنے ساتھ کچھ سامان لے جاتے تو بہتر تھا۔'' قیصر نے کہا۔

''نہیں، نجی دورے کے لیے سامان بھی نجی ہی ہونا چاہیے۔'' اس نے کہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہاں کے باشندوں کا بہت خیال رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ میں ان لوگوں کو بہت پسند کرنے لگا ہوں۔'' پھر وہ سیکریٹری کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اچھی لڑکی، مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اپنے بالوں سے محروم ہونا پڑا۔''

''بال کیا چیز ہیں جناب، آپ کے حکم پر تو بہت کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ بال تو پھر اگ آئیں گے۔''

سیفی نے اسے حیرت سے دیکھا پھر پلٹ کر اسٹیمر کی طرف بڑھ گیا۔ ماسٹر خیر دین اس کے ساتھ تھا۔ اسٹیمر اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گیا پھر جب تک اسٹیمر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا تینوں مشیر اور سیکریٹری الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ ان کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد سیفی ماسٹر خیر دین کی طرف مڑا۔

''کہیں وہ لوگ مجھے چاند پور سے زبردستی نہ اٹھوا لیں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ کسی قیمت پر بھی قانون شکنی نہیں کرسکتے لہٰذا بے فکر رہو...... ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔''

سیفی خاموش ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے وہاں سے نکل آیا ہے۔ اس کا دل جزیرے کے باشندوں کے لیے مغموم تھا مگر وہ بھی مجبور تھا۔ اپنی آزادی وہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور دل ہی دل میں عزم کیا کہ آئندہ شہر کا رخ کبھی نہیں کرے گا اس کے لیے ایک ہی تجربہ کافی تھا۔

امدادِ باہمی

مرزا امجد بیگ

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں مگر ملاپ زمین پر ہی ہوتا ہے اور... ضروری نہیں کہ ہر ملاپ خوشگوار انداز میں ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑے رہنے کے لیے مسلسل محاذ آرائی کرنی پڑتی ہے۔ یہی حال ان کے تعلقات کا بھی تھا جو قسمت سے ایک تو ہوگئے تھے لیکن ایک ساتھ رہنا دوبھر ہوگیا تھا کیونکہ کچھ لوگوں کو یہ ملاپ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اسی لیے اپنی دونوں آنکھیں ان پر گاڑھے رہنا ان کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ بہرحال جو ڈوری اللہ کے حکم سے باندھی گئی ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مرزا امجد بیگ نے غلاظت بھری آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا مکمل انتظام کرلیا تھا۔

تضادِ عمر کے شکار ایک جوڑے کی بے بسی

اور بیگ صاحب کا اندازِ بیاں

ایک روز میں دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ میری سیکریٹری سلمٰی نے انٹرکام پر اطلاع دی۔ ”سر! ایک صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے اصرار کررہے ہیں۔“

”اصرار کررہے ہیں تو انہیں میرے پاس بھیج دو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔“

”اوکے سر!“ سیکریٹری نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

وہ ماہ جنوری کے وسطی ایام تھے۔ کراچی میں جتنی اور جس نوعیت کی بھی سردی آتی ہے اس سے اہالیانِ کراچی... بخوبی واقف ہیں۔ گویا ان دنوں موسم سرما جوبن پر تھا جس کی وجہ سے کام پر بھی اثر پڑا تھا۔ کلائنٹس کی تعداد خاصی کم ہوگئی تھی۔ میں پچھلے آدھے گھنٹے سے بقول شخصے، فارغ بیٹھا مکھیاں ماررہا تھا۔ ایسے میں کسی کلائنٹ کی آمد کی خبر ”نوید مسرت“ سے کم نہیں تھی۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق تین پیشے بعض اوقات بہت ہی نازک اور حساس حیثیت کے حامل ہوجاتے ہیں۔ یعنی وکیل، ڈاکٹر اور گورکن کے پیشے۔ اگر ان لوگوں کا کاروبار مندا چل رہا ہو اور یہ اپنے رزق روزگار میں ترقی اور بہتری کے لیے دعا کریں تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ قانونی معاملات میں الجھ کر وکیل کے پاس پہنچیں، زیادہ سے زیادہ لوگ مختلف بیماریوں کا شکار ہوکر ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کریں اور زیادہ سے زیادہ لوگ ”اناللہ“ ہوکر اپنی آخری آرام گاہ کی جانب روانہ ہوں۔ بہرحال، اس موضوع پر کسی بحث و تمحیص کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہر انسان اپنے انداز میں سوچتا ہے اور...... کسی کی سوچ پر پہرا نہیں بٹھایا جاسکتا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جو گورا چٹا شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا، اس کی عمر ستر کے آس پاس رہی ہوگی۔ قد چھ فٹ سے ایک دو انچ نکلتا ہوا اور جسم دبلا پتلا، ہڈیوں کا ڈھانچا سمجھ لیں۔ اس نے مناسب سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ ڈاڑھی، سر اور بھوؤں کے بال دودھ کے مانند سفید نظر آتے تھے۔ اس پر اس اللہ کے بندے نے سفید ہی شلوار قمیص بھی پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید ٹوپی بھی موجود تھی۔ نگاہِ اول میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ بڑے میاں ابھی ابھی کسی مسجد سے جمعے کی نماز پڑھ کر نکلے ہیں۔

اس نے میرے چیمبر میں داخل ہونے کے بعد بڑی

کراری آواز میں کہا۔ ''السلام علیکم وکیل صاحب!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

نشست سنبھالنے سے پہلے اس نے مصافحہ ضروری جانا اور میری جانب اپنا کنگ سائز ہاتھ بڑھا دیا۔ اگر میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کر دیتا تو میرا یہ فعل بداخلاقی کے زمرے میں آتا چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ آہنی شکنجے میں کس گیا ہو۔

میں کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا، ایک جوان اور صحت مند انسان تھا مگر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس شخص کے کنگ سائز ڈھانچا ہاتھ کی گرفت فولادی تھی۔

میں نے بہ مشکل اپنی جان چھڑائی اور خدا خدا کر کے جب وہ کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی بڑے صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں......؟''

میرے الفاظ ''بڑے صاحب'' نے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا کیے۔ چند لمحے پہلے وہ مصافحہ کرتے ہوئے جس جوانی اور طاقت کا مظاہرہ کرچکا تھا اس کی روشنی میں اسے میری جانب سے ایسے الفاظ کی ہرگز توقع نہیں تھی تاہم میری اس ''جسارت'' پر اس نے برہمی کا اظہار کرنے کے بجائے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میرا نام توفیق عمرصوی ہے۔ میں آپ کے پاس ایک نہایت ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''جی توفیق عمروی صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اپنے ضروری کام کی وضاحت کردیں۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

''اپنے کام کے بارے میں تو میں آپ کو بتاؤں گا ہی وکیل صاحب!'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''پہلے کچھ اور وضاحتیں ہوجائیں۔''

میں سوالیہ انداز میں اس جگی بڈھے کو تکنے لگا۔

''پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ میرا نام توفیق عمرصوی ہے، توفیق عمروی نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اب آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ یہ ''عمرصوی'' کیا ہوتا ہے.....؟''

اتنا بتانے کے بعد وہ رک کر ایسے انداز میں مجھے دیکھنے لگا جیسے میں فوراً بول اٹھوں گا..... جی، توفیق بھائی! بتائیں لیکن جب میں نے اس کی توقع پوری نہ کی تو وہ خود ہی اپنی بات کو آگے بڑھانے پر مجبور ہوگیا۔

''بیگ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پچھلے رمضان میں عمرے کی سعادت حاصل کی تھی اس لیے اپنے نام کے ساتھ ''عمرصوی'' لگاتا ہوں۔ جب اللہ حج کی توفیق دے گا تو عمرصوی ہٹا کر ''حاجی'' لگالوں گا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

''آنے والے رمضان میں پینسٹھ سال کا ہوجاؤں گا۔'' وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اللہ کے فضل سے آج کا نوجوان بھی مجھ سے پنجہ آزمائی کی ہمت نہیں کرسکتا۔''

''ماشاءاللہ!'' میں نے صرف اتنا ہی کہا کیونکہ وہ جو کہہ رہا تھا، چند لمحے پہلے مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوچکا تھا۔

''بیگ صاحب! آپ کے ذہن میں، میرے حوالے سے بہت سارے سوالات سر ابھار رہے ہوں گے۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اس سے پہلے کہ میں اپنا مسئلہ بیان کروں، ان سوالات کے جوابات دینا ضروری سمجھتا ہوں۔''

میں نے اسے اس کے عزائم سے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ آسانی سے رکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس وقت میں بھی فارغ ہی بیٹھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس پینسٹھ سالہ بوڑھے جوان میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

''جی...... ارشاد۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایسے سرد موسم میں کوئی گرم کپڑا کیوں نہیں پہن رکھا؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ آپ اپنے گرم آفس میں فل سوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ میں اسی شلوار قمیص میں اپنی بائیک پر بیٹھ کر یہاں تک آیا ہوں۔''

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ واقعی حیرت ناک تھا۔ تاہم میں نے اس سے سوال کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ خود ہی بتانے لگا۔ ''دراصل، میں نے خود کو جوانی میں بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اللہ کے کرم سے کسی غلط راہ پر قدم نہیں رکھا۔ اس زمانے میں خوراک خالص ہوا کرتی تھی اور اللہ نے ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔ اب اگر آپ اپنا

مسئلہ بھی بیان فرمادیں تو احسان ہوگا۔“

”جی ہاں...... اب مسئلہ بیان کرنے کا وقت آگیا ہے۔“ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”دراصل، ایک شخص نے مجھے بہت پریشان کررکھا ہے۔“

”کون سا شخص؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نام تو اس کا فاروق ہے مگر وہ فاروق دادا کہلاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”محمود آباد میں اس کی بدمعاشی چلتی ہے۔“

”اوہ......“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”ایک بدمعاش سے آپ کی کیا دشمنی نکل آئی؟“

”بیگ صاحب! میں سیدھی راہ پر چلنے والا انسان ہوں اور کسی بھی قیمت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے حق میں نہیں ہوں۔“ وہ پرجوش انداز میں بولا۔ ”ورنہ میں چاہوں تو اس کی ساری بدمعاشی ناک کے راستے بھی نکال سکتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ ایک قانون پسند اور اصول پرست انسان ہیں۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس فاروق دادا کو آپ سے کیا مخاصمت ہے۔ اس نے آپ کو کیوں پریشان کررکھا ہے؟“

”دراصل، میری ساری پریشانی منّی کی وجہ سے ہے۔“ وہ خاصے جذباتی انداز میں بولا۔ ”فاروق منّی کو تنگ کرتا ہے، اس پر بری نظر ڈالتا ہے۔“

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ منّی اس جوان بوڑھے کی پوتی یا نواسی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ بیٹی ہوسکتی تھی لیکن میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھنا ضروری جانا۔

”یہ منّی کون ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”منّی تک نیم ہے جناب!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا اصل نام تو روبینہ ہے اور...... یہ میری بیوی ہے۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”آپ نے جس بدمعاش کا ذکر کیا ہے...... اس بدمعاش کی عمر کیا ہوگی؟“

”یہی کوئی اٹھائیس تیس سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”قیم......!“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی۔ ”اس کمینے کو شرم نہیں آتی کہ وہ آپ کی بیگم کو چھیڑتا ہے۔ کچھ عمر ہی کا لحاظ کرلیا ہوتا۔“

”بیگ صاحب!“ اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ”تو کیا آپ میری بیوی کو کوئی بوڑھی عورت سمجھ رہے ہیں؟“

”بھئی! جب آپ پینسٹھ سال کے ہیں تو آپ کی بیگم پچاس پچپن سے کم کیا ہوں گی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے جناب!“ وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ”منّی کی عمر صرف پچیس سال ہے۔“

”تو پھر یہ آپ کی سیکنڈ میرج ہوگی......؟“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”جی، اب آپ کا اندازہ بالکل درست ہے بیگ صاحب!“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پانچ سال پہلے میری پہلی بیوی صفیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔“

”اوہ......!“ میں نے ہمدردی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی اولاد تو ماشاءاللہ اب جوان ہوگی۔“

”صفیہ سے میری کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بانجھ تھی۔“ توفیق عمر صوی نے بوجھل آواز میں بتایا۔ ”میں نے صفیہ کی آخری سانس تک اس کا ساتھ نبھایا تھا۔“

لحہ بہ لحہ اس کی کہانی میں میری دلچسپی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”منّی سے آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”چھ ماہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”بہت ہی دکھی اور مظلوم لڑکی ہے جناب اور...... مطلقہ بھی! اگر منّی کے گھریلو حالات میرے علم میں نہ ہوتے تو شاید میں دوسری شادی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔“

پھر اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی محمود آباد نمبر تین پر ایک چھوٹی سی لائبریری ہے جہاں اس نے اسکول کی کتابیں، کاپیاں اور اسٹیشنری وغیرہ کا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ منّی کی رہائش بھی محمود آباد نمبر تین پر ہی تھی اور وہ اکثر اس کی لائبریری سے کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔ اس طرح ان دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ منّی کا باپ ایک شرابی اور جواری شخص تھا۔ اس نے منّی کی شادی جب اپنے ہی قماش کے ایک شخص سفیان سے کردی تو توفیق کو اس بات کا دلی صدمہ ہوا تھا۔ منّی کی ماں کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ بہرحال منّی اور سفیان کی شادی بہ مشکل ایک سال بھی نہ چل سکی اور سفیان نے اسے طلاق دے دی۔ اس موقع پر توفیق منّی کے لیے خاصا جذباتی ہوگیا اور پتا نہیں، کس جذبے کے تحت اس نے منّی کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے منّی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے میں کسی حیل وحجت یا تاخیر سے کام نہیں لیا۔

اس دوران میں منی کی عدت پوری ہو چکی تھی اور اس کا باپ حنیف خان بھی زہریلی شراب پینے سے موت کے منہ میں جا چکا تھا لہٰذا جب منی کو توفیق کی شکل میں ایک سہارا نظر آیا تو اس نے توفیق کی شادی کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ اس طرح چھ ماہ پہلے وہ میاں بیوی بن گئے۔ توفیق عمر صوی کی رہائش محمود آباد گیٹ پر تھی۔

یہ تمام معلومات مجھے توفیق عمر صوی نے فراہم کی تھیں۔

اپنے بیان کے اختتام پر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں نے منی سے باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے، میری عزت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اور اسے ہر مصیبت آفت سے بچانا میری ذمے داری ہے۔ یہ فاروق دادا جیسے دو ٹکے کے بچے اس پر آوازے کسیں، اسے چھیڑیں، یہ میں بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ میں اس فاروق کو ایسا عبرت ناک سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی لفنگے پن کے بارے میں سوچتے ہوئے کانپ اٹھیں اور...... اور اس کام کے لیے مجھے آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔''

''مثلاً...... میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو ایک دو دن میرے گھر آنا ہوگا۔'' وہ مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''صرف ایک گھنٹے کے لیے، رات کو آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں کہ فاروق کس طرح میری منی کو پریشان کرتا ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے الجھن بھی محسوس ہوئی اور حیرت بھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا وہ بدمعاش ایک مخصوص وقت پر آپ کی بیوی کو تنگ کرتا ہے؟''

''جی ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔'' اس گورے چٹے دراز قامت بوڑھے نوجوان نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''پہلے وہ خبیث یہی نازیبا حرکتیں رات نو اور دس بجے کے درمیان کیا کرتا تھا۔ منی نے جب مجھ سے شکایت کی تو میں نے لائبریری سے ایک گھنٹا پہلے گھر آنا شروع کر دیا لہٰذا اس نے بھی اپنی کمینگی کے وقت میں تبدیلی کر لی۔''

پھر توفیق عمر صوی نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ صبح دس بجے لائبریری کھولتا تھا۔ دوپہر میں تین سے پانچ بجے تک وہ دکان بند کر کے لنچ بریک کے لیے گھر آ جاتا تھا۔ دوبارہ شام پانچ سے رات دس بجے تک وہ لائبریری میں موجود رہتا تھا تاہم ان دنوں وہ رات نو بجے لائبریری بند کر کے گھر آ جایا کرتا تھا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔

''توفیق صاحب! آپ کی بیان کردہ تفصیل سے چند باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں اور ایک بات کو میں سمجھنے سے قاصر رہا ہوں......''

''ایسی کون سی باتیں ہیں بیگ صاحب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جو باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں، ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ وہ بدمعاش آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی بیگم کو چھیڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اس کام کے لیے صرف رات ہی کو ترجیح دیتا ہے ورنہ دن میں بھی تو آپ گھر سے دور اپنی لائبریری میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ میرے مسئلے کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ ایک ذہین اور قابل وکیل ہیں۔ وہ ذلیل انسان ایسے وقت میں منی سے چھیڑ خانی کرتا ہے جب میں گھر میں موجود نہ ہوں اور رات بھی ہو۔ ایسے وقت کا انتخاب وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اسے میری طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہو اور لوگ بھی اس کی اوچھی حرکات کا نوٹس نہ لے سکیں۔''

''اس سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فاروق دادا کہلانے والا وہ غنڈا آپ کے گھر کے بہت قریب آ کر ایسی گھٹیا حرکتیں کرتا ہے۔'' میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

''جی ہاں، بہت نزدیک۔ گھر کے پچھواڑے۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ سامنے والی مین گلی میں آ کر ایسی کمینگی کرے تو دس لوگوں کی نظروں میں آ جائے گا چنانچہ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر گھر کے عقبی حصے میں پہنچتا ہے اور بے ہودہ جملوں سے منی کو تنگ اور ہراساں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''کیا وہ روزانہ ہی ایسی نیچ حرکت کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، روزانہ...... اس موذی شخص نے میرا سکھ چین لوٹ لیا ہے۔ میں لائبریری بند کر کے پورا دن گھر میں نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی میں منی کو اپنے ساتھ لائبریری لے کر جا سکتا ہوں۔ عورت کا اصل مقام گھر کی چاردیواری کے اندر ہے۔ منی حجاب اور صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے تو میں نے اسے اپنایا ہے۔''

"توفیق صاحب! میں آپ کے مسئلے کو پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ گیا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فاروق کی حرکتیں قابل مذمت ہیں جبکہ آپ کے عزائم قابلِ ستائش۔ ہر معقول شخص کو اپنے گھر کی عزت کی حفاظت کے لیے ایسی ہی سنجیدہ اور جذباتی سوچ کا مظاہرہ کرنا چاہیے لیکن......!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ اس معاملے میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں......؟"

"جناب! سیدھی سی بات ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "جب آپ ایک، دو بار میرے گھر میں موجود رہ کر فاروق کو وہ گھٹیا حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیں گے تو میرے پاس آپ کی گواہی کی شکل میں، فاروق کے جرم کا ایک ٹھوس ثبوت آجائے گا جس کی بنا پر میں اس مردود کو گنتی کا ناچ نچا دوں گا۔"

"اس کام کے لیے خاص طور پر میں ہی کیوں؟" میں نے کہا۔ "آپ محلے کے کسی بھی معزز شخص کو اس مقصد کے لیے استعمال کرسکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کہیں سے ٹیپ ریکارڈر یا کیسٹ پلیئر کا بندوبست کرکے اس شیطان کی آواز بھی ریکارڈ کرلیں تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔"

"آئیڈیا تو عمدہ ہے۔" اس کے چہرے اور آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ "ایک تجربہ کار اور کامیاب وکیل کی یہی پہچان ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ...... مگر کوئی اور نہیں، آپ ہی۔ میں کیسٹ پلیئر یا ٹیپ ریکارڈر جو آپ کی ضرورت ہوگی اس کا انتظام بھی کردوں گا مگر یہ کام ہر صورت میں آپ ہی کو کرنا ہے۔ اب آپ پوچھیں گے...... میں ہی کیوں؟"

اس کا آخری جملہ میرے دل کی آواز تھی لہٰذا میں نے جلدی سے کہا۔ "نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی توفیق صاحب۔ میرے پوچھنے سے پہلے آپ خود ہی بتا دیں...... کیوں!"

"کیونکہ ایک عام آدمی کی بہ نسبت، وکیل زیادہ طاقتور اور مؤثر ہوتا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "فاروق کے خلاف آپ کی گواہی اس کی لٹیا ڈبو دے گی۔ میں نے جو منصوبہ سوچ رکھا ہے اس میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

پھر میرے استفسار پر وہ اپنے منصوبے کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کرنے لگا۔ اس کے مطابق وہ میری وکالت میں فاروق دادا پر کوئی دھانسو قسم کا کیس کرنا چاہتا تھا اور پھر میری گواہی کے زور پر وہ فاروق کو بھیڑیا، شیطان، ننگ انسانیت، معاشرتی ناسور اور جانے کیا کیا ثابت کرکے اسے ایک طویل عرصے کے لیے جیل بھجوانا چاہتا تھا۔

اس کے منصوبے کی تفصیل جان کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ بڑھاپے میں جوان عورتوں سے شادی کرنے والے مردوں کا یہ درد مشترک ہے۔ انہیں تھوڑے عرصے کے بعد گھر بدلنا پڑتے ہیں، اپنی بیویوں کو حجاب کا پابند بنانا پڑتا ہے اور توفیق عرصوی جیسے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ ہمارے معاشرے کی ایک عام روش ہے۔ بعض اوقات آپ بہت مجبور ہوجاتے ہیں۔ آپ کے سامنے کوئی الو کا پٹھا کھڑا یا بیٹھا ہوتا ہے مگر آپ اس کے لیے یہ "الفاظ" استعمال نہیں کرسکتے۔ ان لمحات میں میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ بہرحال، میں نے نہایت ہی تحمل سے کہا۔

"توفیق صاحب! آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

"جی...... کیا مطلب؟" اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے بہ دستور متحمل انداز میں کہا۔ "آپ کا معاملہ کسی وکیل سے متعلق نہیں ہے۔ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ آپ اپنے علاقے کے تھانے جا کر فاروق دادا کے خلاف شکایت درج کرائیں۔ وہ لوگ خود ہی اس بدمعاش سے نمٹ لیں گے۔"

"بیگ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ "پولیس، فاروق سے کیا نمٹے گی۔ ہمارے ملک کی پولیس تو چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کی سرپرستی کرتی ہے۔"

"پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں توفیق صاحب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی خاطر تھانہ انچارج کو فون کرکے فاروق کے خلاف سخت ایکشن لینے کے لیے درخواست کردوں گا۔"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں استفسار کیا۔ "تو آپ میری مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں؟"

"جو کام آپ مجھ سے لینا چاہتے ہیں اس کے لیے میں معذرت چاہوں گا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "آپ اپنے منصوبے کے لیے کسی اور وکیل سے بات کرلیں۔"

"اوکے......!" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! آپ نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

میں نے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا اور کہا۔ ''میں آپ کے کسی کام نہیں آسکا، اس کا مجھے سخت افسوس ہے۔''

مایوسی کے ان لمحات میں بھی توفیق عمرصوی میرے ہاتھ کا کچومر بنانے کے خیال سے باز نہیں آیا تھا۔ واقعی، اس کا مصافحہ فولادی تھا۔

توفیق کے جانے کے بعد میں بھی گھر کے لیے روانہ ہوگیا اور راستے بھر اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر رنگ، نسل اور مزاج کے لوگ پیدا کیے ہیں۔ توفیق عمرصوی بھی انہی میں سے ایک تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر وہ کل صبح سٹی کورٹ کے احاطے میں اپنے مطلب کا وکیل تلاش کرنے کی کوشش کرے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں اس کی مراد پوری ہوجائے گی۔

☆☆☆

پیشہ ور انسان کی زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے، خاص طور پر ایسا پیشہ جس میں پبلک ڈیلنگ کا عمل دخل ہو۔ میں صبح گھر سے نکلتا تھا، کورٹ جانے سے پہلے اکثر آفس کو بھی کرنا پڑتا تھا۔ دن کا ابتدائی حصہ ایک عدالت سے دوسری عدالت میں آتے جاتے گزرتا تھا۔ اس کے بعد لنچ اور پھر آفس۔ رات کو آفس سے نکل کر گھر پہنچتے پہنچتے گیارہ تو بج ہی جاتے تھے۔ اس افراتفری کے معمولات کے پیشِ نظر وہ جوان بوڑھا توفیق عمرصوی میرے ذہن سے نکل گیا۔ شاید وہ دوبارہ کبھی مجھے یاد نہ آتا مگر ایک واقعے نے اس کی ذات میں میری دلچسپی کو تازہ کردیا۔

ایک روز میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس کو ڈیل کررہا تھا کہ اپنی باری پر ایک باپردہ خاتون میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ اس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، باقی کا بدن حجاب میں تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھوں میں بھی اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ میں نے ایسی خواتین کو معاشرے میں زندگی گزارتے اور مختلف شعبوں میں نقل و حرکت کرتے دیکھا تو تھا تاہم ایک وکیل کی حیثیت سے یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے، اپنی میز کی دوسری طرف بچھی کرسیوں کی سمت اشارہ کردیا۔ جب وہ اطمینان سے نشست سنبھال چکی تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''جی، فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''آپ توفیق صاحب کو تو جانتے ہیں نا!'' نقاب کے پیچھے سے اس کا استفسار ابھرا۔

میں نے پوچھا۔ ''کون توفیق صاحب؟''

''کوئی ایک ماہ پہلے وہ آپ سے ملنے آئے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ان کی بیوی ہوں روبینہ......!''

''معاف کیجیے گا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا اور نہ ہی توفیق صاحب میری یادداشت میں تازہ ہورہے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ یہ بتاسکیں کہ آپ کے شوہر کس مقصد سے میرے پاس آئے تھے تو شاید مجھے یاد آجائے۔''

روبینہ نامی اس پردہ پوش خاتون کی آنکھوں میں تذبذب کی پرچھائیں لہرائی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے بدن میں بھی بے چینی کی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس نے نقاب کی اوٹ ہی سے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

''آپ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہی ہیں نا......؟''

''جی ہاں، آپ بالکل درست جگہ پر بیٹھی ہیں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں ہی مرزا امجد بیگ ہوں۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ چہرے سے میری مراد اس کی آنکھیں ہیں ورنہ آنکھوں کے سوا چہرے کے باقی حصے تو نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ قدرے مطمئن انداز میں بتانے لگی۔

''بیگ صاحب! میرے شوہر ایک غنڈے فاروق دادا کے سلسلے میں آپ کے پاس کوئی انوکھا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ وہ اس غنڈے کو آپ کی مدد سے مروا دلوانا چاہتے تھے اور......''

''ایک منٹ......!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا تھا جس میں پینسٹھ سالہ بوڑھے جوان کا چہرہ نمایاں ہوگیا تھا۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ توفیق عمرصوی کی بات کررہی ہیں نا؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو آپ سنی ہیں؟'' میں نے بےساختہ پوچھ لیا۔

توفیق عمرصوی کو میں واقعتاً بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ تر سنی کا لفظ ہی استعمال کیا تھا اسی لیے جب میرے سامنے بیٹھی ہوئی اس پردہ پوش خاتون نے اپنا نام روبینہ بتایا تو میرا دھیان سنی کی طرف گیا اور نہ ہی توفیق عمرصوی کی جانب۔

"جی بیگ صاحب! میں منی ہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"بھئی! آپ کے شوہر تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ "کیا اب عمر حوی صاحب نے اپنے منصوبے پر عملدرآمد کے لیے آپ کو آگے بڑھایا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیگ صاحب!" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

میں چونک اٹھا اور تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ "پھر کیسی بات ہے؟"

منی کے لہجے نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ "کسی منصوبے پر عمل کرنے کا تو اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہی اس کی ضرورت باقی رہی ہے۔ پولیس نے توفیق صاحب کو گرفتار کر لیا ہے۔"

"کیا؟" بے ساختہ میری آواز بلند ہو گئی۔

"جی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ بہ دستور پریشان آواز میں بولی۔ "میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ آپ کے بارے میں توفیق صاحب ہی نے مجھے بتایا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اگر آپ نے ان کے کیس میں ہاتھ ڈال دیا تو وہ بچ جائیں گے۔"

میرا قلم، رف پیڈ پر تیز رفتاری سے حرکت کرنے لگا۔ "پولیس نے توفیق صاحب کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے.....؟" میں نے استفسار کیا۔

وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی اتارتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولی۔ "انہیں فاروق دادا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"اوہ....." میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ چھبیس فروری دوپہر کا واقعہ ہے۔" وہ بتانے لگی۔ "وہ حسب معمول گھر سے تیار ہو کر لائبریری گئے تھے۔ لگ بھگ گیارہ بجے کے قریب پولیس ان کی لائبریری پر پہنچی اور انہیں فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔"

آج اٹھائیس فروری تھی۔ میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، پولیس نے توفیق صاحب کو دو روز پہلے گرفتار کیا ہے۔ یعنی انہوں نے ستائیس فروری کو ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے بیگ صاحب۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "اس وقت توفیق صاحب عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہیں۔"

"یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، فاروق کے قتل والا واقعہ.....؟"

"فاروق دادا کی لاش ہمارے گھر کے پچھواڑے کچرے کے ڈھیر پر پڑی ملی تھی۔" منی نے بتایا۔ "چھبیس فروری کی صبح جب بھنگی (جمعدار) اس طرف صفائی کرنے پہنچا تو اس نے ہمارے گھر کے عقب میں ایک لاش پڑی دیکھی۔ بھنگی کے شور مچانے پر محلے کے کافی لوگ جمع ہو گئے پھر فاروق دادا کی حیثیت سے اس لاش کی شناخت کر لی گئی۔ تھانہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور پھر پولیس نے موقع پر پہنچ کر کارروائی کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے بھی کئی الٹے سیدھے سوالات کیے۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچے اور توفیق صاحب کو فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔"

"آپ کے گھر کے پچھواڑے کسی غنڈے کی لاش پڑی ملتی ہے۔" میں نے منی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے قتل کے الزام میں آپ کے شوہر کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ پولیس کو کس بنا پر یہ شبہ ہوا کہ فاروق دادا کو توفیق نے ہی قتل کیا ہوگا.....؟"

"اس کی چند وجوہات ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "یہ بات تو آپ کے بھی علم میں ہے کہ اس لفنگے نے ہمارا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ وہ روزانہ گھر کے پچھواڑے آ کر مجھے تنگ کرتا تھا۔ ممکن ہے، توفیق صاحب نے اس حوالے سے ادھر ادھر کوئی بات کی ہو....." لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"دوسری سب سے اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس واقعے سے ایک روز پہلے فاروق اور توفیق میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا جس میں توفیق نے فاروق کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ اس موقع پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ممکن ہے، ان دھمکیوں کی وجہ سے پولیس کا دھیان توفیق کی طرف چلا گیا ہو۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "آپ مجھے اس جھگڑے والے واقعے کی تفصیل سے آگاہ کریں جس میں آپ کے شوہر نے فاروق دادا کو خطرناک نتائج کی سنگین دھمکیاں دی تھیں؟"

"یہ چوبیس فروری کی شام کا واقعہ ہے۔" وہ معتدل

انداز میں بتانے لگی۔ ''فاروق، توفیق صاحب کی لائبریری پر پہنچا اور ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ دونوں کے بیچ میں ہاتھا پائی بھی ہوئی تاہم اس سے پہلے کہ مار دھاڑ شروع ہوتی، لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا کے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اسی موقع پر توفیق نے فاروق کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں...... '' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ آپ تھانے جا کر توفیق صاحب سے ایک ملاقات کر لیں۔ وہ آپ کو اس واقعے کی تفصیل بتا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں آج ہی آپ کے شوہر سے ملوں گا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا فاروق دادا کی موت کے بارے میں کیا خیال ہے......؟''

''میں سمجھی نہیں!'' اس کی الجھن بھری آواز ابھری۔

''میرا مطلب ہے...... آپ کو تو یقین ہے ناکہ فاروق دادا کے قتل سے توفیق صاحب کا دور کا بھی واسطہ نہیں......؟''

''جی ہاں...... مجھے سو فیصد یقین ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''اگر انہوں نے قانون کو ہاتھ میں لینا ہوتا تو وہ مدد کے لیے آپ کے پاس کیوں آتے؟''

میں نے منی سے یہ سوال محض اس وجہ سے کیا تھا کہ اس بوڑھے جوان کے بعض جذباتی ڈائیلاگ میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے مثلاً...... اس دو ٹکے کے نیچ فاروق کو میں ایسا عبرت ناک سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی لفنگے پن کے بارے میں سوچتے ہوئے کانپ اٹھیں گی...... بیگ صاحب! میں کسی بھی قیمت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے حق میں نہیں ہوں ورنہ میں چاہوں تو اس کی ساری بدمعاشی ناک کے راستے بھی نکال سکتا ہوں...... اگر میں چاہوں تو پیچھے سے اپنے گھر کے عقب میں جا کر اس شیطان کی گردن دبوچ لوں، وغیرہ......

اسی بنا پر میرے ذہن میں یہ خیال آ گیا تھا کہ کہیں اس مخبطی بڈھے نے جوش میں آ کر کوئی ایسی ویسی ''حرکت'' نہ کر ڈالی ہو۔

''ایک انتہائی ذاتی سا سوال ہے۔'' میں نے منی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو پوچھوں؟''

''ہمارا سب سے اہم ذاتی معاملہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے بیگ صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''آپ کو جو بھی پوچھنا ہے، بے دھڑک پوچھیں۔ مائنڈ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ فاروق دادا، توفیق صاحب سے شادی کے بعد آپ کے پیچھے پڑا تھا یا آپ اسے پہلے سے جانتی تھیں؟''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''توفیق صاحب سے شادی کے کچھ ہی عرصے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ہمارے گھر کے پچھواڑے آ کر ''منی منی'' کی آوازیں لگاتا تھا......''

''آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ گھر کے عقب میں ''منی منی'' پکارنے والا فاروق دادا ہی ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''اس نے خود اپنے بارے میں مجھے بتایا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب ابتدا میں اس نے مجھے پکارنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون ہے جو مجھے گھر کے پچھواڑے سے پکار رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر پوچھ لیا۔

''اے بھائی! کون ہو تم......؟''

''خدا کے لیے مجھے بھائی نہ کہو۔'' ادھر سے جواب آیا۔ ''میں اس علاقے کا بدمعاش ہوں...... فاروق دادا۔''

''کیا بدمعاش غنڈے کسی کے بھائی نہیں ہو سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتے ہیں، کیوں نہیں ہو سکتے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مگر میں تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا۔''

''یہ کیا بات ہوئی......؟''

''دراصل، میں تم سے محبت کرتا ہوں......!''

''کیا تمہیں پتا نہیں، میں کسی کی بیوی ہوں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ایسی حرکتیں کرتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔''

''مجھے شرم نہیں آتی بلکہ افسوس ہوتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''افسوس...... کس بات کا افسوس؟'' میں نے بگڑ کر پوچھا۔

''اس بات کا افسوس کہ تم ایک بڈھے کھوسٹ کے ساتھ اپنی جوانی برباد کر رہی ہو۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''میرے سینے میں جوان دل دھڑکتا ہے اور یہ دل صرف اور صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے اسے بری طرح جھاڑ دیا۔ ''توفیق صاحب میرے شوہر ہیں۔ میں ان کے خلاف

کوئی بات نہیں سن سکتی۔ تم یہاں سے دفع ہوجاؤ اور پھر کبھی دوبارہ اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا...... مجھے کو دادا کہلواتا ہے اور رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر گھر کے پچھواڑے سے آوازیں نکالتا ہے۔''

''میں چاہوں تو سامنے والی گلی سے بھی آسکتا ہوں۔'' وہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈرتا ورتا نہیں ہوں کسی سے...... بس یہی خیال آجاتا ہے کہ میری وجہ سے تم کہیں بدنام نہ ہوجاؤ...... میں منی کی بدنامی سے بہت ڈرتا ہوں۔''

''تم جو سوچ رہے ہو اور جو چاہ رہے ہو، وہ کبھی اور کسی بھی قیمت پر نہیں ہوسکتا۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ منی کے خیال کو دل سے نکال دو اور دوبارہ اس طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھو......'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے گہری سانس لی پھر معتدل انداز میں بولی۔

''یہ فاروق دادا سے میری پہلی اور آخری گفتگو تھی۔''

''کیا آپ کی نصیحت کا اس پر کچھ اثر ہوا تھا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''خاک بھی اثر نہیں ہوا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''اس نے اپنی بے ہودہ روش جاری رکھی۔ وہ ہمارے مکان کے پچھواڑے پہنچتا، حلق سے جانور کی آواز نکالتا اور پھر وہی ''منی منی'' کی پکار اور مختلف انداز میں اظہارِ محبت ......''

''جانور کی آواز...... میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''جی بیگ صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ گھر کے عقب میں پہنچ کر کسی نہ کسی جانور کی آواز نکالتا جیسے بلی، بکری، کتے کی آواز۔ ایک طرح سے وہ مجھے اپنی آمد کا سگنل دیتا تھا مگر میں نے پہلے دن کے بعد سے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے یہ سارا معاملہ توفیق صاحب کو بتا دیا تھا۔ وہ خاصے پریشان ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹائمنگ بھی تبدیل کی لیکن اس خبیث کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ مکار نے اپنی ٹائمنگ بھی بدل دی تھی۔ توفیق صاحب نے کئی بار اس شیطان سے بھڑنے کا ارادہ بھی کیا لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے روکے رکھا پھر وہ اس مسئلے کے حل کے لیے آپ کے پاس آگئے۔ آپ کے عدم تعاون نے انہیں مایوس کردیا۔ وہ دن رات اسی بدذات کے بارے میں سوچتے اور فکرمند ہوتے رہتے تھے پھر انہوں نے یہ معاملہ خدا کے سپرد کیا اور نائٹ بیکری کی پرانی ٹائمنگ کے مطابق وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور پھر...... چند روز بعد ہی یہ واقعہ پیش آگیا۔''

''اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کرنا بہت اچھی بات ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''مگر اس کے ساتھ ہی زمینی حقائق کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ خدا نے ہمیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے کر دوسری مخلوقات پر فوقیت عطا کی ہے لہٰذا اس سمجھ بوجھ کو کام میں لانا ہم پر فرض ہے......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کے مسئلے کا سیدھا سیدھا حل تو یہ تھا کہ تھانے جاکر فاروق دادا کے خلاف رپورٹ درج کروا دیتے۔ تھانے سے دو اہلکار آپ کے گھر میں آکر بیٹھ جاتے۔ جب فاروق گھر کے عقب میں آکر جانوروں کی آواز نکالتا اور ''منی منی'' پکارتا تو اس کے جرم کا ثبوت مل جاتا۔ پھر پولیس کیسے اس کے خلاف کارروائی نہ کرتی۔''

''میں نے توفیق صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ انہیں پولیس والوں پر ذرا بھروسا نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تھانے میں کسی کے ساتھ جھگڑا کرکے کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کردیں۔ پولیس والوں سے انہیں شدید نفرت ہے۔''

''آپ نے تو انہیں صرف رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر انہیں پولیس والوں پر اعتماد نہیں تو میں تھانہ انچارج کو فون کرکے فاروق دادا کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی ہدایت کردوں گا مگر میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ناراض ہوکر میرے دفتر سے چلے گئے تھے۔''

''جو ہوگیا اسے بھول جائیں بیگ صاحب۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ''آپ کسی بھی طرح توفیق صاحب کو اس مصیبت سے نجات دلادیں۔ یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہوکر گھر جائیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''جب تک آپ کے شوہر ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہیں، کوئی عملی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ میں آج آفس سے اٹھنے کے بعد تھانے جاکر ان سے ملاقات کرلوں گا۔ آپ کل اسی وقت دوبارہ میرے پاس آجائیں۔ پھر باقی کے معاملات طے کرلیں گے۔''

''میں آپ کی فیس کے پیسے ساتھ لے کر آئی ہوں۔'' وہ پرس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ

چاہیں تو......"

"نہیں!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کل جب میرے پاس آئیں گی تو اس وقت فیس بھی لے لوں گا۔ پہلے میں توفیق سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ اس کیس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

اچانک اس بوڑھے جوان کے معاملے میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ منی نے مقتول فاروق کے اظہارِ محبت کے حوالے سے بھی خاصے مضحکہ خیز انکشافات کیے تھے۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ گویا فاروق روزانہ ہی اس کے گھر کے عقب میں آ کر پہلے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالتا تھا اور پھر عامیانہ انداز میں اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا وہ وقت کا انتہائی پابند اور دھن کا ایسا ہی پکا تھا کہ کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ ایسی بات نہیں، وہ کبھی کبھی ایک دو دن کے لیے غائب بھی ہو جاتا تھا اور ان دنوں وہ شکرانے کے نفل پڑھا کرتی تھی۔ بہرحال یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا اور...... اس کا خاتمہ، فاروق کے خاتمے پر ہوا تھا۔

اس روز دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر کا رخ کرنے سے پہلے متعلقہ تھانے جا کر توفیق سے ملا۔ ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں کسی ملزم سے ملاقات کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑتے ہیں، اس کی تفصیل پہلے بھی کئی بار بیان کی جا چکی ہے۔

توفیق عمرحوی سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات میں مجھے اس کی بوڑھی ہڈیوں میں جو جوش وخروش اور طنطنہ نظر آیا تھا وہ اس وقت مفقود تھا۔ حوالات میں گزرنے والی چند راتوں نے اس کی حالت خراب کر دی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ میرا کیس ضرور لیں گے۔" وہ حوالات کے فرش سے اٹھ کر میری جانب بڑھا مگر آہنی سلاخوں نے اسے مجھ تک نہیں پہنچنے دیا۔

میں نے بریف کیس کھول کر چند اہم کاغذات نکالے جن میں وکالت نامہ اور درخواست ضمانت سرفہرست تھیں۔ اس نوعیت کے اہم کاغذات ہر وکیل کے پاس ریڈی ہوتے ہیں۔ بس، ان میں موکل کے حساب سے خانہ پری کرلی جاتی ہے۔ میں نے ان تمام کاغذات پر توفیق کے دستخط لیے اور مذکورہ کاغذات کو دوبارہ بریف کیس میں رکھنے کے بعد توفیق کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یہ کیا ماجرا ہے توفیق صاحب......؟"

"ماجرا...... جو بھی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔" وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "اگر آپ نے میری بات مان لی ہوتی تو فاروق آج جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سانس لے رہا ہوتا لیکن قدرت اپنے طریقے سے کام کرتی ہے۔ جس کی سانسیں پوری ہو چکی ہوں وہ منوں مٹی کے نیچے ہی جاتا ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں نے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دیا تھا اور اپنی پرانی ٹائمنگ کے مطابق لائبریری جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے منی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پر اس لفنگے کی کسی بات کا جواب نہ دے۔ گھر کی عقبی دیوار اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے اوپر سے اندر صحن میں جھانک نہیں سکتا تھا اور عقبی دروازہ آہنی ہے جس پر موٹا تالا پڑا رہتا ہے۔ فاروق نے اس عرصے میں کئی بار منی سے وہ دروازہ کھولنے کی درخواست بھی کی تھی تاکہ وہ روبرو منی سے باتیں کر سکے تاہم منی نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور کبھی اس لوفر کی باتوں میں نہیں آئی۔ میں نے منی پر واضح کر دیا تھا کہ اگر کبھی وہ تمام اخلاقی حدود کو پھلانگتے ہوئے عقبی دیوار کود کر گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو منی فوراً 'چور چور' کا شور مچاتے ہوئے گھر کے سامنے والے دروازے سے نکل کر باہر گلی میں آ جائے۔ ماشاء اللہ منی خاصی سمجھ دار اور ہمت والی عورت ہے۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اللہ نے ایسا موقع آنے سے پہلے ہی اس شیطان کا خاتمہ کر دیا...... خس کم، جہاں پاک!"

آخری جملہ اس نے ایسے بدمزہ انداز میں ادا کیا تھا جیسے اس کے منہ میں کوئی نہایت ہی کڑوی شے آگئی ہو۔ اس رویے سے توفیق کی مقتول سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ فاروق نے منی کے حوالے سے پچھلے کچھ عرصے سے جو غیر اخلاقی وتیرہ اپنا رکھا تھا، اس کی روشنی میں توفیق عمرحوی اس سے محبت تو ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

"توفیق صاحب! فاروق دادا کا قتل آپ کے گھر کے پچھواڑے ہوا ہے۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی لاش کچرے کے

ڈھیری پڑی ملی ہے اور آپ کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق آپ کی گرفتاری کا سبب وہ جھگڑا ہے جو وقوعہ سے ایک روز قبل آپ کا مقتول کے ساتھ ہوا تھا جس میں آپ نے اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کمینے نے اس روز میری لائبریری پہنچ کر ایسی بے ہودگی کی تھی کہ مجھے بھی تاؤ آگیا۔ میرے منہ میں جو بھی آیا، میں بولتا چلا گیا۔ مجھے یاد ہے، جب میں بہت زیادہ جوش و جذبات میں تھا تو میں نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی اور...... میرے انہی الفاظ نے آج مجھے تھانے میں پہنچا دیا ہے اور اس کے بعد میں عدالت پہنچنے والا ہوں۔"

اس کے بعد توفیق عرعوی نے مجھے اس جھگڑے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ میں سردست آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ان معاملات کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر آئے گا۔

"توفیق صاحب! جب آپ کا مقتول فاروق کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا تو وہاں درجن بھر افراد بھی جمع ہو گئے تھے جنہیں آپ تماشائی بھی کہہ سکتے ہیں۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ان میں معدودے چند آپ کے ہمدرد ہوں گے جنہوں نے میری معلومات کے مطابق آپ لوگوں کو دست و گریبان ہونے سے روکا ورنہ کوئی بڑا واقعہ بھی جنم لے سکتا تھا۔"

"وہ میرے ہاتھوں پٹتا...... بہت بری طرح پٹتا۔" توفیق نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھول بند کرتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھے جوان کا پورا وجود بھی کپکپا اٹھا تھا۔ ہر انسان کی کارکردگی کی ایک حد ہوتی ہے اور ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ کارکردگی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت اور قانونِ فطرت یہی ہے جو کسی بوڑھے جوان کے لیے تبدیل نہیں ہوسکتا۔

"توفیق صاحب! اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا چاہیے اور کچھ بھی بولنے سے پہلے اسے اچھی طرح تول لینا چاہیے۔ جس مجمع کے سامنے آپ نے فاروق کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی، میرے اندازے کے مطابق انہی میں سے چند لوگ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں جنھی آپ کو فاروق کے قتل کے الزام میں دھرلیا گیا ہے......" میں نے تھوڑا رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہیں ایک آدھ دشمن بھی چھپا بیٹھا ہوتا ہے جو موقع کی تاک میں رہتا ہے تاکہ نقصان پہنچا سکے۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا ہے......"

توفیق عرعوی نے گردن جھکا دی اور حوالات کی آہنی سلاخوں کو تھامتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی واپس نہیں آتے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ میں اس واقعے کے بعد سے سخت پریشان ہوں۔ اب اوپر خدا اور نیچے آپ ہیں۔ میری ساری امیدیں آپ ہی سے لگی ہیں......" بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اگر خدا پر بھروسا ہے تو وہ ضرور آپ کی مدد کرے گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ان کاغذات پر......" میں نے اپنے بریف کیس کو تھپتھپایا۔ "آپ کے دستخط لینے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے آپ کا کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے چنانچہ آپ ہر فکر اور پریشانی کو اپنے ذہن سے نکال کر دور پھینک دیں۔"

"تھینک یو بیگ صاحب!" وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دیں اور عدالت میں ملاقات کا وعدہ کر کے تھانے سے نکل آیا۔

اگلے روز منی ایک بار پھر میرے آفس میں موجود تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "بیگ صاحب! آپ نے توفیق صاحب کا کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے نا......؟"

"جی ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اسے اپنی فیس کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے فوراً اپنے ہینڈ بیگ میں سے فیس کی رقم نکال کر میرے حوالے کردی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید بنا کر اس کے حوالے کی اور کہا۔

"عدالتی اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے جو یقیناً آپ ہی کو برداشت کرنا ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے بیگ صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔ "میں تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ توفیق باعزت بری ہوجائیں گے نا؟"

"انشاء اللہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔ ''ابھی تو میں نے صرف آپ کے شوہر کی اسٹوری سنی ہے۔ پولیس جب عدالت میں چالان پیش کرے گی تو استغاثہ کی رپورٹ کی شکل میں بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں گی جن میں زیادہ تر آپ کے شوہر کے خلاف جائیں گی۔ بہرحال......'' میں نے ذرا رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی صورتِ حال سامنے آئے گی، میں سنبھال لوں گا۔''

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''روبینہ صاحبہ! اچھی طرح سوچ کر بتائیں، کیا چوبیس فروری کی رات بھی فاروق آپ کے گھر کے پچھواڑے، آپ کو پریشان کرنے آیا تھا؟''

''چوبیس فروری......؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''جی، چوبیس فروری!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس شام فاروق اور توفیق میں جھگڑا ہوا تھا......؟''

''بالکل آیا تھا بیگ صاحب۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔ ''لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ شام میں اس نے توفیق سے کوئی پھڈا وغیرہ کیا ہے۔''

''وہ آیا ہوگا، کسی جانور کی آواز نکال کر آپ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد وہ آپ کو پکارنے لگا ہوگا۔''

''جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''لیکن اتنے عرصے کے ناخوشگوار تجربے کے بعد میں نے اس کی آواز اور باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ وہ جیسے ہی ہمارے گھر کے پچھواڑے نمودار ہوتا، میں توفیق صاحب کی ہدایت کے مطابق گھر کے بیرونی دروازے کو کھول دیا کرتی تھی تاکہ اگر کبھی وہ مردود دیوار پھاند کر گھر کے اندر کود آئے تو میں گھر سے باہر نکل کر شور مچا سکوں۔''

''لیکن ایسا سنگین واقعہ کبھی پیش نہیں آیا تھا......؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... اللہ کا شکر ہے۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدمعاش مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بزدل شخص بھی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا جیسے کسی نے خاص طور پر اسے یہ مشن سونپا ہو۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں جناب!'' وہ بے بسی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کی رات کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟''

''میں سمجھی نہیں بیگ صاحب!'' اس کی آنکھوں میں تذبذب ابھرا۔ ''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں......؟''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وقوعہ کی رات یعنی پچیس فروری کو بھی مقتول آپ کے گھر کے پچھواڑے آیا تھا...... اس نے کسی جانور کی آواز نکال کر آپ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''نن...... نہیں......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس رات وہ گھر کے عقب میں نہیں آیا تھا یعنی...... میں اس کی موجودگی سے واقف نہیں کیونکہ اس نے نہ تو کسی جانور کی آواز نکالی تھی اور...... نہ ہی مجھے پکارا تھا۔''

''اس کے باوجود بھی اگلی صبح فاروق دادا کی لاش آپ کے گھر کے پچھواڑے کچرے کے ڈھیر پر پڑی ملی تھی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وقوعہ کی رات آپ کے گھر کے عقب میں آیا تو تھا مگر کسی جانور کی آواز نکالنے سے پہلے ہی وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شیطان کے ساتھ اس رات کیا ہوا تھا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''لگتا ہے، اللہ نے ہماری دعا قبول کر کے اس مصیبت سے ہمیں نجات دلا دی ہے۔''

''اللہ موجودہ مصیبت سے بھی آپ کو نجات دلائے گا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ پورے اطمینان کے ساتھ گھر جائیں۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر میرا شکریہ ادا کر کے دفتر سے رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواستِ ضمانت دائر کر دی اور ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔ دوسری جانب سے وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کے لیے زور لگایا۔ جیسا کہ پہلے

بھی اس امر کی کئی بار وضاحت کی جا چکی ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ آدھے گھنٹے کی گرماگرم بحث کے بعد عدالت نے ملزم کی ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا، پھر پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو منی خاصی مایوس نظر آئی۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! میں تو توقع کررہی تھی کہ توفیق کی ضمانت ہوجائے گی۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا اس سے پہلے کبھی آپ کا عدالت سے واسطہ پڑا ہے؟''

''نہیں...... براہِ راست نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرے چچا مرحوم ایک گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان کا اپنے مالکِ مکان سے تنازع اتنا بڑھ گیا تھا کہ یہ کیس عدالت تک چلا گیا تھا۔ اس کیس کی ساری تفصیلات ابھی میری یادداشت میں ......''

''مالکِ مکان اور کرائے دار کے بیچ پیدا ہونے والا تنازع اور قتل کے کیس میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے روبینہ صاحبہ!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ ہمت نہ ہاریں۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ ابھی تو اس کیس کی ابتدا ہے۔ اپنے حوصلے کو جوان رکھیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

''آپ کہہ رہے ہیں تو میں یقین کرلیتی ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ظاہر ہے عدالت اور قانونی معاملات کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دلاسا دے کر رخصت کردیا۔

اگلی تاریخ پندرہ روز بعد کی تھی۔ اس دوران میں مجھے اس کیس کو اسٹڈی کرنے کا بھرپور موقع مل گیا تھا۔ استغاثہ نے رپورٹ تیار کرتے وقت ملزم کی ذات کے حوالے سے چند چیزوں کو اجاگر کرکے اسے فاروق دادا کے قتل میں ملوث کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

استغاثہ کے مطابق ملزم توفیق عمر صوبی ایک غصیلا اور جھگڑالو شخص تھا اور اس کی فطرت میں شک کا عنصر شامل تھا۔ بڑھاپے میں جب اس نے خود سے چالیس سال چھوٹی ایک نوجوان عورت سے شادی کی تو گویا اس کے پر نکل آئے تھے۔ وہ خود کو جوانوں سے زیادہ جوان ظاہر کرنے لگا۔ اسے اس بات پر بڑا فخر بلکہ غرور تھا کہ وہ پینسٹھ سال کی عمر میں ایک پچیس سالہ عورت کا شوہر ہے۔ اس تفاخر نے اس کی طبیعت اور مزاج میں ایک عجیب طرح کا عدم تحفظ کا احساس پیدا کردیا تھا۔ کوئی بھولے سے بھی اس کی بیوی کی طرف دیکھ لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ شخص اس کی بیوی کو لے اڑے گا۔ اسے ہر وقت اپنی بیوی کے کھونے کا دھڑکا لگا رہتا۔ اس کیفیت نے اسے نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کردیا۔ اسی نفسیاتی عارضے نے ملزم کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ مقتول اس کی بیوی کو ورغلانے، بہ الفاظِ دیگر ہتھیانے کے چکر میں ہے۔ ملزم نے کئی لوگوں کے سامنے مقتول کی نازیبا حرکتوں کا تذکرہ بھی کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مقتول کا اس کی بیوی سے دور دور کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ بس، اتنی سی بات تھی کہ ملزم اور اس کی بیوی کو ایک ساتھ جاتے دیکھ کر مقتول دو، تین بار طنزیہ انداز میں مسکرایا ضرور تھا اور عین ممکن ہے، اس نے کوئی ایک آدھ جملہ بھی پھینک دیا ہو۔

اس کے بعد استغاثہ کی رپورٹ میں اس جھگڑے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا جو پچیس فروری کی شام ملزم اور مقتول کے بیچ ہوا تھا جس میں ملزم نے مقتول کو جان سے مارنے کی خطرناک دھمکی دی تھی۔ یہ ایشو استغاثہ کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس جھگڑے کے اگلے روز ہی فاروق دادا مردہ حالت میں پایا گیا تھا اور وہ بھی توفیق عمر صوبی کے گھر کے پچھواڑے، کچرے کے ڈھیر پر لہٰذا پولیس کا توفیق کی طرف دھیان جانا ایک فطری اور واقعاتی امر تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ بھاری بلاک تھا جو تعمیراتی کام میں استعمال ہوتا ہے۔ قاتل نے وزنی بلاک مقتول کے سر پر مارا تھا جس سے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ بلاک کی ضرب ایسی خطرناک اور کاری تھی کہ مقتول کو سانس لینے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا اور وہ پلک جھپکتے میں موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی وہ ''قاتل بلاک'' بھی پڑا ہوا مل گیا تھا۔ بلاک کے ایک حصے پر لگنے والا خون اور اس میں چپکے ہوئے بال مقتول فاروق ہی کے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا جو اس کی فوری موت کا سبب بن گیا تھا۔ کھوپڑی کا سامنے والا حصہ یعنی پیشانی وغیرہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہی

تھی۔ اس سے واضح ہو جاتا تھا کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں، عقب سے اس پر ایک بھرپور وار کیا تھا۔ اگر مقتول کو اپنے عقب میں قاتل کی موجودگی کا احساس ہو جاتا تو وہ اپنا یقینی بچاؤ کر سکتا تھا۔

پندرہ روز بعد عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، کسی بھی کیس کی ابتدائی چند پیشیاں تکنیکی معاملات کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہ عدالتی کارروائی خاصی بور اور خشک ہوتی ہے۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز لگ بھگ تین ماہ کے بعد ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا مگر اس سے پہلے ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی خاص بات موجود ہوگی۔

ملزم نے عدالت کے روبرو وہی بیان ریکارڈ کرایا جو اس سے پہلے وہ پولیس کو دے چکا تھا۔ یہ بیان نہایت ہی مختصر اور نپا تلا تھا جس میں توفیق عمر صوی نے میری ہدایت کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔

ملزم کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کے پاس چلا گیا۔ اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ وہ ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

"بڑے صاحب...... اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟"

"چھیاسٹھواں سال چل رہا ہے۔" ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے حوالات میں ملاقات کے دوران میں اور بعد میں بھی اپنے مؤکل کو اچھی طرح یہ بات سمجھا دی تھی کہ اسے عدالت اور وکیل استغاثہ کا سامنا کس انداز میں کرنا ہے لہٰذا وہ میری ہدایت کے مطابق نہایت ہی ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنا کیس ڈیل کر رہا تھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ ایک سال پہلے تم نے شادی کی تھی؟" وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جی، یہ درست ہے۔" ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"کیا یہ بھی درست ہے کہ تمہاری بیوی عمر میں تم سے چالیس سال چھوٹی ہے؟"

ملزم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"یہ عمروں کا کوئی عجیب سا میل نہیں ہے۔" وکیل استغاثہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "اس تفاوت کی وجہ سے دیکھنے والے تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ باپ بیٹی جا رہے ہیں......"

توفیق کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم وہ نہایت ہی تحمل لہجے میں بولا۔ "ممکن ہے، بعض کج فہم لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہوں مگر ہم نے چونکہ باقاعدہ نکاح کیا ہے اور ہم قانوناً و شرعاً میاں بیوی ہیں لہٰذا ہم نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ کون ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے۔"

"جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کو ہمارے معاشرے میں عموماً قدم قدم پر عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یقیناً یہ مسئلہ تمہارے ساتھ بھی رہا ہوگا؟"

"نہیں جی...... ایسی کوئی بات نہیں۔" ملزم نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "سوائے مقتول فاروق کی بے ہودگی کے، ہمیں کبھی ایسی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

"مقتول فاروق......!" وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس شخص کی تم سے کیا دشمنی تھی...... تم نے کیوں اس کی جان لے لی......؟"

"میں نے کسی کی جان نہیں لی اور نہ ہی میری کسی سے دشمنی تھی۔" میری توقع سے بڑھ کر ملزم نے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بلکہ وہ شیطان خود ہی میری بیوی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔"

"کیا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا؟" وکیل استغاثہ نے تفریح لینے والے انداز میں پوچھا۔

"وہ میری بیوی کو تنگ کرتا تھا۔ رات کی تاریکی میں جب میں گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا تو وہ مردود ہمارے مکان کے پچھواڑے آ کر...... اسے چھیڑتا تھا۔ بے ہودہ اور واہیات جملوں کی مدد سے وہ اظہارِ محبت کرتا تھا۔ ہم اس کی ان کمینی حرکتوں سے عاجز تھے۔"

"یعنی صورتِ حال وہی تھی جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے تذکرہ کیا ہے۔" وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کو اکثر ایسے ناخوشگوار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے...... ہیں نا؟"

"آپ یہ بار بار بوڑھا کسے کہہ رہے ہیں؟" ملزم، وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بگڑ کر بولا۔

"تمہیں...... اور کسے!" وکیل استغاثہ نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ "کیا چھیاسٹھ سال کی عمر میں بھی تم خود کو

بوڑھا نہیں سمجھتے ؟''

''ہرگز نہیں!'' ملزم چہک کر بولا۔ ''شاید آپ نے یہ محاورہ نہیں سنا وکیل صاحب...... جیسی کہیں، ساٹھا پاٹھا!''

''محاورہ میں نے سن رکھا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اعتماد سے کہا۔ ''مگر تمہاری حالت اور صحت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ''پاٹھا'' تمہارے اندر یا باہر آس پاس کہیں موجود نہیں۔''

ملزم کو جلال آ گیا۔ وکیل استغاثہ نے اس کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''وکیل صاحب! آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے......؟''

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' وکیل استغاثہ بوکھلا گیا۔

''وکیل صاحب! آپ ایک عقل مند اور سمجھدار انسان ہیں۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میں نے سکھ کی سانس لی کہ توفیق نے جوش میں آنے کے بجائے خود کو معتدل کر لیا تھا۔ ''آپ نے قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ میری بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ بہرحال میں ہی وضاحت کر دیتا ہوں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرے کہنے کا مقصد یہ تھا وکیل صاحب کہ کیا آپ خود کو صحت مند اور جوان سمجھتے ہیں؟''

''الحمدللہ!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''میں واقعی صحت مند اور جوان ہوں۔''

وکیل استغاثہ نے اپنی ذات کے حوالے سے جو دعویٰ کیا تھا وہ اس کو دیکھ کر سچا لگتا تھا مگر دوسری طرف بھی چھیاسٹھ سالہ توفیق عرعوی تھا۔ وہ آسانی سے وکیل استغاثہ کی جان چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

''وکیل صاحب......!'' ملزم نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میری موجودہ حالت اور صحت کو دیکھ کر آپ نے مجھے ایک بوڑھا شخص قرار دے دیا ہے۔ ٹھیک ہے...... یہ چھیاسٹھ سالہ مریل سا بوڑھا آپ جیسے جوان رعنا کو مصافحے کی دعوت دیتا ہے...... کیا آپ میری اس دعوت کو قبول کریں گے؟''

جج نہایت ہی توجہ سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ملزم اور وکیل استغاثہ کے درمیان ہونے والی عجیب، دلچسپ اور سنسنی خیز گفتگو سے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال میرے مؤکل یعنی اس کیس کے ملزم توفیق عرعوی کے حق میں جاتی تھی۔

وکیل استغاثہ ملزم کی دعوت کے جواب میں ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' اسی کیفیت کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ صحت مند اور جوان ہونے کا دعویٰ کر چکا تھا لہٰذا دعوت کو قبول نہ کرنا بھری عدالت میں اپنی بھد اڑوانے کے مترادف ہوتا۔

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''کیوں نہیں، کیوں نہیں...... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔''

''اور پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ملزم نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

وکیل استغاثہ نے جھٹ اپنا ہاتھ ملزم کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کے کمرے میں ایک کربناک چیخ بلند ہوئی۔

یہ چیخ یقیناً وکیل استغاثہ کے حلق سے خارج ہوئی تھی۔ ملزم کے ہڈیوں بھرے ہاتھ کی فولادی گرفت نے وکیل استغاثہ کے ہاتھ کا گویا قیمہ بنا ڈالا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ عدالت کے کمرے میں موجود تمام افراد اور جج حیرت اور الجھن بھری نظروں سے وکیل استغاثہ کو پیش آنے والی صورتِ حال کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

ملزم نے دو چار طوفانی ''شیک ہینڈی'' جھٹکے دینے کے بعد وکیل استغاثہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی آہنی جکڑ سے آزاد کر دیا۔ وکیل استغاثہ کھسیانے انداز میں اپنے ہاتھ کو کھول بند کر کے تکلیف کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''وکیل صاحب! آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اگر میں نے چھیاسٹھ سال کی عمر میں کسی پچیس سال کی عورت سے شادی کی ہے تو مجھ میں اس کی اہلیت بھی موجود ہے۔ میں نہ صرف یہ کہ اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کر سکتا ہوں بلکہ اس کی طرف اٹھنے والی کسی بھی میلی نگاہ سے نمٹنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں لیکن......'' وہ چند لمحات کے لیے تھما۔ ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن ...... اس کے ساتھ ہی میں ایک امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والا شہری ہوں۔ اگر مجھے قانون کو ہاتھ میں لینا ہوتا تو میں بہت پہلے اس غنڈے سے الجھ جاتا۔ میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا اور اللہ نے اپنی حکمت سے اس معاشرتی ناسور کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا۔''

''اگر آپ کی اس بات کو درست مان لیا جائے کہ

مقتول آپ کی بیوی کو کافی عرصے سے پریشان کر رہا تھا تو پھر ایک نہایت ہی اہم سوال پیدا ہوتا ہے......'' وکیل استغاثہ ''تم'' سے ''آپ'' پر آتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''کون سا سوال؟'' ملزم نے پوچھا۔

''ایسی صورت میں آپ کو فوراً تھانے جا کر مقتول کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہیے تھی۔ کیا آپ کی طرف سے ایسی کوئی شکایت متعلقہ تھانے میں درج ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

یہ وہی کمزوری تھی جو ابتدا ہی سے اس کیس کے ساتھ نتھی چلی آ رہی تھی۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ استغاثہ کی جانب سے ایسا سوال آ سکتا ہے اور وہ آ گیا تھا۔ وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں ملزم نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''نہیں......!''

''کیوں؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے پولیس پر ذرا سا بھی اعتبار نہیں۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

وکیل استغاثہ بھویں سکیڑ کر مستفسر ہوا۔ ''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟''

''بھلا یہ کوئی بات ہوئی یا نہیں۔'' ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کو بتا دی۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی چوبیس فروری کی شام آپ کا مقتول کے ساتھ زبردست قسم کا جھگڑا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے دریافت کیا۔

توفیق عمر صوی نے جب سے وکیل استغاثہ کے ہاتھ کی ''مزاج پرسی'' کی تھی، اس کے انداز میں بوڑھے جوان کے لیے قدرے احترام کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ رویہ اس کا اب بھی جارحانہ تھا تاہم طرز تکلم ''تم'' سے ''آپ'' پر آ گیا تھا۔

''جی ہاں، یہ سچ ہے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''مقتول کسی تاریخی کتاب کے حصول کے لیے آپ کی لائبریری پہنچا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے پیچے تلے الفاظ میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے تھے۔ زبانی تکرار سے شروع ہونے والا معاملہ ہاتھا پائی تک پہنچا۔ اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کراتے تو وہاں بھی کوئی سنگین واقعہ پیش آ سکتا تھا......؟''

''میں نہ تو آگ بگولا ہوا تھا اور نہ ہی بحث و تکرار میں پہل کی تھی۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بے ہودگی کا آغاز مقتول کی طرف سے ہوا تھا۔ میں پہلے تو برداشت کرتا رہا اور جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو میں نے بھی اس لفنگے کو بے نقط سنا ڈالیں۔''

''اور انہی ''بے نقط'' میں آپ نے مقتول کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے کٹیلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس دھمکی کے اگلے ہی روز یعنی پچیس فروری کی رات مقتول آپ کے گھر کے عقب میں، کچرے کے ڈھیر پر مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔'' ملزم گہری سنجیدگی سے بولا۔

وکیل استغاثہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مقتول فاروق پچیس فروری کی رات کو نہیں بلکہ چھبیس فروری کی صبح میرے مکان کے پچھواڑے کچرے کے ڈھیر پر مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔'' ملزم نے بڑے سخت انداز میں تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے علاقے کے سویپر جاوید نے اس کی لاش دریافت کی تھی۔''

''مگر......'' وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے ملزم کو گھورا۔ ''مقتول کی موت پچیس فروری کی رات کو آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہو چکی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔''

ملزم نے وکیل استغاثہ کی وضاحت پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وکیل استغاثہ نے مزید ایک دو سوالات پوچھنے کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر میں اپنے موکل کے پاس پہنچ گیا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''توفیق صاحب! وقوعہ سے ایک روز پہلے مقتول کون سی تاریخی کتاب لینے آپ کی لائبریری پہنچا تھا؟''

''یہ بالکل غلط بات ہے کہ وہ کوئی تاریخی کتاب لینے میرے پاس آیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ پچھلے کچھ عرصے سے ہمیں جس طرح پریشان کر رہا تھا، ان حالات کی روشنی میں اس کا میرے پاس آنے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔ وہ کتاب کے بہانے سیدھا سیدھا مجھ سے پھڈا کرنے آیا تھا۔''

توفیق عمر صوی اس واقعے کی تفصیل سے مجھے آگاہ کر چکا تھا لیکن میں چونکہ ان تمام حقائق کو ڈرامائی انداز میں عدالت کے سامنے لانا چاہتا تھا اس لیے چونکتے ہوئے لہجے

میں ملزم سے پوچھا۔

”کتاب کے بہانے بھگا کر لے جانے..... یہ کیا کہانی ہے؟“

”یہ بڑی شرم ناک کہانی ہے۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کہانی کو مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔“

جب توفیق عمروی نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا تو میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ اس معاملے کو عدالت میں کس طرح پیش کرنا ہے۔ ان لمحات میں وہ من وعن میری ہدایات پر عمل کرتا دکھائی دیتا تھا۔

”پرمیشن گرانٹیڈ......!“ جج نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عدالت کی جانب سے اجازت ملتے ہی توفیق عمروی شروع ہو گیا۔ ”جناب عالی!“ وہ براہِ راست جج سے مخاطب تھا۔ ”وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی چوبیس فروری کی شام لگ بھگ پانچ بجے مقتول میری لائبریری پر آیا۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ شیطان صفت آدمی یقیناً یہاں کوئی فتنہ جگانے آیا ہے۔ بہرحال، میں نے پہل نہیں کی اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”بڑے صاحب! مجھے دو تین کتابیں پڑھنے کے لیے چاہئیں۔“ وہ بڑی رسان سے بولا۔ ”چند روز کے بعد واپس کر دوں گا۔“

اس نے چونکہ کوئی غلط بات نہیں کی تھی لہٰذا میں نے بھی بالکل کاروباری انداز میں پوچھا۔ ”کون سی کتابیں؟“

”وہی......!“ وہ پُراسرار انداز میں آواز دبا کر بولا۔

مجھے اس کا انداز پسند نہ آیا۔ ”وہی کون سی؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ کتابیں جن سے لڑکیاں پھنسائی جاتی ہیں۔“ وہ بڑے بھونڈے طریقے سے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ”جن کے شائع کرنے اور بیچنے پر سخت پابندی ہے۔ میرا مطلب ہے...... ممنوعہ کتابیں!“

”ایک منٹ......!“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر تنبیہی انداز میں کہا۔ ”میری لائبریری میں اس نوعیت کی کتابیں نہیں ہوتیں۔ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔“

”اچھا تو بڑے میاں...... اب تم مجھے چکر دو گے۔“ وہ اچانک بدتمیزی پر اتر آیا۔ ”میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم نے باتصویر کتابوں کا وہ اسٹاک اپنی لائبریری سے اٹھا لیا ہو۔ انہی سنسنی خیز کتابوں کی مدد سے تو تم نے اس عمر میں ایک نوجوان لونڈیا کو پھانسا ہے۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ منی کی ذات کے حوالے سے اس نے بہت رکیک جملہ کہا تھا۔

”واہ واہ..... سبحان اللہ! سچی بات واقعی بہت کڑوی ہوتی ہے۔“ اس نے مجھے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ منی شادی سے پہلے تمہاری لائبریری سے پڑھنے کے لیے کتابیں لے جایا کرتی تھی؟“

”یہ بات غلط نہیں ہے مگر جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ معاشرتی ناول پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔“

”معاشرتی ناول......!“ اس نے یہ الفاظ ایسے زہریلے انداز میں دہرائے کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ”میں سب سمجھتا ہوں کہ ان معاشرتی ناولوں کی آڑ میں کون کون سی ممنوعہ گندی کتابیں اس لائبریری سے جاتی ہیں۔ تم ایک ہوس پرست اور ٹھرکی بڈھے ہو۔ اس محلے کی نوجوان نسل کے ذہنوں میں زہر انڈیل رہے ہو تم۔ میں تمہاری لائبریری پر چھاپا پڑواؤں گا پولیس کا۔ تم ان تمام گندے رسائل کے ساتھ گرفتار کر لیے جاؤ گے۔“

”میں یہاں تک اس کی ”بک بک“ اور یاوہ گوئی کو برداشت کر رہا تھا لیکن جب اس نے منی کے بارے میں بدکلامی شروع کی تو میری برداشت جواب دے گئی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہوتے ہی میں پھٹ پڑا اور جو بھی منہ میں آیا، بولتا چلا گیا۔ اسی دوران میں، میں نے اس خبیث کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگر اس روز لوگ بیچ بچاؤ نہ کراتے تو خدا کی قسم...... ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ بچتا۔ منی کی انسلٹ نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ

بھگتائے گئے جن کے نام علی الترتیب محمد رفیق، ریاست علی اور قدیر احمد تھے۔ محمد رفیق اور ریاست علی اس بات کے عینی شاہد تھے کہ ملزم توفیق عرعوی نے مقتول کو بڑے خطرناک انداز میں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس بات کا اقرار تو ملزم خود پچھلی پیشی پر عدالت کے روبرو کر چکا تھا تاہم استغاثہ کی پیشکش کا انداز خاصا منفرد اور چٹ پٹا تھا۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محمد رفیق اور ریاست علی کے بیانات کی روشنی میں کس قسم کی عدالتی کارروائی ہوئی ہوگی۔

تیسرا گواہ قدیر احمد وہ شخص تھا جس کے ساتھ ملزم اکثر اپنے گھریلو حالات کا رونا روتا رہتا تھا اور مقتول کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں اسے بتاتا رہتا تھا۔ قدیر نے عدالت کو بتایا کہ کئی بار ملزم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اس فاروق کمینے کی منڈی مروڑ ڈالے۔

ان تینوں گواہوں کو استغاثہ کی جانب سے پیش کرنے کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ عدالت کو باور کرایا جائے، ملزم اپنے دل میں مقتول کے لیے شدید ترین نفرت اور انتقامی جذبات رکھتا تھا اور بڑے کھلے ڈلے انداز میں اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا اور وہ یہ کہ اس پیشی پر تین نہیں بلکہ استغاثہ کی جانب سے چار گواہ پیش کیے گئے تھے اور چوتھا گواہ تھا جاوید عرف جیدا..... وہ سوئپر جس نے مقتول فاروق واوا کی لاش دریافت کی تھی۔ رفیق، ریاست اور قدیر کی طرح جیدا کے بیان میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

جیدا حسب معمول گلیوں کی صفائی کرتے اس علاقے میں پہنچا تھا۔ وہ جمع ہونے والے کچرے کو ملزم کے مکان کے عقبی حصے میں پھینکا کرتا تھا جہاں سے کے ایم سی کا ٹرک اٹھا لے جاتا تھا۔ وقوعہ کے روز جب وہ کچرے والی ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے ملزم کے گھر کے پچھواڑے پہنچا تو وہاں ایک لاش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے شور مچا کر اہلِ محلہ کو جمع کر لیا۔ اس کے بعد ہی یہ معاملہ تھانے تک پہنچا تھا۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں پچیس، تیس منٹ باقی تھے۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔

کسی بھی تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ کے برابر ہوتی ہے بلکہ وہ استغاثہ کا "حقیقی وارث" ہوتا ہے اسی لیے اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میں عموماً ابتدا ہی میں تفتیشی افسر سے سوال و جواب کرلیا کرتا ہوں لیکن اس کیس میں، میں نے دانستہ بعد میں اس کی طرف توجہ کی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔

تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام جنید علی معلوم ہوا۔ وہ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ پولیس آفیسر تھا۔ میں نے آئی او (انوسٹی گیشن آفیسر) جنید علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئی او صاحب! کیا آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو توجہ سے پڑھا ہے؟"

یہ ایک انتہائی سادہ سا سوال تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی تفتیشی افسر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو نہ دیکھا ہو۔ اسی رپورٹ کی بنا پر تو استغاثہ کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

انکوائری آفیسر نے چونک کر میری جانب دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولا۔ "جی ہاں، ایک بار نہیں، میں نے کئی بار اسے پڑھا ہے اور نہایت توجہ کے ساتھ۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کیا آپ اس تاریخ اور وقت سے اتفاق کرتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "یقیناً مقتول کی موت پچیس فروری کی رات ہی کو واقع ہوئی تھی کیونکہ جب چھبیس فروری کی صبح میں نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر مقتول کی لاش کا معائنہ کیا تو مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مقتول کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بارہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ اس کی کھوپڑی بری طرح کچلی ہوئی تھی اور وہاں سے خارج ہونے والا خون بھی سر اور گردن سمیت بالائی جسم کے مختلف حصوں پر جم چکا تھا۔"

"گویا....." میں نے آئی او کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہی واقع ہوئی تھی؟"

"جی ہاں، مجھے کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔" وہ پروثوق انداز میں بولا۔ "میں نے اپنا ماہرانہ تجزیہ آپ کے سامنے پیش کردیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے تجزیے کی تصدیق کرتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا لہٰذا امر واقعی یہ ہے کہ مقتول فاروق کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔"

دل کش کہانیوں اور دل آویز سلسلوں سے مرصع مئی 2015ء کا سالگرہ نمبر 2
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
رفاقت جاوید اور نگہت سیما کے ناولوں کی پُرکشش اقساط
زاہدہ پروین کے روایتی زبان و بیان کا شاہکار..... جنگل کا پھول کا آخری حصہ
زمر نعیم کے اسیر وفا میں خوب صورت وفاؤں کا تذکرہ
ممتا کے حسین اور پُر روح جذبے کا اظہار کرتی ارجمند عقیل اور رفعت شبانہ کی پُراثر کہانیاں
نبیلہ ابر راجا بڑی مہارت سے متاعِ دل سنبھالے ہوئے
سالگرہ نمبر 2 کے لیے نیلم احمد بشیر اور ناہید فاطمہ حسنین کی خصوصی تحریریں
پڑھیے ذیشان رسول کی
شادی کا احوال
عظمیٰ آفاق کے قلم سے دلچسپ
انداز میں
علاوہ ازیں ان مایہ ناز رائٹرز کی شاندار کاوشیں آپ کے ذوق کی نذر جس میں صائمہ اکرم،
اُمِ ایمان، عقیلہ حق، سعدیہ رئیس، شمیم فضل خالق و دیگر شامل ہیں
صرف آپ جیسے خوش ذوق و خوش شوق قارئین کے لیے

''تھینک یو آئی او صاحب!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس میز کی جانب بڑھ گیا جس پر آلۂ قتل ایک سیلوفین بیگ کے اندر پیک پڑا تھا۔

کیس کی سماعت کے دوران میں ایک چوبی میز پر آلۂ قتل اور دیگر متعلقہ اشیا ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ میں کافی دیر سے اس کیس کے انکوائری آفیسر کے ساتھ جو اٹھکیلیاں کر رہا تھا اس پر جج محظوظ اور وکیل استغاثہ مکدر ہو رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کون سا سانپ نکالنے والا ہوں۔ سانپ تو میں واقعی نکالنے والا تھا اور اس نیک کام میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔

میں نے چوبی میز کے پاس پہنچ کر سیلوفین بیگ میں محفوظ آلۂ قتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آئی او سے سوال کیا۔ ''آپ کے خیال میں اس بلاک سے خطرناک وار کر کے مقتول فاروق کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

''اس میں میرے سے زیادہ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کا عمل دخل ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے جائے وقوعہ اور لاش کے معائنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے تھے، لیبارٹری ٹیسٹ نے ان کی تصدیق کی ہے۔ بلاک کے ایک کونے پر مقتول کا خون اور اس خون میں مقتول کے سر کے چند بال چپکے ہوئے ملے تھے۔ خون خشک ہو کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بلاک کو چیک کر سکتے ہیں۔''

''کسی چیکنگ کی ضرورت نہیں مائی ڈیئر آئی او۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ کی بات پر پورا بھروسا ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ اب میں آپ سے جو دو تین مختصر سوال پوچھوں گا ان کا آپ بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں گے۔''

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا اور مسلسل معاندانہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اگر یہی سوال وجواب میں استغاثہ کے کسی عام گواہ سے کر رہا ہوتا تو وہ ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرہ لگاتے ہوئے کئی بار بیچ میں کود چکا ہوتا۔ میں وکیل مخالف کی مجبوری اور بے بسی کو بڑے بھرپور انداز میں انجوائے کر رہا تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے انکوائری آفیسر کو انتظار کی زحمت سے بچاتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''حالات وواقعات اور پوسٹ مارٹم و لیبارٹری رپورٹس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتول فاروق پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان ملزم توفیق عرف موی کے گھر کے پچھواڑے، کچرے کے ڈھیر کے پاس موجود تھا، میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔ ''اس دوران میں وہ وہاں موجود تھا جبھی تو اس کی لاش ادھر پڑی ملی تھی۔''

''مقتول کی موت کھوپڑی چٹخنے سے واقع ہوئی تھی اور تباہ حال کھوپڑی کا معائنہ یہ بتاتا ہے کہ بلاک سے سر کے عقبی حصے پر وار کیا گیا تھا۔'' میں نے آئی او کو الفاظ کے جال میں باندھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں عقب سے اس پر وار کیا تھا؟''

''جی ہاں ...... اس میں کوئی شک نہیں۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل، مقتول کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا تھا؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''قاتل پہلے سے وہاں چھپا بیٹھا تھا یا دبے قدموں مقتول کا تعاقب کرتے ہوئے جائے وقوعہ تک پہنچا تھا، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' آئی او جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ قاتل نے مقتول کی بے خبری میں، اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر بھاری بلاک کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

''قاتل نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔'' میں نے آئی او کے الفاظ کو دہرایا اور عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان قاتل اور مقتول دونوں ملزم کے گھر کے پچھواڑے میں موجود تھے؟''

''جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس نے سادگی سے میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جال کو سمیٹتے ہوئے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''آئی او صاحب! یہ بات تو سمجھ میں آرہی ہے کہ مقتول سے آپ کا اشارہ فاروق دادا کی طرف ہے جس کی لاش ملزم کے گھر کے پچھواڑے کچرے کے ڈھیر پر پڑی ملی تھی لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''ذرا یہ بھی وضاحت کر دیں کہ قاتل سے آپ کی مراد کون ہے؟''

''واہ واہ ...... سبحان اللہ!'' وکیل استغاثہ کی

برداشت جواب دے گئی۔ وہ زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں بولا۔ ”یعنی ساری رات قصۂ زلیخا چلتا رہا اور صبح پوچھا جارہا ہے کہ...... زلیخا عورت تھی یا مرد...... اس کیس کو عدالت میں لگے کئی ماہ گزر گئے۔ سماعت آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور میرے فاضل دوست کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے مؤکل پر فاروق دادا کے قاتل ہونے کا الزام ہے۔ کتنی معصومیت سے پوچھ رہے ہیں...... قاتل سے آپ کی مراد کون ہے۔“

میں نے وکیل استغاثہ کے زہریلے جملے کو صبر و تحمل کی ڈھال سے روکا پھر اپنے مخصوص تپانے والے انداز میں کہا۔ ”مائی ڈیئر کونسلر! آپ نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کردی کہ میرے مؤکل توفیق عرعوی پر فاروق دادا کے قتل کا الزام ہے یعنی جب تک استغاثہ معزز عدالت کے روبرو اس الزام کو درست ثابت نہیں کردیتا، میرے مؤکل کو قاتل نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے میں آپ کی چند باتوں سے مکمل اتفاق بھی کرتا ہوں مثلاً......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”مثلاً یہ کہ...... اس کیس کو عدالت میں لگے کئی ماہ گزر گئے...... سماعت آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے...... وغیرہ وغیرہ...... اس کے ساتھ ہی میری آپ سے درخواست ہے کہ برائے مہربانی ڈیفنس اور آئی او کے درمیان مداخلت کی زحمت نہ کریں۔ آئی او صاحب اس کیس کے بارے میں سب سے زیادہ واقفانی اور تکنیکی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ میرے ہر سوال کا بہ آسانی جواب دے سکتے ہیں۔ بہ فرضِ محال، اگر آئی او صاحب کسی مرحلے پر لاجواب ہوجائیں تو آپ ان کی مدد کے لیے آزاد ہوں گے۔“

میری اس وضاحت نے وکیل استغاثہ کو سلگا کر رکھ دیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تاہم اس کے چہرے کے خوفناک تاثرات سے یہی نظر آتا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں اسے نظرانداز کر کے آئی او کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”جی آئی او صاحب!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا۔ ”قاتل سے آپ کی مراد کون ہے......؟“

”ملزم توفیق......!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”یعنی میرا مؤکل چھیاسٹھ سالہ توفیق عرعوی؟“

جب توفیق سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ پینسٹھ سال کا تھا مگر اس کیس کے دوران میں اس کی عمر چھیاسٹھ سال ہوگئی تھی۔ آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”جی ہاں، یہی!“ بات کے اختتام پر اس نے ملزم کی جانب اشارہ کردیا۔

”کیا آپ ملزم کو سپرمین سمجھتے ہیں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میرے اس سوال پر وہ بری طرح چونکا۔

”مطلب یہ کہ......“ میں نے مزے لے لے کر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ سپرمین کی طرح اڑ سکتا ہے۔ ایک لمحے یہاں اور دوسرے لمحے ”شوں“ کرکے وہاں......؟ یا پھر آپ کے خیال میں ملزم نے اپنے ہمزاد کو تسخیر کر رکھا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”ملزم سپرمین نہیں اور نہ ہی اس نے اپنے ہمزاد کو مطیع و فرماں بردار بنا رکھا ہے۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”اس کا تو صاف صاف مطلب یہی ہے کہ فاروق دادا کو اس نے قتل نہیں کیا کیونکہ......“ میں نے قدرے رک کر ڈرامائی انداز اختیار کیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کردی۔ ”کیونکہ ملزم بیک وقت دو الگ الگ مقامات پر نہیں پایا جاسکتا۔“

”بیگ صاحب......!“ جج کی سرسراتی ہوئی آواز نے میری سماعت پر دستک دی۔ ”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروق دادا کی موت پچیس فروری کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ اس دوران میں ملزم جائے وقوعہ سے دور محمود آباد نمبر تین میں موجود تھا لہٰذا وہ کسی بھی طور مقتول کے قتل میں ملوث نہیں ہوسکتا۔“

میرے انکشاف نے عدالت کے کمرے میں کھلبلی مچادی تھی۔ ہر طرف سنسنی خیز چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ جج نے حاضرین عدالت کو خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنے دعوے کی وضاحت کریں۔“

”جناب عالی!“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بڑے اعتماد کے ساتھ بتانا شروع کیا۔ ”ملزم روزانہ صبح دس بجے لائبریری کھولتا تھا جو کہ محمود آباد نمبر تین میں واقع ہے جبکہ جائے وقوعہ ملزم کی رہائش محمود آباد گیٹ کے علاقے میں

ہے۔ اس جگہ کو محمود آباد نمبر ایک بھی شمار کر سکتے ہیں۔ بہرحال......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ملزم سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے تک لائبریری بند رکھتا تھا اور پھر پانچ بجے سے رات دس بجے تک وہ دوبارہ لائبریری میں موجود رہتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی ملزم نے اپنی معمولات کے مطابق رات دس بجے لائبریری بند کر کے گھر کی راہ لی تھی اور لگ بھگ دس بج کر پچیس منٹ پر وہ گھر پہنچا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر رات کا کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اگلے روز یعنی چھبیس فروری کو گیارہ بجے دن لائبریری سے اسے مقتول فاروق کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ جب وقوعہ کے روز ملزم شام پانچ بجے سے رات دس بجے تک اپنی لائبریری پر موجود تھا تو پھر وہ رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان فاروق دادا کو کیسے قتل کرسکتا ہے......''

''ہوں......!'' جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

''جناب عالی!'' میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا مؤکل ایک بے ضرر اور معصوم انسان ہے۔ فاروق دادا کے قتل سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کو باعزت بری کرنے کے احکام صادر کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی استغاثہ کو پابند کیا جائے کہ وہ جلد از جلد اصل مجرم یعنی فاروق دادا کے قاتل کو عدالت میں پیش کرے۔ دیٹس آل یور آنر۔''

جج نے گہری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ وقوعہ کے روز ملزم کی شام پانچ بجے سے رات دس بجے تک محمود آباد نمبر تین میں موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت عدالت کو فراہم کرسکتے ہیں...... خاص طور پر رات آٹھ اور نو بجے کے درمیانی وقفے کے حوالے سے؟''

''جی...... ضرور......'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں چند زندہ ثبوت عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔''

''زندہ ثبوت!'' جج نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے...... گواہ؟''

''یس سر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''گواہ...... عینی گواہ...... بلکہ عینی گواہان۔''

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند سیکنڈ باقی رہ گئے تھے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ آئندہ پیشی پر صفائی کے گواہان کو عدالت میں لے آئیں۔''

اس کے بعد دس دن کی تاریخ دے کر جج نے عدالت برخاست کردی۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں رضوان احمد کھڑا تھا۔ رضوان کی پان سگریٹ کی چھوٹی سی دکان تھی جو ملزم کی لائبریری سے ملحقہ تھی۔ رضوان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد عدالت کو بتایا کہ وقوعہ کی رات دس بجے اس نے ملزم کو لائبریری بند کر کے وہاں سے رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ رضوان کی دکان آدھی رات تک کھلی رہتی تھی۔ وہ دونوں چونکہ کاروباری پڑوسی تھے لہٰذا ملزم گھر جانے سے پہلے رضوان سے سلام دعا ضرور کیا کرتا تھا۔

صفائی کا دوسرا گواہ محمد طفیل تھا۔ طفیل کی لائبریری کے سامنے سڑک کی دوسری جانب کپڑے کی دکان تھی۔ طفیل نے بھی اپنے حلفیہ بیان میں عدالت کو بتایا کہ وہ روزانہ کم و بیش ساڑھے نو بجے اپنی دکان بند کر کے گھر چلا جاتا تھا۔ وقوعہ کے روز جب وہ دکان بند کر کے گھر جا رہا تھا تو اس نے ملزم کی لائبریری کو کھلا دیکھا تھا اور ملزم بھی لائبریری کے اندر موجود نظر آرہا تھا۔

جب یہ دونوں گواہ بھگت چکے تو جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ کے پاس کوئی ایسا گواہ بھی موجود ہے جو اس امر کا شاہد ہو کہ ملزم وقوعہ کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان اپنی لائبریری پر موجود تھا؟''

عدالتی کارروائی کے دوران میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ ہی کو کمرے میں لا کر اس کا بیان ریکارڈ کیا جاتا ہے اور بعدازاں حسب ضرورت اس پر جرح بھی کی جاتی ہے۔ باقی گواہ عدالت کے کمرے کے باہر کوریڈور میں چوبی بنچوں پر اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ایک گواہ کا بیان دوسرے گواہ کی گواہی پر اثر انداز نہ ہو۔

''جناب عالی!'' میں نے جج کے استفسار پر نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میرے پاس دو ایسے معزز گواہ ہیں جو اس امر کے عینی شاہد ہیں کہ میرا مؤکل وقوعہ کی رات

آٹھ اور نو بجے درمیان جائے وقوعہ سے دور ایک مسجد میں موجود تھا۔"

"مسجد میں......؟" جج نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"یس سر!" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے... بہ آوازِ بلند کہا۔ "ملزم نہایت پابندی سے عشا کی نماز ادا کیا کرتا تھا۔ وقوعہ کی رات وہ سات پینتالیس پر اپنی لائبریری سے نکل کر مسجد میں گیا جو اس کی لائبریری کے نزدیک ہی واقع ہے۔ عشا کی نماز کا اختتام لگ بھگ آٹھ تیس پر ہوا۔ وہ مسجد سے نکلا اور سیدھا لائبریری جا پہنچا۔ مسجد میں اس کی آمدو شد کے دو معزز گواہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے انھیں باری باری گواہی کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"پرمیشن گرانٹیڈ......!" جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

سب سے پہلے عبدالوہاب صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوا۔ جب وہ اپنا...... بیان ریکارڈ کرا چکا تو میں سوال وجواب کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"عبدالوہاب صاحب! آپ ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟"

"کافی عرصے سے جانتا ہوں جناب۔" اس نے جواب دیا۔ "روزانہ عشا کے وقت مسجد میں ہماری ملاقات ہوتی ہے۔"

"کیا وقوعہ کی رات بھی آپ کی ملزم سے ملاقات ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو یہ وضو کر رہا تھا۔"

"یہ کم وبیش کتنے بجے کی بات ہے؟"

"میرا خیال ہے، اس وقت رات کے پونے آٹھ بجے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک دو ضمنی سوالات کے بعد جرح موقوف کردی۔

اپنی باری پر وکیل استغاثہ نے بھی صفائی کے گواہ عبدالوہاب پر تیز وتند سوالات کی بوچھاڑ کردی تاہم وہ گواہ کی زبان سے ایسی کوئی بات نہ اگلوا سکا جو استغاثہ کے حق میں جاتی ہو۔

عبدالوہاب کے بعد حاجی ستار، ملزم کے مسجد میں موجود ہونے کی شہادت دینے وٹنس باکس میں پہنچ گیا۔ اس کے حلفیہ بیان کے ریکارڈ ہوجانے کے بعد ملزم کی بے گناہی میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ حاجی ستار نے عدالت کو بتایا کہ ملزم نے اس سے پچھلی صف میں نمازِ عشا ادا کی تھی۔

میں نے جرح کے اختتام پر صفائی کے گواہ سے پوچھا۔ "حاجی صاحب! میرے مؤکل نے مجھے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ دونوں...... یعنی آپ اور ملزم عشا کی نماز کے اختتام پر مسجد سے ایک ساتھ ہی نکلے تھے؟"

"جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مسجد سے نکل کر توفیق اپنی لائبریری کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں اپنے گھر کی طرف......"

"کچھ یاد ہے...... آپ اندازہ لگا سکتے ہیں......" میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "وقوعہ کے روز آپ عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے کتنے بجے نکلے تھے؟"

"یہی کوئی ساڑھے آٹھ بجے...... یا پانچ دس منٹ زیادہ۔" اس نے جواب دیا۔

"پانچ دس منٹ کم نہیں......؟"

"نہیں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"حاجی ستار صاحب! آپ کا مطلب ہے......" میں نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔ "آٹھ پینتیس...... یا آٹھ چالیس......؟"

"جی ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔"

"تھینک یو حاجی صاحب۔" میں نے صفائی کے گواہ سے سوال وجواب کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے روئے سخن جج کی طرف موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یور آنر! صفائی کے آخری دو گواہان کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کے جواب میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ ملزم توفیق عرف ٹوی وقوعہ کی رات سات پینتالیس سے لے کر آٹھ چالیس تک مسجد میں موجود تھا۔ یہ لگ بھگ وہی وقت ہے جو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتول فاروق دادا کی موت کے حوالے سے بتایا گیا ہے۔ ان ٹھوس حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ملزم کسی بھی طور مقتول کے قتل میں ملوث نہیں بلکہ کسی سوچی سمجھی گہری سازش کے تحت اسے اس کیس میں قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے...... دیٹس آل یور آنر!"

میرے ٹھوس دلائل کے اختتام پر جج نے نگاہ اٹھا کر

وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟''

وکیل استغاثہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہوتا تو وہ لب کشائی کرتا۔ صفائی کے آخری دو گواہان عبدالوہاب اور حاجی ستار نے گویا کیس کا پاسا پلٹ دیا تھا۔ اب میرے مؤکل کے بے گناہ ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

وکیل استغاثہ کے مبہم اور ڈھیلے ڈھالے جواب کے بعد جج نے فیصلے کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر رسمی سی عدالتی کارروائی کے بعد عدالت نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم توفیق عمروی کو باعزت بری کردیا۔ اس روز روبینہ عرف منی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کررہی تھی۔ میں نے آئندہ زندگی کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ انہیں رخصت کردیا۔

ایک پیشہ ور وکیل کی زندگی اتنی مصروف ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربے میں آنے والے تمام افراد کو زیادہ عرصے تک یاد نہیں رکھ سکتا۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ ماہ دو ماہ کے بعد میں بوڑھے نوجوان توفیق عمروی اور اس کی بیوی روبینہ عرف منی کو بھی بھول بھال گیا۔ ممکن ہے، میں انہیں ہمیشہ کے لیے فراموش کر بیٹھتا اگر ایک عجیب واقعہ پیش نہ آیا ہوتا۔

یہ توفیق عمروی کی باعزت بریت کے کوئی سال، ڈیڑھ سال یا دو سال بعد کی بات ہے۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا حسب معمول اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو پورا کررہا تھا کہ منی مجھ سے ملنے کے لیے آگئی۔ وہ خاصی پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے بے تکلفی سے پوچھ لیا۔

''خیریت تو ہے روبینہ صاحبہ! کہیں توفیق صاحب کو پھر کسی غنڈے کے قتل کے الزام میں گرفتار تو نہیں کرلیا گیا......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں بیگ صاحب۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''مگر یہ درست ہے کہ میں توفیق صاحب کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور انہی کے اصرار پر اس وقت آپ کے پاس آئی ہوں۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے توفیق صاحب کو؟''

''وہ شدید بیمار ہیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''پچھلے دنوں انہیں ڈبل نمونیا ہوگیا تھا پھر پتا چلا کہ گردن توڑ بخار ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں ہیں۔ وہ ایک بار آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے...... بیگ صاحب کو بلا کر لاؤ۔ مجھے ان سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔''

اپنی بات کے اختتام پر منی نے متعلقہ اسپتال کا نام بھی بتادیا۔

ان دنوں گردن توڑ بخار نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ یہ دماغ کی مخصوص جھلیوں کا انفیکشن ہوتا ہے جس کی وجہ سے بہت تیز بخار بھی آتا ہے۔ اگر بروقت اس کا علاج نہ ہو پائے اور انفیکشن کنٹرول سے باہر ہوجائے تو پھر موت یقینی ہوتی تھی۔ میں یہ بات ''گردن توڑ بخار'' کے ابتدائی زمانے کے حوالے سے کررہا ہوں جب اس کے لیے کوئی مخصوص اینٹی بائیوٹک تیار نہیں کی گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میڈیکل ریسرچ نے اس خطرناک بیماری کی خطرناکی کو کافی حد تک کم کردیا ہے اور اس کے علاج کے لیے زود اثر تھرڈ جنریشن اینٹی بائیوٹک تیار کرلی گئی ہیں۔

جہاں تک عمروی صاحب کے ڈبل نمونیا کا تعلق تھا تو اس کے امکانات ہر لحہ موجود تھے۔ وہ بوڑھا نوجوان جنوری کے مہینے میں ایک سادہ شلوار قمیص میں آدھی رات کو گھومتا پھرتا اور بائیک ڈرائیو کرتا پایا جاتا تھا اور چونسٹھ پینسٹھ سال کا ہونے کے باوجود بھی اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ جوانوں سے زیادہ جوان اور توانا ہے۔ اس قسم کے فخر اور بلند و بانگ دعوے بعض اوقات انسان کو کڑی مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ توفیق عمروی کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے......'' منی کی پوری بات سننے کے بعد میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل کسی وقت اسپتال جاکر توفیق صاحب سے ملاقات کرلوں گا۔''

''کل نہیں...... آج ہی!'' منی نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! توفیق کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ ضد کر رہے تھے کہ میں آج ہی بیگ صاحب کو لے کر آؤں......''

''اوہ......!'' میں نے تشویش بھری نظر سے منی کو دیکھا اور کہا۔ ''انہوں نے بتایا تو ہوگا، وہ مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں......'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''میں نے بہت پوچھا مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں وہ ایک ہی بات کہتے رہے...... میں بیگ صاحب سے جو بھی ضروری بات کروں گا، وہ تمہارے

سامنے ہی کروں گا۔''

''ٹھیک ہے روبینہ صاحبہ! آپ مطمئن ہو کر جائیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آفس سے اٹھنے کے بعد سیدھا اسپتال جا کر توفیق صاحب سے ملاقات کروں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں توفیق صاحب کے لیے بہت پریشان ہوں۔ ڈاکٹرز مجھے تسلیاں تو دے رہے ہیں مگر ان کے الفاظ کے کھوکھلے پن سے لگتا ہے کہ وہ زیادہ پرامید نہیں ہیں۔ خود توفیق بھی ہمت ہار چکے ہیں.....'' بات کے اختتام پر اس کی آواز بوجھل ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ''روبینہ صاحبہ! مایوسی گناہ ہے۔ آپ حوصلہ پکڑیں اور توفیق کی بھی ہمت بندھانے کی کوشش کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ یہ چھوٹی موٹی بیماریاں توفیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔''

اس نے ایک بار پھر تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے میرے دفتر سے رخصت ہوگئی۔ ''میں یہاں سے سیدھی اسپتال جاؤں گی اور وہاں توفیق کے قریب رہ کر آپ کا انتظار کروں گی۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائے۔

رات کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں اس پرائیویٹ اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا جہاں توفیق عمروی ایڈمٹ تھا۔ مذکورہ اسپتال میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا لہٰذا مجھے کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں تھا۔

راستے بھر میں اسی جوڑے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے منی کے اطمینان کے لیے کہہ تو دیا تھا کہ چھوٹی موٹی بیماریاں توفیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں مگر میں جانتا تھا کہ میرے یہ الفاظ تسلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ڈبل نمونیا اور گردن توڑ بخار کوئی معمولی بیماریاں نہیں تھیں۔

میرا ذہن اس حوالے سے بھی بڑے تشویش ناک انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ بوڑھا نوجوان آئی سی یو میں لیٹے لیٹے مجھ سے ایسی کون سی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ منی کے بیان کے مطابق توفیق اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ منی کے حوالے ہی سے کوئی بات کرنا چاہ رہا ہوگا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں متعلقہ اسپتال پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں توفیق عمروی کے پاس تھا۔ اس وقت میرے، منی اور توفیق کے سوا وہاں اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر توفیق کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! مجھے یقین تھا، آپ ضرور آئیں گے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو..... گویا، یہاں آ کر آپ نے میری آخری خواہش پوری کر دی ہے۔''

''دیکھیں نا بیگ صاحب.....'' منی گلوگیر آواز میں بولی۔ ''یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

میں نے توفیق عمروی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ حوصلہ پکڑیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب ٹھیک ہوگا کہ نہیں اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔'' وہ گویا خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے آپ کو جس مقصد کے لیے اس وقت یہاں بلایا ہے وہ پورا ہو جائے تو میرے ضمیر سے ایک بوجھ اتر جائے گا اور میں سکون سے مر سکوں گا۔''

میں نے اور منی نے بیک وقت تشویش بھری سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ہماری نگاہیں دو خطرناک بیماریوں میں جکڑے بوڑھے نوجوان پر ٹک گئیں۔ وہ خواب ناک انداز میں بتانے لگا۔

''بیگ صاحب! فاروق دادا کو میں نے قتل کیا تھا.....''

''کک..... کیا.....؟'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

منی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! لگتا ہے، ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے جبھی یہ ایسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں..... میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو بلانے کی۔'' وہ نحیف مگر تحکمانہ آواز میں بولا۔ ''جب تک میری بات مکمل نہ ہو جائے، تم دونوں توجہ سے سنتے رہو اس کے بعد جو جی میں آئے، کرتے رہنا.....''

ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ دھیمے لہجے میں بولنے لگا۔

''اس شیطان سے نجات کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز پہلے جب میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا تو رات کو میں نے اپنے گھر کی چھت پر ایک بلاک رکھ دیا تھا۔ آئندہ روز یعنی وقوعہ کی رات ٹھیک سوا آٹھ بجے میں اپنے گھر کی چھت پر موجود تھا تاہم منی میرے

منصوبے سے یا چھت پر موجودگی سے قطعی طور پر واقف نہیں تھی۔ پوری گلی کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ میں نے اس مقصد کے لیے اپنے گھر سے دور ایک چھت کا انتخاب کیا اور پھر مختلف چھتوں سے ہوتے ہوئے اپنی چھت پر آ گیا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے مذکورہ گھر والوں سے کیا بہانہ کیا ہوگا کیونکہ یہ اہم نہیں ہے......"

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "مگر وقوعہ کی رات آپ سات پینتالیس پر تو مسجد کے وضوخانے میں عشا کی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے اور اس امر کی تصدیق صفائی کے گواہ عبدالوہاب نے کی تھی......؟"

"عبدالوہاب نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔" وہ ناتواں آواز میں بتانے لگا۔ "عبدالوہاب نے مجھے وضو کرتے دیکھا تھا مگر میں وضوخانے سے چپکے سے نکل آیا تھا اور آئندہ بیس پچیس منٹ میں، میں اپنے منصوبے کے مطابق اپنے گھر کی تاریک چھت پر موجود تھا۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے فاروق ہمارے گھر کے پچھواڑے پہنچا۔ میں نے اس نے جثے اور قد کاٹھ سے اسے فوراً پہچان لیا۔ ویسے بھی اس وقت پچھرے پر کسی کی آمد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ جانوروں کی آواز نکالنے سے پہلے اس نے گردن جھکا کر اپنی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھنے کی کوشش کی۔ بس، میں نے اسی لمحے کو غنیمت جانا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر بلاک کو ہاتھوں سے آزاد کر دیا۔ میری خوش قسمتی اور فاروق کی بدبختی کہ وزنی بلاک آنِ واحد میں اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر جا کر لگا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر اگلے ہی لمحے پچھرے کے ڈھیر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے پانچ سے دس منٹ تک چھت کی تاریکی میں کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر اس کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش پیدا نہیں ہوئی جس سے مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ فاروق اس جہاں سے اس جہاں میں منتقل ہو چکا تھا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر نزاری آواز میں بولا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ اس رات میرا نشانہ خطا نہیں گیا ورنہ صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اس مردود کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں اپنی لائبریری چلا گیا تھا اور پھر معمول کے مطابق رات دس بجے لائبریری بند کر کے گھر آ گیا تھا۔"

"اور وہ جو......" میرے ذہن میں سنسنی خیزی نے اودھم مچا رکھا تھا۔ "حاجی ستار کے بیان کے مطابق آپ نے نہ صرف اس سے پچھلی صف میں نمازِ عشا ادا کی تھی بلکہ اس رات آپ دونوں ساڑھے آٹھ اور پونے نو کے درمیان ایک ساتھ مسجد سے باہر نکلے تھے......؟"

"اس مشن کی تکمیل میں حاجی ستار نے میرا بہت ساتھ دیا تھا بیگ صاحب!" وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "چھ ماہ پہلے حاجی صاحب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں، بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھا وہ...... ستار میرے حالات سے بخوبی آگاہ تھا جب میں نے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا اور درخواست کی کہ اسے میری جائے وقوعہ سے دور موجودگی کے حوالے سے ایک جھوٹ بولنا ہے تو لمحاتی سوچ بچار کے بعد وہ میری مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ حاجی ستار بھی فاروق سے شدید نفرت کرتا تھا۔ کئی مرتبہ بازار میں آتے جاتے فاروق نے اس کی بیٹی رخسانہ کے ساتھ بھی بدتمیزی کی تھی۔"

"گویا......!" توفیق عرموی اپنی بات مکمل کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں نے "امدادِ باہمی" کے اصول پر عمل کیا تھا۔"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہو۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ فاروق کا قاتل تھا تاہم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس شخص نے بڑھاپے میں جوانوں والا کام دکھا کر خود کو بوڑھا جوان ثابت کر دیا تھا۔ توفیق عرموی کے انکشافی اقبالِ جرم پر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"اللہ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرے۔" ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ میں واپس آ گیا۔

اگلے روز جب میں عدالت جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا تو منی کا فون آ گیا۔ میں نے "ہیلو" کیا ہی تھا کہ وہ نمناک آواز میں بولی۔ "بیگ صاحب! آج صبح توفیق کا انتقال ہو گیا ہے......"

"اوہ......!" میں ایک افسردہ سانس خارج کر کے رہ گیا۔

رات آئی سی یو میں توفیق کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چند پل کا مہمان ہے پھر اس نے خود بھی بڑے وثوق سے کہا تھا...... "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو۔"

واقعی گزشتہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔

(تحریر: حُسام بٹ)

مکافات

تنویر ریاض

کہتے ہیں کہ قدرت کی دسترس سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ انتقام اچھا ہو یا برا... انجام تو تکلیف دہ ہی ہوتا ہے اور جب کوئی کسی کے برے وقت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو قدرت بھی غیرمحسوس طریقے سے اسی وقت کے شکنجے میں اسے قید کردیتی ہے۔ یہ اور بات کہ گزرے ہوئے لمحے کب یکجا ہوکر آئینے کا روپ دھارتے ہیں اور مطلوب کو کب اپنی مکروہ شکل اس میں دکھائی دیتی ہے۔

ایک صابر کھلاڑی کے خاموش انتقام کا بھیانک منظر

اپنے آبائی قصبے جانے کے لیے ریفڈی نے مختلف وجوہات کی بنا پر بس کے سفر کو ترجیح دی۔ حالانکہ وہ ہوائی جہاز یا رینٹ اے کار کے ذریعے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ سکتا تھا جبکہ بس میں اسے تقریباً چھ گھنٹے لگ گئے۔ اس کا ایئرکنڈیشننگ سسٹم بھی کچھ اتنا اچھا نہ تھا اور کھڑکیوں کے گندے شیشوں کی وجہ سے باہر کے مناظر بھی دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ نشستیں آرام دہ تھیں جن کی وجہ سے اس ستر سالہ بوڑھے کی ہڈیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے قصبے کا نام پالمر تھا اور وہ نیوہمپشائر میں واقع تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور اس نے عمر عزیز کے

اکیس سال اسی قصبے میں گزارے پھر کسی وجہ سے اسے یہ جگہ چھوڑنا پڑی اور وہ پچاس سال تک اپنے شہر سے دور رہا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنا پرانا حساب چکانے کے لیے واپس آجائے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھوٹی سی توند پر باندھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے پیروں کے نیچے چمڑے کا بیگ رکھا ہوا تھا جس میں بیس بال یونیفارم، بیس بال کے دستانے، پرانے سوتی کپڑوں کے علاوہ ایک اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور بھی تھا اور اسی کی وجہ سے اسے بس میں سفر کرنا پڑا کیونکہ اس وقت تک بس کے اڈوں پر میٹل ڈیٹیکٹرز نصب نہیں کیے گئے تھے۔ اس لیے اس کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دوسری صورت میں اس کے لیے پولیس یا ایف بی آئی کو مطمئن کرنا بہت مشکل ہوجاتا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک بار پھر گہرا سانس لیا اور پرانی یادوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

رینڈی جاروس کو ستمبر 1958ء کی وہ صبح اور ہفتے کا دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ کچھ کر دکھانے کا عزم لیے بستر سے اٹھا۔ اس روز اسے اپنی اکیس سالہ زندگی میں پہلی بار کچھ ملنے والا تھا۔ اس نے کمرے کے کونے میں لگے ہوئے چھوٹے سے واش بیسن میں اپنا منہ دھویا۔ دانت صاف کیے اور لباس تبدیل کر کے تیار ہوگیا۔ وہ گزشتہ دو سال سے اس بورڈنگ ہاؤس میں رہ رہا تھا اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو وہ زیادہ عرصے یہاں قیام نہیں کرتا۔ اس نے تیار ہونے کے بعد اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا پھر ایک نظر کمرے پر ڈالی جہاں ایک بستر، ایک ریڈیو، ایک کرسی اور واش بیسن کے سوا کچھ نہ تھا۔ باتھ روم مشترکہ تھا جبکہ نیچے لیونگ روم میں سیڑھیوں کے پاس ایک پرانا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی۔

اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ اس نے سفید رنگ کی سوتی بیس بال کی یونیفارم پہن رکھی تھی جس کا کالر اور آستینیں گھس چکی تھیں۔ قمیص کی پشت پر اس کا نمبر 9 اور ٹیم کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایک یا دو برس بعد یہ نام بدل جائے گا اور اس کی جگہ نیویارک، شکاگو یا بوسٹن کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ الماری کے ساتھ رکھے بک شیلف کی طرف بڑھا اور اپنے دستانے اٹھالیے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر یہ دستانے چڑھائے اور مسکرا دیا۔ یہ محض دستانے ہی نہیں بلکہ ایک بہتر اور اچھی زندگی گزارنے

کا ٹکٹ بھی تھا۔ ایک گھنٹے بعد کھیل شروع ہونے والا تھا اور یہی گیم اسے نئے راستوں کا مسافر بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

رینڈی نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ شاید اسے نیند آگئی تھی۔ بس انجن کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بس ویرمونٹ کے قصبے پر کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اعلان کیا۔ ”بس یہاں دس منٹ رکے گی۔ آپ لوگ چہل قدمی کر کے اپنی ٹانگیں سیدھی کر سکتے ہیں۔“

وہ بھی اپنی سیٹ سے اٹھا اور بس سے نیچے اتر آیا۔ اسے بہت دیر سے باتھ روم کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سامنے بنے ہوئے ریستوران میں چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں کا باتھ روم بھی صاف ستھرا ہوگا۔ ایک بار پھر اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ کئی سال پہلے جب وہ جوان تھا تو ہر چیز دھندلی میں نظر آتی تھی۔ اس نے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ دھوئے اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا جبکہ جوانی میں اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی بوڑھا ہوگا تاہم اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس کے پاس یادوں کا خزانہ اور بھاری بینک بیلنس تھا جس کے سہارے زندگی آرام سے گزاری جاسکتی تھی۔

وہ بس میں سوار ہوا لیکن اپنی نشست کے پاس جا کر رک گیا۔ کوئی شخص اس کی سیٹ پر بیٹھا گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اس کے بیگ کو دیکھ رہا تھا اور اس نے یونیفارم بھی پہن رکھی تھی۔ وہ کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ”ایکسکیوزمی!“

وہ شخص اسے دیکھتے ہی سیٹ سے کھڑا ہوگیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سوری! کیا یہ تمہاری سیٹ ہے؟“

”ہاں۔“ رینڈی نے جواب دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تاہم یونیفارم دیکھ کر اطمینان ہوگیا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے نہیں ہے بلکہ اس نے اپنے کام والی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ وہ غالباً کسی ڈیلیوری کمپنی میں کام کرتا تھا۔

”دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔“ وہ شخص معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”ڈرائیور کا کہنا تھا کہ بس میں سیٹیں بہت کم ہیں۔ میں نے یہ دو خالی دیکھیں تو......“

یہ کہہ کر وہ شخص اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اسٹیو ڈیلی۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی اسٹیو!“ رینڈی نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”مجھے رینڈی جاروس کہتے

ہیں۔"

"میرا ٹرک خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے اب مجھے بس کے ذریعے پالمر جانا پڑ رہا ہے۔"

"تم پالمر میں رہتے ہو؟" رینڈی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہماری کمپنی کا مانچسٹر سے باہر بھی ایک دفتر ہے لہٰذا میں صبح کام پر نکلتا ہوں اور دوپہر ڈھلنے تک پالمر واپس آجاتا ہوں۔"

اسٹیو نے رینڈی کے پیروں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا میں تمہارا بیگ دیکھ سکتا ہوں؟"

رینڈی کا دل دوبارہ زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "کیوں؟"

اسٹیو بولا۔ "میں نے اس پر کچھ پینٹ ہوا دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ گریناییٹ لیگ کا لوگو ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

رینڈی کی جان میں جان آئی۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک سمجھے۔ یہ گریناییٹ لیگ کا ہی نشان ہے۔"

"کیا تم اس ٹیم میں کھیل چکے ہو؟"

رینڈی پہلے تو ہچکچایا پھر کھڑکی کی طرف منہ پھیرتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔"

☆☆☆

رینڈی ناشتا کیے بغیر ہی بورڈنگ ہاؤس سے باہر چلا آیا۔ احاطے کی ایک جانب لکڑی کے سائبان کے نیچے اس کی پرانی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے سائیکل پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس پر سوار ہو کر میدان کی جانب چل دیا۔ وہ ایک گرم دن تھا اور بارش ہونے کی کوئی پیش گوئی نہیں تھی۔ اسے بائیسکل چلانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس عمر میں بائیسکل چلاتے ہوئے وہ خاصا احمق لگ رہا تھا لیکن اسے اپنے کھیل کے علاوہ کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا ہوا اس مقام تک پہنچا تھا اور پالمر ٹیم میں اس کی خاص اہمیت بن گئی تھی۔ وہ ایک اچھا ہٹر ضرور تھا لیکن گیند کو پچ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا اور اس کی پھینکی ہوئی گیندوں پر مخالف ٹیم کے کھلاڑی کو ہٹ لگانے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔

یہ اس موسم گرما کا آخری گیم تھا جو وہ پالمر اور گریناییٹ لیگ کے لیے کھیل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تماشائیوں میں میجر لیگ بیس بال کا نمائندہ بھی موجود ہوگا اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو اسے پالمر سے نکال کر میجر لیگ کھیلنے کے لیے کسی بڑی ٹیم میں شامل کر لیا جائے گا اور اس کے بعد یہ قصبہ اس کے لیے ایک بھولی ہوئی داستان بن کر رہ جائے گا۔

☆☆☆

ساتھی مسافر اس کی جان کو اٹک گیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بول اٹھا۔ "میرا مقصد تمہیں کریدنا نہیں ہے لیکن اس لوگو کو دیکھ کر میرا تجسس بڑھ گیا ہے۔ دراصل مجھے ہمیشہ سے چھوٹی ٹیموں سے دلچسپی رہی ہے جیسے اس زمانے میں گریناییٹ لیگ اور ٹن سیٹ لیگ وغیرہ ہوا کرتی تھیں۔"

رینڈی نے کھڑکی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "گریناییٹ کوئی چھوٹی ٹیم نہیں تھی۔"

"ایکسکیوزمی!" وہ شاید رینڈی کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

"گریناییٹ لیگ پیشہ ور کھلاڑیوں کی ٹیم نہیں تھی اور نہ ہی اس کا تعلق کسی بڑی لیگ سے تھا۔ یہ ایسے شوقیہ کھلاڑیوں کی ٹیم تھی جو بیس بال کھیلنا پسند کرتے ہیں۔"

"میں نے دو سال پہلے ایک نمائش میں پالمر لیگ کی ٹیم کے کھلاڑیوں کا گروپ فوٹو دیکھا تھا۔ یہ شاید 1940ء کے زمانے کی تصویر تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ پالمر کی ٹیم نے کب لیگ میں حصہ لینا چھوڑا؟"

"نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

اسٹیو کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور یوں لگا جیسے اس کے دماغ میں کوئی بلب روشن ہو گیا ہے۔ وہ چہکتے ہوئے بولا۔ "ضرور تمہارا تعلق پالمر سے ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

رینڈی کے پاس تردید کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "ہاں، تم ٹھیک سمجھے ہو۔"

"تم وہاں اپنی فیملی سے ملنے جا رہے ہو یا دوستوں سے؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"نہیں، بس یونہی گھومنے کی غرض سے جا رہا ہوں۔" وہ اسٹیو سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔

☆☆☆

وہ کھیل کے میدان میں پہنچا جو دریا کے قریب ایک وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سائیکل ایک درخت کے تنے سے ٹکائی اور پرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی بھی وہاں پہنچ چکے تھے

اور پریکٹس میں مصروف تھے۔ وہ انہیں زیادہ منہ نہیں لگاتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ سب اس سے جلتے ہیں لیکن وہ مجبور تھے کیونکہ وہ ٹیم کی ضرورت بن چکا تھا اور اس کی بدولت ان کی ٹیم گزشتہ تین سال سے کوئی میچ نہیں ہاری تھی۔ پوری ٹیم میں اس سے اچھا گیند پھینکنے والا کوئی نہ تھا۔

اس نے ایک نظر اسٹینڈ پر ڈالی۔ وہاں کھلاڑیوں کے والدین اور دوست بھی موجود تھے۔ اسے تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس کا باپ ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا اور ماں نے شراب کی بوتل کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب اس کے باپ کا انتقال ہوا اور سولہ سال کی عمر میں ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ مایوسی سے اسٹینڈ کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ہاں...... وہ وہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ سینڈی گرسم نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جواب میں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ ان کی ملاقاتیں گزشتہ آٹھ ماہ سے جاری تھیں۔ سینڈی مقامی مل کے منیجر فرینک گرسم کی بیٹی تھی اور صرف دو روز پہلے ہی ان کے درمیان عہد و پیمان ہوئے تھے اور ان میں سے ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ مناسب وقت آنے پر وہ سینڈی کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا اور وہ دونوں شادی کر لیں گے کیونکہ یہاں رہتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر سینڈی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا پھر اسے رکنا پڑا کیونکہ تماشائیوں کے اسٹینڈ میں ایک عمر رسیدہ شخص داخل ہو رہا تھا جو قصبے کے لوگوں کے لیے اجنبی لیکن اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے اسے کھیل کا میدان واضح طور پر نظر آ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی نوٹ بک تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سا شخص معلوم ہو رہا تھا جو پالرل اور امریکن لیگیون ہال کا میچ دیکھنے آیا ہو لیکن وہ ایک اسکاؤٹ تھا اور چھوٹی ٹیموں سے اچھے کھلاڑی تلاش کر کے بڑی ٹیموں کو دیا کرتا تھا۔ دو ہفتے پہلے وہ بورڈنگ ہاؤس کے باہر رکا تھا لیکن اس نے اندر آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے رینڈی کے ایک میچ کے بارے میں سن رکھا تھا جس میں اس نے آٹھ کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا اور صرف ایک کھلاڑی اس کی گیند پر ہٹ لگا سکا۔ چنانچہ فلیرٹی نامی اس شخص نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رینڈی کا کھیل دیکھنے کے لیے دو ہفتے بعد ضرور آئے گا۔

رینڈی نے اس پر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے جو اچھے کھلاڑیوں کی تلاش میں قصبوں، محلوں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے بالکل اس کان کن کی طرح جو کیچڑ اور ریت میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈھونڈتا ہے۔ کئی گھنٹوں کی ڈرائیونگ، نامناسب خوراک، چھوٹے ہوٹلوں میں قیام، یہ بھی کیا زندگی ہے لیکن نیا ٹیلنٹ مل جانے پر اسے بھی اتنی خوشی ہوتی ہوگی جتنی کہ کان کن کو سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا ملنے پر۔ وہ اپنے آپ کو اسی سونے کے ٹکڑے کے مانند تصور کر رہا تھا۔

اچانک اس کے عقب سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''ہے رینڈی...... ہمیں تھوڑی سی پریکٹس کر لینی چاہیے۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ امپائر ٹام گرسم تھا۔ اس کی گرل فرینڈ کا بڑا بھائی جو ٹیلے پر کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ رینڈی نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا اور ٹیلے کی جانب بڑھنے لگا۔ کھیل بس شروع ہی ہونے والا تھا۔

☆☆☆

مسافر ساتھی نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''سچ سچ بتاؤ، تم گریٹ ایسٹ لیگ میں کھیلتے تھے نا؟''

رینڈی خاموش رہا۔

''ورنہ تم یہ بیگ کیوں اٹھائے پھر رہے ہو۔ تم ضرور اس ٹیم کے لیے کھیلتے ہو گے۔''

''ہاں۔'' اس نے بالآخر اعتراف کر ہی لیا۔ ''میں گریٹ ایسٹ لیگ میں تھا۔''

وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یقیناً ماضی کی کوئی یاد تمہیں وہاں لے جا رہی ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

☆☆☆

میچ دیکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان میں دونوں ٹیموں کے حمایتی شامل تھے۔ رینڈی نے اسٹینڈ کی جانب دیکھا۔ امریکن لیگیون کی جانب سے پہلا کھلاڑی ہٹنگ کے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کو جوتے کی نوک سے صاف کیا۔ نگاہ اپنے فیلڈر فورنیئر پر ڈالی جو گزشتہ پانچ سال سے کیچر کے طور پر کھیل رہا تھا اور پہلی گیند پھینکنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گیند پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو مخصوص انداز میں گھمایا اور گیند کو اپنے نشانے پر پھینک دیا۔ اس نے اپنی طرف سے بہترین کوشش کی تھی

لیکن ٹام گرسم زور سے چلایا۔ ”بال!“

اس نے بے یقینی کے عالم میں ٹام کی طرف دیکھا اور دوبارہ گیند پھینکی۔ یہ کوشش پہلے سے بھی بہتر تھی۔

”بال!“ ٹام ایک بار پھر چلایا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹام کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اس سے پہلے کئی بار ٹام کے سامنے گیند کرائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گیند کو کہاں پھینکنا ہے۔ اس کے بعد اس نے تین گیندیں اور پھینکیں۔ جن میں سے ایک پر ہٹ لگی اور کھلاڑی رن لینے میں کامیاب ہو گیا جس پر اس کے حامیوں نے دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ رینڈی نے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پہلی اننگ ختم ہو گئی اور وہ کسی کو آؤٹ نہ کر سکا۔ وہ فیلڈ سے باہر آیا اور سیدھا ٹام گرسم کے پاس چلا گیا۔

”ٹام! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

ٹام نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو، تم کیا کر رہے ہو؟“

”تم جانتے ہو کہ میں کیسی گیند پھینکتا ہوں۔ وہ گیندیں بالکل نشانے پر تھیں جنہیں تم نے بال قرار دے دیا۔“

”میں اس میچ کا امپائر ہوں اور ابھی یہ پہلی اننگ چل رہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم بینچ پر جا کر بیٹھو اور اپنی باری کا انتظار کرو۔“

اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کا دل باہر آ جائے گا۔ اس نے مضبوطی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

پالمر کی حدود میں داخل ہوتے ہی بس کی رفتار سست ہو گئی اور وہ سڑکوں پر بھیڑ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ مرکزی شاہراہ پر بے فکری سے سائیکل چلاتا تھا اور اسے کسی کار سے ٹکرا جانے کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اسے ہر جانب گاڑیاں، دکانیں اور نئے نئے گھر نظر آ رہے تھے۔ وہ باہر کا نظارہ کرنے میں اتنا محو تھا کہ اسٹیو کی پوری بات نہیں سن سکا جو کہہ رہا تھا۔

”اس زمانے میں اسکاوٴٹس کا طریقہ کار بھی مختلف ہوگا؟“

”ہاں۔“ رینڈی نے جواب دیا۔ ”اس وقت انٹرنیٹ، ویب سائٹ اور ای میل کا رواج نہیں تھا۔ اس

”شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات“

☆ دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس ایک گوشے کو ویران کر دیتی ہیں جو کسی ایک انسان کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

☆ محبت کو آزاد چھوڑ کر اپنا بنائے رکھنے کے قابل بن جائیں۔ زنجیروں میں بندھا شخص مجبور ہے یا واقعی آپ کا اپنا، کیسے پتا چل سکتا ہے۔

☆ جھنجلاہٹ کا سب سے موٴثر علاج ایک دوست ہوتا ہے جس پر چیخنے چلانے کے بعد آپ اس کی گود میں سر رکھ کر ڈھیر سارا رو سکیں۔

مرسلہ: اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

لیے اسکاوٴٹس کے پاس دور دراز کے کھلاڑیوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوتی تھیں۔ وہ خود مختلف علاقوں میں جا کر کھلاڑیوں کو دیکھتے اور وہی کھلاڑی ان کی نظروں میں آ سکتا تھا جو اس روز اپنا کھیل دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔ گویا اس کھلاڑی کے پاس ایک ہی موقع ہوتا تھا۔“

☆☆☆

یہ موقع اس نے گنوا دیا تھا۔

دوسری اننگ بھی اچھی ثابت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی گیندیں صحیح جگہ پڑ رہی ہیں۔ اس کے باوجود ٹام انہیں فاؤل قرار دے رہا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس اننگ میں کوئی رن نہیں بنا اور تین کھلاڑی کیچ آؤٹ ہو گئے لیکن آخری کھلاڑی کے آنے تک اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور اس کا اعتماد برف کی ڈلی کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔

اب ان کی ٹیم کی باری تھی۔ وہ اپنا بلا پکڑے باہر آیا۔ ٹام اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔ مخالف ٹیم کا باؤلر گیند ہاتھ میں پکڑے اننگ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا پھر ٹام نے آواز لگائی۔ ”اسٹرائیک!“

رینڈی آگے بڑھا تو ٹام نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنی جگہ پر رہو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“

اس نے بلے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ لیا اور انتظار کرنے لگا۔ ٹام ہنستے ہوئے بولا۔ ”آج کا دن تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ اسکاوٴٹ بھی تمہارا کھیل دیکھ رہا ہوگا۔“

رینڈی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”ٹام ...... پلیز۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، مجھے تمہارے اور اپنی بہن کے تعلقات کا علم نہیں۔ جانتا ہوں کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے کہ تم اب بڑی لیگ میں کھیلنے جا رہے ہو اور اس سے شادی کر لو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں اور ڈیڈی تمہیں اس کی اجازت دے دیں گے۔“

امریکن لیگیون کا کھلاڑی گیند پھینکنے کے لیے تیار تھا۔ ٹام تھوڑا سا جھکا اور آواز نیچی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میری بہن سے شادی کر کے اسے اپنے گھر والوں سے دور لے جاؤ گے۔ تم ایسا کر سکتے ہو جبکہ میں یہاں موجود ہوں اور اس کھیل کو سپروائز کر رہا ہوں۔“

باؤلر نے اس کی جانب گیند پھینکی۔ اس نے زور سے بلا گھمایا۔ گیند ہوا میں بلند ہوئی اور ایک کھلاڑی نے اسے کیچ کر لیا۔ وہ مڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ٹام کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ دیکھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری باری ختم ہوئی۔ اب باہر آ جاؤ۔“

رینڈی اپنی بینچ پر چلا گیا اور بلا پھینک کر اس نے اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ اسکاؤٹ جا چکا تھا۔

☆☆☆

بس منزل مقصود پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ اسٹیو نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”تمہارے ساتھ باتیں کر کے اچھا وقت گزرا۔“

”مجھے بھی تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ رینڈی تکلفاً بولا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلنے ہی والا تھا کہ اسٹیو نے کہا۔

”ایک بات تو میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ اس لڑکے کا کیا بنا، جس کا کھیل دیکھنے وہ اسکاؤٹ آیا تھا؟“

”اس کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ دوسرے روز ہی قصبے سے چلا گیا اور پھر کبھی بیس بال نہیں کھیلی۔“

☆☆☆

اس رات رینڈی اپنے کمرے میں بیٹھا ماں کی طرح بے تحاشا ڈرنک کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ماں کی طرح شراب پی کر موت کو گلے لگا لے۔ اب اس کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹام کی وجہ سے اس کا کیریئر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا لیکن ٹام گرسم کے کہے ہوئے لفظ اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے جنہیں وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ اس لیے ستانے کے لیے قریبی پارک کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا جو ٹام گرسم کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں جیسے اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑا ہو۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ یہاں نہ آتا اگر اس نے گزشتہ دنوں ٹی وی پر بیس بال کے اس کھلاڑی کی کہانی نہ سنی ہوتی جو ساٹھ کی دہائی کے شروع میں منظر عام پر آیا اور ایک شاندار کیریئر بنانے کے بعد اب وہ فلوریڈا میں آرام دہ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ 1958ء میں پنسلوانیا کے ایک چھوٹے سے قصبے سے دریافت ہوا تھا۔

1958ء سے تو اس کی بھی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس کے اندر سے ایک آواز آئی۔ ”اس شو میں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس روز وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم میچ کھیل رہا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، اگر وہ نہ ہوتا تو وہ میچ اس کی قسمت بدل سکتا تھا۔ شہرت اور دولت اس کے قدموں میں ہوتی اور وہ سینڈی گرسم کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوتا لیکن اس کے بجائے کیا ہوا۔

اس نے صبح ہوتے ہی بس پکڑی اور پالمر سے نکل آیا۔ اپنے سب خواب وہیں چھوڑ کر کبھی نہ واپس آنے کے لیے وہ نیویارک اسٹیٹ چلا گیا۔ ایک کے بعد دوسری ملازمت کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے اکاؤنٹس میں ڈگری حاصل کر لی اور مختلف کمپنیوں کے لیے کام کرتا رہا۔ اس نے ایک عورت سے شادی بھی کی جس نے پندرہ سال کی ازدواجی زندگی میں اسے پریشانیوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی پالمر سے کوئی خبر آ جاتی۔ سینڈی شادی کر کے کیلی فورنیا چلی گئی تھی۔ ٹام نے باپ کے مرنے کے بعد ٹی وی اور ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس روز ٹی وی پر وہ شو دیکھ کر اسے اچانک ہی ٹام کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ پہلے سے زیادہ موٹا اور خوش ہوگا۔ چھوٹے سے قصبے میں چھوٹے ذہن کے ساتھ محدود زندگی گزار رہا ہوگا۔ ٹام کا خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ اب پالمر واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔

اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ سڑک پار کی اور ٹام کے گھر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

ایک مہینا پہلے وہ ٹی وی شو دیکھنے کے بعد اس نے پالمر جانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس نے اپنا پرانا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکال کر صاف کیا جو اس نے کئی سال پہلے اس وقت خریدا تھا جب وہ ایک کمپنی میں تنخواہوں کی ادائیگی پر مامور تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ایک بار پالمر جا کر پرانا حساب ضرور چکائے گا۔ اس نے انٹرنیٹ سے ٹام کا فون نمبر معلوم کیا اور پبلک آفس سے اسے فون کرنے چلا گیا۔ وہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

رینڈی نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''کیا یہ ٹام گرسم کا نمبر ہے؟''

''ہاں۔'' وہ عورت بولی۔ ''لیکن وہ اس وقت فون پر نہیں آسکتا۔ اگر کوئی پیغام ہو تو بتا دو۔''

''یقیناً!'' اس نے دل میں سوچا۔ ''اس کے لیے پیغام یہ ہے کہ کئی سال پہلے اس نے مجھے برباد کیا تھا۔ امپائر ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے خلاف فیصلے دیے اور میری زندگی تباہ کر دی۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے اور میں ہمیشہ کے لیے بیس بال سے دور ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی بہن کو مجھ سے بچانا چاہتا تھا اور اس کی خاطر اس نے میری زندگی برباد کر دی۔''

لیکن وہ یہ سب زبان سے نہ کہہ سکا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولا۔ ''نہیں، کوئی پیغام نہیں ہے۔''

☆☆☆

اب وہ پورچ میں پہنچ چکا تھا اور ایک بہت ہی عمدہ مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹل کی فروخت سے ٹام کے ہاتھ اچھی خاصی رقم آئی تھی۔ تبھی تو وہ اتنے اچھے علاقے میں یہ مکان خریدنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹام نے ان برسوں میں کیسی زندگی گزاری ہوگی۔ خوب دولت کمائی ہوگی اور ٹھاٹ سے اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہا ہوگا۔ شاید ہی اسے کبھی 1958ء کی اس رات کا خیال آیا ہو جب اس کے غلط اور بے رحمانہ فیصلوں نے رینڈی کو دربدر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ اس طاقت کا کمال تھا جو امپائر ہونے کی حیثیت میں اسے حاصل تھی تو گویا اس دنیا میں طاقت ہی سب کچھ ہے۔

اس نے چمڑے کے بیگ کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور ڈور بیل بجادی۔

پرورش

ایک بوڑھا اپنے پوتے کو اس جنگ کے بارے میں بتانے لگا جو انسان کے اندر جاری رہتی ہے۔

وہ بولا۔ ''میرے بیٹے! یہ جنگ ہم سب کے اندر دو بھیڑیوں کے مانند ہے۔ ایک بھیڑیا برا ہے۔ یہ غصہ، حسد، بدگمانی، غم، پچھتاوا، لالچ، نخوت، گناہ، تکبر اور انا ہے۔

دوسرا بھیڑیا اچھا ہے۔ یہ خوشی، امن، محبت، طمانیت، عاجزی، سخاوت، سچائی اور یقین ہے۔

پوتے نے ایک ثانیے کے لیے توقف کیا پوچھا۔ ''دادا جان! کون سا بھیڑیا جیتتا ہے؟''

بوڑھے دادا نے سادگی سے جواب دیا۔

''جسے تم خوراک مہیا کرتے ہو۔''

مرسلہ۔ اظہر حسین بہار، ہزاری، جتوئی

انتظار کے دوران رینڈی نے آنے والے لمحات کا تصور کیا۔ یقیناً ٹام اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ پہلی نظر میں وہ اسے نہ پہچان سکے۔ ایسی صورت میں اسے اپنا تعارف کروانا ہوگا پھر ٹام اسے لیونگ روم میں لے جائے گا اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جائیں گے۔ چمڑے کا بیگ رینڈی کے زانوؤں پر رکھا ہوگا پھر باتوں باتوں میں وہ ٹام کو اپنی پرانی یونیفارم اور دستانے دکھائے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ بیس بال سے کتنی محبت کرتا تھا اور کس طرح ٹام نے اس کی زندگی سے اس کھیل کو نکال دیا۔ پچاس سال ہو گئے۔ اس نے گیند کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ٹام یہ سب کچھ سن کر نروس اور خوف زدہ ہو جائے گا اور جب اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگیں گے تو رینڈی اپنا ریوالور نکال کر اس کے سر کو نشانہ بنائے گا۔

اس نے دوبارہ ڈور بیل بجائی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر ایک بے جان سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو رینڈی ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''مجھے ٹام گرسم سے ملنا تھا۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟''
اس نے سر ہلایا اور بولی۔ ''کیا تم اس سے ملنا پسند کرو گے؟''

رینڈی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور دونوں ہاتھ پسینے سے بھیگ گئے۔ یہ سب کچھ اس کے پلان میں شامل نہیں تھا لیکن اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں۔''

اس عورت نے پورا دروازہ کھول دیا اور بولی۔ ''اندر آجاؤ۔ میرا نام ایولین ہے اور میں ٹام کی بیوی ہوں۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا نام رینڈی ہے...... رینڈی جاروس۔''

لیونگ روم کافی بڑا تھا جس میں دو کاؤچ، ایک پرانے ماڈل کا ٹی وی اور کتابوں سے بھرا شیلف رکھا ہوا تھا۔ کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا کہ یہ لیونگ روم، بورڈنگ کے اس کمرے کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں پرانی فلم چلنے لگی۔ اس نے بیگ کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی۔ جب ٹام کمرے میں داخل ہوگا تو مصافحہ کرنے کے بعد وہ کہے گا کہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر ایولین کمرے سے باہر چلی جائے گی اور وہ اپنا کام شروع کردے گا۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے گولی مار کر چل دے گا۔ ممکن ہے کہ بچ جائے یا پکڑا جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے یہاں آنے کا مقصد اس امپائر کو مارنا تھا جس نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔ ایولین کی آواز اسے اپنے بہت قریب سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔

''ٹام! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ وہ اپنا نام رینڈی جاروس بتا رہا ہے۔''

رینڈی نے اس آواز کی سمت میں دیکھا۔ ٹام گرسم اس کے سامنے تھا۔ اسے وہیل چیئر میں دیکھ کر رینڈی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کا دیرینہ دشمن صرف چھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ رینڈی کے ہاتھوں کی گرفت بیگ کے ہینڈل پر اور بھی مضبوط ہوگئی۔

اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے جوڑ اور پٹھے کافی عرصے قبل ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ اس کے نتھنوں میں آکسیجن کی ٹیوب لگی ہوئی تھی اور چہرے پر سفید اور بھورے نشان پڑ گئے تھے۔ وہیل چیئر کے ہینڈل کے ساتھ ہی پیشاب کی بوتل لگی ہوئی تھی۔

ایولین مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے آنے کی بہت خوشی ہوئی کیونکہ ٹام سے ملنے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔''

''اوہ۔'' رینڈی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ایکسیڈنٹ کس طرح ہوا تھا؟''

ایولین نے وہیل چیئر کے ہینڈل پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''بیس سال پہلے کی بات ہے۔ نشے میں دھت ڈرائیور نے اسے ٹکر ماردی۔ اس وقت سے اس کا علاج ہو رہا ہے لیکن اس کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جاتی رہی ہے اور اب یہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ گوکہ بول نہیں سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ اب بھی اس میں سننے کی صلاحیت باقی ہے اور جانتا ہے کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔''

رینڈی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔

ایولین کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''تم اس سے باتیں کرو، میں چائے بناتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ٹام ایک نئی آواز سن کر خوش ہوگا۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور کمرے میں صرف وہ دونوں ہی رہ گئے۔

☆☆☆

رینڈی نے اس کے خمیدہ جسم اور سوجے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پرانے زخم ہرے ہونے لگے۔ وہ ایک بار پھر 1958ء میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے وہ دشمن بیٹھا تھا جس نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔ تاہم رینڈی نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور پرسکون لہجے میں بولا۔ ''ہیلو ٹام!''

ٹام کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

''یاد کرو، میں رینڈی جاروس ہوں۔ تمہیں 1958ء کی وہ صبح تو یاد ہوگی جب بیس بال کے میچ میں تم نے میرے خلاف فیصلے دیے اور میرے لیے بڑی ٹیم میں کھیلنے کا موقع ضائع کردیا کیونکہ تم نہیں چاہتے تھے کہ میں تمہاری بہن سے شادی کروں۔''

ٹام مسلسل اسے دیکھے جارہا تھا۔

رینڈی نے اپنا بیگ کھول کر دستانہ باہر نکالا۔ اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پہن کر پھر اتار کر واپس بیگ میں رکھ دیا۔ اس کے بعد بیس بال کی یونیفارم نکالی اور ٹام کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

''اب تو تمہیں سب یاد آ گیا ہوگا۔ تم اس میچ میں امپائر تھے۔ جس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تم نے میرے خلاف فیصلے دیے اور میرا کیریئر تباہ کر دیا۔''

یہ کہہ کر اس نے یونیفارم بیگ میں رکھ دی۔ اب اس کا ہاتھ ریوالور پر تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''جانتے ہو کہ تم نے مجھ پر کتنا ظلم کیا۔ مجھے بیس بال سے عشق تھا۔ تم نے مجھ سے میری دونوں محبتیں چھین لیں۔ تمہاری بہن کو تو میں بھول سکتا ہوں لیکن بیس بال سے دوری کی خلش آج بھی میرے دل میں پھانس کی طرح چبھتی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا ٹام۔''

اس نے ٹام کے ڈھلکے ہوئے جسم، سپاٹ چہرے، پتلی پتلی ٹانگوں اور بازوؤں پر ڈالی، پیشاب کی تھیلی، آکسیجن کی ٹیوب، اس کے خواب، غصہ اور جوش انتقام سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ رینڈی نے ایک گہرا سانس لیا اور بیگ سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔

ایولین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چائے......''

رینڈی نے اپنا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''واقعی مجھے اس کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دریا کے کنارے تک پہنچا اور بیگ سے ریوالور نکال کر دریا میں پھینک دیا۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا پارک کی جانب آیا جہاں کچھ فاصلے پر بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور بیگ اپنے پیروں کے پاس رکھ لیا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے اپنے دشمن سے انتقام لینے اور اسے مارنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ تقدیر پہلے ہی اپنا وار کر چکی ہے۔ ٹام اب ایک زندہ لاش کے مانند تھا اور لاشوں پر گولی نہیں چلائی جاتی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ جس سے انتقام لینے آیا تھا، وہ پہلے ہی قدرت کے انتقام کا نشانہ بن چکا تھا۔ بس بہت ہو چکا، اب نیویارک واپس چلا جائے اور بقیہ عمر یادوں کے سہارے گزار دے۔

''ہائے رینڈی۔''

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی شخص میدان کے کنارے پر کھڑا اسے پکار رہا تھا۔ اس نے رینڈی کی جانب کوئی چیز پھینکی۔ رینڈی کا بایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ وہ بیس بال کی گیند تھی۔ اسٹیو اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ لائبریری کے پرانے ریکارڈ سے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی تھے اور تم سے اچھا گیند پھینکنے والا کوئی نہ تھا۔''

رینڈی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ اسٹیو یہ آنسو نہ دیکھ سکے لیکن وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔''

رینڈی نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا۔ ''بولو۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا بیٹا بیس بال کا شوقین ہے اور بچوں کی ٹیم میں کھیلتا ہے۔ اس سال انہیں لیگ کھیلنی ہے جس کی وہ تیاری کر رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی ایسا کھلاڑی نہیں جو گیند کو صحیح طریقے سے پچ کر سکے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم انہیں اس بارے میں کچھ مشورے دے سکو؟''

رینڈی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے بیس بال چھوڑے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کھیل تو وہی ہے۔ اس کے اصول، قاعدے اور طریقے تو نہیں بدلے۔''

رینڈی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بال کا معائنہ کیا۔ واقعی کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہی چمڑا، وہی سلائی، وہی شیپ...... اتنے سالوں بعد گیند پکڑنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔''

اسٹیو کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''گویا تم تیار ہو؟''

رینڈی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گیند اور دوسرے ہاتھ میں گرینائیٹ لیگ کا بیگ تھا۔ اس نے مضبوط آواز میں کہا۔ ''ہاں، میں تیار ہوں۔''

اسے یوں لگا کہ بیس بال سے اس کی محبت زندہ ہو گئی ہے جو نہ جانے کب سے اس کے دل کے کسی چور خانے میں چھپی ہوئی تھی اور موقع ملتے ہی باہر آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسٹیو کی طرف دیکھا اور میدان کی جانب بڑھ گیا۔

محفلِ شعر و سخن

❋ مدحت.....کراچی
آئے گی میرے جسم سے اخلاص کی خوشبو
میں پھول ہوں اور پیار کی ٹہنی پہ سجا ہوں

❋ ایم عمران قاسم.....سبل تحصیل کلر سیدال
کئی بار طوفان سے ٹکرائی کشتی
کئی بار ٹکرا کے ساحل آئے
تلاشِ طلب میں وہ لذت ملی ہے
دعا کر رہا ہوں کہ منزل نہ آئے

❋ محمد زریان سلطان.....اردو بازار، کراچی
دل ہنس کر ہر دکھ سہہ لے گا، بس شرط تمہارا ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ

❋ ریاض بٹ.....حسن ابدال
دیوانہ وار آپ کا ملنا وہ بار بار
تھا وقت سازگار ابھی کل کی بات ہے
حالات دوستوں سے بہت دور لے گئے
لاکھوں تھے غمگسار ابھی کل کی بات ہے

جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
مانا کہ بہت قیمتی ہے وقت تیرا لیکن
ہم بھی نایاب تھے گزرے دنوں کی بات ہے

❋ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
شفاف ہو گئیں سبھی اونچی حویلیاں
اک جھونپڑی کی چھت نہ رہی بارشوں کے بعد

❋ نوید احسن رانجھا.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہر ایک پاؤں مجھے روند کے گزرا دوست
جانے کون سی منزل کا راستہ ہوں میں

❋ عابد سعید.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو بچھڑے تو کبھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ.....خانیوال
ہری منزلیں میرے راستے
ہری ہر دعا تیرے واسطے

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد حنیف آصف.....بھکر
بدلہ وفا کا بڑی سادگی سے دیں گے ہم
تم ہم سے روٹھ جاؤ گے اور زندگی سے ہم

❋ توقیر عباس رجوکہ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
سب اس پہ متفق تھے کہ مجھ سے عناد تھا
یارو! بات بات میں ورنہ تضاد تھا
سب کی الگ زبان تھی لہجے الگ الگ
کتنا مخالفت میں مگر اتحاد تھا

❋ اظہر حسین پچار.....ہزاری، جتوئی
مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں
کبھی جینا مجھ کو عزیز تھا، یہ بجا سہی مگر اب نہیں

❋ چودھری علی رضا گوندل.....کمالیے شوگر ملز
ان لمحوں کی یادیں سنبھال کر رکھنا
ہم یاد تو آئیں گے لیکن لوٹ کر نہیں

❋ مرزا طاہر الدین بیگ.....میرپور خاص
ملے ہیں زخم محبت میں اس قدر ہم کو
اداس اتنے ہوئے مرہموں کو بھول گئے
بہت قریب سے گزرے ہیں وحشت کے جھونکے
ہوائے صبح کی ہم لذتوں کو بھول گئے

❋ اعجاز احمد راحیل، ماہی.....ساہیوال
دل ڈھونڈتا تھا رنجشوں کے مختلف جواز
دل کو ہی پھر ملال ہوا فاصلوں کے بعد
منصف! تری عدالتوں کی شہرتیں بجا
پر میں اجڑ گیا ہوں ترے فیصلوں کے بعد

❋ آمنہ رشید سیال.....روہڑی، ضلع سکھر
افق کے اس پار نہ جانے کیا طلسم ہے
لوٹے نہیں زمیں پہ اک بار جو گئے

❋ بلقیس خان.....واہ کینٹ
ہوائیں، رنگ، خوشبو، پھول، تتلی سب منافق ہیں
درودیوار بھی سہمے ہوئے ہیں اپنے مکینوں سے
زمیں پہ پاؤں جن کے خوف سے ہم رکھ نہیں سکتے
وہ ایسے سانپ نکلے ہیں ہماری آستینوں سے

❋ جاوید اختر رانا.....حیدرآباد
تیرا سلوک مجھے روز زخم تازہ دے
کسی کو چپکے محبت میں مات ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی مانگنے نہیں آیا
کسی غریب کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

❋ حسن معاویہ، حسین معاویہ، احسن معاویہ.....بھکر
اندھیرے اور بڑھ گئے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

❋ البیلی.....کراچی
روپ تو اس کو ایسا دیتے، دیکھتی ہی رہ جاتی دنیا
ہم بت سازی چھوڑ چکے تھے، جب وہ پتھر موم ہوا

❋ رضوان تنولی کریڑوی.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
عبادت کے لیے جب جسم اطہر رقص کرتا ہے
جبین عشق جھکتی ہے تو منبر رقص کرتا ہے

❋ طالب حسین طلحہ.....نیو سینٹرل جیل ملتان
طلوعِ شمس و قمر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں
ہر اک شام و سحر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں
خدا کی کتاب تو، ہے میرا سارا نصاب تو ہے
حصولِ علم و ہنر سے پہلے میں تجھ پر آقا درود بھیجوں

❋ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.....گھاتاں
تجھے کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجا ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں

❋ راشد حبیب تابش.....ضلع اٹک، چھب
میرے عدو بھی میرے قتل پر پریشان تھے
کہ اتنی شان سے میت کوئی اٹھی کب تھی
جمالِ یار سے شوکت کشید ہوتی ہے
ہمارے بس میں وگرنہ سخن دری کب تھی

❋ محمد شہباز اکبر الفت.....ڈھپئی، پاکپتن شریف
جن کی صداقتوں پہ کوئی شک نہ کر سکے دلنشیں
تم بھی کتابِ دل کی انہی آیتوں میں ہو

❋ سعید عباسی.....بہاولپور
مجھے پتا تھا کہ لوگ بدل جاتے ہیں دوست
مگر میں نے کبھی تجھے لوگوں میں گنا ہی نہیں تھا

❋ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی
چاندنی رات کا مزاج نہ پوچھ
ہم غریبوں کے گھر نہیں آتی

❋ ناصر علی صدیقی.....عباسیہ ٹاؤن، رحیم یار خان
اب تو وہ بھی عشق کے مارے نظر آنے لگے
ان کی بھی نیندیں اڑیں تارے نظر آنے لگے
آنکھ ویراں دل پریشاں زلف برہم لب خاموش
اب تو وہ کچھ اور بھی پیارے نظر آنے لگے

❋ مونا رضوان.....کورنگی کراچی
جب بھی انسانوں کو پرکھا، مجھ کو یہ احساس ہوا
تن من ان کا زہر بھرا ہے ناگن میں کیا رکھا ہے

❋ نوشاد علی.....فیصل آباد
دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

❋ عاصم اقبال جسپال ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

وفا میں ہر ستم سہہ لے وفا کی شرط ہے اول
نگاہوں سے صدا دینا حیا کی شرط ہے اول
تیرے میخانے میں ساقی عجب دستور دیکھا ہے
تیرا اک جام پینے میں وفا کی شرط ہے اول

❋ محمد اشفاق سیال ..... شورکوٹ سٹی

غنچۂ شوق لگا ہے کھلنے
پھر تجھے یاد کیا ہے دل نے

❋ عبدالجبار رومی انصاری ..... لاہور

زندگی مہک جائے صبح نوخیز کی صورت
آئینہ کی سی شفاف ہوائے صاحب تیری مورت
ہر آن مسکراہٹ تیرے چہرے پہ سجی ہو
نہ ہو کوئی غم، نہ دل میں رہے کوئی کدورت

❋ فرحان شیخ ..... سیالکوٹ

حیرت والی کوئی بات نہیں تو پھر
کیوں اتنی حیرانی بڑھتی جاتی ہے
باہر برف میں لپٹا ایک نیا موسم
اندر آگ پرانی بڑھتی جاتی ہے

❋ احمد حسن عرضی خان ..... قبولہ شریف بائی پاس

پھر آئیں نہ آنکھیں تو اک بات کہوں
اب تم سے بچھڑنے کا امکان بہت ہے

❋ محمد قدرت اللہ نیازی ..... حکیم ٹاؤن، خانیوال

بند مٹھی سے گرتی ریت کے مانند
وہ نکل گیا زندگی سے، ذرا ذرا کرکے

❋ کمال انور ..... کراچی

اب کسی اور کو چاہوں تو شکایت کیسی؟
تم جو بچھڑے ہو محبت میری عادت کرکے

❋ عبدالرحمٰن ..... میرپور

سر منبر وہ خوابوں کے محل تعمیر کرتے ہیں
علاجِ غم نہیں کرتے فقط تقریر کرتے ہیں

❋ رضیہ عمیر ..... کراچی

دل اگر بے نقاب ہوتے
سوچو کتنے فساد ہوتے

❋ ایم اے فاضل فریدی ..... لاہور

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

❋ رائے طیب اکرم بھٹی ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

نہ خلش جدائی کی ختم ہو نہ حیات گزرے قرار سے
میں خزاں رسیدہ ہوں دوستو مجھے غرض کیا ہے بہار سے

❋ وسیم احمد ..... میانوالی

چمن والو! خدا حافظ قفس کو لے چلی گردش
چمن میں گر اندھیرا ہو تو گھر میرا جلا لینا

❋ زوہیب احمد ملک ..... گلستان جوہر، کراچی

عشق تو ہو ہی چکا تھا غرق طوفانِ حیات
حسن بھی موجِ غم ہستی میں ڈوبا جائے ہے

❋ سید محمود علی ..... حیدرآباد

میری آنکھوں سے جھلکتا ہے میری روح کا درد
میرے چہرے پہ میرے گھر کی سی ویرانی ہے

❋ شازیہ کمال ..... کراچی

جلائے بیٹھے ہیں ہم اس جگر لہو کے دیے
جہاں سحر بھی اترتی ہے روشنی کے لیے

❋ جبران احمد ملک ..... گلشن اقبال، کراچی

اسی خیال سے آنکھیں تمام رات جلیں
میں جاگتا ہوں اسے نیند آگئی ہوگی

❋ فیصل علی ..... بہاولپور

دکھائی کچھ نہیں دیتا نگاہ ہوتے ہوئے
بچا ہوا ہے وہ قاتل گواہ ہوتے ہوئے

❋ اطہر حسین ..... کراچی

میں تری یاد کے زنداں میں ابھی تک ہوں اسیر
کب تو آزاد کرانے یہ غلام آئے گا

منتقم مزاج

دانش علی

دامِ فریب آسان تو ہے لیکن اسے آخری لمحات تک نبھانے والے بہت بڑے فنکار ہوتے ہیں... اس نے بھی اپنا کردار بڑی خوبی سے ادا تو کیا مگر ایک کسک کسی کے دل کو بے چین بھی کرگئی تھی کیونکہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے ہمیشہ خسارے کا سودا کرتے ہیں اور یہ بات انہیں ہمیشہ آخر میں سمجھ آتی ہے۔

ذاتیات میں دخل اندازی کرنے والے ایک بلیک میلر کی چالبازی

مارکس ہنری اس وقت ہالی وڈ کے ایک طویل و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے خوبصورت، سرسبز اور پُررونق سوکس پارک کی نم آلود گھاس پر چت لیٹا ہوا تھا۔ سوکس پارک کا نسبتاً کچھ کم پُررونق اور تاریک گوشہ تھا۔ مارکس کی نظریں مسلسل پارک کے مین گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں سے اس کے شکار نے پارک میں داخل ہونا تھا، کچھ دیر بعد ہی اس کا مطلوبہ شخص پارک میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ مارکس اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا لیکن وہ مارکس کی شکل

سے ناواقف تھا۔ جونہی اس نے مارکس کی طرف دیکھا مارکس نے اسے مخصوص انداز میں اشارہ کر دیا۔ آنے والا شخص مارکس کے قریب آکر رک گیا۔

"رقم لے آئے، مسٹر اینجلو میسی؟" مارکس نے اسے بغور دیکھا۔

"ہاں۔" مارکس کا مخاطب اینجلو میسی لب کشا ہوا۔ "لاؤ اب وہ سی ڈی مجھے دے دو۔"

اینجلو میسی نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مارکس کی طرف بڑھا دیا۔

"رقم پوری ہے نا؟" مارکس نے اینجلو میسی کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے وضاحت چاہی اور لفافے کو کھول کر دیکھا۔

مارکس کے حسب منشا لفافے میں ڈالرز موجود تھے۔ اس نے جیب سے ایک پیکٹ نکال کر اینجلو میسی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس میں یقیناً کسی مووی کی سی ڈی تھی۔

"اس کے بعد ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" مارکس دھیمی آواز میں بولا۔ "اور تم بھی اس فلم کو جلا دینا یہ کوئی اچھی فلم نہیں ہے اس میں تم ایک انسان کو قتل کرتے ہوئے نظر آرہے ہو اور انسان بھی وہ جو تمہارا بہت اچھا بزنس پارٹنر تھا، جس کے قاتل کی تلاش میں پولیس اب تک دھکے کھا رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ۔" مارکس کی سرگوشی میں ہمدردی کا عنصر نمایاں تھا جو اینجلو میسی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"بس بس۔" اینجلو میسی نے مارکس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی قطع کر دی۔ "مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اب مجھے کیا کرنا ہے اور ہاں، اب تمہارے پاس بھی اس مووی کا کوئی حصہ نہیں رہنا چاہیے میں نے تمہیں منہ مانگی رقم دی ہے۔" اس کا انداز قدرے کھسیانہ تھا جیسے اسے مارکس کا یہ مشورہ انتہائی ناگوار گزر رہا ہو۔

"یہ اس مووی کا ماسٹر پرنٹ ہی ہے۔" مارکس نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا اور میں کبھی کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کرتا یہ میرے کاروبار کا اصول ہے۔"

"بس ٹھیک ہے اب تم یہاں سے جاؤ۔" اینجلو میسی نے انتہائی رکھائی سے کہا۔ "اور آئندہ میرے سامنے مت آنا اپنے ہمدردانہ مشورے لے کر۔"

"اوکے جیسی تمہاری مرضی۔" مارکس نے جواباً بے پروائی سے کندھے اچکائے اور ہاتھ کو الوداعیہ انداز میں ہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے جیب سے لفافہ نکال کر اپنی الماری کے ایک خفیہ خانے میں روپوش کر دیا۔ وہ اپنی اس کمائی ہوئی دولت کو فی الفور بینک میں جمع کرنے کا عادی نہیں تھا کیونکہ اس میں اس کے لیے گرفتاری کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ واش روم میں نہانے کی نیت سے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھا اور خود کو بہت فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔ اس فلیٹ کی ویرانیوں میں ایک یہ ٹیلی ویژن ہی تو اس کا ساتھی تھا۔ جو اس کا دل بہلانے کا سامان تھا اور زندگی کی تنہائیوں میں صرف جینی لوئس تھی جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ جینی نے اس کا ایسے کٹھن وقت میں ساتھ دیا تھا جب وہ ساری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ ماضی کے ایک بھیانک سانحے نے مارکس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کا باپ ڈریوڈ کیمرون ایک انتہائی دولت مند آدمی تھا۔ اس کا فیکٹریوں کا ایک بہت بڑا فارم تھا۔ اس کے علاوہ وہ کاروں کے اسپیئر پارٹس بنانے کی ایک بڑی کمپنی کا مالک بھی تھا۔ مارکس کی ماں مارگریٹ کیمرون حقیقتاً ایک بہت ہی نفیس خاتون تھی۔ زندگی کی کون سی خوشی اور دولت تھی جو ڈریوڈ کیمرون کے اس مختصر سے خاندان کے پاس نہیں تھی۔

مارکس کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی جب ڈریوڈ کیمرون اپنے ایک دوست رونالڈ بیرن کو ساتھ لے کر گھر آیا تھا۔ رونالڈ ایک انتہائی مفلوک الحال شخص تھا۔ وہ ڈریوڈ کیمرون کا پرانا دوست تھا، اس لیے ڈریوڈ کیمرون نے اسے اپنے ساتھ اپنے آفس لے جانا شروع کر دیا اور کچھ دن بعد ہی رونالڈ نے بہت حد تک کمپنی کے تمام کام اور ذمے داریاں اپنے کاندھوں پر سنبھال لیں۔ ڈریوڈ کیمرون کاروبار کی طرف سے بہت حد تک بے فکر ہو چکا تھا۔ رونالڈ کی شکل میں اسے ایک مضبوط سہارا جو مل گیا تھا اور پھر اسی سہارے نے ڈریوڈ کیمرون کو اس طرح بے سہارا کر دیا جو ڈریوڈ کیمرون کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ڈریوڈ کیمرون کی بے پروائی اور بے نیازی کی وجہ سے رونالڈ نے نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ لیگل پیپرز کی رو سے بھی تمام کاروبار اور کوٹھی پر قبضہ کر لیا اور اس سانحے کے چند دن بعد ہی ڈریوڈ کیمرون کا انتقال ہو گیا۔ مگر وہ درحقیقت رونالڈ بیرن کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ڈریوڈ کیمرون کی قبر کی مٹی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ رونالڈ نے ڈریوڈ کیمرون کی بیوہ مارگریٹ کا گلا دبا کر اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مارکس اس وقت ایک کالج اسٹوڈنٹ

تھا۔ اس نے اپنی ماں کی جان بچانے کے لیے رونالڈ پر حملہ بھی کیا لیکن مارکس کو خود ہی رونالڈ کے درندہ صفت خونی ملازموں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ یہ مناظر مارکس کی آنکھوں میں گویا پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے اسی روز قسم کھالی تھی کہ زندگی میں جب وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے گا تو وہ رونالڈ سے انتقام ضرور لے گا۔ قسمت اسے ایک اجنبی شہر میں لے آئی تھی۔ تپتی ویران دوپہر، اجنبی شہر ناآشنا لوگ، مارکس ساحل سمندر پر اداس بھوکا پیاسا سر جھکائے بے نام منزل کی طرف چلتا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک حادثے سے متصادم ہوگئی۔ ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک زخمی نوجوان کراہ رہا تھا۔ اس کا لباس اس کے خون کی رنگت میں رنگین ہو چکا تھا۔ مارکس نے اس نوجوان کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ جلدی سے نوجوان کے قریب گیا۔ مارکس کو دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔

''پلیز! ہیلپ می.....'' نوجوان نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

مارکس نے برق رفتاری سے کار کا دروازہ کھول کر نوجوان کو برابر والی سیٹ پر کھینچ لیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''جلدی کسی قریبی اسپتال کی طرف چلو۔'' نوجوان نے تکلیف دہ آواز میں مارکس سے کہا۔

مارکس کی مدد پا کر نوجوان کو حوصلہ ہوا تھا۔ مارکس نے ہوا کی رفتار سے کار آگے بڑھا دی۔ مارکس کی نظریں نوجوان کو بالکل قریب سے دیکھ رہی تھیں، نوجوان کو گولی لگی تھی۔ مارکس اگرچہ یہاں کے راستوں سے ناواقف تھا لیکن نوجوان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جلد ہی وہ ایک ڈاکٹر کے سامنے موجود تھے اور نوجوان ٹریٹمنٹ سے فارغ ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس تمام عمل میں کافی وقت لگ گیا تھا لیکن مارکس تمام وقت آپریشن تھیٹر کے باہر ہی ٹہلتا رہا تھا۔ ٹریٹمنٹ کرا کے وہ باہر نکلے تو نوجوان بہتری محسوس کر رہا تھا ڈاکٹروں نے گولی اس کے جسم سے نکال دی تھی۔

''تھینک یو سو مچ۔'' واپسی پر نوجوان نے ہی گفتگو کا آغاز مارکس کا شکریہ ادا کرنے سے کیا۔ ''آج اگر تم نہ آتے تو شاید میں زندہ نہیں بچ پاتا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'' مارکس نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی زندہ رہنا آپ کے نصیب میں تھا۔'' مارکس کی بات سن کر نوجوان مسکرا دیا۔

''گڈ، یو آر اے ویری انٹیلی جنٹ بوائے۔'' نوجوان نے مارکس کی تعریف کی۔ ''ویسے میرا نام میجک ڈان ہے، لوگ مجھے مسٹر میجک کہتے ہیں۔'' اس نے خود اپنا تعارف کرانے میں پہل کی۔

''جی، جان چکا ہوں۔'' مارکس نے مختصراً جواب دیا۔ ''آپ ڈاکٹر کے یہاں یہ نام لکھوا چکے ہیں۔''

''بہت زبردست۔ تم تو اچھے بھلے حاضر دماغ لڑکے ہو، تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑے گی مسٹر.....؟''

''مارکس ہنری.....'' مارکس نے اپنا نام بتا کر اس کا ادھورا جملہ مکمل کیا۔

''ویسے میں ایک پرائیویٹ چینل میں سینئر کیمرامین ہوں۔'' میجک نے اپنے تعارف میں مزید اضافہ کیا تھا۔

اس کے جواب میں مارکس نے صرف ہوں ہاں پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اسے ان باتوں سے اس وقت کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی اسے تو اس وقت بھوک ستا رہی تھی۔

''کیا ہوا، کہاں گم ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے.....؟''

''بتاؤں گا، مگر اس وقت مجھے بھوک لگی ہے۔'' مارکس نے صاف الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''اوہ! آئی ایم سوری۔'' میجک نے پرتاسف لہجے میں کہا۔ ''آؤ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

میجک اسے ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔ ویٹر نے ان کے آرڈر کے مطابق کھانا سرو کر دیا تھا۔

''اس شہر میں اجنبی لگتے ہو۔'' میجک نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں!'' مارکس نے کھانے کے دوران مختصر جواب دیا اور پھر میجک کے سامنے اپنی ساری روداد بیان کر دی۔

میجک کو اس کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔

کھانے سے فارغ ہوتے تو میجک اسے اپنے ساتھ اپنے فلیٹ میں لے آیا اور اپنے ساتھ ہی ملازمت کی بات بھی کرا دی... اب مارکس کو میجک کے بارے میں بہت حد تک معلومات ہو چکی تھیں۔ میجک صرف ایک چینل کا کیمرامین ہی نہیں بلکہ ایک بہت ہی منجھا ہوا بلیک میلر بھی تھا اور اسی وجہ سے اسے گولی بھی لگی تھی لیکن عین وقت پر مارکس کے پہنچنے کی وجہ سے میجک بچ گیا.... ان کے بارے میں میجک نے مارکس کو اپنا فیصلہ بتا دیا تھا کہ بہت جلد وہ بزنس مین کو اپنے ان پالتو غنڈوں کو آئندہ کوئی آرڈر دینے کے قابل نہیں رہنے دے گا۔

''کیا مطلب! کیا تم اس بزنس مین کو قتل کر دو گے؟'' مارکس نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔ ''لیکن کیا یہ اچھی بات ہوگی......؟''

''تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں ان کے ہاتھوں خود کو قتل کروا لوں؟'' مسٹر میجک نے کچھ خفگی سے کہا۔ ''تم بتاؤ تم اگر میری جگہ ہوتے تو تم کیا کرتے؟''

مارکس لاجواب ہو گیا حالانکہ اس کے اور مسٹر میجک کے معاملات میں قدرے فرق تھا۔ رونالڈ نے مارکس اور اس کے والدین کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ وہ اور اس کے والدین... بے قصور تھے جبکہ میجک ایک بلیک میلر تھا بلاشبہ وہ ہر طرح سے اپنی طرز کا ایک انوکھا کریمنل تھا اور مجرموں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جن کے نزدیک جرم کرنا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ جرم کر کے پکڑے جانا انتہائی نا اہلی اور بری بات سمجھی جاتی ہے لیکن میجک نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ وہ کسی کو خود بھی قتل نہیں کرتا۔ اس باغی بزنس مین کے قتل کا کیا منصوبہ میجک کے پاس تھا، یہ اس نے مارکس سے شیئر نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک دن مارکس کو معلوم ہوا کہ میجک نے اپنے منصوبے پر عمل کر لیا تھا۔ یہ اطلاع بھی مارکس کے علم میں ٹیلی ویژن کی خبروں کے ذریعے ہی آئی تھی کہ شہر کا ایک معروف بزنس مین قتل کر دیا گیا تھا مگر قاتل کون تھے؟ یہ کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس واقعے کے بعد میجک مارکس کو ساتھ لے کر ہالی وڈ آ گیا تھا۔ مارکس آسان الفاظ میں میجک کو یوں سمجھ پایا تھا کہ میجک بھی مستقبل کے اشرافیہ میں شمار ہونے والا تھا۔ اس سے مل کر مارکس کو محسوس ہوا تھا کہ شاید قسمت بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ رونالڈ سے بھرپور انتقام لے۔ قسمت کی مہربانی سے میجک کی بدولت مارکس کے پاس ایک ملازمت بھی تھی۔ اپنی تعلیم بھی وہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ رہائش کے لیے میجک کے فلیٹ کی صورت میں ایک ٹھکانا بھی موجود تھا لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ ایک کسک بھی دل میں موجود تھی۔ وہ رونالڈ کو کبھی کسی بھی صورت میں نہیں بھولا تھا اور نہ ہی بھولنا چاہتا تھا۔ وہ رونالڈ سے اپنا انتقام لینے کے لیے تیاری کر رہا تھا اور میجک نے اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ رونالڈ اب وہاں نہیں تھا جہاں مارکس اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ میجک نے رونالڈ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی تھیں، رونالڈ نے مارکس کا گھر، کمپنی سب فروخت کر دیا تھا اور اب خود غائب تھا۔ میجک اور مارکس سے در کنار قسمت کے اپنے فیصلے الگ ہی ہوتے ہیں، مارکس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میجک سے زیادہ بدقسمتی نے مارکس کا ایسا ساتھ نبھایا کہ اچانک ہی مارکس کی زندگی میں ہیجان بپا ہو گیا۔ غم و اندوہ سے لبریز ایک شب اس کی منتظر تھی جب اس نے اپنے فلیٹ میں قدم رکھا تو میجک اس کے سامنے زخمی حالت میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ انجانے دشمنوں کا داؤ چل گیا تھا۔ میجک پر بھرپور حملہ کیا گیا تھا۔ مارکس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میجک کو کسی طرح زندہ بچانے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ مرتے ہوئے میجک نے اسے کچھ خاص راز کی باتیں بتائیں اور آخری نصیحت بس یہی تھی کہ مارکس کو اب اس فلیٹ میں نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے بعد میجک اس دنیا کا باسی نہیں رہا تھا۔ مارکس کی نظروں کے سامنے اس کے مہربان دوست، استاد اور ایک محسن کی لاش پڑی تھی۔ گمنام قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ مارکس نے اس قتل کو چھپانے کی بہت کوشش کی تھی مگر میجک ایک نامور میڈیا پرسن ثابت ہوا تھا۔ ہر طرف اس کے قتل کے چرچے ہو گئے تھے پولیس نے تفتیش شروع کی تو مارکس کو میجک کی بہت ساری اشیا روپوش کرنی پڑی تھیں۔ اگر میجک کی مجرمانہ کارروائیاں پولیس کی نظروں میں آ جاتیں تو مارکس بھی پولیس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا تھا۔ پولیس بھرپور طریقے سے حرکت میں آ گئی تھی اور یہ سب مارکس کے لیے بہت پریشان کن تھا لیکن مجبوراً اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال میں نہ ہی وہ اپنا فلیٹ تبدیل کر پا رہا تھا اور نہ ہی اپنا کام کر سکتا تھا۔ اس دوران مارکس بھی مسلسل پولیس کی نظروں میں مشکوک رہا لیکن مارکس کو اندازہ تھا کہ ایک دن یہ جوش و خروش ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور پولیس اپنی معمول کی کارروائیوں تک محدود ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا، ایک دن شاید پولیس آفیسر کو مارکس کے بے قصور ہونے کا احساس ہو گیا تھا لیکن وہ بہت ہوشیار تھا، اب بھی پولیس کی نظروں میں مشکوک ہونے سے محتاط رہنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے موقع غنیمت جان کر پولیس کو اطلاع دیتے ہوئے پہلی فرصت میں ہی میجک کی وصیت کے مطابق فلیٹ تبدیل کر لیا تھا۔ ایک بار یہاں سے نکلنے کے بعد اس کے پاس بہت سارے راستے کھلے تھے۔ اس نے دوسرا اقدام اٹھاتے ہوئے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ میڈیا کی یہ ملازمت اس کے لیے شہرت کا باعث بن سکتی تھی اور شہرت اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ شہرت کے نقصانات کا اندازہ وہ میجک کا حال دیکھ کے کر ہی چکا تھا۔ میجک کی زندگی کے تجربات اور اس کی اپنی ذہانت اس کے لیے ...... مشعلِ راہ تھے۔ اس نے چند

دن کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اب وہ کچھ دن سستانا چاہتا تھا۔ لیکن تقدیر کا پہیہ اس پر رضامند نہیں تھا کہ اسے تھمنا چاہیے۔ میجک کی لائبریری کا وہ سامان جسے اس نے پولیس سے پوشیدہ کیا تھا، ایک دن اسی سامان میں اسے ایک نئی ویڈیو کی ڈی لی گئی۔ میجک کی موت سے صرف ایک دن قبل کی تاریخ سی ڈی پر نمایاں نظر آرہی تھی۔ مارکس نے سی ڈی پلیئر میں سی ڈی ڈال کر اسے آن کر دیا۔ غالباً کسی ہوٹل کے کمرے کا منظر تھا جو ٹی وی اسکرین پر نمایاں ہوگیا۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی مارکس کی نظروں کے سامنے تھے۔ مارکس نے اپنی پوری توجہ اس سی ڈی کو دیکھنے کی طرف مائل کر دی۔

''آخر ہم کب تک اس طرح جگہ جگہ چھپتے پھریں گے ورتھ؟'' منظر کے ساتھ ہی ابھرنے والی نسوانی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

مارکس کے لیے یہ پہلا جملہ ہی نہایت تعجب خیز تھا آخر یہ دونوں کس سے چھپتے پھر رہے تھے۔

''یہ سوال تم اپنے باپ سے کرو، جینی۔'' ورتھ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تاسف اور اداسی کے ملے جلے احساسات نمایاں تھے۔ ''اور میں تو کہتا ہوں کہ تم واپس اپنے باپ کے پاس چلی جاؤ۔''

اوہ! تو یہ وجہ ہے، مارکس چونکا۔ اس کی سمجھ میں کچھ کچھ یہ وجہ آئی تھی کہ دونوں اپنے اپنے گھر سے فرار ہوئے تھے لیکن کیوں؟ یہ بات مارکس پر عیاں نہیں ہوئی تھی ایک ایسے معاشرے میں جہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا سرعام ملاقاتیں کرنا، دوستی، محبت کرنا اور اپنی مرضی سے شادی کرنا کوئی معیوب بات نہ ہو وہاں آخر ایسی کیا بات تھی کہ یہ دونوں اس طرح چھپتے پھرنے پر مجبور تھے بہرحال میجک دنیا سے جاتے جاتے بھی مارکس کے لیے ایک کیس چھوڑ گیا تھا۔ میجک کا خیال آتے ہی مارکس کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔ یہ کیس میجک کے قتل سے صرف ایک دن پہلے کا ہی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میجک کے قتل سے ان دونوں کا بھی کوئی تعلق ہو، یہ خیال مارکس کو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اب اس کے سر پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی، وہ جلد از جلد ان دونوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور ان دونوں تک پہنچنا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، لہٰذا وہ ان دونوں تک پہنچ گیا لیکن اس کھوج کے اختتام پر جرم اور قانون سے لبریز ایک ابھی ہوئی نئی نو اسٹوری اس کی منتظر تھی۔ نئے انکشاف نے مارکس کو لرزا دیا تھا، اس کیس کی مختصر کہانی یہ سچائی تھی کہ ورتھ جیکسن اور جینی لوکس ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے لیکن دونوں کی مجبوری یہ تھی کہ ورتھ پولیس کو انتہائی مطلوب ایک مجرم تھا اور ورتھ کو ایک مجرم ہونے کی وجہ سے دنیا کی نظروں سے چھپنا پڑتا تھا جبکہ جینی ایک مجرم سے محبت کرنے کی پاداش میں زمانے کی نظروں سے بچنے پر مجبور تھی۔ جینی کے باپ کالٹن کا کردار اس کہانی میں سب سے اہم تھا۔ وہ پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر تھا اور ورتھ کا شدت سے متلاشی تھا۔ جینی کے لیے اذیت کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ ورتھ کو اور ورتھ سے زیادہ اپنے پاپا سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ ورتھ کا کہنا تھا کہ وہ جرائم کی ایسی دلدل میں پھنسا ہوا ہے جہاں سے نکلنا اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوگا۔ ورتھ کے کردار کے بارے میں جان کر مارکس یہ سوچنے پر حق بجانب تھا کہ ورتھ بھی میجک کا قاتل ہوسکتا ہے لیکن بعد میں اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ میجک کے قتل سے ان دونوں کا کوئی تعلق سامنے نہیں آیا

فیصلہ

ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں چند لوگوں کو بحث کرتے ہوئے پایا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔

کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی کرے پھر سچے دل سے توبہ کرے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔ جب ان لوگوں نے اس بزرگ سے اسی بحث کا فیصلہ کرنے کو کہا تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ میں کوئی عالم تو نہیں ہوں لیکن میں کپڑا بننے کا کام کرتا ہوں۔ دھاگے لیے ہوتے ہیں پھر ان میں سے جو دھاگا ٹوٹ جائے تو میں اس کو گرہ لگا دیتا ہوں پھر اس گرہ والے دھاگے پر خاص نظر رکھتا ہوں۔ کہیں دوبارہ نہ ٹوٹ جائے۔ ممکن ہے جس کی تار گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ٹوٹ جائے پھر وہ اللہ پاک سے سچی توبہ کی گرہ لگاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص پر خاص رحمت والی نظر رکھتا ہے تاکہ پھر گناہوں کی کثرت کی وجہ سے تار نہ ٹوٹ جائے۔

مرسلہ۔ نعیم احمد۔ سکھر

تھا۔ ان دونوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میجک نامی ایک کیمرا مین... ان کی ایسی مووی بنا چکا ہے اور اب وہ کسی بھی وقت بلیک میل ہونے جا رہے ہیں شاید اگر ایسا ہو جاتا تو ورتھ واقعی اپنے دشمن میجک کو راستے سے ہٹا دیتا۔ اس کیس میں مارکس کو ایک پولیس والے کا روپ دھارنا پڑا تھا، یہ سب تربیت میجک کی ہی دی ہوئی تھی کہ کب کہاں کس طرح کس کیس میں اپنے آپ کو کیا ظاہر کرنا چاہیے اور اپنے شکار سے کس روپ میں ملاقات کرنی چاہیے اور اس پر مارکس عمل پیرا ہو کر کامیابیوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس بار بھی خوب لمبی رقم مارکس کے ہاتھ آئی تھی جو اس نے بطور پولیس آفیسر ورتھ سے حاصل کی تھی۔ جینی اس تمام وقت میں مارکس کو اپنے باپ کا جاسوس ہی سمجھتی رہی تھی، گویا مارکس نے بڑی کامیابی سے یہ گیم کھیلا تھا۔ ورتھ کے جرائم اور جینی اور ورتھ کے تمام تعلقات اس رشوت کی رقم کے ڈھیر تلے دب گئے تھے جو اپنے تئیں انہوں نے مارکس کے بینک اکاؤنٹ میں اضافے کے لیے مارکس کو دی تھی۔ کسی کو بلیک میل کرنا، کوئی جرم کرنا یا کسی کو اذیت دینا، اگرچہ مارکس کے خون میں شامل نہیں تھا لیکن وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ رونالڈ سے انتقام لینے کی خاطر مارکس کو بہت ساری دولت کی ضرورت تھی۔ یہ اس دنیا کا حقیقی دستور ہے کہ ظالم سے انتقام لینے کے لیے اس کے ہم پلہ بننا پڑتا ہے اور ظالم کوئی بھی ہو کبھی غریب نہیں ہوا کرتا۔ دولت کی ہوس انسان کو ظالم بننے پر مجبور کرتی ہے اور ظالم سے اپنا انتقام لینے والا اگر غریب ہو تو مظلوم کا انتقام خودکشی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ مارکس اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کسی سے انتقام لینا ہو تو بغیر دولت کے ایسا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اتنی دولت جائز ذرائع سے حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے، لہٰذا مارکس ناجائز ذرائع سے بہت تیز رفتاری کے ساتھ دولت جمع کر رہا تھا۔ بہت جلد وہ اپنی ایک بڑی اور خوبصورت ذاتی کوٹھی کا مالک بن گیا تھا۔ یہ اس کا مستقل ٹھکانا تھا، ورنہ فلیٹ تو وہ لباس کی طرح تبدیل کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مسافتیں طے کرنے کے لیے اس کے پاس ایک خوبصورت، قیمتی اور تیز رفتار ہیوی بائیک بھی تھی۔ اپنی ذاتی کوٹھی میں اس نے اپنے استعمال کے لیے آرائش و زیبائش کا پرتعیش فرنیچر اور دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ بہ ظاہر اس نے اپنے ڈیڈ کی طرز پر گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا ایک چھوٹا سا بزنس بھی اسٹارٹ کر لیا تھا مگر اس کے برعکس سچائی یہ تھی کہ کتنے ہی نوجوان لڑکے لڑکیاں، عمر رسیدہ افراد سرکاری و غیر سرکاری اعلیٰ عہدیدار اور ملازمین، بزنس مین سیاستدان حتیٰ کہ مجرم تک بھی اس کا شکار بن چکے تھے۔

مارکس کی زندگی کے دن یونہی تنہائیوں کے ساتھ گزر رہے تھے۔ میجک کی جدائی اسے بہت گراں گزر رہی تھی۔ اس اداسی سے نجات کے لیے اس نے ہوٹل مورنیل کا رخ کر لیا تھا جہاں کی راتیں اپنی رنگینیوں کی وجہ سے مشہور تھیں، وہاں آکر غمگین سے غمگین دل بہل جایا کرتے تھے بالآخر ایک دن مارکس کو بھی وہاں دل بہلانے کا سامان میسر آ گیا۔ ایک رات جب وہ ایک ڈنر کرنے کے بعد اداس بیٹھا وائن کے ایک جام میں غرق تھا۔ ایک نسوانی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''ہیلو......'' مترنم نسوانی آواز سن کر مارکس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، ایک لڑکی اجازت لیے بغیر ہی اس کے سامنے میز کے اس پار رکھی ہوئی کرسی پر براجمان ہو چکی تھی۔

''اوہ آپ......!'' مارکس متحیر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی اس طرح ایک روز اس کے سامنے اچانک ہی آ جائے گی۔

''کیوں؟ کیا میں نہیں ہو سکتی......؟'' لڑکی لب کشا ہوئی۔

''ہو سکتی ہیں'' مارکس نے بلا تامل مگر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہو کیوں نہیں سکتیں۔''

''تو پھر آپ مجھے یہاں دیکھ کر اس طرح حیران کیوں ہوئے؟'' لڑکی نے چبھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کے چہرے پر خوف کیوں ابھر آیا؟''

''خوف نہیں حیرت۔'' مارکس نے وضاحت پیش کی۔ ''دراصل میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم دوبارہ اس طرح یہاں ملیں گے۔''

جواب میں لڑکی مسکرا دی، مارکس کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑکی جس کا نام جینی لوئس تھا، جس کا باپ کالٹن ایک پولیس افسر اور بوائے فرینڈ ورتھ جیکسن ایک مجرم تھا۔ مارکس جینی اور ورتھ کو بلیک میل کر چکا تھا، بعد میں مارکس کو معلوم ہوا تھا کہ ورتھ کو انتہائی وحشیانہ تشدد کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا اور کالٹن پراسرار طور پر فوت ہو گیا تھا۔ آج وہی جینی مارکس کے سامنے کھڑی تھی۔

''لیکن آپ یہاں کیسے......؟'' مارکس نے سوال کیا۔

''جس طرح آپ یہاں ہیں اسی طرح میں بھی یہاں ہوں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' جینی نے مارکس کا سوال جواب کی صورت میں واپس کر دیا۔ ''ویسے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔''

Once a Pack
Hashmi
Ispaghol
استعمال میں سہولت بھی۔۔۔
صحت کے ساتھ بچت بھی
روزانہ صرف ایک
ہاشمی اسبغول
Once a Day Pack
استعمال کیجئے
اور فٹ نہیں۔۔۔ سپر فٹ رہیے
ڈیلی لو فٹ رہو

''میری کشش، آپ نے خوب کہی مس جینی۔'' مارکس نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔ ''اور مجھ سے پوچھیں تو میری تنہائی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے، کسی تنہا انسان کے لیے اس سے بہتر ساتھی اور اس سے بہتر جگہ اور کیا ہوسکتی ہے۔'' مارکس نے سامنے رکھے وائن کے گلاس کی طرف اشارہ کردیا۔

''کمال ہے۔'' جینی نے ایک طویل سانس کھینچ کر چند لمحے آنکھیں بند کرلیں پھر دوبارہ آنکھیں کھول کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ویسے کسی تنہا انسان کے لیے میرا کلب بھی بہت بہتر جگہ ہے۔''

''آپ کا کلب......؟'' مارکس نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

''ہاں، مڈنائٹ کلب۔'' جینی نے کلب کا نام بتایا۔ ''جہاں میں ڈانس کرتی ہوں۔''

''کیا آپ ایک کلب ڈانسر ہیں......؟'' مارکس نے وضاحت طلب کی۔

''نہیں۔'' جینی نے نفی میں سر ہلایا تو اس کی گردن پر بکھرے ہوئے سنہری بال یوں مچلے کہ مارکس کے دل کی دھڑکنیں تڑپ اٹھیں۔ ''کسی کی تلاش مجھے ایسے ہی وہاں لے گئی تھی جیسے آج یہاں قسمت مجھے اپنی منزل پر لے آئی ہے، پاپا اور ورتھ کے بعد میں اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی، نہ کوئی عزیز رشتے دار، کوئی دوست، تلاش محبت نے مجھے کتنا بھٹکایا ہے، اس بات کا اندازہ آپ خود بھی کرسکتے ہیں، کیونکہ آپ بھی تو میری طرح اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں......''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' مارکس نے اس کی تائید کی۔ ''لیکن آپ کا کلب، وہاں بھی تو آپ کے بہت سارے فرینڈز ہوں گے، لوگ مرتے ہوں گے آپ پر؟''

یہ مارکس کا ایک نیا حربہ تھا جو اس نے جینی کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہتا تھا کہ شکاری کبھی کبھی خود بھی شکار ہوجاتا ہے۔

''ہاں۔'' جینی اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''بہت سارے لوگ مرتے ہیں لیکن مجھ پر نہیں، میری اداؤں پر، میرا کلب صرف دل بہلانے کے لیے اچھی جگہ ہے، دل لگانے کے لیے نہیں، وہاں میرے پرستار بہت ہیں مگر کوئی بھی میرا اچھا دوست نہیں، کوئی آپ جیسا آشنا نہیں ہے۔ بے شک آپ بھی میرے بدترین دشمن رہے ہیں لیکن آج یہاں آپ سے مل کر احساس ہورہا ہے کہ دشمن ہی سہی آپ میرے پرانے آشنا بھی تو ہیں۔''

''دشمن نہیں کہو، مجبور کہو۔'' مارکس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جو کچھ ہوا جو کچھ میں نے کیا اور آج تک کررہا ہوں یہ سب میری مجبوری ہے......'' مارکس نے اپنی تمام آپ بیتی اس کے گوش گزار کردی۔

''چلو مجبوری سہی۔'' جینی نے سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔ ''جو ہوا سو ہوا، ہم سب کچھ بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں دوستوں کی طرح، آج سے نہ آپ اکیلے نہ میں اکیلی......''

مارکس ششدر رہ گیا۔ اصولاً تو جینی کو چاہیے تھا کہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرتی لیکن وہ تو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی تھی، اس سے محبت کی متقاضی تھی۔ وہ چند لمحے جینی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور اس کے متعلق کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے اپنا نشے میں جھولتا ہوا دوستی کا ہاتھ جینی کی طرف بڑھا دیا اور دونوں میں تپاک سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

''مارکس ہنری۔'' مارکس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا تھا۔

''جینی لوکس۔'' جینی نے جواباً تعارف میں اپنا نام بتایا۔

''میں اس نام سے واقف ہوں مس جینی......'' مارکس نے آگاہی دی۔

اس تعارف کے ساتھ ہی جینی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم کی لکیر نمایاں ہوگئی تھی جس کے جواب میں مارکس نے اسے بھی وائن کا ایک گلاس پیش کردیا۔

''ناؤ وی آر فرینڈز۔'' جینی نے دلربائی سے کہا تھا۔

''آپ مسکراتی ہوئی بہت خوبصورت لگتی ہیں۔'' مارکس نے توصیفانہ لہجے میں کہا۔

''تھینک یو۔'' جینی نے مختصر سا جواب دیا۔ ''اکثر لوگوں کی میرے بارے میں یہی رائے ہے۔''

دونوں کچھ دیر بیٹھے اپنے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہے پھر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہوگئے۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کس کی تلاش اس کلب میں کھینچ لے گئی تھی؟'' مارکس کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

''کیا بتاؤں!'' جینی کے انداز میں ایک مرتبہ پھر اداسی عود کر آئی۔ ''ہے اسی کلب کی ایک ڈانسر ''میری ویہرن''۔ وہی میری ویہرن جس کی وجہ سے ورتھ جیکسن مجھ سے چھن لیا گیا۔ اسی میری نے ورتھ کے باس کو یہ اطلاع دی تھی کہ ورتھ جیکسن ایک پولیس آفیسر کی بیٹی کی زلفوں کا اسیر ہوچکا ہے اور کسی بھی وقت اپنے باس اور دیگر ساتھیوں

کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ورتھ جیکسن اپنے باس کا خاص بندہ تھا اور ورتھ کا باپ میری کا دیوانہ تھا۔ اس نے میری کے کہنے میں آکر ورتھ کو قتل کروادیا۔ تمہیں معلوم ہے مارکس، میری نے ایسا کیوں کیا تھا، اس لیے کہ وہ ورتھ کو پاگل پن کی حد تک پیار کرتی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ورتھ کسی اور لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے لیکن ورتھ کی غلطی یہ تھی کہ وہ پولیس آفیسر کالنس کی بیٹی جینی لوئس سے محبت کرنے لگا تھا۔ میری نے ورتھ کو کئی مرتبہ یہ باور کرایا تھا کہ اگر وہ اس کا نہیں ہوا تو بھی کسی کا نہیں ہوگا اور ورتھ کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے مجھ سے محبت کی خاطر جرائم پیشہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور یہی بات اس کے باپ اور ساتھیوں کے لیے اذیت، نفرت اور خوف کا سبب بنی تھی۔" جینی نے تفصیل سے اپنے دل کی بات مارکس کے روبرو بیان کردی۔

جینی سانس لینے کے لیے رکی تو مارکس نے غور کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ یعنی ورتھ اس کے دل میں اب تک آباد تھا۔

"اچھا! تو یہی وہ میری ہے جو کلب میں تمہاری دشمن ہے؟" مارکس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "اور اسی کی تلاش نے تمہیں ڈنائٹ کلب میں اسیر کردیا ہے۔"

"ہاں! اب وہ میرے ساتھ ہی کلب میں ہوتی ہے۔" جینی نے انکشاف کیا۔ "مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اب میری دشمن نہیں رہی لیکن میں اب بھی اس کی دشمن ہوں اور میں اس سے انتقام لینے کے لیے ہی اس کلب میں آئی ہوں۔"

"تو پھر تم نے اس سے ابھی تک اپنا انتقام کیوں نہیں لیا؟" مارکس نے تعجب سے سوال کیا۔ "تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو، کیا تم اسے ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"میں ایک پولیس آفیسر کی بیٹی ہوں مارکس، کوئی راستہ چلتی عام سی مجرم نہیں ہوں۔" جینی نے پُراعتماد انداز میں اپنے پاپا کے حوالے سے اپنا تعارف دہرایا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کس سے کس طرح انتقام لینا چاہیے، مارکس! میں نے صرف ورتھ کی جدائی ہی برداشت نہیں کی بلکہ ورتھ کے بعد اپنے فادر کی جدائی کا زخم بھی سہا ہے، میرے فادر پر ان کے محکمے کی جانب سے الزام لگایا گیا تھا کہ ان کی بیٹی ایک مجرم کی پشت پناہی کررہی ہے اور اپنی بیٹی کی وجہ سے وہ بھی اس مجرم کے لیے دل میں ہمدردی رکھتے ہیں اور ورتھ کے قتل کے بعد میرے والد پر یہ الزام لگا تھا کہ پولیس آفیسر کالنس نے محکمے میں اپنی نیک نامی کو قائم

ماں تو عظیم ہے

ابا جی مجھے مارتے تو امی بچا لیتی تھیں، ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو ابا جی کیا کریں گے؟ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔

انہوں نے بازار سے وہی لانے کا کہا میں نے انکار کردیا۔ انہوں نے سالن کم دیا میں نے زیادہ پر اصرار کیا، انہوں نے کہا پیڑھی پہ بیٹھ کے روٹی کھاؤ میں نے زمین پر دری بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا، کپڑے میلے کردیے، میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا، مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے یہ کیا کہ مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ "کیوں دلاور پترا میں صدقے بیمار تو نہیں ہے تو؟"

اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے

مرزا ادیب کی کتاب "مٹی کا دیا" سے اقتباس

*****

☆ کچھ تعلقات چھینک کی طرح ہوتے ہیں ختم ہوتے ہی شکر الحمد للہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔

☆ زندگی میں اپنا پن تو ہر کوئی دکھاتا ہے، اپنا ہے کون؟ یہ وقت بتاتا ہے۔

☆ شیخ سعدیؒ نے ایک دفعہ فرمایا۔ میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے برے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے؟"

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی
اورنگی ٹاؤن کراچی

رکھنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ورتھ جیکسن کو قتل کیا ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو ایک فرض شناس پولیس آفیسر کے لیے صدمے کا باعث بنیں، پھر ایک شب وہ اپنے بیڈروم میں مردہ پائے گئے تھے۔ ان کی پراسرار موت کا سراغ آج تک نہیں لگ سکا مگر مجھے پورا یقین ہے کہ میرے فادر کے قاتل میری اور اس کا باس ہیں۔"

"میری اور اس کا باس......" مارکس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، وہ میری کے باس کے بارے میں وضاحت کا طلبگار تھا۔

"ہاں، میری اب ورتھ کے باس کے لیے کام کرتی ہے۔" جینی نے وضاحت کردی۔ "وہ اب میری کا باس ہے۔"

"مجھے افسوس ہے جینی۔" مارکس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔"

"ہاں مسٹر مارکس۔" جینی حسرت زدہ انداز میں گویا ہوئی۔ "کاش تم میری اور ورتھ کی وہ موی نہ بناتے، نہ وہ موی ورتھ کے باس تک پہنچتی اور نہ یہ بات لیک آؤٹ ہوتی کہ ایک مجرم اور ایک پولیس آفیسر کی بیٹی آپس میں اتنا پیار کرتے ہیں۔ نہ ورتھ مارا جاتا نہ ہی میرے باپ۔"

"پلیز مجھے معاف کردو جینی۔" مارکس کو حقیقتاً بہت صدمہ ہوا تھا۔ "لیکن تم یقین کرو کہ موی میں نے ورتھ کے حوالے کردی تھی اور اس کے بعد میں نے کبھی ورتھ سے رابطہ نہیں کیا، یہ میرے بزنس کا اصول ہے اور میں اس کا پابند ہوں پھر جانے کیسے یہ راز فاش ہوا۔"

"جیسے بھی ہوا۔" جینی اداسی سے بولی۔ "راز تو فاش ہو ہی گیا، ورتھ اور پاپا تو مجھ سے چھن ہی گئے۔"

"لیکن ایک نہ ایک دن تو یہ راز فاش ہونا ہی تھا جینی۔" مارکس نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ "ہاں میں مانتا ہوں کہ اس طرح یہ راز... کھلنا نہیں چاہیے تھا۔"

مارکس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے یہ سچ بتا دے کہ اس کی اور ورتھ کی موی اس نے نہیں بنائی تھی بلکہ یہ اس کے استاد میجک ڈان کی کارستانی تھی مگر مصلحت یہ تھی کہ میجک کے قتل کا کیس ویسے ہی بہت مشکل سے فائلوں میں گم ہوا تھا اور اس کا ذکر ایک پولیس آفیسر کی بیٹی کے سامنے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔

"کیا تم میری اس ایمانداری کی تعریف نہیں کرسکتیں کہ ایک مجرم ہونے کے باوجود میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔" مارکس نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم کہو تو میں اس میری سے..... انتقام لینے میں تمہاری مدد کروں۔"

مارکس یہ راز جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر جینی میری سے کس قسم کا انتقام لینے کی پلاننگ کیے ہوئے تھی۔

"نہیں مارکس، میرا اصل ٹارگٹ میری نہیں بلکہ اس کا باس ہے۔" جینی نے وضاحت کی۔ "میرے پاس میری اس تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ اسی لیے تو میں اس کے دل میں اس حد تک اترنا چاہتی ہوں کہ اسے میرے علاوہ اپنا کوئی دوست نظر ہی نہ آئے۔"

"تو کیا وہ تمہارے کلب میں میری سے ملنے نہیں آتا؟" مارکس نے استفسار کیا۔ "آخر وہ ابھی تک تمہاری پہنچ سے دور کیوں ہے؟"

"نہیں، وہ میری سے ملنے کلب نہیں آتا ہے۔" جینی نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن وہ میری پہنچ سے دور بھی نہیں ہے مارکس۔ میرا پھندا ان کے گلے میں ہے بس اس کو کسنے کے لیے دو مضبوط ہاتھوں کی تلاش ہے، بہت جلد تم دیکھو گے کہ میں اپنے دشمنوں سے کیسا انتقام لیتی ہوں۔"

مارکس اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کی باتوں میں واقعی بہت گہرائی اور اعتماد تھا۔ وہ ایک بہترین منصوبہ ساز دماغ کی مالک معلوم ہورہی تھی۔ اس سے آگے اس کے دماغ میں کیا پلاننگ تھی مارکس اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا۔ اس کے بعد مارکس نے اس سے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی، وہ سمجھ چکا تھا کہ جینی اس کی سوچ سے بھی زیادہ گہری تھی اور پہلی ملاقات میں وہ اتنی آسانی سے کھل کر سامنے نہیں آنے والی ہے۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک ساتھ ہی ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔ مارکس اپنی بائیک پر سوار ہوا تو جینی سینڈل بجاتی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ مارکس اسے دور تک جاتے ہوئے بس دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ کتنی حسین تھی، وہ رات مارکس کے لیے بہت خوشی اور مسرت کی رات تھی، اس کی زندگی کی تنہائی میں کوئی ساتھی کوئی ہمسفر مل گیا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت جلد محبت کا رشتہ قائم ہوگیا تھا اور یہی وہ جینی تھی جو اس بھری دنیا میں مارکس کی واحد سہارا اور راز دار تھی۔ مارکس نے جینی کے ساتھ مل کر مستقبل کے منصوبے بھی بنا لیے تھے۔ دونوں کو ہی رہائش کے لیے نیویارک سٹی بہت پسند تھا اور جس ہوشیاری، ذہانت اور مکاری سے مارکس دولت کما رہا تھا، دونوں کو یقین تھا کہ مارکس کا شمار جلد از جلد شہر کے امیر ترین افراد میں ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے لوگ جو اس کے دشمن تھے اس کے خلاف کئی حربے آزما

کرنا کام ہو چکے تھے۔ مارکس تنہا تھا مگر اس کا طریقۂ واردات کچھ اس طرح تھا کہ بلیک میل ہونے والے شکار کو یہ خوف ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے بلیک میلرز کی ایک بڑی ٹیم لگ چکی ہے جس سے جان چھڑانا شاید ناممکن ہے۔ لہٰذا وہ مارکس کے مطالبے کے مطابق رقم ادا کر کے جان چھڑانے کو ہی بہتر جانتے تھے۔ پولیس بھی اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکی تھی۔ یہ الگ بات کہ ایک مجرم ہونے کے ناتے اس دوران اسے صرف ایک پولیس آفیسر سے خطرہ محسوس ہوا تھا جس کے ساتھ جینی نے اس کی ملاقات کروائی تھی۔ اس کا نام جیمز تھا، وہ جینی کے فادر کالٹن کا اسسٹنٹ تھا جو ان کی موت کے بعد ان کی جگہ تعینات کر دیا گیا تھا۔ جینی نے اب تک مارکس کی ملاقات میری سے نہیں کروائی تھی اور مارکس نے بھی اس کا اصرار نہیں کیا تھا۔ مارکس کو میری سے زیادہ اپنی دولت میں اضافہ کرنے اور اپنے کیس نمٹانے کی فکر تھی۔ اینجلو میسی کے تازہ ترین کیس سے فارغ ہو کر مارکس اپنے فلیٹ پر پہنچا تھا اور اب بستر پر لیٹا ٹی وی ... پروگراموں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی نیند نے اس کی پلکوں پر اپنا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا تو وہ ٹی وی بند کر کے نیند کی وادی کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کی تاریکی ختم ہوئی اور صبح کا اجالا نمودار ہوا تو سورج کی پہلی کرن مارکس کو بیدار کرنے کے لیے کھڑکی کے شفاف شیشے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس روشن کرن نے مارکس کے چہرے پر پہنچ کر اسے اپنے وجود کا احساس دلایا تو مارکس بیدار ہو گیا۔ حسبِ معمول وہ غسل کر کے ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ اس دوران وہ رونالڈ کے بارے میں مسلسل سوچتا رہا تھا۔ آخر وہ کس طرح رونالڈ سے انتقام لے۔ وہ اسے صرف مارنے کا ہی تمنائی نہیں تھا بلکہ وہ اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ رونالڈ کو اس نے ہر جگہ ڈھونڈ لیا تھا مگر رونالڈ تھا کہ بالکل ہی مفقود الخبر ہو چکا تھا۔ جب سے جینی مارکس کی زندگی میں آئی تھی رونالڈ سے انتقام لینے کی خواہش اس کے دل میں شدت اختیار کر چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس پہلو سے اب جلد از جلد فرار حاصل کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔

جینی نے اس کی زندگی میں ہلچل مچا دی تھی، رونالڈ سے جلد از جلد انتقام لینے اور جینی سے مل کر اس کے ساتھ اپنا گھر بسانے کی خواہش دیوانگی اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اپنے غلیظ کاروبار سے وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا جس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ رونالڈ کی تلاش سے مایوس ہوتا تو جینی کا تصور اسے حوصلہ دیتا تھا کہ جینی کس قدر ہوشیاری، لگن اور تگ و دو سے اپنے دشمن کو ڈھونڈ رہی ہے تو پھر مارکس ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ یہی باتیں سوچ کر اس کی ہمت دوبارہ جوان ہو جاتی تھی۔ انہی سوچوں میں وہ غرق تھا کہ اس کا دھیان جینی کی طرف چلا گیا۔ دو دن ہو گئے تھے جینی سے اس کا رابطہ نہیں ہوا تھا جبکہ جینی کے بغیر تو اس پر دو پل گزارنا گراں ہوتا تھا۔ وہم اس کے ذہن میں رینگ رہے تھے۔ اسی کشمکش کے عالم میں سیل فون کی بھنبھناہٹ نے اسے جھنجوڑ دیا۔

''ہیلو .....'' اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو مارکس، کیسے ہو؟'' دوسری طرف سے جینی کی گنگناتی ہوئی آواز سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

''او جینی کہاں ہو تم؟'' اس نے بے تابانہ استفسار کیا۔ ''نہ گھر پر ملتی ہو، نہ فون ریسیو کرتی ہو، یہ سب کیا ہے؟''

''او مارکس۔'' جینی کی آواز سیل فون کے ایئر پیس میں ابھر رہی تھی۔ ''دراصل میں نے گھر شفٹ کر لیا ہے۔''

''کہاں .....؟'' مارکس نے پوچھا۔

''یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔'' جینی نے اس کے تجسس میں مزید اضافہ کیا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں رونالڈ کا پتا بتا دوں تو .....؟''

''تو تو میں اس خبیث کو اسی وقت گولی مار دوں گا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔'' مارکس کے دل میں موجود نفرتوں کے سمندر اس کے لب و لہجے میں موجزن ہو گئے تھے۔ ''جلدی بتاؤ کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''تو پھر میری بات غور سے سنو۔'' جینی گویا ہوئی۔

''نہیں، پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کب اور کہاں مل رہی ہو؟'' مارکس کی بے تابی دیدنی تھی۔

''میں ابھی تمہیں نہیں مل سکتی۔'' جینی نے واضح الفاظ میں انکار کے بعد رکے بغیر سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔ ''میں بہت مصروف ہوں مجھ سے ملنے کے چکر میں تم رونالڈ کو کھو دو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مارکس نے ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر بتاؤ وہ مجھے کہاں ملے گا؟''

''آج وہ اپنے ایک پرائیویٹ بنگلے میں ایک لڑکی سے ملاقات کرے گا۔'' جینی نے تفصیلاً ساری بات بتانا شروع کر دی۔ ''یہ کوئی اعلیٰ برانڈ کی سگار کی اسمگلنگ کا معاملہ ہے۔ یہ بات میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم اچھی طرح سمجھ لو، رونالڈ اب وہ چھوٹا موٹا آدمی نہیں رہا ہے جسے تمہارے ڈیڈ نے سہارا دیا تھا۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے بہت

احتیاط سے کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ رونالڈ اس بنگلے میں اس لڑکی کے ساتھ بالکل تنہا ہوگا اور یہ معاملہ طے کرنے کے بعد رونالڈ فوراً لندن روانہ ہو جائے گا پھر وہ کب آتا ہے کب جاتا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے پاس انتقام لینے کا یہ سب سے سنہری موقع ہے۔''

''مگر اس بنگلے کا ایڈریس .....؟'' مارکس نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''تم لکھو، میں بتا رہی ہوں۔''

''تم مجھے ایس ایم ایس کرو.....''

''نہیں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو، ایس ایم ایس کمپنی ریکارڈ میں آتا ہے میں کسی طرح کا رسک نہیں لینا چاہتی۔'' جینی نے واضح کیا۔ ''یہ کوئی مذاق نہیں ہے، تم جانتے ہو ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔''

''تم بھی میرے ساتھ رہ کر ہوشیار ہو گئی ہو۔'' مارکس نے مسکرا کر کہا۔

''پتا نہیں کون کس کے ساتھ رہ کر کیا ہو گیا ہے۔'' مارکس کے کمنٹس پر جینی نے دھیمی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

مارکس نے اس کی ہدایت کے مطابق ایڈریس نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ جینی نے مکمل وضاحت کے ساتھ ایڈریس اور ملاقات کا وقت نوٹ کرا دیا تھا۔

''تم بھی آ رہی ہو نا؟'' مارکس جینی کے لیے بے تاب تھا۔

''نہیں میں بہت مصروف ہوں، میرا پہنچنا ممکن نہیں۔'' جینی نے یہ کہہ کر گفتگو کا سلسلہ ختم کرنا چاہا تو مارکس نے ایک مرتبہ پھر اس سے رونالڈ کے بارے میں سوال کر دیا۔

''ویسے اتنا تو بتا دو کہ وہ تمہیں کہاں، کیسے مل گیا اور تمہیں کیسے یقین ہے کہ یہ وہی رونالڈ ہے؟'' مارکس کے سوال میں تشویش کا عنصر بھی شامل تھا۔

''اُفوہ، بتا دیتی ہوں۔'' جینی نے اکتاہٹ کے ساتھ تفصیل بتانا شروع کی۔ ''بھئی، ایک ڈانس پارٹی کے دوران میری اس سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تھی۔ تم نے اس کے بارے میں اتنا کچھ بتا رکھا ہے کہ مجھے اس کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور پھر اس کی کچھ باتیں بھی چونکا رہی تھیں۔ اس دن کے بعد سے میں اس کے قریب ہوتی چلی گئی۔ وہ بڑھاپے میں بھی لڑکیوں کا بہت رسیا ہے۔ یہ نیا گھر بھی مجھے اس نے گفٹ کیا ہے اور جب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ وہی رونالڈ ہے جس کے تم متلاشی ہو تو آج میں نے تمہیں یہ سرپرائز دینے کا فیصلہ کر لیا، اب تم جانو اور تمہارا کام جانے، گڈ بائے۔''

''او کے، تھینک یو۔'' مارکس نے بھی شکریے کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔

مارکس کو اپنے وجود میں آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ جینی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اپنی الماری سے میگ کا پستول نکال کر لوڈ کر لیا تھا۔ چہرے کے نقوش تبدیل کرنے کے لیے اس نے ایک مخصوص قسم کا ماسک پہن لیا تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، آج سے پہلے وہ رونالڈ کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسا کوئی موقع اس کے پاس نہیں ہے، اب تو بس فوراً فیصلہ کرنے اور ایکشن لینے کا وقت تھا۔ اس کے بعد جینی کے ساتھ گزارنے کے لیے ایک محبت بھری پرسکون زندگی اس کی منتظر تھی۔ وہ فلیٹ سے نکلا اور اپنی موٹر سائیکل تقریباً اڑاتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جس کے بارے میں جینی نے اسے بتایا تھا۔ یہ ایک خوبصورت اور انتہائی پوش علاقہ تھا۔ تمام بنگلے ویرانی میں ڈوبے ہوئے تھے، مارکس اس بنگلے سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ موٹر بائیک کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کرنے کے لیے اس نے ایک محفوظ مقام کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنی تمام کارروائی سے فارغ ہو کر اسی بائیک پر اپنے فلیٹ تک واپس جانا تھا، اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موٹر بائیک کسی کی نظروں میں آئے اور آنے والے وقت میں اس کے لیے کسی مسئلے کا سبب بنے۔ اس کام کے بعد اس نے ہر طرف سے بنگلے کے محل وقوع کا اندازہ لگایا۔ وہ بنگلے میں داخل ہونے کے کسی مناسب راستے کی جستجو میں تھا۔ تمام جمع تفریق کے بعد اس نے بنگلے کے عقب میں ایک ایسا مقام ڈھونڈ ہی لیا۔ مارکس کا خیال تھا کہ اسے بنگلے میں داخل ہو کر رونالڈ کا انتظار کرنا چاہیے لیکن اس طریقے میں خطرہ زیادہ تھا۔ اس لیے مارکس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر باہر ہی اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اب وہ اپنے لیے ایک پوشیدہ مقام کا متلاشی تھا جہاں بیٹھ کر وہ بنگلے کے دروازے پر پوری طرح سے نظریں رکھ سکے لیکن اس کی سمجھ میں ایسا کوئی مقام نہیں آیا تو وہ بنگلے سے کچھ فاصلے پر اپنے کانوں سے موبائل فون لگائے ادھر ادھر ٹہلنے لگا جیسے وہ کسی سے بہت ضروری بات کر رہا ہو، اس کی نظریں اپنے شکار کے انتظار میں بار بار بنگلے کے گیٹ پر ٹھہر جاتی تھیں۔ جینی کے دیے ہوئے ٹائم

کے مطابق اس کا شکار وہاں پہنچنے ہی والا تھا...... اسی دوران میں اس نے اردگرد رونالڈ کے کارندوں کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن ایسا کچھ نہیں تھا حالانکہ یہ بات مارکس کے لیے باعثِ حیرت بھی تھی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بنگلے کے دروازے پر ایک سرخ رنگ کی کار آکر ٹھہر گئی اور اس میں سے ایک واجبی سی شکل وصورت والی دراز قد لڑکی برآمد ہوئی۔ یہ بات مارکس کی توقع کے برخلاف تھی۔ کیونکہ وہ تو اپنے اندازے کے مطابق رونالڈ کا منتظر تھا اور لڑکی کی اس طرح آمد بتا رہی تھی کہ رونالڈ پہلے سے اندر موجود ہے۔ مارکس کو اپنے دل میں ایک حسرت کا احساس ہوا کاش یہ اندازہ اسے پہلے ہوتا کہ اندر رونالڈ اکیلا ہے تو وہ بہت پہلے ہی اندر جا کر رونالڈ کو ختم کر کے یہاں سے فرار ہو جاتا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر بے تابی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ تھا لڑکی نے سرسری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کار ڈور لاک کر کے بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ کال بیل بجانے کی دیر تھی کہ دروازے کا الیکٹرک لاک اندر سے کھول دیا گیا۔ اب مارکس اپنے کام کے لیے تیار تھا۔ اردگرد نہ ہی رونالڈ کا کوئی کارندہ تھا نہ ہی لڑکی کا کوئی ہمراہی تھا۔ بس اسے چند خفیہ کیمروں کی نظروں سے پوشیدہ رہنا تھا۔ کسی بھی ذی روح کی موجودگی کو نہ محسوس کرتے ہوئے اس نے بنگلے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اپنے طے شدہ حصے سے وہ بنگلے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اپنا پستول ہاتھ میں تھامے ہوئے رونالڈ کو قتل کرنے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ اندر رونالڈ کی بیش قیمت کار موجود تھی۔ مارکس مختلف ہال کمروں اور راہداریوں سے دبے قدموں گزرتا رہا۔ راستے میں نظر آنے والے ہر کیمرے پر اپنی بے آواز پستول سے فائر کرتا اپنے خلاف بننے والے ہر ثبوت کو مٹاتا رہا لیکن وہ لڑکی اور رونالڈ اسے کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ آخر ایک کمرے کی کھڑکی کے شیشے میں سے مارکس کی نظریں رونالڈ پر جا ٹھہریں۔ رونالڈ نو وارد لڑکی سے باتوں میں مصروف تھا اس کے سامنے ٹیبل پر جام کے گلاس موجود تھے، مارکس ان گلاسوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونکا۔ گلاس تعداد میں تین تھے جبکہ یہاں رونالڈ اور اس لڑکی سمیت صرف دو افراد موجود تھے۔ مارکس کی چھٹی حس یہاں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا الارم بجا رہی تھی مگر مارکس اب پلٹ کر دیکھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ صرف اس کشمکش میں تھا کہ رونالڈ کو مارنے کے لیے وہ اس کے کتنا قریب جائے یا اسے خاموشی سے کھڑکی کے باہر سے ہی فائر کر کے ختم کر دے لیکن جذبات وجنون عقل وحواس پر غالب آنے لگے تھے۔ مارکس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔ وہ اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کی پستول کا رخ سیدھا رونالڈ کی طرف تھا۔ رونالڈ اور لڑکی اسے اس طرح یہاں دیکھ کر یکدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مارکس نے اپنے چہرے سے ماسک اتار دیا اور رونالڈ کو اپنی پہچان کرانا شروع کر دی۔

''پہچانا مجھے ظالم درندے۔'' مارکس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ''پہچان مجھے، میں کون ہوں؟''

''ہاں، بہت اچھی طرح پہچان گیا ہوں ڈریوڈ کے بیٹے۔'' رونالڈ کی آواز میں غراہٹ نمایاں تھی۔

''اچھا ہوا کہ تم نے اپنی موت کو پہچان لیا۔'' مارکس نے اپنے پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔

''ان کھلونوں سے بچوں کو ڈرایا جا سکتا ہے لڑکے، مجھے نہیں۔'' رونالڈ نے مسکراتے ہوئے کہا...''تم کیوں اپنی موت کو آواز دے رہے ہو بے وقوف بچے۔''

اس کی زہریلی مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لیے مارکس کو فکرمند کر دیا تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ رونالڈ کے آدمی اردگرد موجود تھے اور اب مارکس دشمنوں کے درمیان پھنس چکا تھا لیکن اسے فوراً ہی جینی کی بات یاد آگئی کہ رونالڈ اور وہ لڑکی بالکل اکیلے ہوں گے مگر ایسی کیا بات ہو سکتی تھی کہ رونالڈ نے باہر بھی اپنے آدمی نہ کھڑے رکھے ہوں، کہیں جینی نے مارکس کے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا تھا، ہزاروں سوال مارکس کے ذہن میں ابھرے اور تحلیل ہو گئے لیکن اب ان سوچوں اور سوالوں کا وقت نہیں تھا۔ اب تو مارکس رونالڈ کے کمرے میں موجود تھا اور رونالڈ اس کے سامنے تھا اگر مرنے کا وقت آ بھی گیا تھا تو مارکس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رونالڈ کو مار کر ہی مرے گا۔ اس خیال کے بعد اس نے نہ تو کوئی دوسری بات کی اور نہ ہی رونالڈ کی کوئی بات سنی بس اس کے بے آواز پستول نے شعلے اگلے تھے۔ جن کا رونالڈ نے بھرپور جواب دیا تھا رونالڈ بڑھاپے میں بھی بہت سخت جان اور پھرتیلا ثابت ہو رہا تھا، مارکس بھی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

اسی دوران لڑکی نے بھی مارکس کے عقب سے اس پر حملہ کیا تھا۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ میری...'' رونالڈ اپنی بھاری آواز میں چیخا۔

''لیکن باس.....'' لڑکی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پیچھے

ہٹ گئی۔ ان کے مختصر جملوں کا تبادلہ مارکس کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔ مارکس کے ذہن نے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ یہ لڑکی جینی کی دشمن کلب ڈانسر میری ویرن ہے اور رونالڈ ہی اس کا باس ہے جس کو جینی اپنے پاپا اور ورتھ کا قاتل گردانتی ہے جس کی تلاش جینی کو کلب تک لے گئی تھی اور مارکس کو دربدر بھٹکا رہی تھی لیکن جینی نے یہ بات مارکس سے کیوں چھپائی تھی؟ مارکس کے ذہن میں سوالیہ نشان ابھر گیا تھا۔ میری نے اس دوران بھاگنے کی کوشش کی مگر اس کی کنپٹی پر پڑنے والے مارکس کے۔۔۔ گھونسے نے اسے وہیں بے ہوش کر دیا تھا۔ یکایک مارکس کے پستول میں گولیاں ختم ہو گئیں اور نوبت دونوں کے درمیان باقاعدہ ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی تک آ گئی تھی۔ مارکس پاگلوں کی طرح رونالڈ پر حملے کر رہا تھا اور رونالڈ بھی بھرپور طریقے سے جواب دے رہا تھا۔ بالآخر مارکس کا جنون رونالڈ کی بوڑھی طاقت اور تجربے پر غالب آ گیا۔ رونالڈ زمین پر کچھ اس طرح گرا تھا کہ مارکس نے اس کا سر اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا لیکن مارکس دیوانہ وار اس پر ٹھوکریں برسائے جا رہا تھا یہاں تک کہ رونالڈ کے منہ سے غرغراہٹ کی آخری آواز بلند ہوئی۔ اس کی کھوپڑی خون میں ڈوب چکی تھی۔ وہ ایک لمحے میں ختم ہو گیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر مارکس میری کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے زندہ چھوڑنا مارکس کے لیے مشکل پیدا کر سکتا تھا۔ بالآخر اس کی اگلی ٹھوکر میری کے سر پر عین دماغ کے مقام پر پڑی اور میری ایک جھٹکا لے کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس نے دونوں لاشوں کو وہیں چھوڑا۔ اپنے تئیں اپنے جرم کے تمام ثبوتوں کو صاف کیا، ماسک دوبارہ چہرے پر سجایا اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔ پرسکون انداز میں چلتا ہوا وہ اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا اور موٹر سائیکل کو برق رفتاری سے تقریباً اڑاتا ہوا واپس اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے موٹر سائیکل کو بھی کہیں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی اس کے نزدیک اس کے جرم کا ایک ثبوت تھا۔ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد پورا کر چکا تھا۔ اب وہ پرسکون زندگی کی طرف قدم بڑھانا چاہتا تھا۔ تمام کارروائی سے فارغ ہو کر وہ فلیٹ پر پہنچا اور بہت دیر تک خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایک بلیک میلر ضرور تھا لیکن کوئی پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے اس خوف میں مبتلا کرتا جا رہا تھا کہ بس ابھی وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے والا ہے۔ اسے اس موقع پر

مجک کی یاد شدت سے ستا رہی تھی۔ کاش اس وقت وہ زندہ ہوتا اور مارکس کے ساتھ ہوتا۔ کاش وہ دیکھتا کہ اس کا شاگرد آج صرف ایک بلیک میلر ہی نہیں رہا بلکہ قاتل بھی بن گیا ہے۔ اس نے مطمئن ہونے کے لیے اپنی الماری سے سکون آور دوا۔۔۔ نکال کر دودھ کے ساتھ نگلی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسی وقت اس کا ذہن جینی کی طرف چلا گیا۔ جینی نے اسے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ جینی نے اسے میری اور رونالڈ کے بارے میں مکمل تفصیلات کیوں نہیں بتائی تھیں؟ اس نے یہ بات مارکس سے کیوں چھپائی تھی کہ جس لڑکی سے رونالڈ میٹنگ کرنے جا رہا ہے وہ جینی کی دشمن میری ہی ہے؟ اس نے مارکس کو یہ بات بھی کیوں نہیں بتائی تھی کہ میری کا باس رونالڈ ہی ہے؟ یہ سوال مارکس کو پاگل کیے دے رہے تھے پھر اس نے ان تمام سوالات کو دماغ سے جھٹک دیا، کچھ بھی تھا جینی نے اس کی زندگی پر بہت بڑا احسان کیا تھا، جس رونالڈ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ اور مجک پاگل ہو چکے تھے جینی نے مارکس کو اس تک بہت آرام سے پہنچا دیا تھا لیکن مارکس کی زندگی پر اتنا بڑا احسان کر کے جانے وہ خود کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا پرانا نمبر بند تھا اور جس نمبر سے اس نے رونالڈ کے بارے میں بتایا تھا وہ نمبر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ ایڈریس سے مارکس بالکل لاعلم تھا، اسی گھبراہٹ میں دوا۔۔۔ اثر انداز ہونا شروع ہو گئی اور مارکس پر نیند غالب آ گئی۔ رات کے کسی پہر میں موبائل فون کی الرٹ ٹون نے اسے بیدار کر دیا۔ موبائل فون کی ٹون اسے پولیس کی گاڑی کا سائرن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس طرح خوفزدہ ہو کر اٹھا جیسے اس نے کوئی بھیانک سپنا دیکھ لیا ہو۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی رات کے دو بج رہے تھے گویا اب تک کچھ غلط نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق رہا تھا۔ اس نے فون ریسیو کیا، دوسری طرف جینی تھی۔ جینی نے صرف حال احوال پوچھنے پر اکتفا کیا تھا اور بہت جلد دوبارہ ملاقات کی خوشخبری دیتے ہوئے مستقبل کے پلان کے بارے میں آگاہ کرنے کے متعلق بتایا تھا تاکہ وہ دونوں ایک نئی زندگی شروع کریں۔ اپنا ایڈریس اس نے اب بھی نہیں بتایا تھا۔ بہرحال مارکس کے لیے یہی غنیمت تھا کہ جینی نے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا تھا۔ مارکس اب لوگوں کو بلیک میل کرنے کا کام بند کر کے اپنی توجہ اپنے اسپیئر پارٹس کے کاروبار پر مبذول کر رہا تھا۔ اب اسے صرف جینی کا انتظار تھا۔ اس کے خیال میں ایک پیاری محبت بھری دنیا اس کی اور

جینی کی منتظر تھی۔ وہ اس بات کا شدت سے منتظر تھا کہ جینی کب اس کی زندگی میں شامل ہوتی ہے۔ رونالڈ کے قتل کا پانچواں دن تھا۔ اس لیے مارکس ذہنی طور پر بھی فریش ہو چکا تھا۔ رات کو وہ تھکا ہارا واپس اپنے فلیٹ پر پہنچا تو اسے فلیٹ کے ماحول میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کے فلیٹ میں داخل ہو کر کوئی کارروائی کی ہے لیکن کیا ہوا ہے؟ یہ بات بہت دیر غور و فکر کے بعد بھی اس کی نظریں نہیں بھانپ سکی تھیں۔ لہٰذا اس نے سب کچھ فراموش کر کے غسل کرنے کا ارادہ کیا اور غسل کر کے فریش ہونے کے بعد وہ ایک کپ کافی بنا کر لایا اور ٹی وی سیٹ پر رکھی ایک سی ڈی سی ڈی پلیئر میں لگا...

دی۔ اب وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا کافی پینے کے ساتھ ساتھ سی ڈی بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سی ڈی نے اس کی تمام توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ اس کا خیال یقین میں بدلتا جا رہا تھا اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کے فلیٹ میں آیا تھا۔ یہ سی ڈی مارکس کی نہیں تھی تو پھر یہ اس کے گھر میں کس طرح آئی؟ مارکس کو لگ رہا تھا کہ کچھ انجانے خطرات کے گھیرے اس کے گرد تنگ ہوتے جا رہے تھے۔ اسی وقت موبائل فون کی ٹون کو اس نے غراتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے مووی بند کرتے ہوئے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو......“ وہ خوف سے تھرتھراتی آواز میں بولا۔

”ہیلو، مارکس ہنری......“ دوسری طرف سے ایک مسکراتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں زہر گھول رہی تھی۔ ”کہو، کیسی لگی مووی۔ کتنے اچھے لگ رہے ہو تم ایک آدمی اور ایک لڑکی کو اتنے بھیانک انداز میں قتل کرتے ہوئے، بہرحال جو ہوا سو ہوا اب موت کی کرسی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ مووی کے بدلے میری منہ مانگی رقم اور رقم دینے کے لیے جگہ اور وقت نوٹ کرو اور اپنی جان بچانے کے لیے آجاؤ۔“

دوسری طرف سے اس سے مووی کے بدلے ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اب مارکس سمجھ چکا تھا کہ اس کا اندازہ اس وقت بالکل درست تھا۔ رونالڈ میری کی آمد سے قبل بھی اس بنگلے میں اکیلا نہیں تھا بلکہ شاطر منصوبہ ساز اس وقت خود رونالڈ کے ساتھ موجود تھا اور اس شیطانی دماغ نے ایک تیر سے تین شکار کیے تھے۔ اس نے نہ صرف رونالڈ اور میری کو مارکس کے ہاتھوں قتل کرایا تھا بلکہ وہیں ایک قاتل کی حیثیت سے مارکس کی مووی بھی بنائی تھی۔ مارکس کے پاس اپنے مخاطب کی بات ماننے کے علاوہ

کوئی چارہ نہیں تھا۔ مارکس سے اس کا تقریباً سب کچھ ہی مانگ لیا گیا تھا لیکن مارکس کے لیے اس وقت اس تمام دولت سے زیادہ اپنی زندگی قیمتی تھی۔ یہ دولت، فلیٹ، بنگلے گاڑیاں وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا تھا لہٰذا اس نے اپنے شکاری کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ بھی اپنے شکار کو مووی کے بدلے رقم دینے کے لیے مقام اور وقت کا تعین کیا کرتا تھا۔ آج اس کے شکاری نے اسے ہوٹل مور ینگل میں بلایا تھا۔ اپنی زندگی بھر کی کمائی کے بدلے مارکس مووی کا ماسٹر پرنٹ لے کر اپنے فلیٹ پر تھکے ہوئے قدموں سے واپس پہنچا ہی تھا کہ کال بیل کی چیخ نے اسے لرزا دیا۔ اس نے سی ڈی ایک خفیہ خانے میں پوشیدہ کر دی اور بوجھل بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”ہیلو ڈیئر مارکس ہنری! اپنی زندگی کا مقصد تم نے پورا کر لیا؟ آخر تم نے رونالڈ سے اپنا انتقام لے ہی لیا جس کے لیے تم نے میری خوشیاں تباہ کر دی تھیں اور یہ دیکھو کہ میں نے تم سے، میری سے اور میری کے پاس رونالڈ سے اپنا انتقام لے لیا۔ انتقام کی کہانی تو یہاں ختم ہوئی لیکن اس بھیانک مووی کا ماسٹر پرنٹ اب بھی پولیس کے پاس ہے مسٹر مارکس ہنری سو اب تم پولیس کو بھی اس کا فرض پورا کرنے دو تاکہ میں اور جیمو جلدی سے ہنی مون منانے کے لیے نیویارک سٹی جا سکیں......“

مارکس اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی کوئی اس سے اس قدر بھیانک انتقام بھی لے سکتا ہے۔ یہ تو سراسر دھوکا تھا۔ اس نے تو اپنے کاروبار میں بھی کسی کے ساتھ ایسے دھوکا نہیں کیا تھا مگر یہ کاروبار کہاں تھا یہ تو انتقام تھا۔ اس کی دوستی اور محبت کی آڑ میں اس کی کمر پہ کامیاب وار کیا گیا تھا۔ اس کے اعتماد کا خون کر دیا گیا تھا۔ اسے مہرہ بنایا گیا تھا اور پھر اس کی زندگی بھر کی کمائی ایک ہی جھٹکے میں اس سے چھیننے کے بعد اسے تڑپا تڑپا کر اس کی زندگی تباہ کرنے کے منصوبے پر کامیابی سے عملدرآمد ہو گیا تھا۔ موت کی کرسی شدت سے مارکس کی منتظر تھی۔ مارکس انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر کھڑے پولیس آفیسر جیمو نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ جینی کے تضحیک آمیز قہقہے اس کی بے وفائی اور فریب کی تصدیق کے لیے مارکس کے کان میں پگھلے ہوئے لاوے کے مانند سرایت کرتے جا رہے تھے۔

ماروی

محی الدین نواب

اٹھارھویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چھپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موز پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چمن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمیرو اور چاچی خیری کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون۔ لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ مراد اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف وکیل تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی معلومات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرے حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سکھی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس ٹیکنی کرٹ ایجنٹ ہرب روڈ کو رہا کرانے کے لیے امکانات لینے سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دلاور آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب ٹیک چکی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیکر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور وکیل صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ، ماروی کو جاننا چاہتا ہو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا اشکالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کروا لیتا ہے لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا مطلوب ایک مجرم بہارو مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد ادھر مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے پاس پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET قیصر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مگی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کینیڈی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب یہ عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو ہو بہو دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آتی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر مگی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مراد نے ایمان کو ساری تمام باتیں بتا دیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھگانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں سنگی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سنگی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئرپورٹ پر سنگی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا۔ محبوب نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مراد کے بغیر ہی ماروی اس کی نہیں ہو سکتی۔ ادھر لندن میں بلا نے سنگی براؤن کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا۔ شریلی نے سنگی کے بیٹے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ بلے کو شریلی کی فکر تھی اور وہ کسی بھی وقت دشمنوں کی گرفت میں آ سکتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اسٹیڈیم میں حالات معمول پر آ گئے تھے۔ مسلح پولیس کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب کوئی دھماکا نہیں ہوگا۔ تماشائی اپنی سیٹوں پر آ کر بیٹھ رہے تھے۔ رائفل شوٹنگ کا مقابلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

بلّے نے وہاں پہنچ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بشریٰ سے فون پر پوچھا۔ ''تو کہاں ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں گیٹ نمبر تھری کے باہر ہوں۔''

وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں اسی گیٹ کے سامنے ہوں۔ تو کہاں ہے؟ کیا تجھے میری کار نظر آ رہی ہے؟''

''ہاں نظر آ رہی ہے۔ دل سے دیکھے گا تو میں بھی نظر آ جاؤں گی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''دل کی آنکھوں سے کیسے دیکھوں؟ میرا دل تو تیرے پاس ہے... میری جان آ بھی جا...''

وہ کار کے پیچھے تھی۔ آگے بڑھ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''لے آ گئی...''

وہ اسے کھینچ کر ایک بازو کے حصار میں لے کر بولا۔ ''تو نے میکی براؤن کے پسینے چھڑا دیے ہیں۔''

وہ خود کو چھڑا کر بولی۔ ''کیا گھر نہیں ہے؟ یہاں آ کر انگریزوں کی طرح بے حیا بن رہا ہے؟''

''ہائے میری جان...! صبر نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے ٹریننگ حاصل کرے گی تو مریسہ جیسی بن جائے گی۔''

''تو ہمیشہ مریسہ کی مثال کیوں دیتا ہے؟ میں اس سے کم نہیں ہوں۔ چل اسے بلا اور دیکھ تماشا اس کے بھی بارہ بجا دوں گی۔''

اس نے ہنستے ہوئے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی پھر کہا۔ ''میرے ساتھ رہ کر کارنامے انجام دیتی رہے گی تو تجھ پر فخر کروں گا۔''

پھر وہ کار روک کر بولا۔ ''تو ڈرائیو کر۔ میں میکی سے باتیں کروں گا...''

انہوں نے جگہ بدل لی۔ بشریٰ کار ڈرائیو کرنے لگی۔ وہ فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگا۔

میکی ڈی بلیک کی گاڑی میں اسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے فون سے رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ اس نے اسکرین پر انجانے نمبر دیکھے پھر فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہیلو کون؟''

بلّے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر کہا۔ ''قہقہے سے پہچان نہیں سکو گے۔ میرے لب و لہجے سے پہچانو۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''مراد...!''

مراد کا نام سنتے ہی پوری فیملی چونک گئی۔ ڈی بلیک گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے رفتار کو سست کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز اسپیکر کی آواز بڑھاؤ، مجھے سننے دو۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟''

اس نے آواز بڑھا دی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سب ہی افراد سننے لگے۔ بلّا کہہ رہا تھا۔ ''ہاں تو فرعون کی اولاد...! اپنے باپ کی آواز پہچان گئے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ایک بیٹے کے بعد دوسرے کی باری ہے لیکن میں اتنی جلدی کھیل ختم نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے تمہارے بیٹے کو صرف زخمی کیا ہے اور خالی کار کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔''

وہ خطرناک دشمن بے بسی سے فون کال سن رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تم سے اتحاد رکھنے والے دوسری تنظیموں کے سربراہوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ کس طرح مارنے سے پہلے دہشت پیدا کرتا ہوں۔ وہ تمام سربراہ بھی میری نظروں میں ہیں۔ لیکن تم سے نمٹنے کے بعد ان کی نیندیں حرام کروں گا۔''

میکی کا ایک اتحادی سربراہ ڈی بلیک اس وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا باپ بھی ہماری پرچھائیں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ میں ڈینجرس ریکٹ کا ڈی بلیک بول رہا ہوں۔ لندن میں تمہاری موت بن کر آیا ہوں۔''

بلّے نے کہا۔ ''پہلے حساب کرو۔ میں نے انڈیا میں تمہارے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ مجھے میکی سے نمٹ لینے دو پھر تمہیں گھاس ڈالوں گا۔''

ہیلنا نے رونے کے انداز میں کہا۔ ''فار گاڈ سیک میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرو۔ تمہاری دشمنی اس کے باپ سے ہے۔''

انہیں جواب ملا۔ ''اس کی آئندہ نسل کو ختم کروں گا تو دشمنی باپ سے ہی ہوگی۔ اگر میرا ایک مطالبہ پورا کیا جائے گا تو تمہارے بیٹے کی جان چھوڑ دوں گا۔''

میکی نے پوچھا۔ ''کیا مطالبہ ہے تمہارا؟''

بلّے نے کہا۔ ''سنا ہے تم اپنی بیٹی میڈونا کی شادی کسی سے کرنا چاہتے ہو؟ کون ہے وہ بدنصیب؟''

''وہ ڈاکٹر میکی سن کا بیٹا ایمان علی ہے۔''

''یہ شادی نہیں ہوگی۔ میں نے دور سے دیکھا ہے، تمہاری بیٹی بڑی پٹاخہ ہے، پہلی دیوالی میں مناؤں گا۔''

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا بکواس کر

رہے ہو؟ مرد کے بچے ہو تو میرے سامنے آکر بولو پھر تم ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکو گے۔''

''شادی کا پیغام دینا ہوتا تو تمہارے سامنے آنا پڑتا۔ میں تو بس سوچ مستی کروں گا۔''

میڈونا غصے سے اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''جب تک دل نہیں بھرے گا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بعد تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔''

ہیلنا نے چیخ کر کہا۔ ''یہ دشمن کی اولاد کیا کہہ رہا ہے؟ یہ...... یہ میری بیٹی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ یہ براؤن فیملی کی بیٹی ہے۔ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔''

''چلو وعدہ کرتا ہوں۔ اسے معمولی بنا دوں گا۔'' وہ فون کے سامنے چٹکی بجا کر بولا۔ ''ایک چٹکی بجا کر معمولی بنا دوں گا۔ اب تمہارا بیٹا ہی نہیں، بیٹی بھی ٹارگٹ بن گئی ہے۔ اب اگر ہمت ہے تو ایمان علی سے اس کی شادی کا دن مقرر کرو پھر اس کا انجام دیکھو۔''

بلے نے فون بند کر دیا۔ میڈونا، ایمان علی (مراد) کے لیے دیوانی ہو رہی تھی۔ بھائی کی ہلاکت کے باعث وہ فیملی دس دنوں تک سوگ منا رہی تھی ورنہ میکی براؤن نے فرعون بن کر حکم دیا تھا کہ دوسرے ہی دن ایمان علی کو اس کی بیٹی سے شادی کرنی ہوگی۔

اگرچہ شادی ذرا ٹل گئی تھی لیکن میڈونا مطمئن تھی کہ دس دنوں کے بعد ہی سہی، وہ ایمان کی آغوش میں پہنچ جائے گی۔

اسی لیے بلے نے ابھی چیلنج کیا تھا تاکہ میکی فرعون بن کر ایمان علی کو داماد بننے پر مجبور نہ کرے اور واقعی وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے ہیلنا سے کہا۔ ''سوگ منانے کے بعد شادی نہیں ہوگی۔ کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنی ہوگی۔''

میڈونا نے احتجاج کیا۔ ''نو پاپا! آپ جرائم کی دنیا میں ناقابلِ شکست کہلاتے ہیں۔ کیا بیٹی کی خوشی کے لیے ایک دشمن کو راستے سے ہٹا نہیں سکتے؟ کہاں ہے آپ کی فرعونیت؟''

''بکواس مت کرو۔ آنکھوں سے دیکھ رہی ہو کہ وہ کسی طرح بھی ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ ہمیشہ ہمیں ہی نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس نے تمہارے ایک بھائی کو قتل کیا ہے۔ دوسرے کو اسپتال پہنچا کر ثابت کر رہا ہے کہ وہ ہماری فیملی میں گھسا آ رہا ہے۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''وہ کیسا جیالا ہے، یہ ابھی زخمی بیٹے اور ہماری کار کی تباہی نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے، تم بھی سمجھو۔ نادان بچی نہ بنو۔''

ڈی بلیک نے کہا۔ ''اس کتے نے اچانک فون بند کر دیا۔ ورنہ ابھی اس کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیتا۔''

میکی نے پوچھا۔ ''فون پر کیا کرتے؟ کیا اسے گولی مار دیتے؟ کیا اسے ہم سے کہیں دور لے جا کر اس سے پیچھا چھڑا دیتے؟''

وہ بولا۔ ''میکی! تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ میں دشمن کا چیلنج سن کر پیچھے ہٹنا نہیں جانتا۔''

وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''ابھی اس کا نمبر پنچ کرو۔ میں اس سے بولوں گا کہ میں میڈونا کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں ایک ہفتے کے اندر ایمان علی سے اس کی شادی کروں گا۔ میں اسے چیلنج کروں گا کہ اس نے ماں کا دودھ پیا ہے تو آئے اور اس شادی کو روکے۔''

میڈونا نے خوش ہو کر کہا۔ ''انکل! آپ بہت اچھے ہیں۔''

باپ نے کہا۔ ''بے وقوف لڑکی! انکل کے منصوبے کو سمجھو۔ تمہارا چارا ڈال کر مراد کو اپنی طرف آنے پر مجبور کرے گا۔ وہ سرپھرا ہے۔ چیلنج قبول کرے گا۔ تمہیں وہاں سے اٹھانے یا مار ڈالنے آئے گا۔''

پھر وہ بے بسی سے بولا۔ ''ہم اسے گھیرنے اور پکڑنے کے سلسلے میں ناکام ہوتے آ رہے ہیں۔ یہ ڈی بلیک ناکام ہوگا تو اس کا کچھ نہیں جائے گا۔ یا تو تم جان سے جاؤ گی یا عزت سے جاؤ گی۔''

ڈی بلیک نے کہا۔ ''جب میڈونا کی شادی میرے علاقے میں ہوگی تو وہاں تم اور تمہارے گن مین بھی خاصی تعداد میں ہوں گے۔ ہم اسے ٹریپ کرنے کی زبردست پلاننگ کرنے کے بعد میڈونا اور ایمان علی کی شادی کا دن مقرر کریں گے اور اسے چیلنج کریں گے۔ اس کا باپ بھی میڈونا کو اغوا نہیں کر سکے گا۔''

ہیلنا نے کہا۔ ''برادر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس شادی کے بہانے اسے گھیرنے کا اچھا موقع ملے گا۔ وہ تو ہمارے لیے ملک الموت بن گیا ہے۔ ابھی اسی وقت کوئی ٹھوس پلاننگ کریں۔ کسی دن تو اس سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر اب کیوں نہیں۔''

وہ ماں تھی۔ ایک بیٹے کی ہلاکت کے بعد دوسرا ابھی زخمی ہوا تھا۔ وہ آخری بیٹے کی سلامتی کے لیے چاہتی تھی ابھی بیٹی کا چارا ڈال کر مراد کو پھانس لیا جائے۔

میکی اس کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس ذلیل کمینے سے جلد ہی پیچھا چھوٹ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ میں اپنے مشیروں سے بات کرنے کے

بعد ڈی بلیک کی بات مانوں گا۔"

وہ سب چپ ہو گئے۔ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ گاڑی کی محدود فضا میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

مرینہ برونزانو کو اسٹیڈیم سے کچھ دور ایک اسپتال میں لے آئی تھی۔ دھماکے سے تباہ ہونے والی کار کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے سینے پر بھی آ کر لگا، چوٹ گہری نہیں تھی۔ ایمرجنسی میں فوراً ٹریٹمنٹ ملتے ہی وہ ہوش میں آ گیا تھا۔

وہاں مرینہ نے اس کے لیے ایک کمرا حاصل کیا۔ کرائے کا بوائے فرینڈ بھی اس بوڑھے پی اے کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ اس کے لیے دودھ، مکھن، پھل، میوے اور دوائیں لا رہا تھا۔ مرینہ نے اس پرسنل سیکریٹری کو ٹریپ کرنے کی پلاننگ کرنے سے پہلے اس کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔

یہ معلوم ہوا تھا کہ برونزانو پندرہ برسوں سے میکی براؤن کی خدمت کر رہا ہے۔ چھ برس پہلے میکی نے اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنا مشیر اور رازدار پرسنل سیکریٹری بنا لیا تھا۔

ریڈ الرٹ کا ہیڈ کوارٹر سسلی میں تھا، وہیں ایک عالی شان محل میں میکی اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ محل کے ایک طرف ہیڈ کوارٹر کی بڑی سی عمارت تھی۔ عمارت کے احاطے میں کئی چھوٹے چھوٹے رہائشی بنگلوز بنے ہوئے تھے۔ وہاں صرف رازدار باڈی گارڈز' قانونی مشورے دینے والے بیرسٹر، مشیر اور پرسنل سیکریٹری کی فیملیز رہتی تھیں۔

ان سب کو اور ان کے بیوی بچوں کو بھی سسلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہی علاقے میں جہاں جاتے تھے وہاں ان کی سختی سے نگرانی کی جاتی تھی۔ مسلح گارڈز ان کے آس پاس رہا کرتے تھے۔ انہیں کسی غیر ضروری فرد سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک بار میکی کا ایک رازدار باڈی گارڈ اس سے بدظن ہو کر اس کی ملازمت چھوڑنا چاہتا تھا۔ میکی نے اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ باڈی گارڈ سمجھ گیا تھا کہ آقا کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اپنی حفاظت کے لیے اسے باڈی گارڈ بھی نہیں رہنے دے گا۔

تب اس بدنصیب نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور سسلی کی بندرگاہ تک پہنچتے پہنچتے حرام موت مارا گیا تھا۔

میکی براؤن کی لائف ہسٹری میٹ ڈپارٹمنٹ کے ریکارڈ روم میں تھی۔ مرینہ نے اسے پڑھ کر کام کی کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور خوب سوچ سمجھ کر بوڑھے برونزانو کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

وہ اسپتال کے کمرے میں اپنوں سے دور پڑا تھا۔ مرینہ کو اپنی خدمت میں مصروف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوری طرح حواس میں آنے کے بعد پوچھا۔ "بیٹی! تم کون ہو؟"

وہ بولی۔ "میرا نام ثلاشہ ہے۔ میں استنبول سے آئی ہوں۔ یہاں گرینڈ کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں ٹیچر ہوں۔ میں نے اسٹیڈیم میں آپ کو دیکھا تو چونک گئی۔ یوں لگا جیسے اپنے ڈیڈی مرحوم کو دیکھ رہی ہوں۔ آپ ان سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔"

وہ کمزوری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے اپنا باپ ہی سمجھو۔ میرے لیے اپنے دل میں درد رکھتی ہو۔ مجھے اٹھا کر یہاں لائی ہو۔ میرا علاج کرا رہی ہو۔ تمہارے سینے میں ایک محبت کرنے والا دل ہے۔ تم ایک بیٹی کی طرح خدمت کر رہی ہو۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "آہ۔۔۔! میرا آقا اور ان کے کسی گارڈز نے یہ معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ میں ان کے کام سے کار کی طرف گیا تھا اور اسی وقت دھماکا ہوا تھا۔ کسی کو میری پروا نہیں ہے کہ میں زندہ ہوں بھی یا نہیں؟"

مرینہ اسے فون دیتے ہوئے بولی۔ "آپ کا یہ فون میں نے رکھا تھا۔ اب تک کوئی کال نہیں آئی ہے۔ واقعی کسی کو تو آپ کی خبر لینی چاہیے تھی۔ صرف ایک کال کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ آپ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

اس بوڑھے کی آنکھوں سے دکھ درد جھلکنے لگا۔ مرینہ اس کے پاس آ کر بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ اپنی بیوی بچوں کا فون نمبر بتائیں۔ میں ان سے رابطہ کراتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "میری بیوی ریچا بہت بیمار ہے اور ایک پیاری سی بیٹی ہے۔ اس کا نام جولیا ہے۔ میں اپنی یہ حالت بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سسلی میں ہیں۔ انہیں بے خبر رکھوں گا تو وہ سکون سے رہیں گی۔"

"اپنے باس کے نمبر بتاؤ۔ میں تم سے بات کراتی ہوں۔"

"میرے باس کا نام میکی براؤن ہے۔ فون میں اس کے نام سے نمبر محفوظ ہے۔"

مرینہ نے فون میں اس کا نام اور نمبر پڑھتے ہوئے کہا۔ "میں نے پچھلے دنوں ایک میکی براؤن کا نام اخباروں میں پڑھا ہے۔ ٹی وی کی خبروں میں سنا ہے، وہ ایک بدنام

زمانہ مجرم ہے اور کسی نے اس کے بیٹے کو گولی ماردی تھی۔"

وہ بولا۔ "یہ وہی میکی براؤن ہے، بہت خطرناک شخص ہے۔ تم اس سے بات نہ کرنا۔ مجھے نمبر پنچ کرکے دے دو۔"

اس نے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ اس کا فون بزی ہے۔ دس منٹ بعد ری ڈائل کرنے سے رابطہ ہوگیا۔ مرینہ نے فون کو اس کے کان سے لگا دیا۔ وہ فون کو پکڑ کر بڑی نقاہت سے بولا۔ "باس! میں اسپتال میں زخمی پڑا ہوں۔ جب بلاسٹنگ ہوئی' تب میں آپ کی کار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ زخم کھاتے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔"

میکی براؤن نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میرے دشمن کا نشانہ تم بن گئے۔ کیا زخم گہرا ہے؟"

"یہ میرے بڑھاپے کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں برداشت کر رہا ہوں، شاید ایک ہفتے تک چلنے پھرنے کے قابل ہوسکوں گا۔"

"اسپتال کا نام بتاؤ، تمہارے لیے خدمت گار بھیج رہا ہوں۔ علاج معالجے میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جتنا کیش چاہو گے' ملے گا۔ آرام سے وہاں رہو۔ اطمینان سے علاج کراتے رہو۔"

اس نے التجا کی۔ "جناب عالی! میرا بڑھاپا میری کمزوری اور میری تنہائی بیوی اور بیٹی کے لیے تڑپ رہی ہے مجھ پر رحم کریں۔ مجھ پر بھروسا کریں۔ سخت نگرانی میں جولیا کو میری تیمارداری کے لیے بھیج دیں۔ مجھے دلی اطمینان حاصل ہوگا۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں کسی رازدار کے کسی فیملی ممبر کو کسی سے باہر جانے نہیں دیتا۔ بیوی بچے تمہاری کمزوریاں ہیں۔ وہ تمہارے مرتے دم تک میری پابندیوں میں رہیں گی۔ تمہاری نگرانی کرنے والے اور خدمت کرنے والے ابھی آ رہے ہیں۔"

رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ بڑے دکھ سے گونگے فون کو دیکھنے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا وہ تمہاری بیٹی کو تیمارداری کے لیے نہیں بھیجے گا؟"

وہ بڑے کرب سے بولا۔ "وہ اپنے خاص رازداروں کو بڑی رقمیں دیتا ہے، بڑے عیش و آرام سے رکھتا ہے لیکن قیدی بنا کر رکھتا ہے۔ میں اس کے اہم رازوں کا امین ہوں۔"

مرینہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ بیوی اور بیٹی کے ساتھ عیش و عشرت سے قیدی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر تو اس زندگی کے عادی ہوگئے ہوں گے۔"

"میں عادی نہیں بلکہ مجبور ہوگیا ہوں۔ مرنے سے پہلے آخری خواہش یہی ہے کہ اپنی بیٹی کو وہاں سے نکال کر کہیں دور لے جاؤں۔"

"کیا بیٹی وہاں محفوظ نہیں ہے؟"

اس کے چہرے سے تکلیف ظاہر ہوئی۔ اس نے نہیں کہتے ہوئے سر ہلایا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا مسئلہ ہے؟"

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مسئلہ رہنے دو۔ کیا کرو گی پوچھ کر؟"

"آپ کی تکلیف دور کروں گی۔ کسی کام آؤں گی۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کوئی ہمارے کام نہیں آسکتا۔ وہ پہاڑ ہے، اس کے سامنے سب تنکا ہیں۔"

وہ بولی۔ "تنکا اڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے حالات بتائیں گے۔ کم سے کم اپنی بیٹی کا ہی مسئلہ بتائیں گے اور مجھے وہاں کے راستے معلوم ہوں گے تو میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گی۔"

وہ بڑی محبت سے بولا۔ "میری بیٹی! تم بہت بھولی ہو۔ یہ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ اس وقت کتنا احمقانہ دعویٰ کر رہی ہو۔ وہ۔۔ تمہیں ایک پھونک میں اڑا دے گا۔"

"آپ میکی براؤن کے اندر کی کمزوریاں جانتے ہیں، وہ کتنا ہی شہ زور کیوں نہ ہو، کسی سے تو مات کھاتا ہوگا۔ کیا وہ کسی کے ہاتھوں پریشان نہیں ہو رہا ہے؟ اس خطرناک شخص کے ایک بیٹے کو کسی نے ہلاک نہیں کیا ہے؟"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں پاکستان کا رہنے والا ایک شخص مراد علی منگی ہے۔ وہ اس کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا رہا ہے۔ جوان بیٹے کی ہلاکت نے اسے کسی حد تک توڑ ڈالا ہے۔"

مرینہ نے اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر اس مراد علی منگی کو تمہاری مجبوریاں معلوم ہوں گی تو پھر یقین کرلو کہ تمہاری بیٹی وہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکل آئے گی۔"

اس نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں نے کئی بار سوچا ہے۔ کوئی مراد جیسا جیالا ہی میری جولیا کو عزت کی زندگی دے سکتا ہے، وہاں سے کسی طرح لا سکتا ہے اور اس کے دوسرے بیٹے جیکی کو بھی قتل کرسکتا ہے۔"

مرینہ نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم چاہتے ہو، جیکی بھی مراد کے ہاتھوں مرے؟"

"ہاں مراد، روبی براؤن کو ہلاک نہ کرتا، جیکی براؤن کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تو ہمارے تمام مسائل ختم ہوجاتے۔"

"کیا جیکی براؤن تمہاری بیٹی کو ٹارچر کرتا ہے؟ کیا اس کی عزت سے کھیلتا ہے؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر آنکھیں بند کرلیں، وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ایک باپ کے جھکے ہوئے سر نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں لیکن نظریں جھکی رہیں۔

وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ "جب سے وہ پیدا ہوئی تب سے دل میں رہتی ہے۔ ہم نے اسے پھول کی طرح رکھا۔ وہ ہمارے لیے کانچ کی گڑیا تھی۔ ہم اسے ٹوٹنے سے بچاتے رہے۔ وہ ایک بار بیمار ہوئی قریب المرگ ہوگئی۔ ہم نے موت سے لڑ کر بچالیا۔ لیکن آقا کے بیٹے سے نہ بچا سکے۔"

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچا پھر ہونٹ کھلے اس نے کہا۔ "میں نے دبی زبان میں آقا سے شکایت کی۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ میرے بیٹے کے خلاف میرے منہ پر بول رہے ہو۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟ جولیا اسے پسند آگئی ہے تو دل بہلانے دو۔ تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے گی۔ میں اس ملازمت پر لعنت نہیں بھیج سکتا تھا۔ میں اس کے ایک ایک راز کا امین ہوں۔ ملازمت چھوڑنے کی بات کرتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔"

وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "میری بیٹی کے کیسے کیسے سپنے تھے۔ آقا زادے نے خاک کردیے۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے لیکن نفرت ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔"

"وہ ظالم آقا کہتا ہے، انتظار کرو۔ جب میرے بیٹے کا دل بھر جائے گا تو اسے چھوڑ دے گا لیکن وہ نہیں چھوڑے گا، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میکی صاحب ایک ملازم کی بیٹی کو بہو نہیں بنانا چاہتے۔"

مرینہ نے کہا۔ "آپ کی باتیں سن کر ایک کام کی بات معلوم ہوئی کہ جولیا، جیکی براؤن کے حواس پر چھائی ہے۔"

"ہاں، جولیا کہہ رہی تھی کہ اس سے شادی کرنے کے لیے باپ کے خلاف بڑبڑاتا رہتا ہے۔"

مرینہ نے اسے سمجھایا۔ "جولیا اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"

"وہ کیسے فائدہ اٹھائے گی؟"

"بیٹی سے بولیں، وہ جیکی کو اپنے ساتھ لندن یا کسی دوسری جگہ سیر و تفریح کے لیے لے جائے۔ وہ سیکیورٹی کے انتظامات کے ساتھ جولیا کو سسلی سے باہر لے جائے گا تو باپ اعتراض نہیں کرے گا۔"

"وہ اپنے بیٹے کو بھی اجازت نہیں دے گا۔"

"آپ بوڑھے ہیں۔ یہ نہیں سمجھیں گے کہ جوان لڑکی لڑکے سرپھرے والدین سے کس طرح اپنی باتیں منوا لیتے ہیں۔ یہ آپ کی نظروں میں کمزوری کوشش ہوگی پھر بھی کوشش کریں۔ آپ جولیا سے بات کریں۔ وہ جیکی کو شیشے میں اتارے گی۔ جیکی اپنے باپ سے اپنی ضد منوائے گا۔"

"چلو مان لیتا ہوں۔ وہ جیکی کے ساتھ سسلی سے باہر آجائے گی پھر کیا ہوگا؟"

وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "مراد اسے ہمیشہ کے لیے جیکی سے نجات دلا دے گا اور اسے تحفظ بھی فراہم کرے گا۔"

وہ حیرانی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مراد میری مشکل آسان کرنے کہاں سے آئے گا؟ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

وہ بولی۔ "یہ سب کہتے ہیں کہ مراد کو مرینہ کہیں چھپا کر رکھتی ہے۔ کیا آپ نے مرینہ کا نام سنا ہے؟"

"بہت سنا ہے، وہ یہاں کی میٹ آفیسر ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی، اس نے جینز کی پچھلی جیب سے میٹ آفیسر کا آئی ڈی کارڈ نکال کر دکھایا پھر کہا۔ "میں ہوں مرینہ، پہلے یقین کرلو۔ یقین نہیں کرو گے تو اپنی گڑیا جیسی بیٹی کو بھی وہاں سے رہائی دلا نہیں سکو گے۔"

"تم مجھے الجھا رہی ہو۔ میں نے مرینہ کی تصویریں دیکھی ہیں۔"

"یہ جو چہرہ دیکھ رہے ہو، اس کے پیچھے میں ہی ہوں۔ کبھی مراد سے تمہارا سامنا ہوگا تو اسے بھی پہچان نہیں سکو گے، ہم دشمنوں سے اپنے اصلی چہرے چھپائے رکھتے ہیں۔ اس لیے محفوظ ہیں اور آزادی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر کشمکش میں رہ کر بولا۔ "مجھے تم پر بھروسا کرنا ہوگا۔ میں اپنی جولیا کو ہر قیمت پر وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی مجھ پر زیادہ بھروسا نہ کرو۔ صرف اپنی بیٹی کو سمجھاؤ کہ وہ جیکی کے عشق اور دیوانگی سے فائدہ اٹھائے، اسے اپنے اشارے پر چلائے اور سسلی سے باہر آجائے۔ وہ جس ملک میں بھی پہنچے گی ہم اسے جیکی اور اس کے سیکیورٹی گارڈز کے چنگل سے نکال لائیں گے پھر اسے محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔ وہاں تمہارے آقا کا کوئی آدمی نہیں پہنچ سکے گا۔"

بروزانو فون پر بیٹی سے رابطہ کرنے لگا۔ نیٹ ورک کی خرابی کے باعث کچھ دیر تک پریشانی رہی، پھر رابطہ ہوگیا۔ وہ مرینہ کے مشورے کے مطابق بیٹی سے باتیں کرنے لگا۔

اسے اپنی موجودہ حالت بتائی تو وہ باپ سے ملنے کے لیے پریشان ہو گئی۔ وہ وہاں کی پابندیوں سے بیزار تھی۔ باپ نے فرار کی راہ سمجھائی تو وہ راضی ہو گئی۔

میکی براؤن کی طرف سے آنے والے خدمت گاروں نے فون پر بروزانو سے کہا کہ وہ بیس منٹ میں آرہے ہیں۔

مرینہ نے کہا۔ "میں جارہی ہوں، مجھے میکی کے کسی کارندے کے سامنے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں فون کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں گی۔"

وہ اس سے مصافحہ کر کے اسپتال سے باہر آگئی۔ شام چھ بجے کی فلائٹ سے مراد، ماروی اور عبداللہ کھڈی آنے والے تھے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ وہ اپنی رینٹڈ کار میں آکر بیٹھ گئی، کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے کچھ دور جا کر رک گئی تاکہ میکی براؤن کے آدمیوں کی نظروں میں نہ آئے۔

پھر اس نے فون نکال کر ماسٹر کو بوبو سے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں مرینہ بولو۔"

وہ بولی۔ "تمہیں تو معلوم ہو چکا ہوگا، بلے نے بڑی کامیاب واردات کی ہے۔"

"ہاں بلے نے بتایا ہے، اس کی دو گاڑیاں تباہ ہو گئی ہیں۔ اگرچہ وہ میکی کے کسی فیملی ممبر کو نقصان نہیں پہنچا سکا پھر بھی ایک اچھی کارکردگی دکھائی ہے، مراد علی کے نام سے اور زیادہ دہشت پھیلا دی ہے۔"

"ماسٹر! بلے کی اس واردات سے میں نے ایک بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ میکی براؤن کے ایک بوڑھے رازدار پرسنل سیکریٹری بروزانو کو ٹریپ کیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کیا واقعی؟"

"تمہیں یہ سن کر اور خوشی ہوگی کہ اس سے دوستی کر لی ہے۔ وہ مجھ پر اعتماد کر رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان فون کے ذریعے خفیہ رابطہ رہا کرے گا۔"

"تم نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ اپنے آقا کے خلاف تم سے دوستی رکھے گا؟"

مرینہ نے اسے بتایا کہ بروزانو اپنے آقا سے بدظن ہو گیا ہے۔ آقا کے بیٹے نے اس کی بیٹی کو داشتہ بنالیا ہے۔ وہ بیٹی کو سسکی سے باہر لانے کے لیے مرینہ کی پلاننگ پر عمل کر رہا ہے۔ وہ بولی۔ "جب جولیا جیکی کے ساتھ وہاں سے نکل کر کسی ملک میں پہنچے گی۔ تب میں، مراد اور بلا ان کی سیکیورٹی توڑ کر جولیا کو رہائی دلائیں گے۔ اسے اپنی پناہ میں کہیں رکھیں گے۔ اسی دن جیکی براؤن کو ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"ویری نائس مرینہ! دوسرا بیٹا جائے گا تو میکی براؤن کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ یہ بتاؤ کیا تم ڈیوٹی پر واپس جاؤ گی؟"

"نہیں، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ پورا میٹ ڈپارٹمنٹ یہی چاہتا ہے کہ مراد کے ذریعے پچاس لاکھ ڈالرز وصول ہو جائیں۔ میں نے اس ملازمت پر لعنت بھیج دی ہے۔"

"اچھا کیا۔ تمہیں ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم مراد کو جان سے زیادہ چاہتی ہو۔ میرا ہی کام کرتی رہو۔ میں میٹ والوں سے زیادہ پے کیا کروں گا۔"

"انہوں نے میرے اپارٹمنٹ پر پہرا بٹھا دیا ہے تاکہ میں ادھر جاؤں تو پکڑی جاؤں۔ میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے بینک اکاؤنٹ کو فریز کر دیا ہے۔"

"نیا اکاؤنٹ نئے نام سے کھولو۔ جتنی رقم جب چاہو گی وہاں جمع کرا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی ائرپورٹ جارہی ہوں۔ تم نے مراد اور ماروی کے لیے جس کنکٹڈ فلائٹ میں سیٹیں لی ہیں، وہ دو گھنٹے بعد سن سٹی کے لیے روانہ ہوگی۔ میں ان کے ساتھ ائرپورٹ میں دو گھنٹے گزاروں گی۔"

"میں اس وقت فون پر مراد سے باتیں کروں گا۔ یہاں اس کی رہائش اور سیکیورٹی کے انتظامات مکمل ہیں۔ تم بروزانو سے لگی رہو۔ کوشش کرو کہ اس کی بیٹی آج کل میں وہاں سے نکل آئے۔"

"میں کوشش کرتی رہوں گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے ائرپورٹ کی طرف جانے لگی۔ ابھی وہ ایک بات سے بے خبر تھی کہ بشریٰ نے ایک چونکا دینے والا کارنامہ انجام دیا ہے اور دشمنوں کی نئی پلاننگ کے مطابق میکی براؤن کی بیٹی میڈونا کی شادی ڈی بلیک کے علاقے میں ہوگی۔

اس سے پہلے ہی بلے نے مراد بن کر انہیں چیلنج کیا ہے کہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ اس سلسلے میں دشمن منصوبہ بنا رہے تھے کہ میڈونا اور ایمان علی کی شادی کے بہانے مراد کو کس طرح ٹریپ کیا جائے گا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ دشمنوں کے تمام منصوبے طشت ازبام ہو جائیں۔ اس لیے مرینہ، مراد اور بلا ابھی بے خبر تھے۔

وہ ائرپورٹ پہنچ گئی۔ وہاں ایک جگہ بیٹھ کر جہاز کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ فون کی رنگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔ اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو؟"

بلنے کی آواز سنائی دی۔ ''میں بلال احمد بلا بول رہا ہوں۔ ابھی ماسٹر نے تمہارا یہ نمبر دیا ہے اور کہا ہے ہمارے درمیان رابطہ رہنا چاہیے۔ مجھے تمہارے ساتھ کام کرنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے تمہارے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔ تم بہت اچھے جا رہے ہو۔''

''مراد ماروی کو لے کر آرہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا ہے۔ میں ابھی ائرپورٹ میں ہوں۔ اس سے دور رہوں گا۔ میری وائف بشریٰ عرف بلی میرے ساتھ ہے۔ وہ مراد اور ماروی کو پہلی بار دیکھنے آئی ہے۔''

وہ دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی یہاں ہوں۔ تمہارا نام تو سنا ہے لیکن کبھی دیکھا نہیں ہے۔''

بلا بھی دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی تمہیں صورت سے پہچان نہیں سکوں گا۔''

''میں چہرہ بدل چکی ہوں۔ جب مراد آئے گا اور میں اس سے ملوں گی تب مجھے دیکھ سکو گے۔''

''کیا تمہیں اندر جانے کی اجازت ملے گی؟''

''نہیں، ہم یہاں سامنے وزیٹرز لابی میں جالی کے اطراف رہ کر ملیں گے۔''

اسی وقت لاؤڈ اسپیکر سے کہا گیا کہ پاکستان سے آنے والی فلائٹ رن وے پر اتر چکی ہے۔ وہ انتظار کرنے لگے۔ مراد کو کسٹم چیکنگ کے لیے نہیں جانا تھا کیونکہ وہ وہیں اندر رہ کر دوسری فلائٹ سے جانے والا تھا۔ اس نے اپنی ماروی کی ٹکٹیں وہاں سے حاصل کیں۔ اس میں اچھا خاصا وقت گزر گیا۔

مرینہ نے عبداللہ کبڈی کو دیکھا۔ وہ وزیٹرز لابی میں آ کر ممی سن کے ساتھ عمارت سے باہر جا رہا تھا۔ جب مراد ماروی کے ساتھ جالیوں کے پاس آیا تو مرینہ نے آ کر کہا۔

''سر! میرا نام ثلاشہ ہے۔''

مراد پہلے ہی ثلاشہ کے متعلق ماروی کو بتا چکا تھا کہ ماسٹر کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک گائیڈ ان سے لندن ائرپورٹ میں ملے گی۔ وہ بے حد حسین بھی تھی۔

مراد نے کہا۔ ''ماسٹر کہہ رہا تھا تم ہماری گائیڈ بن کر رہو گی۔''

مرینہ نے کہا۔ ''پہلے تو میں تمہاری وائف کو سلام کرتی ہوں۔ ماشاء اللہ ایسا قدرتی حسن اور ایسی کشش پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ یو آر لکی مراد!''

ماروی نے کہا۔ ''شکریہ۔ مراد کہہ رہے تھے تم ہمارے ساتھ رہو گی۔''

''ہاں، دو چار روز میں ایک اہم معاملے سے نمٹنا ہے مراد کو یہاں آنا ہوگا۔ تب میں دن رات ساتھ رہا کروں گی۔''

وہ مراد کو بروزنزالو اور اس کی بیٹی کے پرابلمز بتاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے میکی براؤن کے اس رازدار پی اے کا اعتماد کسی حد تک حاصل کر لیا ہے۔ جب ہم اس کی بیٹی جولیا کو رہائی دلائیں گے اور اسے اپنی پناہ میں رکھیں گے تو بروزنزالو ہم پر اندھا اعتماد کرنے لگے گا اور ہمیں میکی کی ایسی کمزوریاں بتاتا رہے گا جن سے ہم کھیلتے رہیں گے۔ اسے مٹی میں ملاتے رہیں گے۔''

بلا جالیوں سے دور اپنی بلی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ مراد جالی کے پاس کہاں کھڑا ہے۔

بلی نے کہا۔ ''تم نہ بھی بتاؤ تب بھی پہچاننے کے لیے ماروی بھابی کا مشرقی حسن ہی کافی ہے۔ ہائے نی...... کیسی من موہنی ہیں۔ جی چاہتا ہے دوڑ کے جاؤں اور گلے سے لگا لوں۔''

''گلے لگانے جائے گی تو جالی سے ٹکرائے گی۔ تجھے سمجھایا ہے، ہمیں ان سے دور اجنبی بن کر رہنا ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور جالی کے پاس کھڑی ہوئی مرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ آئندہ اس کے ساتھ کام کرنا تھا۔ ادھر مراد ماسٹر سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے پوچھا۔ ''ثلاشہ! تمہاری شادی ہوگئی ہے؟''

وہ مسکرائی۔ سمجھ گئی ماروی کے دل میں اندیشے چٹکیاں لے رہے ہیں۔ اس نے کن انکھیوں سے مراد کو دیکھ کر کہا۔ ''میں ایک جیالے سے محبت کرتی ہوں۔ جلد ہی اس سے شادی کرنے والی ہوں۔''

ماروی نے گھور کر کہا۔ ''تم مجھ سے بول رہی ہو اور مراد کو دیکھ رہی ہو۔''

وہ پھر مسکرا کر بولی۔ ''ماسٹر سے ہونے والی باتیں سنتے وقت تو دیکھنا ہی پڑے گا۔ اتنا چھوٹا دل نہ رکھو۔ تمہارے میاں کو ہزاروں عورتیں دیکھتی ہیں۔ ہماری دنیا میں مراد کا واسطہ کتنی ہی عورتوں سے پڑتا ہے۔ کیا تم ان سب کو حکم دو گی کہ مراد کو نہ دیکھیں؟''

''میں انہیں عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش کروں گی۔''

''تم ایک بہت ہی ایڈوانس اور ماڈرن عورتوں کے ملک میں آئی ہو۔ وقت اور حالات کے مطابق خود کو بدلنا چاہیے۔ ابھی یہ جالی رکاوٹ نہ بنتی تو میں تم سے اور مراد سے مصافحہ کرتی۔ آئندہ ملاقات میں کروں گی۔ تم اعتراض کرو گی تو ماسٹر مراد سے کہے گا کہ اس کی وائف بیک ورڈ پسماندہ اور ناخواندہ ہے۔ تم اپنے ساتھ مراد کی بھی انسلٹ کرو گی۔ پلیز

اپنے مرد پر بھروسا کرو۔ یہ تمہارا ہے، تمہارا ہی رہے گا۔"

بشریٰ عرف بلی ماروی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بلے سے پوچھا۔ "وہ کون عورت ہے، مراد بھائی کے سامنے کھڑی ہے؟"

"وہ مراد کی طرح زبردست فائٹر ہے، آج سے میں اس کے ساتھ رہ کر کام کروں گا۔"

"کوئی ضروری ہے عورت کے ساتھ رہ کر کام کرنا؟"

وہ تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھ بلی! لڑنے والی کوئی بات نہ کرنا۔ میں نے پہلی ہی سمجھایا ہے ہم مجرمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض حالات میں عورتوں کے ساتھ دن رات رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھ پر بھروسا کرنا ہوگا۔ میں تیرا ہوں تیرا ہی رہوں گا۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "کروں گی بھروسا۔ کرنا ہی ہوگا مگر دیکھو تو اتنی دور سے صاف پتا چل رہا ہے کہ بھابی اسے پسند نہیں کر رہی ہیں۔ وہ عورت ہے کون؟ بھابی کو تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ تم ابھی فون پر اس سے بول رہے تھے۔ ابھی بولو کہ وہاں سے جائے نہیں تو......"

وہ گھور کر بولا۔ "نہیں تو؟"

"میں اس کے بال پکڑ کر وہاں سے کھینچتی ہوئی لے آؤں گی۔"

"پاگل ہوئی ہے؟"

وہ بولی۔ "یہ میرے پاکستان کی بیٹی ہے، میری بھابی ہے۔ میں کسی سوکن جیسی عورت کو برداشت نہیں کروں گی۔"

"چپ ہو جا۔ وہ ابھی چلی جائے گی۔"

وہ ایک سرپھری کو سمجھا رہا تھا۔ دوسری سرپھری آ گئی۔ وہ میڈونا تھی۔ اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ کسی فلائٹ سے سسلی جا رہی تھی۔ بلے نے میکی براؤن کو دیکھ کر زیرلب کہا۔ "یا خدا! یہ جانی دشمن کہاں سے آ گیا۔"

اس دشمن نے مراد...... ایمان علی کو یعنی ہونے والے داماد کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جالیوں سے بہت دور تھا۔ میڈونا کسی ضرورت سے ادھر جا رہی تھی۔ اس نے مراد کو دیکھ لیا۔ وہ تڑپ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ پڑی۔ "ایمان! تم کہاں گئے تھے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ باہر آؤ......"

مراد اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "مصیبت آ رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی قریب آ گئی تھی۔ مراد ماروی کا ہاتھ پکڑ کر اسے انجان بن کر وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے آواز دی۔ "ایمان! مجھ سے منہ پھیر کر کیوں جا رہے ہو؟ یہ لڑکی کون ہے؟ تمہاری شادی مجھ سے ہونے والی ہے ....."

وہ ماروی کے ساتھ آگے جا کر ایک طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پھر چیخ پڑی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ڈیڈ! اسے روکیں ..."

مرینہ بھی وہاں سے دور ہو گئی تاکہ میکی براؤن اسے نئے روپ میں نہ دیکھے۔ میکی دور تھا، اس نے بیٹی کی آواز نہیں سنی۔ وہ دوڑتی ہوئی باپ کی طرف جانے لگی۔ بلی کے بالکل قریب سے گزرنے لگی۔ اس لمحے میں بلی نے چپکے سے ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ آگے کی طرف اچھل کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ نہ سکی۔

بلی نے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "منحوس... ! میری بھابی کا رستہ روک رہی تھی......"

☆☆☆

بلی نے ایسی حرکت کی تھی کہ بلا ایکدم سے بوکھلا گیا تھا۔ اس سرپھری نے مسلح دشمنوں کی موجودگی میں میکی براؤن کی بیٹی کو اوندھے منہ گرایا تھا۔ ایک بچکانا حرکت کر کے جرائم کی دنیا میں بلے کے لیے نئے خطرات کو دعوت دی تھی۔

بلے نے فوراً ہی اس کے گداز بازو کو پکڑا اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے دور لے جاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "الو کی پٹھی! یہ کیا کیا تو نے؟ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ابھی خیریت تھی۔ نصیب اچھے تھے۔ دشمن ان سے ذرا دور تھے۔ کسی نے بلی کو میڈونا سے دشمنی کرتے نہیں دیکھا تھا۔

جب وہ گرتے وقت چیخ پڑی، تب ماں باپ اور بھائی نے سر گھما کر دیکھا پھر ان کے ساتھ مسلح گارڈز بھی دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ اوندھی پڑی تھی۔ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

میکی براؤن نے بیٹی کے پاس فرش پر دوزانو ہو کر اسے دونوں بازوؤں سے اٹھایا۔ پختہ فرش پر اوندھے منہ گرنے کے باعث ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ماں اپنے اسکارف سے لہو پونچھتے ہوئے بولی۔ "او مائی گاڈ... ! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیسے گر پڑیں؟ کیا کسی نے تمہیں گرایا ہے؟"

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں نے تمہاری آواز سنی تھی۔ شاید تم چیختی ہوئی کچھ کہہ رہی تھیں؟"

میڈونا کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے جالیوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ادھر ہاتھ

اٹھاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ ”وہ...... وہ ایمان......“

وہ آگے نہ بول سکی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ سر پر بھی چوٹ آئی تھی۔ للی نے بہت ظلم کیا تھا۔ آخر وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی بولی۔ ”پاپا... ! وہ ایمان وہاں ہے۔“

ان سب نے جالیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں ایمان تو کیا، کوئی بے ایمان بھی نہیں تھا۔ باپ نے کہا۔ ”مائی ڈیئر... ! کیا کہہ رہی ہو؟ وہاں تو صرف کنکٹڈ فلائٹ کے مسافر ہوتے ہیں۔ کیا تم نے ایمان علی کو دیکھا ہے؟“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”ہاں، وہ کسی جوان خوب صورت لڑکی کے ساتھ ہے۔ وہ اس کی کون ہوگی ڈیڈ؟“

وہ باپ کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ”اسے پکڑیں۔ نہیں تو وہ چلا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے، اس کا دل پھر گیا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے منہ پھیر کر اس لڑکی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ وہ کون ہوگی؟ اسے پکڑیں ڈیڈ......!“

میکی براؤن اور جیکی براؤن فوراً وہاں سے دوڑتے ہوئے جالی کے پاس آئے۔ بشریٰ نے اگرچہ جیکی کو زخمی کیا تھا۔ تاہم وہ میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔

وہ جالی کے پاس آکر دور تک متلاشی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اندر کئی مسافر عورتیں، مرد اور بچے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ مراد کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

مرینہ ان سے دور ایک طرف کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ رہی تھی۔ پہلے پریشان تھی کہ مراد ان کی نظروں میں آجائے گا تو کیا ہوگا؟ پھر اسے اطمینان ہوگیا کہ دشمن اس کی پرچھائیں بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ بھی اطمینان تھا کہ وہ قانون کے خلاف اسے دیکھنے اور پکڑنے کے لیے اندر نہیں جا سکیں گے۔ پھر اس نے مطمئن ہو کر سر گھما کر ایک سمت دیکھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر بلا اور للی دبی آواز میں جھگڑ رہے تھے۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں میرا ہاتھ پکڑا ہوا ہے؟ کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟“

”اری! وہ بہت خطرناک آدمی کی بیٹی ہے۔ ان کا پورا خاندان مراد کا جانی دشمن ہے۔ اگر وہ تجھے دوستی کرتے دیکھ لیتے تو ہمیں زندہ نہ چھوڑتے۔“

میڈونا فرش پر سے اٹھتے ہوئے ماں سے بولی۔ ”مام! میں دوڑتی ہوئی ڈیڈ کو بولنے آرہی تھی کہ ایمان ادھر ہے۔ ایسے وقت کسی عورت نے میری ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔“

یہ بات چونکا دینے والی تھی کہ کسی نے براؤن فیملی کی بیٹی کو گرایا تھا۔ تمام مسلح گارڈز متلاشی نظروں سے دور تک دیکھنے لگے۔ اس کی ماں بھی آس پاس کسی دشمن عورت کو تاڑنے لگی۔ بلا پہلے ہی اسے وہاں سے دور لے گیا تھا۔

میڈونا گرنے سے پہلے اپنی دھن میں بھاگتی جارہی تھی۔ وہ للی کی صورت نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے باپ اور بھائی کو دیکھا۔ وہ جالیوں کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی مراد کی طرف سے اندھے ہو گئے تھے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔

بلے نے پھر للی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔ ”چل یہاں سے ...... وہ ماں بیٹی تجھے ڈھونڈ رہی ہیں۔ کیا میڈونا نے دوڑتے وقت تجھے دیکھا تھا؟“

”میں کیا جانوں؟ دیکھا ہوگا۔ وہ خطرناک باپ کی بیٹی ہوگی اپنے گھر میں۔ اونہہ... !“ وہ حقارت سے بولی۔ ”تو نے دیکھا نہیں، وہ پاگل کی بچی بھابی اور مراد بھائی کو روکنے والی تھی۔“

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ ”یہ بتا، یہ تمام کتے کیا اندر جا کر انہیں پکڑ سکیں گے؟“

”نہیں وہ میکی براؤن جتنا طاقتور اور وسیع ذرائع کا مالک ہے، اتنا ہی قانون کی نظروں میں ناقابل گرفت مجرم ہے۔ اس پر پابندیاں بہت ہیں۔ یہاں ائرپورٹ پر انٹیلی جنس والے اس کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔“

وہ بولی۔ ”اللہ کرے یہ مرجائے۔ مراد بھائی کو نہ دیکھ سکے۔“

بلے نے پارکنگ ایریا میں آکر کار کا اگلا دروازہ کھولا اور کہا۔ ”تو یہاں بیٹھ۔ میں کام سے جارہا ہوں۔ خبردار میرے واپس آنے تک گاڑی سے باہر نہ نکلنا۔“

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ”ارے واہ... ! تجھے دیر ہوگی تو کیا ڈھونڈنے بھی نہ آؤں؟“

”کہہ دیا نا یہاں سے باہر نکلے گی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ دیر ہوگی تو تجھے کال کرلینا۔“

وہ اسے کار میں چھوڑ کر تیزی سے چلتا ہوا پھر عمارت کے اندر آیا۔ للی کو وہاں سے دور کار میں بٹھانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مرینہ سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ عورتوں کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لیے اسے وہاں چھوڑ کر آیا تھا۔

مرینہ ایک جگہ بیٹھی میکی براؤن اور اس کے آدمیوں کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب ہی تجسس میں مبتلا تھے۔ کسی طرح معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایمان علی وہاں کس لڑکی کے ساتھ ہے اور کس فلائٹ میں کہاں جارہا ہے؟ میکی

براؤن کوشش کر رہا تھا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے اندر جانے کی اجازت مل جائے۔

بلّے نے مرینہ سے ملاقات سے پہلے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو مرینہ...! میں بلّا بول رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”ہائے بلّے...! کہاں ہو تم؟ ابھی مجھ سے آ کر ملو۔ ہمارے درمیان شناسائی ضروری ہے۔“

”میں یہیں ائرپورٹ پر ہوں۔ جب تم مراد سے باتیں کر رہی تھیں، تب میں نے تمہاری صورت دیکھی تھی۔ اس وقت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں قریب آ جاؤں؟“

اس نے دشمنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں مل سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، دشمنوں کو ہم پر شبہ نہیں ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”میرے موجودہ روپ میں کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ کیا تمہیں کوئی دوست یا دشمن پہچان سکتا ہے؟“

”کوئی نہیں پہچانے گا۔“

”تو پھر چلے آؤ۔ میں بھی ملنا چاہتی ہوں۔“

وہ فون بند کر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میڈونا اور اس کی ماں کے قریب سے گزرنے لگا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ براؤن فیملی کے افراد اب کیا کرنے والے ہیں؟

اس وقت میکی اپنے بیٹے جیکی کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر بیٹی سے بولا۔ ”اتنا معلوم ہوا ہے کہ ابھی ایک جہاز سن سٹی جا رہا ہے۔ شاید ایمان علی اسی جہاز میں جائے گا۔“

وہ باپ کے پاس آ کر بولی۔ ”پلیز ڈیڈ! اسے کسی بھی طرح روکیں۔ جانے نہ دیں۔“

”میں اسے روک نہیں سکوں گا۔ ابھی صرف سن سٹی کے مسافروں کو اندر جانے کی اجازت ہے۔“

بلّا قریب ہی رک کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہاں آس پاس اور کئی مسافر اور وزیٹرز کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میکی نہ اس پر شبہ کر سکتا تھا، نہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میکی نے سر گھما کر جالیوں کی طرف دیکھا پھر بیٹی سے کہا۔ ”ہمارے بدترین دشمن ماسٹر کو بوبو کا ہیڈ کوارٹر سن سٹی میں ہے۔ ایمان علی کا بھلا ماسٹر سے کیا لینا ہے؟ میں سوچ رہا ہوں، وہ خواہ مخواہ ادھر کیوں جائے گا؟“

پھر اس نے اندازاً کہا۔ ”دو گھنٹے بعد ہمارا جہاز روانہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے، ایمان اسی جہاز سے کہیں جا رہا ہو؟“

میڈونا تو جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”او گاڈ...! ہیلپ می۔ وہ میرے جہاز کا مسافر ہوگا تو میں اس سے نمٹ لوں گی۔ شادی مجھ سے ہونے والی ہے اور وہ کسی دوسری کے ساتھ آسمانوں میں اڑتا پھر رہا ہے۔“

بلّے کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمن مراد تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یونہی خیال آرائیاں کرتے رہیں گے۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ کر مرینہ کے پاس آیا۔ وہ پہلی بار ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تھے۔

مرینہ نے مسکراتے ہوئے اندازہ کیا کہ وہی بلّا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔

وہ جواباً مسکرا کر بولا۔ ”تمہاری آنکھیں سوال کر رہی ہیں اور جواب ہے کہ میں بلّا ہوں۔“

وہ میکی براؤن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہاں دشمن کی فیملی کے پاس رک کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ اطمینان ہوا ہے کہ وہ مراد تک نہیں پہنچ پائیں گے اور اب تو اس کا جہاز ٹیک آف کرنے والا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں اسی انتظار میں بیٹھی ہوں کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر نکل جائے۔“

بلّا اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”وہ اسے روک نہیں سکیں گے لیکن میکی کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ سن سٹی جا رہا ہے اور وہاں ماسٹر کو بوبو کے سنڈیکیٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اب یہ دشمن معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ ایمان علی وہاں کیوں گیا ہے؟“

مرینہ نے کہا۔ ”ہاں، یہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اب وہ دشمن اس کی ٹوہ میں رہے گا۔ ماسٹر کو ابھی انفارم کرنا ہوگا۔“

اس نے اپنا فون نکال کر ماسٹر سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”یہاں ائرپورٹ میں مراد کا راستہ روکنے والا تھا۔ میکی براؤن کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ سن سٹی جا رہا ہے۔ وہ یہاں تو اسے روک نہ سکا لیکن سن سٹی میں گڑبڑ کر سکتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”اس کا باپ بھی یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ میرا علاقہ ہے۔ یہاں صرف میری حکمرانی ہے۔ اس کے کسی شوٹر کو یہاں آنے تو دو۔ وہ ایک کی لاش دیکھ کر پھر کسی دوسرے کو ادھر نہیں بھیجے گا۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”تم اس کے پی اے برونزانو اور اس کی بیٹی کے معاملے میں کیا کر رہی ہو؟“

”انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے اس کی بیٹی جولیا آج کل میں جیکی کے ساتھ سسلی سے باہر آئے گی۔“

”ان کے ساتھ بہت ہی سخت سیکیورٹی ہوگی۔ اس سے پہلے تم ٹھوس پلاننگ کرو۔“

”پہلے دیکھنا ہوگا کہ وہ دونوں کس ملک میں جائیں

گے۔ وہاں کے ماحول اور حالات کے مطابق سوچا جائے گا۔'' پھر اس نے اپنے دل کی بات کہی۔ ''آپ یہ بات ذہن میں رکھیں۔ میں پہلے سے کہہ دیتی ہوں، وہاں مراد میرے لیے ضروری ہوگا۔ بہت ضروری ہوگا۔''

بلا اس کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مراد سے بولیں کہ وہ ہنی مون ایک جگہ نہ منائے۔ جس ملک میں جولیا اور جیکی جائیں گے، وہاں بھی لہوا چھالنے کے لیے ہنی مون منانے چلا آئے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''ہاں وہ نئی دلہن کے ساتھ ہے۔ اسے یہاں سن سٹی میں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اسے ساتھ لے جائے گا، ابھی وہ دو گھنٹے میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔''

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ مرینہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میدانِ جنگ میں صرف فائٹر عورت کو جانا چاہیے۔ میں نے ماروی کے بلے کہہ تو دیا ہے لیکن وہ ایک سیدھی سادی سی شریک حیات ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی مشن پر رہے گی تو پرابلم بن جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

بلے نے کہا۔ ''یہی مشکل میرے ساتھ ہے۔ میری للی فائٹر ہے، لیکن عورتوں والی لڑائی جانتی ہے۔ اگلے مشن میں کوشش کروں گا کہ اسے یہیں اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر جاؤں۔'' پھر وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہائے ری عورت...! بیوی بننے کے بعد پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

مرینہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا ارادہ ہے...... کیا بیزار ہو؟ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''عورت بیوی بننے کے بعد پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

''پھر تو وہ بوجھ لگتی ہوگی؟''

وہ پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ یہاں معاملہ الٹا ہے۔ میں اس سے دور نہیں رہنا چاہتا۔ وہ ساتھ رہتی ہے۔ ایسی مزیدار باتیں کرتی ہے، ایسی دلچسپ حرکتیں کرتی ہے کہ میں بارود اور آگ سے گزرنے کی ساری تھکن بھول جاتا ہوں۔''

''جب تم نے میکی کے بیٹے کو گولی ماری تو کیا وہ تمہارے ساتھ تھی؟''

''نہیں وہاں بڑے خطرات تھے۔ میں اسے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میرا پیچھا کر رہی تھی۔''

''یہی تو کہہ رہی ہوں، عورت بیوی بننے کے بعد پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کیا وہ کار چلانا جانتی ہے؟''

''ہاں میں سن سٹی میں ٹریننگ حاصل کرتا رہا۔ وہ بھی بہت کچھ سیکھتی رہی۔ چھوٹی گن چلا لیتی ہے مگر نشانہ پکا نہیں ہے۔''

پھر مسکرا کر بولا۔ ''لیکن بہت تیز طرار ہے۔ کل اس نے اسٹیڈیم میں میکی کے دوسرے بیٹے پر گولی چلائی تھی۔''

''کیا واقعی...؟''

مرینہ نے بے یقینی سے دور کھڑے ہوئے میکی کے بیٹے جیکی کو دیکھا۔ بلے نے کہا۔ ''اسے گولی چھو کر گزر گئی تھی۔ اس لیے چلتا پھرتا دکھائی دے رہا ہے۔ بشریٰ کا نشانہ ابھی کچا ہے۔''

مرینہ نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''پھر بھی لڑنے مرنے والی تو ہے۔ ماروی کی طرح صرف اپنے مرد کی پیچھے وار تو نہیں ہے۔ تو یہ بہت ہی شکی مزاج ہے۔'' پھر وہ ناگواری سے بولی۔ ''کیا تم نے دیکھا تھا، میں مراد سے باتیں کر رہی تھی اور اس کے تیور بدل گئے تھے۔''

''تم ماروی کی بات کر رہی ہو۔ ادھر میری للی کے تیور بھی بدل گئے تھے۔ وہ تمہارے خلاف بول رہی تھی۔ دنیا کی تمام بیویاں اپنے حقوق کے مطابق چاہتی ہیں کہ ان کے شوہروں سے کوئی دوسری عورت بات نہ کرے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''صاف نظر آرہا ہے۔ یہ بیویاں کچھ گل کھلائیں گی۔ میں نے دیکھا تھا وہ ابھی تمہارے ساتھ تھی۔''

''ہاں میں اسے پارکنگ ایریا میں کار کے اندر بٹھا کر آیا ہوں اسے تاکید کی ہے کہ ادھر نہ آئے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''آئے گی تو تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر گریبان سے پکڑ کر لے جائے گی۔''

''میں اسے اتنی ڈھیل نہیں دیتا کہ میرا گریبان پکڑے۔ یہ چاہتا ہوں کہ وہ تم سے بھی بدتمیزی نہ کرے۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے دیکھا تھا؟ میڈونا ٹھوکر کھا کر نہیں گری تھی۔ للی نے ٹھوکر مار کر اسے گرایا تھا۔''

اس نے چونک کر حیرانی سے بلے کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''او گاڈ! کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

''میڈونا باپ سے کہنے جارہی تھی کہ مراد ان جاسوسوں کے پیچھے ہے۔ اسے جانے سے روکا جائے۔ ایسے وقت للی کی کھوپڑی گھوم گئی۔ دماغ میں یہ بات سما گئی کہ کوئی اس کی ماروی بھابی کو جانے سے نہ روکے۔ اس نے میڈونا کو اوندھے منہ گرا کر باپ تک پہنچنے سے روک دیا۔''

"مائی گاڈ! تمہاری عورت تو بڑی تیز طرار ہے۔ کچھ کر گزرنے کے لیے دیر نہیں کرتی۔ تم اسے ڈھیل دیتے رہو گے اور وہ ایسی حرکتیں کرتی رہے گی تو مشکلات سے دو چار ہوتے رہو گے۔"

بلے نے کہا۔ "اس نے دشمنوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ میں یہاں سے بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ میڈونا کے گارڈز دور تک میری بلی کو تلاش کرنے کے لیے بھٹک رہے ہیں۔"

"بہتری اسی میں ہے کہ اپنی بیوی کو ہمارے معاملات سے دور ہی رکھا کرو۔ جاؤ، اسے یہاں سے دور لے جاؤ۔"

وہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بار بار بے چینی سے ادھر دیکھ رہی تھی، جدھر بلا گیا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ دل میں کھد بدی ہو رہی تھی۔ یہ بات اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھی کہ وہ حسین چڑیل مراد بھائی سے باتیں کر رہی تھی۔ مراد بھائی تو چلے گئے مگر وہ ادھر ہی ہوگی اور بلا ادھر ہی گیا ہے۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوچا۔ 'میں بلے کو اس کے ساتھ کام کرنے سے نہیں روک سکوں گی۔ کیا کروں؟ ان لوگوں کا کام ہی ایسا ہے۔'

وہ کار کی کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔ 'جرائم کی دنیا میں عورتیں بھی بندوق چلاتی ہیں۔ میں نے بھی کچھ سیکھا ہے لیکن میں غیر مردوں کے ساتھ کام کرنے والی عورتوں کی طرح بے حیا اور بدمعاش نہیں ہوں۔'

اس سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ بلے کے پاس جانے کی بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کار سے باہر نہ نکلے اور عمارت کے اندر نہ آئے۔ وہ تذبذب میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ اسے کھولے یا نہ کھولے؟ باہر جائے یا نہ جائے؟

ایسے ہی وقت ایک شخص اس کے پاس آیا۔ اس کے قریب کھڑکی پر جھک گیا۔ وہ ایک سیاہ نیگرو تھا۔ کالے چہرے پر دو سفید دیدے چمک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تو سفید دانت یوں لگے جیسے اسے چبانے کے لیے آیا ہو۔

اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "اے تم کون ہو؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ دوسرا نیگرو اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا لیکن وہ خوفزدہ ہونے والی نہیں تھی۔

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ میری گاڑی میں کیوں آئے ہو؟"

جواب ملنے سے پہلے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان سیاہ نیگرو لڑکی وہاں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پستول تھا۔

بلی کو اتنی عقل تھی کہ ہتھیار کے سامنے زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔ وہ گولی مار کر فرار ہو جائیں گے۔ وہ چپ تھی۔ نجات حاصل کرنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔

جو پہلے کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا، وہ وہاں سے ہٹ کر پچھلی سیٹ پر اس لڑکی کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے لانگ کوٹ کے اندر سے شاٹ گن نکال لی تھی۔ بلی سمجھ گئی یا تو وہ لٹیرے ہیں یا پھر بلے سے دشمنی رکھنے والے ہیں۔

نیگرو لڑکی نے کہا۔ "فوراً بتاؤ تم کون ہو؟ اور جو آدمی ادھر گیا ہے، وہ تمہارا کون ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟"

بلی نے کہا۔ "میرے مرد سے تمہیں کیا لینا ہے؟ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟"

اس کے ساتھی نے سخت لہجے میں کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ فوراً بتاؤ کیا وہ ہماری طرح دھندا کرتا ہے؟ اگر تم دونوں ہمارے کام کے نہ ہوئے تو ہم ابھی چلے جائیں گے۔"

اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نیگرو نے کہا۔ "یہ کام کے ہیں، یہ مِیگی براؤن کے دشمن ہیں۔ تب ہی اس نے میڈونا کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔"

بلی نے انگریزی سیکھی تھی مگر اٹک اٹک کر بولتی تھی۔ بڑی روانی سے بولنے والوں کی باتیں کچھ کچھ سمجھتی تھی۔ اس نے کہا۔ "کیا بول رہے ہو؟ میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ ٹھہر ٹھہر کر بولو۔"

وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ "تم نے میڈونا کو کیوں گرایا تھا؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "وہ میری بھابی کو جانے سے روکنا......"

وہ یکلخت چپ ہوگئی۔ یہ عقل آئی کہ ماروی اور مراد سے تعلق ظاہر کرے گی تو دشمن مراد کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ معلوم کریں گے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

پھر ان تینوں نیگروز کو معلوم ہو جاتا کہ بلی اور بلا مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات بنائے؟ اس نے کمزوری بات بنائی۔ "وہ بات یہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی شرارت کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق میری ایک ٹانگ بے اختیار اس کی

ٹانگوں سے الجھ گئی۔"

ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم بات بنا رہی ہو۔ چالاک نہ بنو۔ تم نے شرارت نہیں کی تھی۔ تمہارا آدمی جانتا ہے کہ تم نے ایک بہت خطرناک شخص کی بیٹی کو گرایا ہے۔ اسی لیے وہ فوراً ہی تمہیں پکڑ کر وہاں سے یہاں لے آیا ہے۔"

نیگرو لڑکی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارا آدمی کرتا کیا ہے؟ جلدی بولو۔"

وہ الجھی ہوئی تھی کہ کیا جواب دے؟ ایسے وقت ایک پولیس افسر گاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ گئی گاڑیوں کے شیشوں سے جھانک کر اندر دیکھتا جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

پچھلی سیٹ پر لانگ کوٹ والے نے فوراً ہی شاٹ گن کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "گمبولا......! گاڑی یہاں سے نکالو۔ ورنہ افسر ایک ایشیائی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ہم پر شبہ کرے گا۔"

گمبولا نے اپنے پستول کو چھپا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ بلّی نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ اپنے آدمی کو بلاتی ہوں۔ اس کے ساتھ جاؤں گی۔"

پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے پستول کی نال اس کی پسلی سے لگا دی، بڑی سفاکی سے بولی۔ "اگر شور مچاؤ گی، ہمارے خلاف کچھ بولو گی تو بھری جوانی میں جاؤ گی۔"

وہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کھڑکی کے باہر یوں دیکھنے لگی، جیسے کار سے نکل کر بھاگنا چاہتی ہو۔

گمبولا نے کار کو وہاں سے نکالتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو، اگر کوئی بھی پولیس والا روکے اور قریب آئے تو تم مسکرا کر ہم سے بولتی رہو گی۔"

"میں صرف اپنے مرد سے مسکرا کر بولتی ہوں۔"

دوسرے نے کہا۔ "بکواس نہ کرو۔ اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گی، ہمیں گرفتار کرانا چاہو گی تو ہم گرفتار ہونے سے پہلے تمہیں گولی مار کر سزائے موت ضرور دیں گے۔"

نیگرو لڑکی نے پستول کی نال کو اس کی پسلی میں گڑاتے ہوئے کہا۔ "زندہ رہنا چاہتی ہو، اپنے آدمی سے ملنا چاہتی ہو تو وہی کرتی رہو جو ہم کہہ رہے ہیں۔"

کار پارکنگ ایریا سے نکل رہی تھی۔ بلّی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ دعا مانگ رہی تھی کہ بلّا نظر آ جائے۔ وہ اس سے دور جانا نہیں چاہتی تھی۔ فی الحال اکیلی پڑ گئی تھی۔ اس سر پھری کو اپنے مرد کا ذرا بھی سہارا ملتا تو وہ اغوا ہونے سے انکار کر دیتی۔ جو ہونی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے۔ پھر بھی ہوا وہ کار پارکنگ لاٹ سے نکل کر عمارت کے سامنے کشادہ سڑک پر آئی اور ذرا رک گئی۔ کچھ ہونے والا تھا۔ آگے ٹریفک کانسٹیبل گاڑیوں کو روک روک کر آگے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ بلّی کی پسلی سے پستول لگا ہوا تھا اور اس کی اپنی کہنی بھی پستول کے قریب ہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک ذرا ہاتھ پیچھے کر کے اس پستول کو پکڑ سکتی تھی۔ اس کے اندر کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ جو ہوتا ہے 'ہو جائے' کچھ کر... یہاں سے نکل... عقل نے کہا۔ "یہ لوگ ایسی بھری پری جگہ گولیاں نہیں چلائیں گے۔ انہیں فرار ہونے کا کھلا راستہ نہیں ملے گا۔ بلّی! کچھ کر جا۔ نہیں تو بلّے سے بچھڑ جائے گی۔"

ایسے ہی وقت بلّا باتیں کرتا ہوا مرینہ کی کار کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بلّی کے اندر بارود بھر گیا۔ اب کوئی اسے دھماکا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے اچانک ہی کہنی پیچھے لے جا کر اس کے ہاتھ کو پستول سمیت جکڑ لیا اور اسے کھینچ کر پسلیوں کی طرف سے ہٹا کر اس کا رخ ڈیش بورڈ کی طرف کر دیا۔ لڑکی آگے کو جھک کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ سب ہی بلّی کی اس حرکت سے پریشان ہو گئے تھے۔ ان لمحات میں وہ اس پر جوابی حملہ کر سکتے تھے، نہ اپنی اپنی گن نکال کر گولیاں چلا سکتے تھے۔ آگے پیچھے گاڑیاں تھیں، لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ قریب سے گزرنے والے شیشے سے جھانک کر کار کے اندر ہونے والی خاموش جدوجہد کو دیکھ سکتے تھے۔

لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے پیچھے سے ہاتھ کر بلّی کے چہرے اور گردن کو جکڑ لیا تھا۔ بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ "پلیز ایزی ہو جاؤ۔ منہ سے آواز نہ نکالو۔ ہم دوست ہیں ابھی تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

بلّی کے ہاتھ میں پستول آ گیا تھا۔ اس نے فائر کرنا چاہا تو وہ چل نہ سکا۔ پیچھے سے جکڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ اوپر کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ پستول کو دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن سمجھ گئی تھی کہ وہ لاکڈ ہے، اس نے دیر نہیں کی۔ فوراً ہی سیفٹی کیچ کو ہٹا کر ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ گولی چلا دی۔

آخر طوفانی بلا بن ہی گئی۔

اسے پکڑنے والے بوکھلا کر پیچھے سیٹ پر الٹ گئے۔ گمبولا نے راستہ پاتے ہی کار کی رفتار بڑھائی۔ وہ بھی پھرتیلی تھی، اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ اس نے جان پر کھیل جانے والا خطرہ مول لیا تھا۔ بلّے کو دیکھ لینے کے بعد اب اسے کوئی دوست یا دشمن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی اندھی دلیری دشمنوں کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ وہ کار سے

چھلانگ لگا کر نیچے گر کر لڑھکتی ہوئی ایک گاڑی کے سامنے آئی۔ وہ گاڑی زوردار بریک کے ساتھ رک گئی ورنہ وہ کچلی جاتی۔ وہاں گولی چلتے ہی بھگدڑ شروع ہوگئی تھی۔ پولیس والے اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے دوڑتے آرہے تھے۔

بلّے نے فائرنگ کی آواز سن کر ادھر دیکھا۔ پھر اپنی بلّی کو دیکھتے ہی حیرت سے چیخ پڑا۔ ”بشریٰ...!“

وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے دوڑتے ہوئے آنے لگا۔ وہ ایک کار کے آگے تھم جانے کے بعد وہیں زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے پستول کو تھام کر بڑی جی داری سے بھاگنے والے دشمنوں کی طرف فائر کررہی تھی۔

وہ تینوں کار کے اندر تھے اور تیز رفتاری سے دور ہوتے چلے جارہے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی ان کے پیچھے دوڑنے لگی تھی۔

مرینہ دور کھڑی تھی۔ بلّی کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”واؤ... چلتی کار سے چھلانگ لگائی ہے۔ ایکشن سے بھرپور ہے۔ پتا نہیں کن دشمنوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد ان پر فائر کررہی ہے۔“

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ فرار ہونے والے کار سمیت نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی بلّی کی طرف آئی۔ بلّے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زمین سے اٹھا کر سینے سے لگالیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا؟

پولیس اور ایجنسی والے بھی آگئے تھے۔ بلّی کو چاروں طرف سے گھیر کر پوچھ رہے تھے کہ وہ کون لوگ تھے؟ اسے کیوں ٹریپ کررہے تھے؟ اور اسے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

اس دوران میں وہ ان تمام پولیس موبائل گاڑیوں سے رابطہ کررہے تھے جو ان نیگروز کے تعاقب میں تھیں۔ ان تینوں کی تو جان پر بن آئی تھی۔ ان کی شامت آگئی تھی۔ واردات کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ لندن پولیس کے گھیرے سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پورے شہر میں موبائل پولیس گاڑیوں کا جال بچھا رہتا ہے۔ وہ سب وائرلیس کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اور وہ سب بہت ہی مستعد اور فعّال ہوتے ہیں۔

فرار ہونے والے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ یہ جانتے تھے کہ لمبی دوڑ کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے۔ انہوں نے ایک معروف علاقے میں دس منزلہ شاپنگ پلازا کے سامنے کار روک دی پھر وہاں سے نکل کر دوڑتے ہوئے عمارت کے اندر چلے گئے۔

پولیس کی چھ گاڑیوں نے اس وسیع و عریض شاپنگ پلازا کو چاروں طرف سے گھیرلیا۔ انہیں فون کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ فرار ہونے والے تینوں مجرم نیگرو ہیں اور وہ کالے کلوٹے لاکھوں میں پہچانے جاسکتے تھے۔

وہاں پولیس کے مسلح سپاہی اور زیادہ تعداد میں آگئے تھے۔ اعلان کیا جارہا تھا کہ کسی کالے آدمی یا کالی عورت کو چیکنگ کے بغیر عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

یہ ایسا طریقۂ کار تھا کہ وہ تینوں عمارت سے باہر نہیں

جاسکتے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں پھینک دی تھیں۔ اس کے بعد کوئی غیر قانونی سامان ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر بھی ان کے آئی ڈی کارڈز اور ان کا پیشہ معلوم کر کے ان پر شبہ کیا جاسکتا تھا کہ وہی مجرم ہیں۔

وہاں گراؤنڈ فلور سے دسویں منزل تک گھنٹوں چیکنگ جاری رہی۔ وہ تینوں نگاہوں میں نہیں آرہے تھے۔ نیچے سے اوپر تک تمام منزلوں میں گورے اور کالے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ ان میں گاہک بھی تھے اور سیلز مین بھی تھے۔ تقریباً پچاس نیگرو عورتیں اور مرد سیلز مین تھے اور اپنے اپنے کاؤنٹر کے پیچھے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔

وہ تینوں وہاں پہنچتے ہی سیلز مین بن گئے تھے۔

یہ تحفظ اس لیے حاصل ہوا کہ وہ شاپنگ پلازا ان کے نیگرو مالکان کا تھا۔ ایک پولیس افسر اور دو سراغ رساں نے ان کاؤنٹرز پر آکر تینوں کا محاسبہ کیا۔ وہاں ملازمت کے سلسلے میں ان کے جو قانونی کاغذات تھے، وہ انہیں برسوں سے کام کرنے والے سیلز مین ثابت کر رہے تھے۔ ان پر ایک ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سپاہی اور سراغ رساں مطلوبہ مجرموں کو پکڑنے کے لیے بھٹکنے کے لیے آگے چلے گئے۔

تین گھنٹے کے بعد انہوں نے ناکام ہو کر محاصرہ ختم کر دیا۔ اس شاپنگ پلازا کا مالک جیمس ہارورڈ ساتویں فلور پر رہتا تھا۔ اس نے تینوں کو آفس میں طلب کیا پھر پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے، پہلے تم لوگوں سے ایسی غلطی نہیں ہوئی۔ ان پولیس والوں کو کیسے پیچھے لگا لیا تھا؟''

گھولا نے کہا۔ ''ہم میکی براؤن کی چھوٹی بیٹی باربی ڈول کو اغوا کرنے گئے تھے۔ وہاں ائرپورٹ پر میکی کی بیوی بیٹی اور بیٹا تھا۔ باربی ڈول نہیں تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ بچی کو سسلی کے محل میں چھوڑ کر آئے ہیں۔''

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ''جب وہ بچی نہیں تھی، کوئی واردات نہیں کی تھی تو پولیس کیوں پیچھے پڑ گئی؟''

نیگرو لڑکی نے کہا۔ ''بگ باس نے حکم دیا تھا کہ بچی کو اغوا نہ کر سکیں تو اس کے بیٹے جیکی براؤن کو گولی مار دیں۔ مراد کسی دن اسے ہلاک کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہم مرڈر کریں گے تو الزام مراد پر ہی آئے گا۔ نہ میکی ہم پر شبہ کرے گا نہ ہمارے پیچھے اپنے شوٹرز لگائے گا۔''

باس نے پوچھا۔ ''بگ باس کا دماغ بہت کام کرتا ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس کے بیٹے پر گولی چلائی ہے؟''

''نو باس... !وہاں ہجوم میں بچی کو اغوا کیا جا سکتا تھا۔ کسی پر گولی چلا کر ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے۔''

''پھر تم لوگوں نے ایسا کیا کیا کہ پولیس پیچھے پڑ گئی؟''

''ہم ایک ایشیائی لڑکی کو ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔''

ہارورڈ نے غصے سے کہا۔ ''ہم سے اجازت حاصل کیے بغیر نئی واردات کیوں کی؟ کون تھی وہ ایشیائی لڑکی...؟'' وہ میز پر گھونسا مارتے ہوئے بولا۔ ''اتنی تو عقل ہونی چاہیے کہ وہاں لوگوں کا اور ٹریفک کا ہجوم ہوتا ہے۔''

وہ بتانے لگے کہ لڑکی نے کس طرح میکی کی بیٹی کو ٹھوکر مار کر گرایا تھا۔ اس کی حرکت سے اندازہ ہوا کہ وہ میکی براؤن کی دشمن ہے۔ آئندہ باربی کو اغوا کرنے یا جیکی کا مرڈر کرنے کے سلسلے میں ہمارے کام آئے گی۔

ان نیگروز کا بگ باس چاہتا تھا کہ مراد کسی طرح ماسٹر کوبوبو کو چھوڑ کر اس کا کام کرے۔ وہ ماسٹر سے زیادہ اسے پیسہ اور سہولتیں دینے کی آفر کر چکا تھا۔

گھولا نے کہا۔ ''جس ایشیائی لڑکی کو ہم ٹریپ کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اندازہ ہوا کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستانی ہوگی تو مراد سے اس کا کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ یوں ہم مراد کے قریب پہنچ کر اسے دوست بنا سکیں گے۔''

نیگرو گرل نے کہا۔ ''بگ باس نے سختی سے تاکید کی ہے کہ جب تک مراد سے دوستی نہ ہو، وہ ہمارے لیے کام کرنے پر راضی نہ ہو، تب تک ماسٹر کوبوبو کو ہماری پلاننگ سے بے خبر رہنا چاہیے۔''

باس نے پوچھا۔ ''ابھی کیا ہوا؟ یہاں چھپنے آ گئے۔ اس ایشیائی لڑکی کو ٹریپ نہ کر سکے؟''

''ہم نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ ایک سیدھی سادی عام سی لڑکی لگ رہی تھی اور ہمارے قابو میں بھی آ گئی تھی پھر اچانک ہی اس نے حیران کر دیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ زونا لا سے پستول چھین کر ہمارے لیے مصیبت بن جائے گی۔ اس نے ایسی پھرتی اور جی داری دکھائی کہ ہم اپنی سلامتی کے لیے وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔''

باس ناگواری سے ان کے بیانات سن رہا تھا۔ پھر وہ بگ باس سے فون پر رابطہ کرنے لگا۔

وہ بگ باس کون تھا؟

میکا لو رابرٹ ہیروں کا تاجر تھا۔ دنیا کی چوتھی بڑی ہیروں کی کان ''کا کوتا ڈائمنڈ مائن'' میں اڑتیس فیصد کا شیئر ہولڈر تھا۔ اس کی ایک لمبی ہسٹری تھی۔ وہ برسوں سے مجرمانہ زندگی گزارتا ہوا ہیروں کا تاجر بن بیٹھا تھا۔ بے انتہا دولت حاصل کرنے کے باوجود اس کی مجرمانہ سرشت باقی تھی۔

اس کی مجرمانہ تنظیم ڈیئرنگ ڈائمنڈ ٹریڈرز کہلاتی تھی۔

اس تنظیم میں اور دو خطرناک مجرم اس کے پارٹنر تھے۔ ان میں سے ایک شاپنگ پلازا کا مالک جیمس ہارورڈ اور دوسرا پارٹنر ایک انڈین کرمنل راکیش راؤ تھا۔ وہ دونوں پارٹنر میکا نو رابرٹ کو بگ باس کہتے تھے۔

جیمس ہارورڈ نے رابطہ ہونے پر بگ باس کو بتایا کہ ان کے تین تیز رو کارندے کس طرح ائرپورٹ میں ناکام ہو کر چھپنے کے لیے اس کے پاس آئے ہیں۔ فی الحال خیریت سے ہیں۔ وہ تینوں قانونی گرفت میں نہیں آئیں گے۔

میکا نو رابرٹ نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''کامیابی اور ناکامی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ہمیں اس لڑکی کو اہمیت دینی ہے' جسے وہ ٹریپ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ مسلمان ہے۔ اگر پاکستانی ہوگی تو مراد سے اس کا تعلق ضرور ہوگا۔''

دوست ہوں یا دشمن سب ہی مراد کے پیچھے پڑے تھے۔ اسے دشمنی سے مارنا چاہتے تھے اور دوستی سے ہر قیمت پر اسے اپنی تنظیم کا ہیرو بنانا چاہتے تھے۔ میکا نو رابرٹ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں کسی بھی طرح مراد کو اپنی تنظیم میں لانا ہے۔ ان تینوں سے کہو، کسی طرح بھی اس لڑکی پر دور ہی دور سے نظر رکھیں، معلوم کریں کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے، اس کے ساتھ اور کون لوگ ہیں؟''

جیمس ہارورڈ نے گمبولا سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ اس لڑکی تک دوبارہ پہنچ سکو گے؟''

وہ بولا۔ ''معلومات کا ایک ہی راستہ ہے۔ ہم اس کی کار میں فرار ہوئے تھے، کار کا نمبر مجھے یاد ہے۔ رجسٹریشن آفس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کار کا مالک کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس طرح ہم اس شاطر حسینہ تک پہنچ سکیں گے۔''

وہ پھر بلی کو ٹریپ کرنے کی پلاننگ کرنے لگے۔ اس سلسلے میں یہ احتیاط برتنے والے تھے کہ بلی کو پہلے رازداری سے شکنجے میں لیا جائے گا۔ جب یقین ہو جائے گا کہ اس کا تعلق مراد سے ہے تب بلی سے دوستی کی جائے گی یعنی آئندہ بھی صرف بلی سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

☆☆☆

جب خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ تمام دلدر دور ہو گئے۔ اب ناکامیاں لوٹ کر نہیں آئیں گی۔ کامیابیوں کا نشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کے معاملے میں سمیرا اور معروف تجلی کو اب دلی سکون حاصل ہو رہا تھا۔ ماروی مراد کی دلہن بن کر جا چکی تھی۔ اس کوٹھی سے اس شہر سے اور اپنے وطن سے دور چلی گئی تھی۔

عشق کہیں جیسے

ایک شخص نے بس میں بیٹھے ہوئے مایوس اور افسردہ شخص کو دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہو گئے۔''

وہ صاحب جھلا کر بولے۔ ''میں نے زندگی میں ایک بار عشق کیا تھا اور بدقسمتی سے کامیاب ہو گیا۔''

مرسلہ: حسنین عباس، کمیل عباس، ہگیانہ روڈ کھاریاں

معروف تجلی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ آئندہ بزنس پھلے پھولے گا۔ سمیرا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جس ماروی سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں تھا' وہ جا چکی تھی۔

محبوب بڑی حد تک ماروی کو نظر انداز کر کے اس کی بانہوں میں آ گیا تھا۔ اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ جلد ہی اسے اپنی شریک حیات بنا لے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حالات بدل گئے تھے۔ ادھر ماروی اور مراد کے لیے اور ادھر سمیرا کے لیے اب ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ محبوب نے ماروی سے یہ وعدہ لیا تھا کہ کبھی مراد سے کسی وجہ سے علیحدگی ہوگی یا وہ دنیا میں نہیں رہے گا تو وہ محبوب کی پناہ میں آ جائے گی۔

اسی طرح ماروی نے بھی اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی غیر یقینی واپسی تک تنہا نہ رہے۔ سمیرا کو اپنی شریک حیات بنا لے۔ اب تو یہی ہونا تھا۔ سمیرا شادی سے پہلے ہی اس کی تنہائی میں آ چکی تھی۔ اس نے ماروی کو رخصت کیا تھا پھر ائرپورٹ سے گھر واپس آ کر جھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر پڑا تھا۔ وہ ہارا ہوا سپاہی تھا۔ بڑے حوصلے سے چپ چاپ ناکامی اور شکست کو برداشت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے فون کو دیکھا پھر سوچا۔ اس کے بعد نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہائے سمیرا...... آخر وہ چلی ہی گئی۔ بچھڑ ہی گئی۔''

سمیرا نے کہا۔ ''ہم اس کے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ خدا اسے سلامتی دے۔ وہ اپنے مراد کے ساتھ دنیا گھومتی رہے۔ ہمیشہ عیش و عشرت سے رہے۔ یہاں کبھی واپس نہ آئے۔''

''وہ واپس آئے یا نہ آئے تم آ رہی ہو۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے لیے اگلا جمعہ کیسا رہے گا؟''

اس نے ایسا خوشگوار دھماکا کیا کہ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ''او مائی گڈنیس۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ آئی لو یو محبوب! میں تو خوشی سے اچھل پڑی ہوں۔''

وہ واقعی خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ کمرے میں ادھر سے ادھر بھاگنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ سکون سے ایک جگہ بیٹھ نہیں پا رہی تھی۔ بے اختیار ماروی کو دعائیں دیے جا رہی تھی۔ "ماروی جیو ہے۔ ہزار برس جیو ہے۔ اس پر خدا کی رحمت ہو۔ اس کے جاتے ہی آپ میرے ہو رہے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں جانتا تھا، میرے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر تم خوشی سے پاگل ہونے لگو گی۔"

"سچ کہہ رہی ہوں میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔"

"میں ابھی معروف صاحب سے کہہ رہا ہوں۔ وہ آج ہی تمہاری ممی پاپا کے پاس جائیں گے۔ میرے لیے تمہارا رشتہ مانگیں گے۔ یہ بتاؤ' نکاح خوانی کے لیے جمعے کا دن کیسا رہے گا؟"

وہ جلدی سے انگلیوں پر گنتے ہوئے بولی۔ "آج سے چار دنوں بعد جمعہ ہے۔ میں پانچویں دن آپ کی گھر والی بن جاؤں گی۔"

"ہاں وقت بہت کم ہے۔ شادی دھوم دھام سے ہوگی۔"

"یا اللہ۔۔۔! اتنی جلدی دھوم دھام کیسے ہوگی؟"

"یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ ہم بزنس کمیونٹی کے ہزاروں معزز افراد کو کیسے نظر انداز کریں گے؟ ان سب کو مدعو کرنا ہوگا۔ تم دیکھ لینا، ہماری شادی یادگار ہوگی۔ بیچ سمندر میں بحری جہاز کے میرج ہال میں شادی کی تقریب ہوگی۔"

ان لمحات میں سیرا کی مسرتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت ہو کر بولی۔ "او گاڈ! اتنی مہنگی اور زبردست تقریب ہوگی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ اتنی جلدی تیاریاں کیسے ہوں گی؟"

"فکر نہ کرو۔ میں سارے انتظامات کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھو۔ اب تم پردہ کرو گی۔" وہ ہنسنے لگی۔ محبوب نے پوچھا۔ "یہ پردہ داری کیسی لگے گی؟"

"بڑی اچھی لگے گی۔ ایسی لگے گی جیسے آپ نے ابھی تک مجھے دیکھا نہ ہو۔ بڑے رومانٹک احساسات ہوں گے۔"

"تم سہاگ رات سے پہلے میرے سامنے نہیں آؤ گی تو اچھوتی لگو گی۔ اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ یہ باتوں کا نہیں' کام کا وقت ہے۔ مجھے سیکڑوں کام نمٹانے ہیں۔"

پھر اس نے معروف کو یہ خبر سنائی۔ اسے خوش خبری کہنا چاہیے لیکن محبوب صرف خبر سنا رہا تھا۔ اس کے اندر جھانک کر دیکھا جاتا تو انکشاف ہوتا کہ خوش خبری میں جو لفظ خوش ہے' اسے ماروی لے گئی تھی۔

اس کے آنے تک اسے ایک بزنس مین کی حیثیت سے ایک نارمل زندگی گزارتے رہنا تھا۔ اس لیے شادی محض ایک خبر تھی۔ اس کے جانے سے ویرانی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ اس خلا کو ہنسنے بولنے ناچنے گانے کے دھوم دھڑاکے سے بھر دینا تھا۔

ان خوشیوں سے اور موجودہ حالات سے قطع نظر اب بات ذرا دوسرے رخ سے ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اپنے پہلے لمحے سے موت کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہے۔ کبھی اچانک معلوم ہونے سے پہلے ہی موت اسے دبوچ کر اس کا وقت پورا کر دیتی ہے۔ محبوب کے ساتھ بھی موت بڑی خاموشی سے چل رہی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک موت نہیں آتی' شامت آتی رہتی ہے۔

شامت اس طرح آ رہی تھی کہ وہ مراد کا ہم شکل تھا۔ دشمنوں کو ہمیشہ یہ نہیں سمجھایا جا سکتا تھا کہ وہ مراد علی منگی نہیں ہے۔ محبوب علی چانڈیو ہے۔

دشمن جانے پہچانے ہوتے تو ان کے پاس جا کر یا فون کے ذریعے مراد اور محبوب کا فرق سمجھایا جاتا۔ فی الحال محبوب سخت سیکیورٹی میں رہتا تھا۔ چار دیواری سے باہر نکلتا تو اس کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔

پھر عداوت رکھنے والوں کو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہونے لگا کہ مراد پاکستان میں نہیں رہتا ہے۔ جے پور، دہلی اور لندن میں شوٹرز کے علاوہ وہ میکی براؤن کا بیٹا مارا گیا تھا۔ اس طرح یقین ہو گیا تھا کہ مراد پاکستان میں نہیں ہے وہاں ایک معزز بزنس مین محبوب علی چانڈیو اس کا ہم شکل ہے۔

پھر بھی پوری طرح یقین نہیں تھا۔ یہ شبہ تھا کہ مراد نے دہری شخصیت اختیار کی ہے۔ وہ پاکستان میں معزز پرامن شہری بن کر رہتا ہے اور وطن سے باہر آگ اور لہو کا کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے اندازے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔

تمام شوٹرز اور جاسوس اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی دن بھی ہم شکل بننے والی مکاری کھل کر سامنے آ جائے گی۔

یہ تو محض اندازہ تھا لیکن قدرت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ جب اچانک ہی کھیل شروع ہوتا ہے تب پتا چلتا ہے کہ پیتے پیتے جام بدل جاتے ہیں۔

محبوب بے خبر تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ کاروباری

دورے پر ملک سے باہر نہیں جاتا تھا۔ جب سے عشق کا روگ لگا تھا' تب سے ماروی کو صبح وشام دیکھتے رہنے کے لیے ایک ہی شہر میں رہتا تھا۔ اب حالات بدل رہے تھے۔ بزنس پر پوری توجہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کاروباری دورے پر ملک سے باہر بھی جانا تھا اور شاید ہنی مون کے لیے بھی کہیں یورپ کی سمت رخ کرنا تھا۔

فون کی رنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔ سمیرا کال کر رہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں بولو؟"

"آپ نے تاکید کی ہے کہ مجھے سہاگ رات تک پردہ کرنا چاہیے۔ کیا آواز کا پردہ بھی لازمی ہے؟"

"اب تو بول رہی ہو۔ پردہ کہاں رہا؟"

"بس ایک بات کروں گی۔ ایک ضروری بات... پھر جمعے کی رات تک اپنی آواز نہیں سناؤں گی۔"

"اچھا بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میرے دل میں کھدبدی ہے کہ ہم ہنی مون کے لیے کہاں جائیں گے؟ آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"آہ...! ہنی مون تو شاید اب نہ ہو پائے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ نہ بھولو کہ میں مراد کا ہم شکل ہوں۔ باہر دشمنوں کو کون سمجھائے گا کہ میں مراد نہیں محبوب ہوں۔"

وہ پریشان ہوگئی۔ "او گاڈ...!"

اس نے کہا۔ "وہ گولی مارنے سے پہلے نام نہیں پوچھیں گے اور نہ ہی میرا شناختی کارڈ دیکھیں گے۔ بس دور سے دیکھتے ہی فائر کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔" پھر اس نے پوچھا۔ "کیا لہو میں ڈوبا ہوا ہنی مون مناؤ گی؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تعجب ہے۔ یہ بھول گئی تھی کہ مراد آپ کا ہم شکل ہے۔ وہ یہاں سے جانے کے بعد بھی... ہم شکل ہونے کے باعث دشمنوں کو آپ کی طرف لگائے رکھے گا۔ آپ بھی کراچی شہر سے باہر کی دنیا نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"شادی کے بعد یہی ہوگا۔ تم میرے ساتھ باہر کھلی فضا میں کہیں نہیں جا سکو گی۔"

"میں آپ کو بھی خطرہ مول لینے نہیں دوں گی۔ آپ کی جان ہے تو میرے لیے یہ جہان ہے۔"

پھر وہ بولی۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کب تک چھپتے ہوئے محدود زندگی گزارتے رہیں گے؟ مراد کے دشمن کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔"

"جب تک یہ چہرہ میرے ساتھ ہے اور جب تک سانسیں چل رہی ہیں، دشمن ختم نہیں ہوں گے۔"

"اس لیے کہ مراد کے دشمن کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔"

ان حالات میں ایک ہی بات دماغ میں گھومتی تھی کہ جس دن مراد کسی دشمن کی گولی سے مارا جائے گا۔ جس دن جرائم کی دنیا میں اس کی موت کی تصدیق ہو جائے گی، اس دن سے محبوب کو کوئی مراد نہیں سمجھے گا اور شاید اس روز وہ بے خوف وخطر ہنی مون منانے کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک میں جا سکیں گے۔

صرف اتنا ہی نہیں... ایک اور خوش کن خیال یہ بھی تھا کہ مراد کے بعد ماروی اپنا وعدہ پورا کرنے والی تھی۔ وہ صرف سمیرا کے ساتھ ہی نہیں، ماروی کے ساتھ بھی ڈبل ہنی مون منانے والا تھا۔

بس قسمت کے مہربان ہونے کی دیر تھی۔

سمیرا سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے ماروی کے خیال میں کھو گیا تھا۔ وہ کل بچھڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا' برسوں سے اس کی نہ صورت دیکھی ہے، نہ آواز سنی ہے۔ وہ بڑے جذبے سے سوچ رہا تھا، کیا مجھے یاد کر رہی ہوگی؟

اسی لمحے اس نے یاد کیا۔ تبھی ہی اسکرین پر اس کا نام پڑھتے ہی وہ جذبوں سے سرشار ہو کر بولا۔ "ماروی! تم سلامت رہو ہزار برس! ابھی تمہیں یاد کر رہا تھا اور تم چھم سے آ گئیں۔"

اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ "یاد کریں' میں نے وعدہ کیا تھا کہ لندن پہنچ کر فون کروں گی۔ مجھے افسوس ہے، دیر ہو گئی مگر وعدہ پورا کر رہی ہوں۔"

"اس وقت مجھے کتنی مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں' یہ تم سمجھ سکتی ہو۔ میں یہی چاہتا ہوں' اتنی ہی مہربانی کیا کرو' جب بھی یاد آؤں' ایک کال ضرور کیا کرو۔"

"آپ اپنا وعدہ پورا کریں۔ سمیرا کو اپنی دلہن بنائیں۔"

"میں جلد ہی یہ خبر سناؤں گا کہ وہ میری شریک حیات بن چکی ہے۔ ابھی اپنی باتیں کرو۔ تم خوش ہو نا؟ مراد کے دشمن کوئی پرابلم تو نہیں بن رہے ہیں؟"

اس سوال کے پیچھے یہ چھپی چھپی سی لاشعوری خواہش پرورش پا رہی تھی کہ دشمن پرابلم بن جائیں۔ ایسا کچھ ہو جائے کہ ماروی کل گئی ہے' آج ہی آ جائے۔

لیکن جواب اس کی حسرتوں کے خلاف تھا۔ ماروی نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔ ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ دشمن تو دشمن ہی ہیں۔ وہ تو پریشان کرتے رہیں گے۔ مراد کے لیے تو یہ روز کا معمول ہو گیا ہے۔"

"میری دعا ہے کہ دشمن کبھی پریشان نہ کریں اور تم مراد کے ساتھ ساری دنیا گھومتی رہو۔ یہ بتاؤ لندن میں کب

تک رہوگی؟"

وہ لندن میں نہیں تھی۔ سن سٹی پہنچی ہوئی تھی۔ مراد نے اسے سمجھایا تھا کہ کسی کو یہ نہ بتائے کہ وہ کچھ دنوں تک سن سٹی میں رہے گی۔ اس نے کہا۔ "ابھی لندن میں ہوں۔ ہم دو چار دنوں میں ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔"

یک بیک محبوب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ بھی سمیرا کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے سوئٹزرلینڈ جائے گا تو وہاں ماروی کو قریب سے دیکھ سکے گا۔ پھر نہ جانے وہ مراد کے ساتھ کن ملکوں میں بھٹکتی رہے گی۔ فی الحال یہ اچھا موقع تھا۔ ہنی مون کے بہانے اس کا دیدار ہو سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والے تمام اندیشوں کو بھول گیا۔ اس نے کہا۔ "سمیرا بھی ہنی مون منانے کے لیے سوئٹزرلینڈ جانے کو کہہ رہی تھی۔ وہاں ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض کیوں ہوگا؟ آپ کو سمیرا کے ساتھ دیکھ کر خوشی ہوگی۔ مجھے اطمینان ہوگا کہ آپ ایک نارمل ازدواجی زندگی گزارنے لگے ہیں۔"

وہ اسے تصور میں دیکھنے لگا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے برفانی علاقے میں اس کے ساتھ اسکیٹنگ کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ "پھر تو یہ پروگرام پکا ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں سمیرا کے ساتھ ضرور آؤں گا۔"

"آپ اجازت دیں۔ جس دن ہنی مون کے لیے جاؤں گی اس دن آپ کو کال کروں گی۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ گونگے فون کو دیکھنے لگا۔ عقل سمجھا چکی تھی کہ پاکستان سے باہر موت آئے یا نہ آئے، شامت آسکتی تھی۔

☆☆☆

ماروی پاکستان سے باہر آکر دیکھ رہی تھی کہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ وہ جہاں سے گزر رہی تھی، جہاں پہنچ رہی تھی، وہاں دولت کی فراوانی، حسن وشباب کی رنگینی اور جرائم کی سنگینی تھی۔

بہ ظاہر خوب صورت مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ وہ مراد کے ساتھ سن سٹی کے ائرپورٹ سے باہر آئی تو مسلح گارڈز نے اسے سیلوٹ کیا۔ اس کے لیے ایک بہت ہی مہنگی شاندار گاڑی کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ متاثر ہو رہی تھی۔ اس کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں تھیں۔

ان کی رہائش کے لیے دی پیلس آف دی لوسٹ سٹی میں انتظامات کیے گئے تھے۔ یہ دنیا کے سب سے مہنگے ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ ماروی کے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے ڈگمگانے سے پہلے مراد کا بازو تھام لیا تھا۔ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ "میں تو خواب میں بھی ایسا خوب صورت محل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیا ہم سچ مچ یہاں رہیں گے؟"

وہ ہنستے ہوئے اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ "ہم رہنے کے لیے ہی آئے ہیں، یوں سکڑ کر نہ رہو۔ تن کر رہو۔ تمہیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔"

ماسٹر گوبوان کا استقبال کرنے ہوٹل کے دروازے پر آیا تھا۔ پہلی بار مراد کو روبرو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قوی ہیکل سیاہ فام نیگرو تھا۔ اس نے مراد کو دیکھتے ہی دونوں بازو پھیلا کر اپنی زبان میں خوشی سے نعرہ لگایا پھر اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "آج ایک مرد میدان کو سینے سے لگا رہا ہوں۔ تم پہلے ٹارگٹ ہو جو کسی کے نشانے پر نہیں آتے۔ جرائم کی دنیا میں کون سا ایسا ملک ہے۔ کون سی ایسی تنظیم ہے، جہاں تمہارا چرچا نہیں ہورہا ہے۔"

وہ بڑے فخر سے تن کر بولا۔ "مراد علی منگی ایسا نام ہے جسے سنتے ہی دشمن نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ایم پراؤڈ آف یو مائی سن! میں تمہیں بیٹا کہتا ہوں اور اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ تمہیں مانتا ہوں۔"

وہ اس سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ "تم پہلی بار میرے پاس آئے ہو۔ میں تمہارا استقبال کرتے ہوئے تمہارا قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

پھر وہ قصیدہ پڑھنے لگا۔

"تم نے مجھے ذلت اور شرمندگی سے بچایا ہے۔

سنڈیکیٹ ریڈ البرٹ بہت پاور میں تھی۔ ایک برس پہلے انہوں نے میرے ایک بیٹے کو قتل کیا تھا اور لندن میں میرے ایک کیسینو پر قبضہ جمالیا تھا اور میں کچھ نہ کر پایا تھا۔ میرے پاس بہت ہی ماہر شوٹرز ہیں۔ ایک نہیں درجنوں ہیں لیکن کوئی میرے مقتول بیٹے کا انتقام لینے کے لیے میکی براؤن کی فیملی کے کسی فرد کو گولی نہ مار سکا۔"

وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ "میرے بیٹے...! میرے گاڈ نے تمہیں میرے لیے آسمان سے اتارا ہے۔ "کیا کمال کیا ہے تم نے... اچانک ہی ان کے بہنوئی برنارڈ کو جہنم میں پہنچا دیا۔ یہ کبھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی برنارڈ جیسے جلاد کو چھو کر بھی گزر سکتا ہے۔ تم ایک ہی گولی چلا کر جرائم کی دنیا میں گفتگو کا موضوع بن گئے ہو۔ پھر ایک

کمال اور کیا' ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی البرٹ کو انڈیا میں گولی مار کر یہ دہشت طاری کر دی کہ براؤن فیملی کا کوئی فرد تم سے نہیں بچے گا۔"

وہ بڑے فخر سے بولا۔ "آج تک کسی کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز نہیں لگائی گئی۔ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ تم خطرناک شوٹر ہو۔ موت سے زیادہ خطرناک ہو۔"

وہ آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے جکڑ کر بولا۔ "مرد میدان تم ہو اور نام میرا ہو رہا ہے۔ آج جرائم کی دنیا میں میرا رعب اور دبدبہ ہے۔ وہ لندن کے کیسینو کا قبضہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ یہاں سن سٹی میں ان کے جاسوس آتے رہتے ہیں اور حرام موت مرتے رہتے ہیں۔"

اس نے بڑے یقین سے کہا۔ "یہ کوئی نہیں جانتا کہ تم میرے پاس آئے ہو۔ اچھا ہے یہاں جب تک چاہو رہو۔ میری تنظیم کا سیٹ اپ دیکھو۔ تمہیں ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت کچھ سمجھنا اور سیکھنا بھی ہے۔"

مراد نے کہا۔ "اپنی وائف کے ساتھ محفوظ رہنے کی یہی ایک جگہ ہے۔ اس شہر میں آپ کی حکمرانی ہے۔ قدم قدم پر میری نگرانی اور حفاظت کی جائے گی۔ میں یہاں کھلی فضا میں آزادی سے تفریح کر سکوں گا لیکن ہنی مون منانے کا شوق ہے۔ کچھ روز کے لیے کہیں ضرور جاؤں گا۔"

ماسٹر نے ماروی کو دیکھ کر کہا۔ "سوری بیٹی! میں مراد کو دیکھ کر اپنے آپ کو بھول گیا۔ تمہیں وش نہ کر سکا۔"

اس نے آگے بڑھ کر ماروی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم میری بیٹی ہو۔ یہاں ساری عمر رہو گی تو بھی تمہارے پاؤں میں کانٹا چبھنے نہیں دوں گا۔ سنا ہے تم سیدھی سادی سی گھریلو لڑکی ہو۔ ہمارے خطرناک دھندوں کو نہ سمجھتی ہو، نہ سمجھنا چاہتی ہو۔"

وہ اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "کوئی بات نہیں، میری دو بیویاں اور تین بیٹیاں بھی تمہاری جیسی ہیں۔ وہ محل کی چار دیواری میں عیش و آرام سے رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بیوی اور تین بیٹیاں میرے دھندوں کو سمجھتی ہیں۔ وہ سنگین معاملات میں میرا ساتھ دیتی رہتی ہیں۔"

ماروی نے کہا۔ "میں آپ کی ایک بیوی اور تین بیٹیوں کی طرح نہیں بن سکوں گی۔ میرا مزاج آپ کی ان بیویوں اور بیٹیوں کی طرح ہے جو محل کی چار دیواری میں رہتی ہیں۔"

"تو پرابلم۔ تم عیش و آرام سے محفوظ رہو گی۔ گھر کی چار دیواری کے باہر اپنی مرضی سے جایا کرو گی۔ ویسے یہ سمجھا دوں کہ سن سٹی کے باہر مراد کے ساتھ بھی کہیں تفریح کے لیے

اقوال زریں

☆ بہت بڑا گناہ ہے کہ وہ بات کہو جو تم خود نہیں کرتے۔

☆ جو اللہ کا ذکر کرے وہ زندہ ہے اور جو نہ کرے وہ مردہ ہے۔

☆ خوش خبری دو نفرت مت پھیلاؤ۔

☆ مومن بار بار دھوکا نہیں کھاتا۔

☆ سچائی کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔

☆ قرآن اور سنت کی دعوت لے کر اٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ۔

مرسلہ: ماہین بابر، گلیانہ روڈ کھاریاں

جانے کی ضد کرو گی تو دشمنوں کی کوئی گولی کبھی تمہاری طرف چلی آئے گی۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "بلا یہاں اپنی وائف کے ساتھ آیا تھا۔ کئی ماہ تک ٹریننگ حاصل کرتا رہا۔ اس کی وائف نے بھی ڈرائیونگ، رائفل شوٹنگ اور انگریزی زبان سیکھی ہے۔ وہ اس حد تک ایکٹیو ہو گئی ہے کہ اس کے ساتھ چار دیواری سے باہر بھی جاتی ہے' اسے کسی حد تک دشمنوں سے نمٹنا آ گیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "آپ ماروی کو جو اہم بات سمجھانا چاہتے ہیں' وہ میں بھی سمجھاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہاں تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ میرے ساتھ تفریح کے لیے کہیں بھی جا سکے گی؟"

"بے شک یہاں خطرہ نہیں ہے۔ اوّل تو کوئی نہیں جان سکے گا کہ مراد علی منگی یہاں آیا ہوا ہے پھر یہ کہ میرے مسلح کارندے ہر جگہ تم دونوں کی سیکیورٹی کے لیے موجود رہیں گے۔ یہاں بھی ہوٹل کے اندر اور باہر میرے آدمی موجود ہیں۔ تم وائف کے ساتھ جہاں جانا چاہو گے' جاؤ گے۔ ابھی سفر سے تھکے ہوئے آئے ہو۔ آرام کرو۔ کل ایک قابلِ اعتماد گائیڈ تمہیں پورے سن سٹی کی سیر کرائے گا۔"

وہ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ ان سے کچھ فاصلے پر دو خوب صورت کنیزیں اور دو حبشی غلام ہاتھ

باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماروی نے انہیں ناگواری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ عورتیں یہاں کیوں ہیں؟"

"تمہاری خدمت کے لیے ہیں۔"

"مجھے نہیں کرانی ہے خدمت۔ انہیں جانے کو کہو۔"

مراد نے ان سے کہا۔ "تم سب باہر جاؤ۔"

وہ چاروں سر جھکا کر چلے گئے۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ماروی! اپنے آپ کو بدلو۔ تمہیں وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہیے۔"

وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں مان سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ "کیا حالات کے مطابق بدلنے کے لیے عورتوں کو تمہارے پاس آنے کی چھوٹ دے دوں؟"

"کیا یہ عورتیں مجھے تم سے چھین کر لے جائیں گی؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

اس نے تڑخ کر جواب دیا۔ "نہیں ہے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ شادی سے پہلے خوب رنگ رلیاں منا چکے ہو۔ میں تم پر کڑی نظر رکھوں گی۔ اچھی طرح پرکھتی رہوں گی۔ جب اعتماد ہو جائے گا تو پھر بھی تم پر شبہ نہیں کروں گی۔"

"پتا نہیں تم کب تک میری پارسائی کا یقین کرو گی۔ تب تک بڑے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ پلیز مجھ پر بھروسا کرو۔ کسی دن ثلاثہ آنے والی ہے۔ وہ یہاں کے اہم معاملات میں دن رات میرے ساتھ رہا کرے گی۔"

"وہ کیوں رہے گی؟ کوئی مرد کیوں نہیں رہے گا؟"

"وہ اکیلی دس مردوں پر بھاری ہے۔ بہت زبردست فائٹر ہے۔ ماسٹر نے خوب سوچ سمجھ کر اسے میرا باڈی گارڈ بنایا ہے۔ میں ماسٹر کے حکم سے انکار نہیں کرسکوں گا۔ یہ موٹے دماغ سے سمجھنے والی باتیں کیوں نہیں سمجھتی ہو؟"

"تمہارے پیار میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتی تو یہ سمجھ میں آجاتا کہ جرائم کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہو۔ شادی کے بعد مسائل پیدا ہوں گے۔ میں تمہیں صحیح راستوں پر لے جانا چاہتی ہوں لیکن تم غلط راستوں کو نہیں چھوڑو گے۔"

پھر اس نے گھور کر کہا۔ "تم نے ابھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ثلاثہ دن رات تمہارے ساتھ ڈیوٹی پر رہا کرے گی۔ پھر دن رات میں میرا کتنا حصہ رہا۔ تم نے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ مرینہ سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔ اب ثلاثہ ساتھ رہے گی، ثلاثہ جائے گی تو کوئی دوسری تیسری آتی رہے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ اگر سمجھ سکتی ہو تو سمجھ لو۔ میری سلامتی کے لیے ماسٹر کی سرپرستی اور ہتھیار لازمی ہیں۔ ان کے بغیر کوئی بھی مجھے چیونٹی کی طرح مسل دے گا۔ لہٰذا ابھی یہ نہ کہو کہ میں جرائم کی دلدل میں دھنس گیا ہوں۔"

"جو میرے مقدر میں ہے اسے جھیلتا رہوں گا۔ تم میری جان سے زیادہ عزیز ہو۔ صرف مجھ پر بھروسا کر کے میرے ساتھ پیار بھری زندگی گزارتی رہو گی۔"

پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "مجھے عیاش اور گناہ گار سمجھو گی تو میرے قریب عورتوں کو دیکھ کر جلتی کڑھتی رہو گی۔ اپنے سکھ چین کو پیار بھری زندگی کو برباد کرتی رہو گی۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟"

ماروی نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر قریب آکر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر سینے سے لگ گئی۔ سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں پھنس گئی ہوں تم کتنے مکار ہو، محبت سے پھانس کر یہاں لے آئے ہو۔ تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ میں تو پاکستان جانے کا راستہ بھی نہیں جانتی ہوں۔"

وہ رونے لگی۔ مراد اسے پیار کرنے لگا۔ وہ حالات کے آگے جھک رہی تھی۔ اسے جھکا کر رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی مجرمانہ زندگی میں مرینہ بہت اہم ہوگئی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار ضروری ہوتا ہے۔ مرینہ بھی ایک خطرناک ہتھیار تھی اس کی حفاظت کے لیے...... وہ دست راست بن کر رہنے والی تھی۔ وہ اپنے تحفظ اور سلامتی کے حوالے سے درست کہہ رہا تھا۔ مراد کے حالات کے پیش نظر وہ حقیقتاً لازمی ہوگئی تھی۔

فی الحال ماروی کی دلجوئی لازمی تھی۔ ہوٹل کے چاروں طرف بہت ہی خوب صورت بوٹانیکل گارڈن تھا۔ وہ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے گارڈن میں لے آیا۔ ماروی نے آنکھوں کو تازگی بخشنے والی ایسی ہریالی اور عجیب وغریب پیڑ پودے نہ کبھی دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلائے ادھر سے ادھر دوڑتی رہی۔ ایسی مست ہوگئی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

آگے اس گارڈن میں ایسے بھول بھلیوں والے راستے تھے جہاں سے گزرتے وقت یوں لگتا تھا جیسے سچ مچ کسی گم شدہ شہر میں پہنچ کر بھٹک رہے ہیں۔

دی پیلس آف لوسٹ سٹی کا مطلب ہے 'گم شدہ شہر کا ایک محل...' وہ ہوٹل ایک خیالی اور تصوراتی محل کی طرح عالی شان تھا۔ اسے دیکھ کر یہ خیال قائم ہوتا تھا کہ ہزارہا صدیوں پہلے کوئی شہر تھا' جو تاریخ کے بدلتے ہوئے بدترین حالات کی

نذر ہو کر کھنڈر بن گیا تھا یا نابود ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے گارڈن کے اس حصے میں پہنچ کر ایسا ہی لگتا تھا کہ کسی گم شدہ شہر میں آ گئے ہیں۔

جو کوزے تک محدود رہتے ہیں وہ سمندر کی وسعت اور گہرائی تک کبھی نہیں پہنچتے۔ وہ پہلی بار حسن و جمالیات کی وسیع و عریض دنیا دیکھ رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رہ کر دنیا کی رنگینیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتی رہوں گی۔ یا اللہ! میں بول نہیں سکتی کہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ نظارے یہ مسرتیں غلط دھندوں کے ذریعے حاصل نہ ہوتیں۔“

مراد کو بھی وہ غلط دھندا منظور نہیں تھا۔ مگر کیا کرتا؟ خون خرابے نے اسے اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ ساری زندگی ہاتھ سے بندوق نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ماروی نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”تم بھی محبوب کی طرح رئیس اعظم ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ پلیز مراد! سوچو کیا گن چلائے بغیر دولت حاصل نہیں کر سکو گے؟“

وہ مایوسی سے گہری سانس لے کر بولا۔ ”ایک سیدھی سادی پر امن زندگی خواب ہو گئی ہے۔ نہ دشمن پیچھا چھوڑ رہے ہیں نہ گن ہاتھ سے چھوٹے گی۔“

”یہ دل توڑنے والی بات ہے۔ کیا ہم ساری زندگی مجرموں کی دنیا میں رہیں گے؟ کیا ہمارے بچے بھی بندوق چلائیں گے؟ لہو بہائیں گے؟ پھول نہیں کھلائیں گے؟“

”ہاں، یہی نظر آ رہا ہے۔“

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ”تم پیار کرنے والی بیوی کو اپنی ماروی کو کیسی لعنتی زندگی دے رہے ہو؟ تم نے میرے تمام خوب صورت خوابوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔“

وہ کچھ بول نہ سکا۔ چپ رہا۔ ماروی کو ان لمحات میں محبوب یاد آ رہا تھا۔ یہ خیال آ رہا تھا کہ اس کی منکوحہ ہوتی تو تمام خوب صورت خوابوں کی تعبیر مل جاتی۔ ان لمحات میں اسے ایک اجلی اور میلی زندگی کا فرق صاف نظر آ رہا تھا۔

مراد نے کہا۔ ”حالات سے سمجھوتا کرو، اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بشریٰ اپنے شوہر بلے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ اسے بھی جان سے چاہتی ہے۔ اس کی خاطر اس نے ٹریننگ حاصل کی ہے یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر گئی ہے۔ تمہیں بھی میری خاطر خود کو بدلنا چاہیے۔ تمہیں بھی ٹریننگ حاصل کرنا چاہیے۔“

”میں انسانوں کی جان لینے والی بندوق کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ مجھے تمہاری اس مجرمانہ زندگی سے سخت نفرت ہے اور تم اپنے رنگ میں مجھے رنگنا چاہتے ہو۔“

”تم مجھ سے محبت کرتی رہو گی اور میری زندگی سے نفرت کرتی رہو گی۔ کیا اس طرح ایک اچھی زندگی گزار سکو گی؟“

”اچھی زندگی تو خواب ہو گئی ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنے اندر ٹوٹتی بکھرتی رہوں گی لیکن دل سے مجبور ہوں تم سے پیار کرتی رہوں گی۔“

انہوں نے رات کا کھانا ڈائننگ روم میں کھایا۔ ہوٹل کے اسی پورشن میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، بیڈ روم اور ٹی وی لاؤنج سب ہی کچھ تھا۔ انٹرنس کے باہر سیکیورٹی گارڈز اور ملازموں کے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ایک حسین ملازمہ ڈائننگ روم میں آئی تو ماروی نے اسے گھور کر دیکھا۔

ملازمہ نے ہوٹل کے یونیفارم کے مطابق مختصر سا لباس پہنا ہوا تھا اس کا گورا چکتا ہوا بدن بڑا ہی جاذب نظر تھا۔ اس نے مراد سے کہا۔ ”سر! آپ کی کال ہے۔ اسے اٹینڈ کرنے کے لیے آپ کو کیبن میں جانا ہوگا۔“

ماروی نے حسینہ کو گھور کر دیکھا۔ پھر مراد سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ تمہیں باہر کیوں لے جا رہی ہے؟ کیا کال یہاں تمہارے فون میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتی؟“

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”پلیز ماروی! تم ہمارے معاملات کو نہیں سمجھتی ہو۔ کچھ کالیں خفیہ کوڈ ورڈز کے ذریعے ہوتی ہیں۔ وہ ادھر سے ادھر ٹرانسفر نہیں کی جاتیں۔ تم کھاتی رہو۔ میں اٹینڈ کر کے آتا ہوں۔“

وہ حسینہ کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ اس کا تو کھانا حرام ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا مراد کو چھین کر لے جانے کے لیے ہی وہ مختصر سا لباس پہن کر آئی تھی۔

بیویوں کو اس قدر شکی مزاج نہیں ہونا چاہیے لیکن جہاں شک درست ہو، وہاں شکی مزاج ہونا بھی درست ہوتا ہے۔ مراد نے باہر کیبن میں آ کر ریسیور کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو کون؟“

مرینہ کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔ میں نے ماسٹر سے کہا تھا کہ تم سے فون پر بات کروں گی تو ماروی برداشت نہیں کرے گی۔ تب ماسٹر نے یہ نمبر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ میں کسی رکاوٹ اور جھنجھٹ کے بغیر تمہاری آواز سن رہی ہوں لیکن کب تک....؟“

”مرینہ! تم جانتی ہو، وہ میری جان ہے لیکن جان عذاب میں ڈال رہی ہے۔ میرے قریب کسی بھی عورت کو

برداشت نہیں کر رہی ہے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ براہِ راست میرے فون پر کال نہیں کی۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں، ایسا کب تک ہوگا؟ تم نے لندن ائرپورٹ میں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس نے نہیں پہچانا تھا کہ میں مرینہ ہوں پھر بھی تمہارے قریب میرا وجود برداشت نہیں کر رہی تھی۔"

"وہ بیوی کی حیثیت سے اپنی جگہ درست ہے۔"

وہ بولی۔"میں صاف کہہ دیتی ہوں۔ اب تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔ پھر تم خود ہی دیکھ رہے ہو، حالات ایسے سنگین ہیں کہ ہم دونوں کو ساتھ رہنا ہی ہوگا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے ضروری ہو لیکن کیا کروں۔ وہ شکی مزاج ہے اور ہمیشہ رہے گی۔"

مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔"اگر وہ شکی مزاج ہے تو کیا غلط ہے۔ کیا ابھی اس سے چھپ کر مجھ سے باتیں نہیں کر رہے ہو؟"

"ہاں مجبوری ہے۔ تم میری ضرورت بن گئی ہو اور وہ کبھی کسی سوکن کو برداشت نہیں کرے گی۔"

"ہم دونوں سمجھ رہے ہیں کہ وہ اپنی جگہ درست ہے۔ ادھر تم اپنی جگہ مجبور ہو اور ادھر میرا دل تمہیں پکارتا رہتا ہے۔ میں وہاں آنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ ہمیں آزادی سے ملنے دے گی؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابھی نہ آؤ۔ ذرا صبر سے انتظار کرو۔ میں ماروی کو اپنے اعتماد میں لے رہا ہوں۔"

"میں انتظار اس لیے کر رہی ہوں کہ بروزنانو کی بیٹی میکی براؤن کے بیٹے کو شیشے میں اتار کر سسلی سے باہر آئے گی۔ وہ جس ملک میں بھی جائے گی، وہاں تم میرے ساتھ رہو گے۔"

وہ سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مرینہ سے ملتے رہنے کا ایک راستہ نکل رہا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔"یہ اچھا موقع ہے بروزنانو کی بیٹی جولیا کو اغوا کرنا ہے اور میکی کے بیٹے جیکی براؤن کو ختم کرنا ہے۔"

"ہاں۔ ملنے کا ایک راستہ نکل آیا ہے۔ جولیا اور جیکی جس ملک میں جائیں گے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"فار گاڈ سیک مراد...! پلیز...... پلیز وہاں ماروی کو نہ لانا۔ وہ بڑے مسائل پیدا کرے گی۔"

"بڑی مشکل ہے۔ وہ نئی دلہن ہے۔ ہنی مون منانے کے لیے میرے ساتھ رہے گی۔ میں سوچوں گا کہ مجھے موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے۔"

"سوچو اور یہ بتاؤ کہ آئندہ رابطہ کیسے ہوگا؟"

"آئندہ بھی اسی فون پر کال کرو۔ اسے شبہ نہیں ہوگا۔ بس اب میں جا رہا ہوں۔ وہ کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔"

وہ رابطہ ختم کرکے واپس آ گیا۔ وہ اپنی ماروی کا سچا عاشق تھا۔ لیکن اس کے اعتماد سے کھیل رہا تھا۔ بعض اوقات حالات ایسے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ ایسے موڑ پر لے آتے ہیں کہ ہزار سچائی کے باوجود دغابازی کرنی ہی پڑتی ہے۔

☆☆☆

میڈونا کو اوندھے منہ گرنے کے بعد معمولی چوٹیں آئی تھیں لیکن تمام تکالیف پر ایمان علی حاوی ہو گیا تھا۔ وہ ماں باپ سے اسی کے لیے ضد کر رہی تھی کہ اسے کہیں جانے سے فوراً روکا جائے۔

میکی براؤن دولت مند اور طاقتور ہونے کے باوجود اسے نہ روک سکا۔ اسے اندر جانے اور ایمان علی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سسلی والی فلائٹ میں جا رہا ہے یا سسلی جانے والی فلائٹ میں کس ملک کی طرف جانے والا ہے۔

میکی براؤن کے آدمی اس عورت کو بھی تلاش کر رہے تھے جس نے میڈونا کو دوڑتے وقت گرایا تھا لیکن اس عورت کے نقشِ قدم بھی نہیں مل رہے تھے۔

وہ پوری فیملی سسلی جا رہی تھی۔ جب وہ سب بورڈنگ کارڈز لینے اندر چلے گئے، تب انہوں نے باہر فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ یہ وہ وقت تھا جب ملی نے کار کے اندر ایک فائر کیا تھا۔ پھر کار سے باہر چھلانگ لگا کر فرار ہونے والوں پر گولیاں چلائی تھیں۔

میکی براؤن کے خاص ماتحتوں نے اسے فون پر بتایا کہ ایک ایشیائی جوان اور خوب صورت عورت نے عمارت کے باہر ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ وہ جس کار پر فائرنگ کر رہی تھی، وہ دور نکل گئی ہے۔ موبائل پولیس بھی ان کے تعاقب میں گئی ہے۔

یہ میکی براؤن کے پیشے کے مطابق بہت ہی اہم خبر تھی۔ اس نے کہا۔"ایسا ہنگامہ کرنے والی اور گولیاں چلانے والی کوئی عام سی عورت نہیں ہوگی۔ معلوم کرو، وہ کون ہے؟"

"سر! وہ پاکستانی شلوار سوٹ میں ہے۔ ریڈ اینڈ بلیک کلر کی میچنگ ہے۔ وہ قد آور، صحت مند اور اسمارٹ ہے۔"

میکی نے میڈونا سے کہا۔"تم نے اس عورت کی صورت نہیں دیکھی مگر کیا اس کے لباس کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی؟"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ گرتے وقت سرخ اور سیاہ رنگ کی جھلک دکھائی دی تھی۔"

میکی نے فون پر کہا۔ "وہی ہے۔ اسی نے میڈونا کو گرایا تھا۔ فوراً اسے گھیرو۔ معلوم کرو، کون ہے؟ کن لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں اور وہ کہاں رہتی ہے؟"

"سر! اس کے پاس گن ہے پھر پولیس والے ابھی اس کی حمایت میں مفرور مجرموں کو گرفتار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور عقل کہتی ہے کہ گن چلانے والی عورت تنہا نہیں ہوگی اس کے پیچھے خطرناک لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اس سے دور رہو اور جلد سے جلد اس کے متعلق معلومات حاصل کرو۔"

ببلی نے ایک چھوٹی سی حرکت کی تھی۔ اپنے جیسی ایک جوان لڑکی کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔ اب وہ چھوٹی سی حرکت رائی کا پربت بن رہی تھی۔ ڈی ڈی ٹریڈرز (ڈیزنگ ڈائمنڈ ٹریڈرز) کا بگ باس میکا تو رابرٹ بھی اسے پکڑنے کی فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی براؤن کے کارندے بھی اسے گھیرنے والے تھے۔

بلا ابھی اپنی ببلی کی اس کارستانی سے بے خبر تھا کہ اس نے کتنے دشمنوں کو اپنے پیچھے لگالیا ہے پھر بھی اسے اندازہ تھا کہ اس کی سرعام گن شوٹنگ نے مجرموں کو دور تک چونکا دیا ہوگا۔ سب ہی اس تجسس میں مبتلا ہوں گے کہ وہ پاکستانی شلوار سوٹ والی جوان عورت کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟

بلے نے اندازہ کرلیا تھا کہ تجسس میں مبتلا رہنے والے ببلی کا پتا ٹھکانا معلوم کرتے ہوئے موجودہ رہائش گاہ تک ضرور پہنچیں گے۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ تو کیا کر بیٹھی ہے ببلی...؟"

"میں نہ کرتی تو وہ مجھے اغوا کر لیتے...... کیا تجھے چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی جاتی؟"

"میں مانتا ہوں۔ تجھے یہی کرنا تھا۔ تو نے کمال کیا ہے لیکن اب ہم رازداری سے یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ رفتہ رفتہ تمام دشمنوں کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ہم سیدھی سادی زندگی گزارنے والے عام شہری نہیں ہیں۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "دشمنوں کو کیسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم سیدھے سادے نہیں ہیں؟"

"تو نے سرعام گولیاں چلائی ہیں۔ یہ بات دور تک پھیل چکی ہوگی۔ موٹی عقل والے بھی یہی سوچیں گے کہ جس کی عورت گن چلاتی ہے، اس کا مرد بھی کچھ کم نہ ہوگا۔ آج سے ہمارے متعلق چپ چاپ معلومات حاصل کی جاتی رہیں گی۔"

وہ بولی۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تو نے مجھ سے بھی بڑے کام کیے ہیں۔ میکی کے جوان بیٹے کو گولی سے اڑا دیا۔ بم دھماکے سے ان کی گاڑیاں تباہ کردیں۔ تب تو کوئی معلوم کرنے نہیں آیا کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

وہ اس کی پیشانی کو ایک انگلی سے مارتے ہوئے بولا۔ "کبھی دماغ سے بھی سوچا کر۔ میں نے کسی کے سامنے آکر نہ گولی چلائی ہے، نہ بم دھماکا کیا ہے۔ آئندہ بھی یہی کرنے والا ہوں۔ رازداری سے دشمنوں کو دہلاتا رہوں گا تو کبھی کسی کی نظروں میں نہیں آؤں گا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ تو لوگوں کے ہجوم میں گولیاں چلا کر کھلا اشتہار بن گئی ہے۔"

وہ فکر میں مبتلا ہو گئی۔ بڑی معصومیت سے منہ بنا کر بولی۔ "اب کیا ہوگا بلے؟ ہم اپنے اپارٹمنٹ میں کتنے سکون سے ہیں۔ کیا اب نہیں رہ سکیں گے؟"

"کوئی حملہ کرنے ہمارے دروازے پر نہیں آسکے گا۔ میرے ماتحت اس اپارٹمنٹ کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے خطرات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ویسے یہ غلط ہو گیا۔ تجھے ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

اس نے بشریٰ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "جی داری تو نے دکھائی ہے۔ میرا سینہ چوڑا ہو گیا ہے، فخر سے کہتا ہوں تو جلد ہی میری طاقت میرا ہتھیار بننے والی ہے۔"

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گردن کو چوم کر بولی۔ "جو ہوتا ہے ہونے دے۔ جئیں گے ایک ساتھ، مریں گے ایک ساتھ۔ خدا نہ کرے کبھی تجھے گولی لگے تو میں بھی دوسری سانس نہیں لوں گی۔ خود کو گولی مار کر تیرے ساتھ مر جاؤں گی۔"

بلے نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "خودکشی کی بات سوچے گی تو منہ توڑ دوں گا۔ اللہ نے زندگی دی ہے۔ تو اسے ختم کرنے والی کون ہوتی ہے؟"

پھر اسے تھام کر بولا۔ "تیرا یہ وجود میرے لیے ہے۔ کیا میرے بعد دشمنوں سے انتقام نہیں لے گی؟"

"ہاں، یہ تو بھول ہی گئی تھی۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں؟ ان کتوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"تو پاگل ہے، جان دے دی گی۔ کیسے یقین کروں کہ میرے بعد انتقام لینے کے لیے زندہ رہے گی؟"

"تو مر کے دکھا، میں زندہ رہ کے دکھاتی ہوں۔"

اس بات پر دونوں ہنستے ہنستے لپٹ گئے لیکن رنگ نون کباب میں ہڈی بن گئی۔

انہوں نے الگ ہو کر فون کو دیکھا، بلّے نے اسے اٹھا کر نمبر پڑھے پھر کہا۔ ''کوئی انجانا نمبر ہے۔''

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ ''ہیلو......؟''

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''سلام مسلمان بھائی!''

بلّے نے کہا۔ ''وعلیکم السلام۔ مسلمان بھائی۔''

''میں اپنی مسلمان پاکستانی بہن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فون میری عزیزہ مسسز کو دیں۔''

بلّے نے فون کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تعجب ہے تم کیسے مسلمان ہو؟ کب سے بھائی ہو اور کس رشتے سے میرے سالے ہو؟ پہلے اپنا تعارف تو پیش کرو۔''

''میں دین اسلام کے رشتے سے بھائی ہوں۔ اپنی بہن کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جو سمجھ رہی ہیں، وہ ہم نہیں ہیں۔ ہم اسے اغوا کرنا نہیں چاہتے تھے...''

بلّے اور بشریٰ نے ایک دوسرے کو سمجھنے کے انداز میں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بائی گاڈ... ہمارے دل صاف ہیں۔ ہم تو اس کی سلامتی کے لیے اسے وہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔''

بلّے نے کہا۔ ''اچھا تو تم لوگ ہو۔ میری وائف کی سلامتی چاہتے تھے اور اسے گن پوائنٹ پر لے جا رہے تھے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ تم ہمیں غلط نہ سمجھو۔ ہم سچے دل سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔''

''شٹ اپ۔ تم مسلمان نہیں ہو بہروپیے ہو۔ دنیا کا ہر مسلمان خواہ وہ کسی ملک کا ہو اسے السلام علیکم کہنا آتا ہے۔ تم تو سلام کرنا بھی نہیں جانتے۔''

''جانتا ہوں۔ بائی گاڈ میں تمہارے جیسا مسلمان ہوں۔''

''اچھا تو پہلا کلمہ سناؤ۔''

''آں۔ وہ۔ وہ بات یہ ہے کہ میرے ماں باپ عیسائی ہیں۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ کلمہ کیا ہوتا ہے۔''

بلّے نے فون بند کر دیا۔ پھر بشریٰ سے کہا۔ ''سنا تم نے؟ ابھی صرف چھ گھنٹے گزرے ہیں اور انہوں نے بڑی آسانی سے میرا فون نمبر معلوم کر لیا ہے۔''

''تعجب ہے کیسے معلوم کیا ہوگا؟''

''بہت آسانی سے۔ انہوں نے ہماری کار کے نمبر سے رجسٹریشن آفس میں معلوم کیا ہوگا۔ وہاں میرا نام رہائشی پتا فون نمبر اور دیگر کوائف درج ہیں۔''

بشریٰ نے حقارت سے کہا۔ ''وہ ایک نہیں تین مرد تھے۔ مجھ سے مات کھانے کے بعد شرم سے منہ چھپانا چاہیے تھا۔ مگر وہ دوستی کرنے کے لیے فون کر رہا ہے۔''

''وہ دوستی کے بہانے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارا دھندا کیا ہے؟ معلومات حاصل کرنے کے پیچھے ان کا کوئی مقصد اور مفاد ضرور ہوگا۔''

اس نے فون کے ذریعے اپنے ماتحتوں سے رابطہ کیا۔ انہیں بتانے لگا کہ وہ تین فیگرو اس کا فون نمبر اور رہائشی پتا معلوم کر چکے ہیں۔ لہٰذا پوری مستعدی سے اس کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کی جائے اور ان اطراف میں آنے والے اجنبیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

اس نے فوری ہدایات دینے کے بعد فون بند کیا تو ایک اور کال آگئی۔ اسکرین پر پھر ایک نیا نمبر تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ ''ہیلو فرمایئے؟''

ایک رعب دار آواز سنائی دی۔ ''میں سی آئی اے کا ایک افسر ہوں۔ معلوم ہوا ہے، تم راجر اسٹریٹ میں ایک پب کے مالک ہو جبکہ اس کا مالک ایک انڈین تھا۔''

بلّے نے کہا۔ ''آپ جاسوس ہیں اور افسر بھی ہیں۔ یہ تفصیلات تو معلوم کی ہوں گی کہ میں نے حال ہی میں وہ پب اس انڈین سے خرید لیا ہے۔''

وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے ہم معلوم کریں گے۔ تم ہمارے سوالوں کے جواب دو۔ یہ بتاؤ تم یہاں لندن میں کتنے عرصے سے ہو؟''

وہ خود کو سی آئی اے کا افسر کہہ رہا تھا اور بہت ہی کمزور سا سوال کر رہا تھا۔ بلّے نے کہا۔ ''میں یہاں تب سے ہوں، جب تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ابے او بناسپتی افسر...... سیدھی طرح بتا دے کہ کون ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

''ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ وہ عورت تیری کون ہے جس نے میکی صاحب کی بیٹی کو گرانے کی جرأت کی تھی؟''

بلّے اور بشریٰ نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ انجان بن کر فون پر بولا۔ ''یہ میکی صاحب کون ہیں؟''

''وہ اتنے خطرناک انسان ہیں کہ ان کے بارے میں سنو گے تو پتلون گندی ہو جائے گی۔''

''اچھا تو ان کے ساتھ رہ کر تم لوگ پتلون دھوتے رہتے ہو؟ پتا نہیں کون ہو تم لوگ؟ میری وائف کی کسی میکی صاحب کی بیٹی سے بھلا کیا دشمنی ہوگی۔ خواہ مخواہ الزام نہ دو۔ ہمیں عزت سے پرامن زندگی گزارنے دو۔''

''کیا پرامن زندگی گزارنے والے کی بیوی گن فائٹر ہوتی ہے؟ وہ ایسی ہے تو تم بھی جانے کس کے لیے ہتھیاروں

سے کھیلتے ہو گے۔ بہتر ہے! اپنی اصلیت بتادو۔ تم میاں بیوی کون ہو اور کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

بلّے نے کچھ سوچا۔ وہ ان کے اندر پہنچ کر ان کی اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا رویہ بدلتے ہوئے کہا۔ "میں ایک...... پیشہ ور فائٹر اور شوٹر ہوں۔ جو مجھے اچھی رقم پے کرتا ہے، میں اس کے لیے کام کرتا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ایسے بولو نا' تم کرائے کے کرمنل ہو۔ ہمارا ابھی کام کر سکتے ہو۔"

اس نے پوچھا۔ "کام کیا ہے؟"

"یہ تو ہمارا باس ہی بتائے گا۔ میں جہاں کہتا ہوں وہاں آ کر ہم سے ملنا ہوگا۔"

"میں پہلی ملاقات کسی کے اڈے میں نہیں کرتا۔ تمہارے باس سے کسی کھلی جگہ مل سکتا ہوں۔"

"تم بولو کہاں ملنا چاہتے ہو؟"

"شہر سے تیس کلومیٹر دور ہائی وے کے کنارے ذرا فاصلے پر ایک چرچ ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ اگر تمہارا باس دو چار گھنٹوں میں آ سکتا ہے تو وہاں آ جائے۔"

"میں تھوڑی دیر بعد تمہیں کال کر کے ملاقات کنفرم کروں گا لیکن ہمارا باس اس دلیر عورت سے بھی ملنا چاہے گا۔ اسے اپنے ساتھ لانا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بلّے نے بشریٰ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اے دلیر عورت! تیار ہو جا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ بلّے نے اپنے ایک ماتحت سے فون پر کہا۔ "ہائی وے کے میریا چرچ میں کسی کرمنل تنظیم کا باس مجھ سے ملنے آئے گا۔ تم میری جگہ کرائے کے شوٹر بن کر اس سے ملو گے۔ اپنے ساتھیوں سے کہو، ابھی فوراً اس چرچ میں جا کر اندر اور باہر مورچے بنا لیں۔ میں اپنی وائف کے ساتھ وہاں چھپ کر آ رہا ہوں۔ ابھی پھر تمہیں کال کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے بشریٰ سے کہا۔ "ابھی یہاں سے نکلو۔ قریبی مارکیٹ میں چلو۔ وہاں ایک عیسائی راہبہ کا لباس خرید کر پہنو۔ تم وہاں چرچ کے اندر دشمنوں کے سامنے ایک راہبہ کی حیثیت سے موجود رہو گی۔"

وہ خوش ہو رہی تھی۔ اسے اپنے بلّے کے ساتھ ایکشن میں رہنے کا چانس مل رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد ہی کال آئی کہ ان کا باس ہائی وے کے میریا چرچ میں دو گھنٹے بعد پہنچنے والا ہے۔ بلّے نے گھڑی دیکھی۔ اچانک مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ اس نے ماتحت کو سمجھایا۔ "وہاں چرچ میں کوئی باس نہ آیا تو اس کا کوئی دستِ راست آئے گا۔ اس سے پوچھنا ہے کہ وہ کون ہے؟ کس تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟

"چونکہ ہم مسلمان ہیں اور میں پاکستانی ہوں۔ اس لیے اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ مراد سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔ تم اس سے لاتعلقی ظاہر کرو گے۔ میں بعد میں باتیں بناؤں گا۔

"میں اور بشریٰ وہاں نہتے رہیں گے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا لیکن تم سب محتاط اور مستعد رہو گے۔ ضرورت کے وقت چشم زدن میں ہمارے پاس ہتھیار پہنچاؤ گے۔"

بشریٰ نے ایک دکان سے راہبہ کا لباس خرید کر ایک کیبن میں جا کر اسے پہن لیا۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں چھپ گئی۔ اس کے بال بھی اسکارف میں چھپ گئے تھے۔ سامنا کرنے پر صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

بلّا وہاں سے کار ڈرائیو کرتا ہوا ہائی وے پر آ گیا۔ وہ بشریٰ کو سمجھا رہا تھا کہ وہاں کیا کرے گی اور جتنا سمجھایا جا رہا ہے، اس سے آگے کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ اگر کرے گی تو اسے آئندہ کسی مہم میں ساتھ نہیں لے جائے گا۔

وہ بڑی فرمانبرداری سے سر ہلا کر وعدہ کر رہی تھی کہ وہاں اپنی عقل استعمال نہیں کرے گی۔ فون پر ماتحت نے کہا کہ وہ دو ساتھیوں کے ساتھ چرچ میں پہنچ گیا ہے۔ باقی تین ابھی پہنچنے ہی والے ہیں۔

وہ چرچ ہائی وے پر آبادی سے دور تھا۔ وہاں اتوار کو عبادت گزار آ جاتے تھے۔ عام دنوں میں وہ ویران رہا کرتا تھا۔ وہاں سے گزرنے والے' عقیدت مندی سے رک کر چرچ کے اندر جاتے، سر جھکا کر راہب سے اپنے لیے دعا کراتے' پھر اپنے راستے چلے جاتے تھے۔

اس روز بھی وہ ویران تھا۔ اس کے عقب میں رہائشی کوارٹرز تھے۔ بشریٰ اور بلّا ان کے پاس آ گئے۔ وہاں ایک کوارٹر میں راہب تھا۔ دوسرے کوارٹروں میں ایک بوڑھی اور ایک جوان راہبہ تھی۔ انہوں نے تینوں کو یکجا کیا پھر ان سے کہا۔ "آج یہاں چرچ میں گولیاں چل سکتی ہیں۔ تم تینوں کو یہاں سے دور ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچایا جا رہا ہے۔ ہم پر بھروسا کرو۔ تعاون کرو، شام سے پہلے تمہیں یہاں واپس لے آئیں گے۔"

دروازے پر دو گن مین کھڑے ہوئے تھے اور وہ تینوں سہمے ہوئے تھے۔ بلّے نے بوڑھی راہبہ سے کہا۔ "تم

ہمارے ساتھ یہاں رہوگی۔ باقی یہ دونوں جائیں گے۔"

وہ گن مین ان دونوں کو بلّے کی کار میں لے گئے۔ بلّے نے وہاں راہب کا لباس پہن لیا۔ بشریٰ بوڑھی راہبہ سے کہہ رہی تھی۔ "تم ہماری ماں ہو۔ ہم پر بھروسا کرو۔ گولیاں چلنے کے باوجود تم پر ایک ذرا آنچ نہیں آئے گی۔"

بوڑھی نے کہا۔ "اب میری زندگی کتنی رہ گئی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میں مدر کہلاتی ہوں۔ تم مسلمان ہوکر مجھے ماں کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

بلّا اور بشریٰ اس کے ساتھ چرچ میں آگئے۔ اس وقت فون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں بولو۔ تم وہی ہو نا...؟"

"ہاں۔ ہم چرچ کے قریب آگئے ہیں۔ تم کہاں ہو؟"

"میں چرچ کے اندر ہوں۔ آجاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بلّے کے ایک ماتحت نے فون پر اسے بتایا کہ وہ لوگ چرچ کو چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔

یہ ابھی معلوم ہونے والا تھا کہ وہ دوست ہیں یا دشمن؟ حقیقت سامنے آنے سے پہلے سب ہی اپنے اپنے طور پر احتیاطی تدابیر پر عمل کررہے تھے۔

اور کچھ وقت گزرنے کے بعد چرچ کا دروازہ کھلا۔ ایک گن مین نے اندر آکر دیکھا۔ اس وقت بلّے کا خاص ماتحت ہاتھوں میں ایک گن لیے ایک اونچی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بلّے، بشریٰ اور بوڑھی راہبہ کو اپنے نشانے پر رکھا تھا۔ وہ تینوں ایک بڑی سی صلیب کے سائے میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

آنے والے نے پوچھا۔ "کیا تم وہی کرائے کے کرمنل ہو جس سے فون پر بات ہوچکی ہے؟"

"ہاں میں تو وہی ہوں مگر تم وہ نہیں ہو۔"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ ہمارا باس باہر گاڑی میں ہے۔ وہ پہلے اطمینان کرنا چاہتا ہے۔"

"اسے کہو، جلدی اطمینان حاصل کرے۔ میں نے ان بے چارے راہب اور راہباؤں کو جبراً یہاں بٹھا رکھا ہے۔"

اس نے فون پر کہا۔ "باس! یہاں صرف وہی کرائے کا کرمنل ہے۔ اس نے کچھ فاصلے پر ایک راہب اور دو راہباؤں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اور دو گن مین آگئے۔ وہ چرچ کے اندر کسی چھپنے والے کو تلاش کرنے لگے۔ اچھی طرح تلاش کرنے کے باوجود انہیں اور کوئی وہاں نظر نہیں آیا۔ تب باس نے حکم دیا۔ "ان راہبوں کی تلاشی لو۔"

باہر سے ایک عورت وہاں آئی۔ اس نے بوڑھی عورت اور بشریٰ کی سر سے پاؤں تک تلاشی لی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ انہیں راہب بھی نہتا ملا۔ تب وہ باس مطمئن ہوکر ایک باڈی گارڈ کے ساتھ اندر آگیا۔ وہ ایک قدآور صحت مند نیگرو تھا۔

اس نے اندر آکر صلیب سے کچھ فاصلے پر رک کر بلّے کے ماتحت سے کہا۔ "میرا نام جیمس ہارورڈ ہے۔ میں اسی دس منزلہ شاپنگ پلازا کا مالک ہوں، جہاں میرے تین نیگرو ماتحت اس روز پولیس والوں سے چھپنے آئے تھے۔ تمہاری گھر والی نے ان تینوں کو اچھی طرح دوڑا دیا تھا۔ میرے آدمی نے فون پر کہا تھا کہ میں اس دلیر خاتون سے ملنا چاہتا ہوں۔"

بشریٰ نے زیرِ لب مسکرا کر بلّے کو دیکھا۔ ماتحت نے کہا۔ "میری گھر والی سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ ابھی اپنی بات کرو۔ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ اگر دھندے کی بات ہے تو مجھ جیسے کرائے کے شوٹر سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟ کیا کسی ریکٹ، سنڈیکیٹ یا اور کسی گروہ سے تمہارا تعلق ہے؟"

"میں اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا اور تمہارے بارے میں بھی سنوں گا لیکن پہلے ہمارے درمیان دوستانہ اعتماد قائم کرنا ضروری ہے۔ یہ دیکھو میں اپنی گن ہٹا رہا ہوں۔"

اس نے اپنی گن کو ہولسٹر میں رکھ دیا پھر کہا۔ "میں خالی ہاتھ ہوگیا۔ تم بھی اپنی گن ایک طرف رکھ کر آؤ اور دوستوں کی طرح مصافحہ کرو۔"

"ضرور کروں گا۔ پہلے اپنے آدمیوں کو باہر جانے کے لیے کہو۔ یہاں میری طرح تمہیں بھی تنہا ہونا چاہیے۔"

اس نے سوچتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو دیکھا پھر انہیں باہر جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ سب چلے گئے وہ تنہا رہ گیا۔ ماتحت نے کہا۔ "پہلے ہمارے درمیان اعتماد قائم ہوگا پھر ہم کھلے دل سے مصافحہ کریں گے۔"

وہ ماتحت اوپر سے کود کر نیچے آیا اور مسکرا کر بولا۔ "اب تم اصل آدمی سے بات کرو۔"

اس نے بلّے کے پاس آکر اپنی گن اسے دی۔ جیمس ہارورڈ نے حیرانی سے ایک راہب کو گن پکڑتے دیکھا۔ بلّے نے کہا۔ "میں نے فون پر تمہارے آدمی سے باتیں کی تھیں۔ میں راجر اسٹریٹ کے اس اپارٹمنٹ میں اپنی وائف کے ساتھ رہتا ہوں۔"

بشریٰ نے اپنے سر سے اسکارف اتار کر پھینک دیا۔ پھر

کہا۔ ''مجھ سے ملنے کی تمنا تھی۔ اب بولو میں سامنے ہوں۔''

وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ حیرانی سے بلے اور بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''میڈم...! ہمارے بگ باس نے کہا ہے، آپ کی خدمات ہر قیمت پر حاصل کی جائیں۔ وہ آپ سے بہت متاثر ہے۔''

بشریٰ نے پوچھا۔ ''یہ بگ باس کون ہے؟''

''میں ابھی تمام سوالوں کے جواب دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ، تم میاں بیوی کتنی تنظیموں کے لیے کام کرتے ہو؟''

بلے نے کہا۔ ''یہ ہمارا پیشہ ورانہ پرسنل راز ہے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ تم اپنے کام کی بات کرو۔''

اس نے کہا۔ ''مراد علی منگی کا نام دنیا کے تمام مجرم جانتے ہیں۔ تم لوگ بھی جانتے ہوگے۔ وہ پاکستانی ہے۔ تم بھی پاکستانی ہو۔ اس سے جان پہچان ضرور ہوگی؟''

وہ بولا۔ ''اسے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''کبھی تو کسی نہ کسی واردات کے دوران میں اس سے سامنا ضرور ہوا ہوگا؟''

''ایک بار اس سے مقابلہ ہونے والا تھا لیکن میں اس سے کترا کر نکل گیا۔ وہ بھی مجھ سے کتراتا ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں نہیں مانتا۔ وہ کسی سے کتراتا نہیں ہے۔ اچھے اچھوں کو کتر کے رکھ دیتا ہے۔''

''وہ مجھ سے اس لیے دور ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیر بھائی ہیں۔''

''یہ پیر بھائی کیا ہوتے ہیں؟''

اس نے سمجھایا۔ ''پیر کا مطلب ہے (saint) سینٹ... اللہ کے پسندیدہ بندے۔ ہم ان کے عقیدت مند ہیں۔ انھیں پیر کہتے ہیں اور ہم دونوں ہی ان کے مرید ہیں۔ اس حوالے سے ایک دوسرے کے پیر بھائی کہلاتے ہیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تعجب ہے پیر بھائی ہو کر ایک دوسرے سے دور رہتے ہو؟''

''ہمارے راستے اور ہمارے مزاج الگ ہیں۔ اس کے باوجود میں کسی مصیبت کے وقت اسے بلاؤں تو وہ میری مدد کرنے چلا آئے گا۔ وہ کسی کام سے مجھے پکارے گا تو میں اس کی طرف دوڑا چلا جاؤں گا۔ ہمارے پیر بابا نے سختی سے تاکید کی ہے کہ ہماری ذات سے کسی پیر بھائی کو تکلیف نہ پہنچے۔''

''اتنا بتادو، اگر کبھی اس سے ملنا چاہو گے تو کیسے ملو گے؟''

''میں پیر بابا سے گزارش کروں گا۔ وہ مراد کو حکم دیں گے تو وہ میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔''

وہ بلے کی طرف دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ''او گاڈ...! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ اگر تم مراد سے ہماری دوستی کرا دو گے تو ہم تمہارے وزن کا سونا تول کر تمھیں دیں گے۔''

بلے نے پوچھا۔ ''تم ہو کون؟ کیا کرتے ہو؟ کس تنظیم سے تمہارا تعلق ہے؟ اور مراد سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے یقیناً ڈی ڈی ٹی یعنی ڈیئرنگ ڈائمنڈ ٹریڈرز کا نام سنا ہوگا؟''

''ہاں سنا ہے۔ ایک بہت ہی امیر کبیر خطرناک سرپھرا مجرم میکانو رابرٹ اس تنظیم کا سربراہ ہے۔''

اس نے کہا۔ ''جسے سرپھرا کہہ رہے ہو، وہ افریقا کی سب سے بڑی ہیروں کی کان ''کا کونا ڈائمنڈ مائن'' کا مالک ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کے پاس کتنے بیش قیمت ہیروں کا ذخیرہ ہے اور وہ کس قدر دولت مند ہے۔''

''تعجب ہے۔ وہ اس قدر دولت مند ہو کر مجرمانہ زندگی کیوں گزار رہا ہے؟''

''اس لیے کہ مجرمانہ زندگی گزارتے ہوئے ہی وہ ہیروں کی کان کا مالک بن گیا ہے۔ اسے اپنے خفیہ معاملات کے لیے ایک ناقابل شکست فائٹر اور شوٹر کی ضرورت ہے۔ وہ ہر قیمت پر مراد علی منگی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''تو اسے مراد سے بات کرنا چاہیے۔''

''وہ بڑی رازداری سے مراد کو اپنا وفادار دوست بنانا چاہتا ہے۔ ماسٹر کو بو بو سے کھل کر دشمنی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم تمھیں رازداری کی منہ مانگی رقم دیں گے۔ تم مراد سے میکانو رابرٹ کی ایک ملاقات کرادو۔''

بلے نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میرے کہنے سے وہ ملاقات نہیں کرے گا۔ وہ میرا پیر بھائی کسی مشکل میں ہی میرے کام آنے کے لیے آسکتا ہے۔ ورنہ مجھ سے بھی دور رہتا ہے۔''

ہارورڈ نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ وہ تمہاری کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے آسکتا ہے؟''

''بے شک۔ ہمارے پیر بابا حکم دیں گے تو وہ مجھے کسی بھی مصیبت سے نکالنے چلا آئے گا۔''

''پھر تو مراد کو آسانی سے میکانو رابرٹ کے پاس بلایا جاسکتا ہے۔ تم اپنے پیر بابا سے بولو کہ میکانو رابرٹ کے چنگل میں پھنس گئے ہو۔ وہاں سے نکلنے کے لیے مراد کی ضرورت ہے۔ وہی تمھیں وہاں سے نجات دلائے گا۔''

''سوری مسٹر ہارورڈ۔۔۔! نہ میں پیر بابا سے جھوٹ بولوں گا، نہ مراد کو دھوکا دے کر بلاؤں گا۔''

''تم مال کمانے کے لیے گن چلاتے ہو۔ ہم تمہارے اکاؤنٹ میں آج ہی دس لاکھ ڈالرز جمع کر دیں گے۔''

''دس کروڑ بھی دو گے تو مراد کو دھوکا نہیں دوں گا۔''

وہ بلّے کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ آخر اپنی گن نکال کر بولا۔ ''پھر تو ہم تمہیں یہاں سے پکڑ کر لے جائیں گے۔ اپنا قیدی بنا کر رکھیں گے۔ اس کے بعد تم اپنے پیر بابا سے سچ بولو گے۔ مراد کو بھی دھوکا نہیں دو گے۔ پھر تو وہ تمہاری مدد کرنے کے لیے دوڑا چلا آئے گا۔''

بلّے کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا مجھے جبراً قیدی بناؤ گے؟''

''اگر ہمارے ساتھ راضی خوشی نہیں جاؤ گے، ہمیں مجبور کرو گے تو جبر کرنا ہی ہوگا۔''

''یعنی ہم دونوں ابھی گولیاں چلائیں گے۔ دونوں زخمی ہوں گے یا دونوں مر جائیں گے۔''

وہ تن کر بولا۔ ''میں ایک منی فوج لے کر آیا ہوں۔ مجھے موت آئے گی تب بھی میرے آدمی تمہیں قیدی بنا کر لے جائیں گے۔''

دراصل وہ باتوں میں الجھا رہا تھا۔ وہاں چرچ کے اندر بیٹھ کر عبادت کرنے والوں کے لیے کئی قطاروں میں بنچیں بنی ہوئی تھیں۔ ہارورڈ اچانک ہی چھلانگ لگا کر دو قطاروں کے درمیان جا کر گر پڑا، ان کی نظروں سے چھپ گیا۔ بلّا، بشریٰ اور ماتحت نے بھی پھرتی دکھائی۔ بوڑھی راہبہ کو کھینچ کر دوسری قطاروں کے درمیان آگئے۔

ماتحت نے وہاں ہتھیار چھپا کر رکھے تھے۔ وہ اوندھے منہ رینگتا ہوا کنفیشن باکس کے اندر گیا۔ وہاں سے بلٹس اور گنیں اٹھا کر لے آیا۔ ہارورڈ بے خبر تھا کہ وہ چپکے چپکے کیا کر رہے ہیں۔

وہ چیلنج کر رہا تھا۔ ''تم ایک گن لے کر کب تک چھپتے اور مقابلہ کرتے رہو گے؟ میرے مسلح فوجی ابھی آرہے ہیں۔''

اس نے فون کے ذریعے باہر انتظار کرنے والوں کو حکم دیا۔ ''اٹیک کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں' یہاں صرف ایک ہی آدمی کے پاس گن ہے۔ اندر آجاؤ۔''

حکم سنتے ہی چرچ کا دروازہ کھلا۔ جو باہر گئے ہوئے تھے وہ اپنی اپنی گن سنبھالتے ہوئے اندر آئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ مقابلے میں ایک ہی گن ہے۔ لیکن اندر آتے ہی موت جھپٹ پڑی۔ یکبارگی تین سمتوں سے فائرنگ ہونے لگی۔

ہارورڈ کے چار شوٹرز آئے تھے' ان پر گولیاں چلانے والے بلّا اور بشریٰ وغیرہ سیٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگے۔ لیکن دروازے تک نہ جاسکے۔ موت نے ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے گرے تو پھر اٹھ نہ سکے۔

ان میں سے ایک وہاں آکر گرا جہاں ہارورڈ بینچوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے مردہ شوٹر کو دیکھنے لگا۔ پھر ذرا گردن ٹیڑھی کر کے دیکھا تو باقی ماتحتوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ اس کی اپنی پلاننگ خاک ہو رہی تھی۔

اسے بلّے کی آواز سنائی دی۔ ''ہارورڈ۔۔۔! تیرے چاروں گئے......اور کتنے ہیں، انہیں بھی بلا۔''

باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بلّے کے جو ماتحت چھپے ہوئے تھے وہ دشمنوں پر گولیاں چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں پہلے سے آکر چرچ کو گھیر لیا تھا اور اس خوش فہمی میں تھے کہ انہیں کسی نے دیکھا نہیں ہے۔

ان کی طرف آنے والی گولیوں نے سمجھا دیا کہ موت سے کوئی چھپ نہیں سکتا۔ وہاں بڑی دیر تک کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی۔

چرچ کے اندر خاموشی تھی۔ ہارورڈ جہاں چھپا ہوا تھا' وہاں سے نکلنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ باہر کی مسلسل فائرنگ سمجھا رہی تھی کہ بلّا نہ چرچ کے اندر تنہا ہے نہ باہر۔۔۔ وہ بھی اپنی فوج لے کر آیا تھا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ ایک شوٹر نے فون کے ذریعے ہارورڈ سے کہا۔ ''ہمارے تمام آدمی مارے گئے ہیں۔ میں اور دو کی جان بچا کر بھاگتے ہوئے ہائی وے پر آگئے ہیں۔''

وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''آپ اپنے شوٹرز کے ساتھ چرچ میں محفوظ ہوں گے۔ ہمیں حکم دیں ہم کیا کریں؟ کیا آپ کو وہاں سے نکالنے کے لیے اور شوٹرز کو بلائیں؟''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''شوٹروں کی فوج آجائے گی، تب بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکے گی۔ یہاں بھی وہ چاروں مارے گئے ہیں۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ابھی ان سے سمجھوتا کرنے والا ہوں۔ میری کال کا انتظار کرو۔''

وہ فون بند کر کے اونچی آواز میں بولا۔ ”مسٹر بلال احمد۔۔۔! میں مان گیا تم زبردست ہو۔ میں تمہیں سیلوٹ کرتا ہوں۔ تم بہت ذہین پلان میکر ہو۔“

وہ خوشامدانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”ہمارا بگ باس میکانو رابرٹ بھی تمہاری دلیری اور ایسی پلاننگ کی قدر کرے گا۔ میری سلامتی کے عوض ابھی تمہیں بھاری رقم دی جائے گی۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

چرچ کے اندر بلے کی آواز گونجی۔ ”کیا مراد علی منگی سے ملاقات کیے بغیر جاؤ گے؟“

وہ بولا۔ ”مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔ ابھی تمہاری منہ مانگی رقم وہاں جمع کر دی جائے گی۔ تم تصدیق کرنے کے بعد مجھے یہاں سے جانے دو۔“

”پہلے میری آواز کی سمت اپنی گن پھینک کر میرے سامنے آؤ۔ پھر کوئی بات کرو۔“

ہارورڈ کے لیے سلامتی کا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ گن پھینک کر سیٹوں کے درمیان سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر دوسری طرف بھی بشریٰ، بلا اور اس کا ماتحت ان قطاروں کے درمیان سے ابھر آئے۔

بشریٰ نے اس کی گن اٹھا کر کہا۔ ”میں وہی ہوں جس نے تیرے تین گنرز کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”بائی گاڈ۔۔۔! ہم سب تمہارے قدر دان ہیں۔ یقین کرو ہم بگ باس کے حکم سے اسی دن تم کو اور بلال احمد کو اپنا دوست بنانا چاہتے تھے۔“

بلے نے کہا۔ ”اور ہم دیکھ رہے ہیں، دوستی کی آڑ میں دشمنی ابھی ظاہر ہوگئی ہے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”بلے! باتوں میں وقت ضائع نہ کر۔ مجھے گولی مارنے دے۔ میں اسے ابھی ٹھنڈا کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”نہیں، میں اسے زندہ جانے دوں گا۔ اس کے بگ باس میکانو رابرٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مراد علی منگی کا پیر بھائی بھی کتنا زبردست ہے۔“

پھر اس نے ہارورڈ سے کہا۔ ”تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ مراد تک میرے ہی ذریعے پہنچ سکو گے۔ تم آئندہ مجھے گھیرنے اور پکڑنے کی کوششیں کرتے رہنا۔ فی الحال جاؤ یہاں سے۔۔۔“

وہ جانے لگا۔ اپنے شوٹرز کی لاشوں کے قریب سے گزرتے ہوئے چرچ کے باہر آگیا۔ بلے نے کہا۔ ”جاؤ اور اپنے بگ باس سے بولو مجھ سے فون پر بات کرے۔ میں مراد کے متعلق ایک چونکا دینے والی بات اسے بتاؤں گا۔“

اسے رہائی مل رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا جا کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہائی وے پر آگیا۔ وہاں اس نے رفتار کو معمول پر لاتے ہوئے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی پھر فون نکال کر بگ باس سے رابطہ کیا۔

رابطہ ہونے پر میکانو رابرٹ کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”ہاں بولو، کام ہوگیا؟“

اس نے شکست خوردہ انداز میں وہاں کی روداد سنائی۔ پھر کہا۔ ”یہ بلال احمد بھی مراد کی طرح زبردست ہے۔ اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ بھی خطرناک بلا ہے۔ انہیں کسی بھی طرح دوست بنانا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ناکام رہا ہوں۔“

وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کوشش کریں۔ وہ آپ کی کال کا منتظر ہے۔ آپ کو مراد کے بارے میں کوئی سرپرائز دینا چاہتا ہے۔“

ادھر بلے کے ماتحتوں نے تمام لاشوں کو چرچ سے دور لے جا کر پھینک دیا تھا۔ وہاں فرش پر پھیلے ہوئے لہو کو پانی سے دھو دیا تھا۔ راہب اور راہبہ کو بھی واپس لے آئے تھے۔ چرچ کا ماحول پہلے کی طرح پرسکون اور امن و امان والا ہوگیا تھا۔

بشریٰ نے مایوسی سے کہا۔ ”مجھے مزہ نہیں آیا۔ میں سمجھ رہی تھی، ایکشن میں رہنے کا موقع ہے۔ کچھ کر گزرنے کی لیکن تو نے تو ایک بھی گولی چلانے نہیں دی۔“

وہ بولا۔ ”کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ ایکشن والے اور فائرنگ کرنے والے مرحلوں سے گزرتے رہیں۔ آج میں نے بھی کچھ نہیں کیا ہے۔ میدان میرے ماتحتوں نے مارا ہے۔“

وہ اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر بولا۔ ”تجھے یہ تجربہ حاصل کرنا چاہیے کہ ایسے وقت کس طرح حکمت عملی سے کام لیا جاتا ہے۔ تو دیکھنا ابھی ان کے بگ باس کی کال آئے گی۔ پھر تجھے معلوم ہوگا کہ میں کیسا زبردست گیم کھیل رہا ہوں۔“

وہ اپنی حکمتِ عملی کو سمجھتے ہوئے درست کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی میکانو رابرٹ نے فون پر اسے مخاطب کیا اور کہا۔ ”مسٹر بلے۔۔۔! تم سے رابطہ کر کے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ تم نے بہترین پلاننگ کے ذریعے ہارورڈ کے شوٹرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اگرچہ میرا ہی نقصان ہوا ہے۔ لیکن میں تمہاری حکمت

عملی اور دلیری کی قدر کرتا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "یہ بڑی بات ہے۔ تم نے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے گویا دوستی کرنے کے لیے جیکس ہارورڈ کو زندہ چھوڑ کر فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔"

بلّے نے کہا۔ "واقعی۔ اسے زندہ چھوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مراد علی منگی کے پیر بھائی ہو۔ مجھے امید ہے میرے دوست بن کر مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ ایک بار ضرور مراد سے میری ملاقات کراؤ گے۔"

"میں تمہاری یہ مراد ابھی پوری کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ' میرا ایک راز اپنے دل میں چھپا کر رکھو گے؟"

وہ جیسے تڑپ کر جلدی سے بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو...؟ ابھی مراد سے ملاقات کراؤ گے...؟ او گاڈ...! میں وعدہ کرتا ہوں' یہ راز میرے دل میں رہے گا۔ کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔ میں گونگی دیواروں سے اور اپنے سائے سے بھی نہیں بولوں گا۔"

"تم ماسٹر کو بوبو سے بھی نہیں بولو گے۔"

"میں کس طرح یقین دلاؤں کہ تمہارے رازوں کا امین رہوں گا۔ فار گاڈ سیک بتاؤ' مراد کی بات کرو۔"

بلّے نے اچانک مراد کی آواز اور لہجے میں کہا۔ "راز یہ ہے کہ تم ان لمحات میں مراد علی منگی سے باتیں کر رہے ہو۔"

میکا نو رابرٹ جہاں بیٹھا ہوا تھا' وہاں سے یکلخت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شدید حیرانی سے بولا۔ "تم...... تم مراد علی منگی ہو...؟"

مراد کی آواز کی ریکارڈنگ اور اس کی حرکات و سکنات کی ویڈیو فلمیں تمام کرمنل ریکنس اور سنڈیکیٹس میں پہنچی ہوئی تھیں۔ میکا تو اس کی آواز کو اور لہجے کو نقار خانے میں بھی سن کر پہچان سکتا تھا۔

ان لمحات میں اچانک اس کی آواز سن کر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جس سے ہر قیمت پر ملاقات کا خواہش مند ہے' وہ اچانک ہی اس کے فون میں گھس آیا ہے۔

وہ یقین کرنے کے باوجود بے یقینی سے بولا۔ "او گاڈ...! وہی آواز ہے' وہی لہجہ ہے۔ میں کیا کروں' مجھے یقین دلاؤ کہ تم ہی مراد علی منگی ہو؟"

بشریٰ حیرانی سے بلّے کا منہ تک رہی تھی۔ وہ ایک نئی چال چل رہا تھا۔ ایک نیا گیم شروع کر رہا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ "ابھی میں نے صرف بتایا ہے کہ مراد ہوں۔ آئندہ دیکھا رہوں گا کہ یہ راز کب تک اپنے پیٹ میں رکھ سکو گے؟"

وہ اس کے اندر بے چینی اور ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ اس کی شدید ضرورت کو سمجھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "جب تم پر بھروسا ہو جائے گا تو اچانک ہی تم سے ملاقات کروں گا.... فی الحال ضروری نہیں ہے کہ میرے مراد ہونے پر یقین کرو۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں یقین کر رہا ہوں۔ تم میری خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکو گے۔ آج تم سے دوستی کی ابتدا کرتے ہوئے تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا میں ایک بڑی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں؟"

"ہرگز نہیں۔ پہلے ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہو گا۔ پھر تم سے لین دین ہو گا۔"

وہ بڑی بے تابی سے بولا۔ "مراد...! مجھے نیند نہیں آئے گی۔ پلیز بتاؤ' میں تم سے کب مل سکوں گا؟"

وہ بولا۔ "میں ابھی دو روز تک لندن میں ہوں۔ پھر پتا نہیں کہاں رہوں گا؟ تم اتنی رازداری سے لندن آؤ کہ اپنی ڈی ڈی ٹی کے بھی کسی فرد کو تمہاری یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے۔ تب ہی میں تم سے مل سکوں گا۔"

آواز اور لہجے سے اس کی بے انتہا مسرتوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اوہ گاڈ...! میں ابھی یہاں سے نکل پڑوں گا اور بڑی رازداری سے وہاں آؤں گا۔"

"آج نہیں' کل ہی آؤ۔ اگر کل کسی وجہ سے نہ مل سکا تو پرسوں ہر حال میں ملاقات کروں گا۔"

ان کے درمیان ملاقات طے ہو گئی۔ رابطہ ختم ہو گیا۔ بشریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ "تو مراد بھائی بن کر کیا کرنے والا ہے؟"

"یہ معلوم کروں گا کہ وہ مراد سے دوستی کرنے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہے؟ اس کے ذاتی خفیہ معاملات کیا ہیں' جن سے نمٹنے کے لیے مراد لازمی ہو گیا ہے؟

"میں ماسٹر کو بوبو کو اعتماد میں لوں گا اور اس سے ڈبل گیم کھیلنے کی اجازت حاصل کروں گا۔ میکا تو یہی سمجھے گا کہ مراد صرف ماسٹر کے لیے ہی نہیں' اس کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ جبکہ میں مراد بن کر اس کا اعتماد حاصل کرتا رہوں گا۔ اس کا کام بھی کرتا رہوں گا اور اس سے بڑی بڑی رقمیں بھی حاصل کرتا رہوں گا۔"

بشریٰ نے اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر تو لاکھوں کروڑوں ڈالرز کمائے گا۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے

کہا۔ ”وہ ہیروں کا تاجر ہے۔ آئندہ میں ہیروں سے جڑے ہوئے زیورات تجھے پہناؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر اس کے بازو سے لگ گئی۔

☆☆☆

جزیرہ سسلی یورپ اور افریقہ کے درمیان بحیرۂ روم میں ہے۔ سسلی کی اہمیت کا اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے شمال میں اٹلی، اسپین اور البانیہ ہیں۔ جنوب میں مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا ہیں۔ مغرب میں پرتگال اور مشرق میں ترکی، شام اور اسرائیل ہیں۔

اتنے اہم ممالک کے درمیان یہ جزیرہ اسمگلنگ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ بڑے بڑے مال بردار بحری جہاز اس جزیرے کے آس پاس سے گزرتے ہیں۔ جہازوں میں منشیات اور ہتھیاروں سے بھرے کنٹینرز بھی ہوتے ہیں۔ اسمگل ہونے والی حسین عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں۔

جب اطلاع ملتی ہے کہ کسی بھی ملک کی مطلوبہ بندرگاہ میں غیر قانونی مال اتارا نہیں جاسکے گا تو وہ جہاز سسلی کے قریب گہرے پانی میں رک جاتا ہے۔ وہاں سے سسلی کی مافیا تنظیموں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ وہ غیر قانونی مال وہی تنظیمیں جہاز سے اتار کرلے جاتی ہیں۔ وہاں کسی بھی ملک کے قانونی محافظ انہیں روکنے نہیں آتے۔ اس سمندر کے حکمران بھی مافیا والے ہوتے ہیں۔

ان دنوں ریڈ الرٹ کا میکی براؤن سسلی کے شمالی علاقوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ مجرمانہ معاہدے کے مطابق تمام غیر قانونی کنٹینرز کو اور عورتوں بچوں کو گہرے پانی میں کشتیوں پر اتارا جاتا تھا پھر انہیں جزیرے کے مختلف ساحلوں پر پہنچایا جاتا تھا۔

یہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ایک سو میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے جزیرے میں تقریباً ایک سو مافیا خاندان آباد ہیں۔ ان میں سے ہر قبیلے کا دعویٰ ہے کہ سسلی ان کے باپ دادا کا ہے۔ وہ کسی اور کو اپنی زمین پر قبضہ نہیں کرنے دیتے۔

ان تمام مافیا فیملیز نے ایک دوسرے کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپس میں اتحاد قائم رکھا ہے اور ریڈ الرٹ کو تمام مافیا گروپس کا سرپرست بنایا ہے۔ ان کے اتحاد نے وہاں کی حکومت اور قانون کو کمزور بنا دیا ہے۔ وہاں انتخابات کے بعد جو بھی حکمران آتا ہے، وہ ریڈ الرٹ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہتا ہے۔

میکی براؤن کو صحیح معنوں میں بے تاج بادشاہ کہا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی بیوی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ پہنچ گیا۔

میڈونا نے جہاز سے اترتے ہی باپ سے کہا۔ ”پاپا! فون کریں، معلوم کریں ایمان علی کس لڑکی کے ساتھ کہاں گیا ہے۔“

وہ یہ سوچ کر تلملا رہی تھی کہ ایک حسین لڑکی نے اس کے ہونے والے شوہر پر قبضہ جمالیا ہے اور میکی یہ سوچ کر بے چین ہو رہا تھا کہ ایمان علی ان کے جہاز میں نہیں تھا۔ یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ سن سٹی گیا ہے۔

اسے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ ہونے والا داماد وہاں کیوں گیا ہے؟ جہاں اس کے دشمن ماسٹر کو بو بو کا ہیڈ کوارٹر ہے؟

اس نے اپنے ایک دستِ راست سے فون پر پوچھا۔ ”سن سٹی میں ہمارے کتنے جاسوس ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ایک ماہ پہلے بارہ تھے۔ اب پانچ رہ گئے ہیں۔ ماسٹر کے جاسوس بہت ہی شاطر ہیں۔ انہوں نے ایک ماہ میں ہمارے سات آدمیوں کو ڈھونڈ کر مار ڈالا ہے۔ باقی پانچ بھی سہمے رہتے ہیں۔ واپس آنا چاہتے ہیں۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”جو واپس آئے گا، اس کے پورے خاندان کو یہاں جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ فوراً ان پانچوں سے رابطہ کرو۔ ان سے بولو کہ ایمان علی نامی ایک جوان شخص ایک لڑکی کے ساتھ ابھی وہاں پہنچا ہے۔ وہ معلوم کریں کہ اس نے سن سٹی میں کہاں قیام کیا ہے؟ اور وہاں کیا کر رہا ہے؟“

پھر اس نے لندن میں اپنے کارندوں سے کہا۔ ”ایمان علی کے باپ ڈاکٹر مجنی سن کے پاس جاؤ۔ اس سے پوچھو کہ اس کا بیٹا سن سٹی کیوں گیا ہے؟ اور اس کے ساتھ لڑکی کون ہے؟“

اس نے حکم دیا۔ ”ڈاکٹر سے کہو وہ بیٹے کو کسی بھی پہلی فلائٹ سے لندن آنے کو کہے۔ وہ اسے واپس نہیں بلائے گا تو اسے سخت وارننگ دی جائے۔“

اس نے فون بند کیا تو ایک کارندے کی کال آئی۔ اس نے کہا۔ ”جس عورت نے ہماری بے بی کو گرایا تھا، وہ راجر اسٹریٹ میں اپنے مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ مرد کا نام بلال احمد ہے۔ عورت کا نام بشریٰ ہے۔ بلال احمد ایک چھوٹے سے پب کا مالک ہے۔“

”کیا یہ معلوم کیا ہے کہ بشریٰ نے میری بیٹی سے بدمعاشی کیوں کی تھی؟“

”باس! ہم معلوم کر رہے ہیں۔“

اس نے غصے سے کہا۔ ”اس عورت کی بدمعاشی کے پیچھے کوئی تو خاص وجہ ہوگی پھر وہ عورت گن چلاتی ہے۔ وہ

فرار ہونے والے مجرموں پر گولیاں چلا رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ بشریٰ اور بلال عام شہری نہیں ہیں۔ مجرموں سے ٹکرانے والے لوگ ہیں۔"

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ دونوں ہمارے ہی اتحادیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا دشمنوں سے؟"

"وہ دشمنوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس عورت نے میری بیٹی سے دشمنی کی تھی۔ کل صبح تک ان کی اصلیت معلوم نہ ہو تو اس عورت کو... کیا نام ہے اس کا؟"

کارندے نے کہا۔ "بشریٰ..."

"ہاں اسے اٹھالو۔ ہم اس سے اصلیت اگلوالیں گے۔"

اس نے فون کو بند کر دیا۔ جیکی نے کہا۔ "پاپا! آپ تو پتا نہیں کتنے معاملات سے نمٹتے ہوئے گھر جائیں گے۔ میں اپنی کار میں جا رہا ہوں۔ جولیا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ان سے دور ہوتا چلا گیا۔

اس کی ماں نے کہا۔ "یہ جولیا کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس نے شادی کرنے کی ضد کی تھی۔ آپ کی ڈانٹ سن کر فی الحال چپ ہے لیکن اس کی طلب سے باز نہیں آ رہا ہے۔"

میکی براؤن نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اس سے دل بھر جائے گا تو خود ہی اسے چھوڑ کر دوسری کو پکڑ لے گا۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ اسے چھوڑے گا۔ ہماری برادری میں کتنی ہی حسین لڑکیاں ہیں۔ کسی سے اس کی شادی کر دیں۔ نئی آئے گی تب ہی پرانی دل سے اترے گی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اس کمبخت مراد علی منگی سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ اسے جلد ہی موت کے گھاٹ نہ اتارا گیا تو وہ مجھے اور کوئی بڑا نقصان پہنچائے گا۔"

"دشمنی تو چلتی ہی رہتی ہے۔ وہ دشمن قابو میں نہیں آئے گا تو کیا بیٹے کو کنوارا ہی رکھیں گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تو سوچ ہے کمانے کے بعد بھی بیٹا ماں کی نظروں میں کنوارا ہے۔"

"میری بات ہنسی میں نہ اڑائیں۔ کیا اپنے وارث اپنے پوتی پوتے نہیں چاہتے ہیں۔ اس ذلیل کتے نے پہلے آپ کے بہنوئی برنارڈ کو مارا۔ پھر آپ کے بھائی کو مار ڈالا۔ ہمارے ایک بیٹے کو ختم کر ڈالا۔ کیا ہمارا خاندان اسی طرح ختم ہو جائے گا، آپ کی آئندہ نسل پیدا نہیں ہوگی؟"

اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ "ہاں، وہ پہلا دشمن ہے جو میرے خاندان کو ختم کر رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد اپنے بیٹے کی شادی کر دینا چاہیے۔ یہ بات دل کو لگ رہی

تھی کہ نسل کو آگے بڑھانا ہے۔ اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔ ’’تم لڑکی پسند کرو۔ میں الجھنوں میں رہ کر دیر کر رہا ہوں۔ اپنی آئندہ نسل کے بارے میں سوچنا بھول گیا ہوں۔ ہمارے گھر میں پوتی پوتے جلد سے جلد ہونے چاہئیں۔‘‘

میڈونا نے باپ کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ’’آپ بھائی کی شادی جلدی کریں گے۔ میرا کیا ہوگا؟ کیا آپ کے آدمی ایمان کو سن سٹی سے پکڑ کر نہیں لاسکیں گے؟‘‘

وہ اس کی پیشانی چوم کر بولا۔ ’’باپ کی جان! وہ ہمارے بدترین دشمن کے شہر میں ہے۔ وہاں ہمارا کوئی جیالا جا کر واردات نہیں کر سکے گا۔ ایمان علی نے وہاں جا کر الجھا دیا ہے۔ پہلے یہ معلوم کرنے دو کہ وہ کمبخت وہاں کیوں گیا ہے؟‘‘

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ’’ایک لڑکی کے ساتھ گیا ہے۔‘‘

اسی وقت ایک کارندے نے کال کی۔ اس نے کہا۔ ’’باس! ہمارے سن سٹی کے جاسوس نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ ایمان علی وہاں ائرپورٹ سے دی پیلس آف لوسٹ سٹی میں گیا ہے۔‘‘

میکی براؤن نے حیرانی سے کہا۔ ’’اوہ گاڈ! وہ اتنے مہنگے ہوٹل میں رہنے گیا ہے۔ کیا وہاں کوئی اس کا میزبان ہے؟‘‘

’’یہ ابھی معلوم نہیں ہوسکا۔ اس ہوٹل کا آؤٹ ڈور ریسپشنسٹ ائرپورٹ میں اس کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ جلد ہی مزید معلومات حاصل ہوں گی تو میں آپ کو رپورٹ پیش کروں گا۔‘‘

رابطہ ختم ہوگیا۔ میڈونا نے رونے کے انداز میں کہا۔ ’’وہ ایک مہنگے ہوٹل میں گیا ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ ہنی مون منا رہا ہے۔ اس سے شادی کر چکا ہے۔‘‘

وہ باپ کے بازو کو جھنجوڑ کر بولی۔ ’’پاپا! اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں اپنی توہین برداشت نہیں کروں گی۔ اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’توہین تو میری بھی ہو رہی ہے۔ ایمان علی جیسا ایک عام شہری میرے ہاتھ نہیں آرہا ہے۔‘‘

’’میں کچھ نہیں جانتی۔ جب تک آپ اسے پکڑ کر میرے سامنے نہیں لائیں گے، تب تک میں بھوکی رہوں گی۔ آپ سے بات بھی نہیں کروں گی۔‘‘

وہ مغرور رئیس زادی ماروی کا وجود برداشت نہیں کر رہی تھی۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی ماں باپ سے دور ہو کر عمارت کے باہر پارکنگ ایریا میں آئی۔ پھر باپ کی کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

یہ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ وہ خوب صورت بلا کون ہے جو ایمان علی کو سحر زدہ کر چکی ہے۔ کیا میں اس سے کم ہوں؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟

باپ نے فون پر پوچھا۔ ’’میری کار لے کر کہاں جا رہی ہو؟‘‘

اس نے کہا۔ ’’میں آپ سے نہیں بولوں گی۔ اگر میری خوشی چاہتے ہیں تو کسی بھی پہلی فلائٹ میں مجھے سن سٹی جانے دیں۔ میں اس کلموہی کو گولی مار کر ایمان کو یہاں لے آؤں گی۔‘‘

’’فضول باتیں نہ کرو، وہ ایسے دشمن کا شہر ہے جو مراد کے ذریعے میرے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کرا رہا ہے۔ وہ دشمن تمہاری بو پاتے ہی تمہیں کچا چبا جائے گا۔‘‘

’’میں کہہ چکی ہوں۔ مر جاؤں گی لیکن اسے کسی دوسری کے ساتھ برداشت نہیں کروں گی۔‘‘ پھر وہ چیخ کر بولی۔ ’’میں پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ اس کے ساتھ ہنی مون منانے گیا ہے۔‘‘

’’پاگل مت بنو۔ واپس آؤ۔ مجھے ایمان علی کے بارے میں معلوم کرنے دو۔ اگر وہ ایک عام شخص کی طرح تفریح کرنے گیا ہے اور اس کا تعلق دور تک بھی ماسٹر کو بو بو سے نہیں ہے تو میرے آدمی اسے یہاں آنے پر مجبور کر دیں گے۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے گا تو اسے گولی مار دیں گے۔ یہی مناسب ہے۔ وہ نہیں رہے گا تو تمہارا پاگل پن ختم ہو جائے گا۔‘‘

’’نو ڈیڈ! اسے میرے لیے زندہ رکھیں۔ بس کسی طرح اس خوب صورت بلا کو ختم کر دیں پھر مجھے سکون ملے گا۔‘‘

’’میں وعدہ کرتا ہوں۔ کل شام تک تم اس لڑکی کی موت کی خبر سنو گی۔ واپس آجاؤ۔‘‘

میڈونا نے کار روک دی۔ پھر اسے واپسی کے لیے موڑنے لگی۔ ایک کارندے نے میکی سے کہا۔ ’’باس! ڈاکٹر نجی سن لندن میں نہیں ہے۔ وہ انڈیا گیا ہے اور وہ یونا مراد بھی اس کے ساتھ ہی گیا ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر کا فون نمبر معلوم کرو۔‘‘

اس نے فون بند کیا تو سن سٹی کے کارندے نے کال کی۔ ’’باس! بڑی اہم رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ ماسٹر کو بو بو، دی پیلس آف لوسٹ سٹی میں آیا تھا۔ اس نے وہاں ایمان علی سے ملاقات کی ہے۔ ان کے درمیان کوئی اہم رشتے داری ہے۔‘‘

میکی نے بے یقینی سے پوچھا۔ ’’کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

وہ بولا۔ ’’جو آنکھوں سے دیکھا ہے وہی بول رہا ہوں۔ ماسٹر نے ایمان علی کو گلے لگایا تھا۔ میں دور تھا۔ ان کی

باتیں نہ سن سکا۔ لیکن ماسٹر کی خوشیاں اور اس کے انداز سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ایمان علی اس کا سگا ہے اور اس کے لیے بہت اہم ہے۔"

میکی براؤن یہ رپورٹ سن رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر ممی سن کا بیٹا ماسٹر کو بوبو کے لیے اہم کیوں ہے؟ اور وہ ایک مہنگے ہوٹل میں ہنی مون منانے کیوں گیا ہے؟ ماسٹر سے اس کا کیا تعلق ہے؟

میکی براؤن کو اس کے مذکورہ سوالات کا جواب ملے یا نہ ملے، یہ تو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ماسٹر جیسے بدترین دشمن سے ایمان علی کا گہرا تعلق ہے۔

میڈونا واپس آ گئی۔ میکی نے کہا۔ "ہم ایمان علی سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ وہ خطرناک بہروپیا ہے۔ ماسٹر کو بوبو سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ میری بیٹی، میری جان! اسے دل سے نکالو۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے، وہ ماسٹر کا بہت ہی خاص آدمی ہے۔ نہ وہ ہماری طرف آئے گا، نہ ہم اسے اپنے قریب آنے دیں گے۔ اسے تو اب دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

میڈونا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ دل برداشتہ ہو کر بولی۔ "پاپا! وہ ظالم میرے دل سے نہیں نکلے گا۔ میری خاطر ایک بار اس کے باپ سے بات کریں۔ اس سے معلوم کریں کہ ماسٹر سے ان لوگوں کا کیا تعلق ہے؟"

"ڈاکٹر ممی سن کا فون نمبر معلوم کیا جا رہا ہے جیسے ہی مجھے نمبر ملے گا، میں اس سے بات کروں گا۔ تم صبر کرو اور انتظار کرو۔"

وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اپنے محل کی طرف جانے لگا۔

☆☆☆

ایمان علی فطرتاً حسن پرست تھا۔ مراد نے جگنی بائی کی بیٹی ورشا کے حسن و جمال کی ایسی تعریفیں کی تھیں کہ وہ اسے دیکھے بغیر اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ اس نے مراد سے یہ تمام ہسٹری سنی تھی کہ ورشا اس کی کیسی دیوانی ہے اور وہ کس طرح اس سے دامن بچاتا رہا ہے۔

مراد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب ایمان علی وہاں جائے گا تو وہ اسے مراد سمجھ کر پھر اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ گویا وہ اس کے لیے پکی پکائی کھیر تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ انڈیا جائے گا۔ ایسے ہی وقت دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں اسے گولی ماری تھی۔ ابھی مقدر میں زندگی تھی اس لیے بچ گیا تھا۔ صرف زخمی ہوا تھا۔ چار دنوں تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ مرینہ نے اس کی تیمارداری کی۔ جب اسپتال سے نکلا تو مرینہ جا چکی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن کی فلائٹ سے انڈیا پہنچ گیا۔

اس نے اپنے باپ سے کلمہ پڑھنے کو کہا تھا۔ ڈاکٹر ممی سن کے عیسائی رشتے دار انڈیا سے لندن تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان سب کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان مذہبی کشیدگی تھی۔ ادھر ایمان علی نے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ کلمہ نہیں پڑھے گا تب تک وہ باپ کے سامنے نہیں آئے گا۔ فون پر بھی اس سے بات نہیں کرے گا۔

اب انڈیا میں باپ بیٹے کا سامنا ہونے والا تھا۔ اس کے بنگلے میں جا کر رہنا تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ ڈیڈ کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہے گا لیکن اس سے بات نہیں کرے گا۔

جب وہ دہلی پہنچا تو ڈیڈ کا بنگلا مقفل تھا۔ اس نے ہوٹل میں ایک کمرا لیا اور سوچا کہ دو چار روز میں کرائے کا مکان حاصل کرے گا۔ مراد نے اسے جگنی بائی کا فون نمبر دیا تھا اور رہائشی پتا بھی بتایا تھا۔ ورشا سے ملنے سے پہلے اس کی ماں سے ملنا ضروری تھا۔

اس نے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "ماتا جی! میں مراد بول رہا ہوں۔ واپس آ گیا ہوں۔ ڈیڈی کا بنگلا لاکڈ ہے۔ اس لیے ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوں۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولی۔ "تمہیں شرم نہیں آئی ہوٹل میں جاتے ہوئے؟ مجھے ماں کہتے ہو اور میرے پاس نہیں آئے۔ مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں اپنی ماں کو منا لوں گا۔"

"فوراً یہاں آؤ۔"

"کسی وجہ سے آپ کے پاس نہیں آیا۔ پہلے آپ تنہا آ کر مجھ سے ملیں۔ ابھی بیٹی کو ساتھ نہ لائیں۔ پھر میں آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہاں سے جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آ رہی ہوں۔"

وہ آدھے گھنٹے میں آ گئی۔ ایمان علی نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر آداب کہا۔ جگنی بائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خوش رہو بیٹے! تمہاری آواز بدلی ہوئی کیوں ہے؟"

"آپ آرام سے یہاں بیٹھیں، میں بتاتا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ میری پیدائشی آواز اور لب و لہجہ ہے۔ میں مراد نہیں ہوں۔ سچ سچ ایمان علی ہوں اور ڈاکٹر ممی سن کا وہ بیٹا ہوں، جو

باپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

وہ اس کے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

وہ اسے بتانے لگا۔ "مراد سے تل ابیب میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے یہاں کے تمام حالات بتائے ہیں۔ پھر وہ وہاں سے لندن چلا گیا ہے۔ دشمنوں نے مجھے مراد سمجھ کر گولی ماری تھی۔ چار دن اسپتال میں رہ کر سوچا، بھارت میرا پیدائشی وطن ہے۔ مجھے یہاں آ کر رہنا چاہیے۔ اس لیے چلا آیا۔"

"تم اپنے ڈیڈی کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟"

"میں چاہتا تھا، وہ بھی میری طرح مسلمان ہو جائیں۔ انہوں نے انکار کیا تو میں ناراض ہو کر چلا گیا۔"

"تم نے غلط کیا۔ تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دھرم کوئی سا بھی ہو، اسے دل سے قبول کیا جاتا ہے۔ تم نے دل سے اسلام قبول کیا۔ تمہارے ڈیڈی دل سے عیسائی ہیں۔ میں دل سے ہندو ہوں۔ جب وہ اپنا مذہب چھوڑنا نہیں چاہتے تو تمہیں ضد نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں اپنی زندگی جینے دو بیٹے!"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔

"آپ درست کہتی ہیں میں ضد نہیں کروں گا۔"

جگنی بائی نے اپنے فون پر نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "ڈاکٹر بھائی میں جگنی بول رہی ہوں۔ تم وہاں خیریت سے ہو؟"

وہ بولا۔ "تھینکس گاڈ! ابھی تک خیریت ہے۔ لیکن مراد کا دشمن میکی براؤن میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ مراد کو ایمان علی سمجھ کر اسے داماد بنانا چاہتا ہے۔ تم تو جانتی ہو، مراد اپنی ماروی کے سوا کسی اور کا نہیں ہوگا۔ آئندہ وہ دشمن میرے پیچھے پڑے گا۔ اس سے پہلے ہی میں کل کی فلائٹ سے دہلی آ رہا ہوں۔"

"یہ بہت اچھا کر رہے ہو۔ تل ابیب میں مراد نے فون پر تمہیں خوش خبری سنائی تھی کہ تمہارا بیٹا ایمان علی زندہ ہے۔"

"ہاں جب مراد مجھ سے فون پر بول رہا تھا، تب وہ وہاں موجود تھا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک ہی ضد ہے کہ میں اس کی طرح مسلمان ہو جاؤں۔ میں نے سوچنے اور جواب دینے کے لیے اس سے کچھ مہلت مانگی تھی۔"

جگنی نے کہا۔ "میں نے ابھی ایمان علی کو سمجھایا ہے کہ کسی سے زبردستی اپنا دھرم قبول نہ کراؤ۔ یہ صرف اور صرف اپنے دل کا اور اپنے عقیدے کا معاملہ ہے۔"

"کیا وہ انڈیا میں ہے؟"

"ہاں، اب تم سے مسلمان ہونے کی ضد نہیں کرے گا۔ لو اس سے بات کرو۔"

ایمان علی نے اس سے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔

"ڈیڈ السلام علیکم......"

"خوش رہو بیٹا! تم سلامت رہو ہزار برس۔ تم اپنی ضد چھوڑ کر مجھ سے بول کر مجھے ایک نئی زندگی دے رہے ہو۔"

"ہاں ڈیڈ! ابھی ماتا جی کی نصیحت سن کر قرآن مجید کی ایک آیت یاد آ گئی کہ تمہارا دین تمہارے ساتھ ہمارا دین ہمارے ساتھ...... میں وعدہ کرتا ہوں' اب دینی معاملات میں آپ سے کچھ نہیں بولوں گا۔"

"بیٹے! میرا بنگلا لاکڈ ہے۔ جگنی بہن کو فون دو۔ تم ابھی کہاں ہو؟ میں کل آ رہا ہوں۔"

"میں ہوٹل میں ہوں۔ اب ماتا جی کے گھر جا رہا ہوں۔ یہ لیں ان سے باتیں کریں۔"

جگنی بائی نے فون لے کر پوچھا۔ "مراد کہاں ہے؟" پھر کہا...."اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں اس نے مصلحتاً فون کی سم بدل دی ہوگی۔"

"ہاں۔ وہ اپنے طور پر محتاط ہے۔"

"اور عبداللہ کیڈی کہاں ہے؟"

"وہ ضروری شاپنگ کے لیے گیا ہے۔ کل میرے ساتھ آ رہا ہے اور اب وہ بونا مراد نہیں ہے۔ میکی براؤن اسے اغوا کرانے والا تھا۔ میں نے پھر سرجری کی اور اس کا پیدائشی چہرہ اسے واپس دے دیا۔ یوں بھی اب اس کے لیے مراد بن کر رہنا ضروری نہیں تھا۔"

"چلو اچھا ہوا۔ یہاں فرمونا کے ماں باپ اسے داماد بنانے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے کچھ اور باتیں کرنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا پھر ایمان علی سے کہا۔ "میرے ساتھ چل رہے ہو لیکن جانتے ہو کہ میری ایک بیٹی ورشا تمہاری دیوانی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ مراد نے اس کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ میں ایک بار اس سے تنہائی میں ملوں گا اور اس سے سچ بولوں گا کہ میں مراد نہیں ہوں۔ اصلی ایمان علی ڈاکٹر ممنی سن کا بیٹا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں دیکھوں گی کہ وہ مراد کو چاہتی تھی یا اب ایمان علی کی شکل و صورت کو اور اس کی شخصیت کو چاہے گی۔"

ہوٹل کے ملازم نے اس کا سامان جگنی بائی کی کار میں لے جا کر رکھا۔ وہ ماتا جی کے ساتھ کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر

آ کر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کدھر چلوں؟''

''کناٹ پیلس کی طرف چلو۔''

پھر ماں نے فون کے ذریعے بیٹیوں سے کہا۔ ''گھر میں رہو۔ کسی بھی کام سے باہر نہ جانا۔ میرے ساتھ ایک بہت بڑا سرپرائز آرہا ہے۔ اسے دیکھو گی تو دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔''

وہ تینوں ماں کی فرمانبردار تھیں پھر کوئی سرپرائز ملنے والا تھا۔ لہٰذا وہ انتظار کرنے لگیں۔ جب کار کوٹھی کے احاطے میں پہنچی اور ایمان علی دروازہ کھول کر باہر نکلا تو تینوں حیرت سے اور مسرت سے چیخ پڑیں۔ دوڑتی ہوئی آ کر اس کے بازوؤں سے لگ گئیں۔ ورشا تو جیسے پاگل ہوگئی تھی۔ سیدھی آ کر گردن میں بانہیں ڈال کر سینے سے لگ گئی تھی۔

ماں نے ہنستے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے، اسے گھر میں تو آنے دو۔''

اس نے ایک ایک بیٹی کو کھینچ کر الگ کیا۔ ایمان علی سینے سے لگنے والی پر شیدا ہوگیا۔ دل میں کہنے لگا۔ ''یہی ورشا ہو تو اچھا ہے اس پر دل آگیا ہے۔''

ماں نے ایک ایک کو الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مینا ہے، یہ ڈولی ہے اور یہ ورشا......''

ایمان علی نے خوش ہو کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر ان کے ساتھ کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ ماں نے کہا۔ ''سنو لڑکیو! اگر تم اس سے آکر لگتی رہو گی تو یہ ابھی چلا جائے گا۔ اگر دور دور رہو گی تو یہاں کل تک رہے گا۔''

مینا اور ڈولی نے کہا۔ ''ہم ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ دور سے باتیں کریں گے۔ ایمان رات کو بھی یہاں رہے گا۔ مزہ آجائے گا۔''

ورشا نے کہا۔ ''میں تو مر جاؤں گی پر الگ نہیں رہوں گی اور نہ کہیں جانے دوں گی۔ دن رات پرارتھنا کرنے کے بعد یہ واپس آیا ہے۔ یہ جہاں جائے گا وہاں جاؤں گی۔ جہاں رہے گا، وہاں رہوں گی۔''

ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''ورشا! خواہ مخواہ پرابلم نہ بنو۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''ماتا جی! میں ورشا سے تھوڑی دیر تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بیٹے! مجھے اعتراض نہیں ہے۔ ضرور باتیں کرو۔ دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔''

ورشا نے کہا۔ ''یہاں نہیں، ہم باہر کہیں جا کر باتیں کریں گے، آپ مجھے کار کی چابی دیں۔''

ماں نے اسے چابی دی۔ مینا نے کہا۔ ''ورشا آئے گی تو میں بھی تنہائی میں باتیں کرنے جاؤں گی۔''

ماں نے کہا۔ ''وہ ورشا کو پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے پاگل بننا چھوڑ دو۔ وہ جلد ہی تمہارا جیجا بننے والا ہے۔ تم دونوں کو ورشا کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے۔''

ان دونوں کے منہ لٹک گئے۔

ورشا اگلی سیٹ پر ایمان علی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ''جسٹ اے منٹ۔ پہلے ٹھکانا تو بنالوں۔''

اس نے رابطہ ہونے پر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو متاشا! کیا گھر میں ہو؟''

متاشا نے کہا۔ ''ہاں، گھر میں ہوں۔ مام اپنی مسٹر سے ملنے گئی ہیں۔ رات کو ڈیڈ کے ساتھ آئیں گی۔ میں بور ہو رہی ہوں۔ اچھا کیا تو نے کال کرلیا۔ یہاں آجاتی تو اچھا ہوتا۔''

''اسی لیے فون کیا ہے۔ آرہی ہوں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ۔ مجھے تنہائی چاہیے۔ سمجھ گئی نا؟''

''سمجھ گئی...... آجا۔''

وہ رابطہ ختم کر کے اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ''قطب مینار کی طرف چلو...... اور تم کچھ کہہ رہے تھے۔''

وہ بولا۔ ''پہلے میں تم سے کتراتا تھا۔ آج آتے ہی تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی ہے۔ تمہیں اس تبدیلی پر حیران ہونا چاہیے؟''

''حیرانی کیسی؟ میں تو خوشی سے بے حال ہو رہی ہوں۔ آج تمہیں اتنی خوشیاں دوں گی کہ پھر مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ مجھے ہی مجھ سے مانگتے رہو گے۔''

''تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ مراد گناہوں سے اور تمہاری قربت سے بھاگتا تھا۔ آج تمہاری قربت چاہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں مراد نہیں ہوں۔ سچ مچ ایمان علی ہوں۔''

ورشا نے ذرا پیچھے ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''تم میری آنکھوں کے سامنے سر سے پاؤں تک وہی ہو جس کے سینے سے لگنے کے لیے دل مچلتا رہتا ہے۔''

''لیکن میں وہی نہیں ہوں۔ ڈاکٹر ممی کن کا وہ بیٹا ہوں جو باپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔''

وہ پھر اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ''تمہارا نام مراد ہو یا ایمان علی۔ تم ڈاکٹر ممی کن کے بیٹے ہو یا کسی اور کے، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''مجھے بھی امید تھی۔ کوئی فرق نہیں

پڑے گا تو اچھی بات ہے۔ یہ یقین کرلو کہ میں وہ ایمان علی نہیں ہوں جو عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔"

"عورتوں سے دور بھاگنے والا مرد نہیں ہوتا۔ اچھا ہے کہ تم وہ نہیں ہو۔ میں تمہاری صورت کی تمہاری شخصیت کی پہلے بھی دیوانی تھی۔ اب بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔"

"میں دیکھوں گا کہ تم مجھے کس قدر چاہتی رہوگی۔"

"مجھے کس طرح آزماؤ گے؟"

"اس طرح کہ شادی نہیں کروں گا۔ شادی کرنے کے بعد ایک روٹین لائف گزارنی پڑتی ہے۔ پتی پتنی کو مجبوراً ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ شادی نہ ہو رومانس ہوتا رہے تو جوانی کو انجوائے کرنے کا مزہ آتا رہتا ہے۔"

"تم بالکل میری طرح سوچتے ہو۔ میں شادی کے بعد چولہے ہانڈی اور بچوں میں اپنی جوانی برباد نہیں کروں گی۔ ہم عاشق اور معشوق بن کر آزادی سے دنیا گھومتے رہیں گے۔"

وہ نتاشا کے بنگلے میں پہنچ گئے۔ سہیلی نے اس کے لیے اپنا بیڈروم تیار رکھا تھا۔ اس نے ایمان علی کو دیکھ کر کہا۔ "یہ تو وہی ہیں' جن کے لیے پاگل ہو رہی تھیں۔ یہ کب آئے؟"

"آج ہی میرے نصیب سے آئے ہیں۔ اب مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

وہ سہیلی کا شکریہ ادا کر کے ایمان علی کے ساتھ بیڈروم میں آگئی۔ دروازہ اندر سے بند ہوگیا۔ نتاشا نے بند دروازے کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ ایسا ہینڈسم اور اسمارٹ نوجوان اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔ اس کے چاہنے والے اور اسے شادی کی آفر دینے والے کئی تھے لیکن کوئی آئیڈیل جوان نہیں تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آکر ایک صوفے پر گر پڑی۔ جوانی تیزی سے بھاگی جارہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایمان علی کو اپنے شہر کی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس پر دھیما دھیما سا جنون طاری ہونے لگا۔ دماغ میں ہلچل سی ہونے لگی۔ "یہ میرا گھر ہے' میرا بیڈروم ہے' مجھے اپنے بیڈ پر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ مزے لوٹ رہی ہے۔"

اس نے آدھے گھنٹے بعد اپنے فون پر ورشا کے نمبر پنچ کیے' وہاں طوفان آکر گزر گیا تھا۔ ایسے وقت اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ایسے رنگین لمحات میں اپنا فون بھی کباب میں ہڈی لگ رہا تھا۔ وہ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ورشا نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اسے پکارتے پکارتے چپ ہوگیا۔

فون بند ہوا تو نتاشا اور تڑپ گئی۔ "ہائے کیا ہو رہا ہے ادھر؟ وہ گرج رہا ہوگا۔ برس رہا ہوگا۔ اس کی گرج چمک میں فون کی آواز نہیں پہنچ رہی ہے' کیا میں یہاں سلگتی رہوں؟"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی بیڈروم کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ اندر بڑی پراسرار اور گرما دینے والی خاموشی تھی۔ اسے بھی ایسے ہی اسرار و رموز سے گزرنا تھا۔

اس نے دروازے پر ہاتھ مارا' پھر اسے پیٹ ڈالا۔

ورشا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ادھر ادھر پڑے ہوئے لباس کو اٹھانے لگی۔ ایمان علی نے اس کے لباس کو چھین کر دور پھینک دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ دوسری دستک نے پھر اسے الگ کردیا۔ اس نے پوچھا۔ "کون؟ نتاشا تم ہو؟"

"ہاں میں نے کال کی تھی۔ تم نے اٹینڈ نہیں کی۔ باہر آؤ۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"میں باہر نہیں آسکتی۔ پلیز سمجھا کرو۔ میں ابھی کال کر رہی ہوں۔ مجھ سے فون پر بولو۔"

اس نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر پوچھا۔ "ہاں بولو؟"

"کیا بولوں؟ ایک گھنٹا ہو رہا ہے۔ سہیلی کا کچھ تو خیال کرو۔"

وہ شدید حیرانی سے بولی۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ ہماری ایسی کوئی ڈیلنگ نہیں ہوئی تھی۔"

"وہ کوئی زمین جائداد نہیں ہے کہ اس کے لیے ڈیلنگ ہوتی۔ اب تم آؤ۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"کوئی انوکھی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے جتنے ہی معاملات میں شیئرز کرتے ہیں۔ پلیز بحث نہ کرو۔ باہر آجاؤ۔ مجھے اندر جانے دو۔"

"نتاشا! میں ہر معاملے میں شیئرز کرسکتی ہوں۔ مگر اپنے مرد کو کسی کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی۔"

"وہ تمہارا مرد کہاں سے ہوگیا؟ وہ تمہارا پتی نہیں ہے۔ تم اسے بازار سے خرید کر نہیں لائی ہو۔ دیکھو مجھ پر ہسٹریا کے دورے پڑ چکے ہیں۔ پھر پڑے گا تو مشکل میں پڑ جاؤ گی۔"

ورشا ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔"

وہ فون پر چیخ کر بولی۔ "میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔"

وہ بیڈ پر سے اترتے ہوئے بولی۔ "کھولتی ہوں۔

مجھے کپڑے تو پہننے دو۔''

وہ فون بند کر کے جلدی جلدی لباس پہنتے ہوئے بولی۔ ''وہ پاگل ہوگئی ہے۔ ہسٹریا کی مریضہ ہے۔ تمہارے پاس آنے کے لیے مچل رہی ہے۔ میری سہیلی نہ ہوتی تو اسے گولی ماردیتی۔''

اس نے کہا۔ ''ابھی دروازہ کھولو گی تو وہ مجھ سے آکر لگ جائے گی۔ ہم اس کے گھر میں ہیں۔ میں اسے کیا کہہ سکوں گا؟''

''میں اسے لگنے ہی نہیں دوں گی۔ تم صرف میرے ہو۔ آؤ میرے پیچھے رہو۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔''

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ نتاشا سامنے کھڑی تھی۔ ورشا نے گھور کر کہا۔ ''کیا بکواس کررہی تھیں؟ یہ میرا مرد ہے۔ میں نے بازار سے نہیں خریدا ہے۔ دل کا سودا دل سے کیا ہے۔''

وہ ورشا کی بات نہیں سن رہی تھی۔ ایمان علی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ خود کو بچانے کے لیے ورشا کے پیچھے آگیا۔ نتاشا نے کہا۔ ''مرد ہو کر اس کے پیچھے چھپ رہے ہو۔ تم پہلے ورشا سے بھی دور بھاگتے تھے۔ مجھے اندر سے دیکھو گے تو......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے گریبان کو پھاڑ ڈالا۔ اس پر واقعی دورہ پڑ رہا تھا۔ ورشا نے کہا۔ ''ایمان! فوراً باہر جاؤ۔ گاڑی اسٹارٹ کرو۔ میں آرہی ہوں۔''

وہ پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ وہ چیخنے لگی۔ ''رک جاؤ۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔''

وہ دوڑتی ہوئی جاکر اسے پکڑنا چاہتی تھی۔ ورشا نے اسے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو میں آگ اور لہو سے کھیلنے والی جگنی بائی کی بیٹی ہوں۔ تمہیں اس لیے ڈھیل دے رہی ہوں کہ تم مریضہ ہو۔ میں نے یہاں آکر بڑی بھول کی ہے۔ کمرے میں چلو مجھے بتاؤ تمہاری دوائیں کہاں ہیں؟''

وہ نہیں سن رہی تھی۔ ایمان علی کے پاس جانے کے لیے ورشا کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ ہسٹریا کا مرض ایسا ہی ہوتا ہے۔ مریضہ قابو میں نہیں آتی۔

ورشا اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ پھر اسے بیڈ کی طرف دھکا دیا۔ وہ بیڈ سے ٹکرا کر پھر ایمان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ ورشا نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ پھر ایک گھونسا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ پیٹ پکڑ کر تکلیف سے دہری ہوتی ہوئی جھکنے لگی۔ ورشا نے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک لات اس کے منہ پر ماری۔ وہ الٹ کر فرش پر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ ورشا نے اسے دیکھا۔ یہ اندازہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر آکر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ایمان علی نے اسے آگے بڑھا کر کھلی سڑک پر پہنچ کر پوچھا۔ ''وہ تو جنون میں مبتلا ہوگئی تھی۔ تم نے پیچھا کیسے چھڑا لیا ہے؟''

''اس کی پٹائی کی تو وہ بے ہوش ہوگئی۔ خود ہی پیچھا چھوڑ دیا۔''

وہ چپ رہ کر پریشانی سے سوچنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہم نے پہلی بار جس کے گھر میں پیار کی ابتدا کی وہاں اسے تم نے مار پیٹ کر بے ہوش کردیا۔ ہماری محبت کا آغاز اچھا نہیں ہوا ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہنگامہ کرے گی۔ ہمارے خلاف بولے گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنا سر بھاری نہ کرو۔ میں ہوں نا۔ جیسے بھی حالات ہوں گے میں نمٹ لوں گی۔''

وہ اپنے بنگلے میں آگئے۔ جگنی بائی نے بیٹی کو دیکھا تو سمجھ گئی کہ اپنی ضد پوری کر کے ایمان علی کو جیت کر آئی ہے۔ نیتا اور ڈولی مایوس ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ایمان علی کو جیجا جی کہہ کر مخاطب کیا۔ ورشا نے کہا۔ ''انہیں جیجا ضرور کہو لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے، ابھی شادی نہیں کریں گے۔''

ماں نے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی نہیں کروگی تو کیا بوڑھی ہوکر شادی کروگی؟''

''میں نے اور ایمان نے فیصلہ کیا ہے۔ ابھی ایک برس تک شادی کا نام نہیں لیں گے۔ ہماری عمر ابھی ہواؤں میں اڑتے رہنے کی ہے۔ میں گھر والی اور بچوں والی بن کر جوانی کے خوب صورت دنوں کو مٹی میں نہیں ملاؤں گی۔''

ایمان علی نے جگنی بائی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میں بھی ورشا کو بیوی نہیں محبوبہ بنا کر لائف انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا ہاتھ تھام کر کہتا ہوں کہ آپ میری بھی ماتا جی ہیں۔ ایک برس بعد جب بھی حکم دیں گی میں ورشا کو دلہن بنالوں گا۔''

جگنی بائی نے خوش ہوکر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''میں تم پر بھروسا کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے تم میری بیٹی کو دھوکا نہیں دوگے۔''

ایمان علی نے ایک ہی دن میں جگنی بائی کے دل میں اور پوری فیملی میں جگہ بنالی۔ لیکن ورشا کے ساتھ عیش کرنا مہنگا

پڑ گیا۔
دوسرے دن صبح انٹیلی جنس کا ایک سراغ رساں ان کے دروازے پر آیا۔ اس نے جگنی بائی سے کہا۔ ''آپ کی بیٹی ورشا سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔ ایک بری خبر ہے۔ اس کی سہیلی نتاشا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''
جگنی بائی نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر بیڈروم میں ورشا کے پاس آ کر بولی۔ ''ایک سراغ رساں تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہاری سہیلی نتاشا کو کسی نے قتل کیا ہے۔''
ورشا پریشان ہو کر ایمان علی کے پاس آئی۔ اس سے بولی۔ ''نتاشا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس بات کا اعتراف نہ کرنا کہ کل ہم اس کے گھر گئے تھے۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔''
وہ فون پر نتاشا کی ماں کا فون نمبر پنچ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ہاتھ جوڑ کر سراغ رساں کو نمستے کہا پھر فون پر بولی۔ ''آنٹی! میں ورشا بول رہی ہوں۔ یہ کیا سن رہی ہوں۔ میری نتاشا اس دنیا میں نہیں ہے؟''
دوسری طرف سے ماں کے رونے کی آواز آئی۔ ورشا نے کہا۔ ''ہائے آنٹی! یہ کیا ہو گیا۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔''
اس نے فون بند کر کے جاسوس سے پوچھا۔ ''کیا قاتل کو گرفتار کیا گیا ہے؟''
''نہیں۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ شاید تمہارے تعاون سے ہم قاتل کے قریب پہنچ سکیں گے۔''
وہ آفیسر کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں قاتل تک پہنچنے کے لیے دن رات حاضر ہوں۔''
افسر نے کہا۔ ''کسی نے اس پر ظلم کیا تھا۔ اس کی ناک سے ایک ذرا سا خون نکل کر بند ہو گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کہتی ہے کہ اس کے پیٹ کی ایک رگ پھٹ گئی تھی۔ کسی نے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی تھی۔''
ورشا نے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا تھا اور منہ پر ایک کک ماری تھی۔ اسی لیے ناک سے خون بہہ کر رک گیا تھا۔ جاسوس نے کہا۔ ''مرڈر شام کے چار اور پانچ بجے کے درمیان ہوا ہے۔ اس سے ایک گھنٹا پہلے تم نے اسے کال کی تھی۔ اس کے فون پر تمہارا نام اور وقت لکھا ہوا ہے۔''
وہ بولی۔ ''ہاں اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا چاہتی تھی۔ اس نے سوری کہہ دیا کیونکہ گھر میں وہ تنہا تھی۔ اس کے مام اور ڈیڈ نہیں تھے۔''
''پھر اس نے ایک گھنٹے بعد تمہیں کال کی تھی۔ اس کے بعد ہی تم نے جواباً اسے کال کی۔''
''نتاشا نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ رات کو شاپنگ کے لیے میرے ساتھ جا سکتی ہے۔ میں نے جواباً کہا تھا کہ ماتاجی سے مشورہ کرنے کے بعد جا سکوں گی۔ پھر میں نے تھوڑی دیر بعد اسے سوری کہہ دیا۔''
''کیا آخری کال سے پہلے تم نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے یا خوفزدہ ہے؟''
''نہیں، بالکل نہیں۔ وہ باتیں کرتے وقت بہت فریش تھی۔''
وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''جو بھی قاتل ہے وہ کار میں آیا تھا۔ اس کے بوڑھے پڑوسی نے تقریباً پانچ بجے ایک کار کو اس بنگلے کے احاطے سے نکلتے دیکھا تھا۔''
ورشا کچھ پریشان ہوئی پھر بولی۔ ''پڑوسی نے کار چلانے والے کو دیکھا ہوگا؟''
''وہ بوڑھا ہے، اس کی نگاہیں کمزور ہیں۔ وہ کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص کو نہ دیکھ سکا۔''
ورشا نے اطمینان کی سانس لی۔ ڈرائنگ روم کے باہر کوریڈور میں ایمان علی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ورشا نے اس سے کہا تھا کہ نتاشا کی پٹائی کی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کن فولادی ہاتھوں سے پٹائی کی تھی کہ وہ مر گئی اور ورشا اسے بے ہوش سمجھ کر چلی آئی تھی۔
وہ جاسوس چلا گیا تھا۔ ورشا اپنی ماں کے ساتھ نتاشا کے گھر پرسے کے لیے گئی تھی۔ ایمان علی سوچ رہا تھا ورشا سے پیار کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ ایک کنواری کی لاش پر دوسری کنواری کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر آیا ہے۔ ورشا بہت ہی چالاک اور تیز طرار تھی۔ اس نے جاسوس کے سامنے باتیں بنا کر خود کو اور ایمان علی کو قتل کے الزام سے بچا لیا تھا۔ لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔
ڈاکٹر ممتحن شام پانچ بجے کی فلائٹ سے آیا۔ ایمان علی جگنی بائی کے ساتھ باپ کے استقبال کے لیے ائرپورٹ آیا تھا۔ وہیں کرائم برانچ کا ایک افسر دو سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بولا۔ ''ایمان علی! تمہیں حراست میں لیا جا رہا ہے۔''
ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میرے بیٹے کو کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟''
افسر نے کہا۔ ''آپ اپنے بیٹے کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لے کر ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں آئیں۔ وہاں گرفتاری کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔''
اچانک ایسی افتاد آ پڑی تھی جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ ایمان علی کو ایک سیل میں پہنچا کر کہہ رہے

تھے۔ ''تم پاکستانی جاسوس ہو۔ ہم ایک عرصے سے تمہاری تاک میں ہیں۔ یہ ثابت نہیں کرسکیں گے کہ تم مراد علی منگی ہو لیکن یہ ثابت کردیں گے کہ تم بڑی رازداری سے پاکستان جاتے آتے رہتے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''آج تک میرے باپ نے بھی پاکستان کی زمین پر قدم نہیں رکھا ہے۔''

''تم بیس دن پہلے یہاں سے لندن گئے تھے پھر وہاں سے پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں ہماری انڈین ایمبیسی نے رپورٹ دی ہے کہ تم وہاں ڈیفنس کے علاقے میں تھے۔ وہاں تم نے ایک لڑکی ماروی سے شادی کی پھر اس کے ساتھ لندن چلے گئے۔ لندن میں ہمارے جاسوس تمہیں نہ دیکھ سکے۔ تم کسی کنکنڈ فلائٹ سے کسی دوسرے ملک چلے گئے تھے اور اب تم یہاں پہنچ گئے ہو۔''

''جناب عالی! میں تقریباً پانچ برس کے بعد یہاں آیا ہوں۔ پتا نہیں بیس دن پہلے آپ نے کسے یہاں سے لندن جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں ثابت کردوں گا کہ میں پچھلے پانچ برسوں میں استنبول، لبنان اور اسرائیل میں رہا ہوں۔''

ان افسروں اور سراغ رسانوں کے سامنے میز پر جو فائلیں رکھی ہوئی تھیں، ان میں مراد علی منگی عرف ایمان علی کے ایک ایک دن کی رپورٹس تھیں۔ لندن اور پاکستان میں انڈین ایمبیسی کی ٹھوس چشم دید اطلاعات درج تھیں کہ مراد بیس دن پہلے انڈیا سے تل ابیب، وہاں سے لندن پھر لندن سے پاکستان گیا تھا۔ ایسی چشم دید اطلاعات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

اور حقیقتاً یہی ہوا تھا۔ ایمان علی کے پیچھے چھپا ہوا مراد ان کی رپورٹس کے مطابق آخری بار لندن جاکر گم ہوگیا تھا اور اب انہیں دہلی میں نظر آیا تو انہوں نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔

ڈاکٹر مُنی سن اور جگنی بائی اس کا پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات لے آئے۔ انہوں نے وہ پاسپورٹ دیکھا تو حیران رہ گئے، دوسرے کاغذات سے بھی یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ کبھی پاکستان نہیں گیا تھا۔

ایک افسر نے جھنجلا کر ڈاکٹر سے کہا۔ ''پھر وہ کون تھا، جو یہاں آپ کا بیٹا بن کر آیا تھا؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں خود حیران ہوں کہ وہ کون تھا۔ ہو بہو میرے بیٹے جیسا تھا۔ اگر اس میں اور میرے بیٹے میں کوئی فرق تھا تو میں اس لیے سمجھ نہ سکا کہ وہ پانچ برس کے بعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اور صرف میں ہی نہیں کرائم برانچ کے جہاں دیدہ جاسوس بھی دھوکا کھاتے رہے۔''

ایمان علی کے پاس ٹھوس ثبوت تھے کہ وہ ڈاکٹر مُنی سن کا بیٹا ہے۔ لندن اور پاکستان میں انڈین ایمبیسی کی رپورٹ بھی درست تھی کہ ایمان علی وہاں جاچکا ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہورہا تھا کہ وہ بہروپیا مراد علی منگی اب بھی ایمان علی کا چہرہ رکھے یورپ کے کسی ملک میں ہے۔

بہرحال وہ ان کا مطلوبہ مجرم نہیں تھا۔ اسے حراست میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس لیے اسے رہا کردیا گیا۔ باپ بیٹے پہلی بار فرصت سے گلے ملے۔ جگنی بائی اور اس کی بیٹیاں خوش تھیں۔ وہ ورشا کو دیکھ کر دل ہی دل میں پریشان ہوکر بولا۔ ''یہ میرے لیے خوش قدم نہیں ہے۔ ابھی دو ہی دنوں میں پہلے نتاشا کے قتل کے الزام سے بچا۔ پھر کرائم برانچ والوں کے عذاب سے نجات ملی۔ آگے اور نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟''

جگنی بائی شگون کو اور نحوست کو مانتی تھی۔ اس نے تنہائی میں بیٹی سے کہا۔ ''ورشا! تمہارے نئے جیون کی شروعات اچھی نہیں ہے۔ جذبات میں اندھی نہ بنو۔ میں جیوتشی مہاراج سے کہتی ہوں وہ تمہاری جنم کنڈلی دیکھ کر بتائیں گے کہ تمہیں ایمان علی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہیے یا نہیں؟''

دوسرے ہی دن جیوتشی مہاراج نے کہہ دیا کہ دونوں کی کنڈلی نہیں ملتی ہے۔ اگر آئندہ ان کا ملاپ ہوگا تو لڑکی کی ماں پر کوئی بھاری مصیبت آئے گی۔ جگنی بائی نے کان پکڑ لیے۔ وہ بیٹی کی ہوس پوری کرنے کے لیے خود کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس نے ورشا پر کڑی پابندیاں عائد کردیں۔

ادھر میکی براؤن نے ڈاکٹر مُنی سن کا فون نمبر حاصل کرنے کے بعد اسے کال کی۔ ''ہیلو ڈاکٹر! میں میکی براؤن بول رہا ہوں۔ میں نے تمہارے بیٹے اور اپنی بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا۔ میرا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے جو اس پر عمل نہیں کرتا، وہ زندگی سے جاتا ہے۔ کیا میری بات سن رہے ہو؟''

''ہاں تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔''

''یو نان سنس! یہ میری بیٹی کی زندگی کا اہم معاملہ ہے۔ میرا حکم ہے اور تم اسے بکواس کہہ رہے ہو؟''

''تم نے مجھے نان سنس کہا ہے۔ اگر شریفانہ زبان سے نہیں بولو گے تو فون بند کردوں گا۔''

''شریفانہ زبان کیا بولوں؟ تم باپ بیٹے بھگوڑے ہو۔ وہ سن سٹی چلا گیا ہے اور تم انڈیا جاکر چھپ گئے ہو۔''

''نہ میں تمہاری دھونس میں ہوں، نہ یہاں چھپنے آیا ہوں اور نہ ہی میرا بیٹا ایمان علی سن سٹی میں ہے۔ یہ میرے

ساتھ یہاں انڈیا میں ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔ میری بیٹی نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ اس وقت سن سٹی کے ہوٹل دی پیلس آف لوسٹ سٹی میں ہے۔"

"اور وہ اس وقت میرے پاس ہے۔ ابھی باتھ روم میں شاور لے رہا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ٹی وی آن کر کے بیٹھو اور اسکائپ کے ذریعے اسے اسکرین پر دیکھ کر اس سے باتیں کرو۔ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

وہ رابطہ ختم کر کے بیٹے کے بیڈروم میں آیا۔ وہ غسل سے فارغ ہو کر باتھ روم سے باہر آ رہا تھا۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! ایک اور مصیبت آ رہی ہے۔"

"کیسی مصیبت ڈیڈ؟"

وہ بیٹے کو بتانے لگا کہ جب مراد تل ابیب سے لندن آ رہا تھا، تب میکی براؤن کی فیملی کے ساتھ جہاز میں جان پہچان ہوئی تھی۔ میڈونا، مراد پر عاشق ہو گئی تھی۔ لندن میں میکی براؤن نے ڈاکٹر کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی کی شادی کی تیاریاں کرے۔ انکار کی صورت میں اس نے موت کی دھمکیاں دی تھیں۔

باپ نے کہا۔ "مراد ان دنوں سن سٹی میں ہے اور تم میرے ساتھ ہو۔ میکی براؤن اور اس کی بیٹی تمہیں وہ ایمان علی سمجھیں گے جس سے شادی کی بات طے ہو چکی ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم سے ہی میڈونا کا رشتہ ہوا تھا۔"

بیٹے نے کہا۔ "کوئی بات نہیں میں کہہ دوں گا کہ مجھ سے ہی رشتہ طے ہوا تھا۔ کیا میڈونا خوب صورت ہے؟ آپ کی بہو بننے کے قابل ہے؟"

"ایسی باتیں نہ سوچو۔ میکی براؤن بہت ہی خطرناک سسر بن کر رہے گا۔ اس کی بیٹی کو ذرا بھی تم سے شکایت ہوگی تو تمہیں الٹا لٹکا دیا کرے گا۔"

"جب وہ ایسا خطرناک ہے تو مجھے جبراً داماد بنانا چاہے گا۔"

ڈاکٹر مینی سن نے مراد کو ایمان علی کا ہم شکل بنا کر اپنے بیٹے کے لیے نت نئی آفات کے لیے راستے ہموار کر دیے تھے۔ وہ مراد کے دھوکے میں گولی کھا کر اسپتال سے ہو آیا تھا۔ ورشا کے ساتھ رہ کر ایک مرڈر کیس میں پھنسنے سے پہلے بال بال بچا تھا۔ مراد کا ہم شکل ہونے کے باعث انٹیلی جنس والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اب حالات کہہ رہے تھے کہ میکی براؤن اسے اپنا یہودی داماد بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں کیا کروں؟ اس کی بیٹی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ایک مراد ہی ہے جو باپ بیٹی سے پیچھا چھڑا سکے گا۔ پہلے اسکائپ کے ذریعے ان سے باتیں کرو۔ پھر میں مراد سے بات کروں گا۔"

وہ دونوں ٹی وی کے سامنے آ گئے۔ ڈاکٹر نے فون کے ذریعے میکی کو اطلاع دی کہ وہ رابطہ کر رہا ہے۔ بیٹے کے ساتھ اپنے ٹی وی کے سامنے ہے۔ وہ بھی بیٹی کے ساتھ سامنے آ جائے۔

ادھر باپ نے بیٹی کو بتایا تھا کہ ایمان علی سن سٹی میں نہیں ہے، انڈیا میں اپنے باپ کے ساتھ ہے۔ ابھی وہ اسے اسکرین پر دیکھ سکے گی اور باتیں کر سکے گی۔

میڈونا یہ سن کر بے چین ہو گئی تھی۔ وقت سے پہلے ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ جب رابطہ ہوا تو ڈاکٹر مینی سن نظر آیا۔ دوسری طرف میکی براؤن اپنے ٹی وی کے سامنے تھا۔ اس نے کہا۔ "اپنے بیٹے کو سامنے لاؤ۔ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے میں اسے دیکھوں گا اور باتیں کروں گا۔"

ایمان علی باپ کی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ باپ بیٹی نے حیرانی سے دیکھا۔ انہیں وہ ایمان علی نظر آ رہا تھا جسے وہ اب تک دیکھتے آئے تھے جبکہ اس چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے مراد کو دیکھتے رہے تھے۔

میکی براؤن نے پوچھا۔ "تم تو سن سٹی میں تھے؟"

وہ بولا۔ "تعجب ہے آپ نے وہاں کیسے دیکھ لیا؟ میں تو خواب میں بھی سن سٹی نہیں گیا۔ میں آپ کے سامنے یہاں دہلی میں ہوں۔ پتا نہیں آپ نے وہاں کسے دیکھا ہے؟"

میڈونا نے کہا۔ "پاپا! مجھے اس سے بات کرنے دیں۔"

ایمان علی نے کہا۔ "میں بھی میڈونا کو دیکھنا اور اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میڈونا باپ کی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس حسن پرست نے پہلی بار اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سحر زدہ ہو کر دل میں کہنے لگا۔ "ہائے اس دنیا میں کتنا حسن بکھرا پڑا ہے۔ میں کہاں کہاں جاؤں؟ کس کس کو گلے لگاؤں؟"

مقدر مسکرا رہا تھا۔ "اے حسن پرست... میں نے مراد کو تیرا ہم شکل بنایا ہے۔ جا... کہاں کہاں جائے گا اور کیسی کیسی شامت کو گلے لگائے گا۔"

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

وہ بابا راستہ چلتے ہوئے مجھے مل گیا تھا۔
بعض بابا ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی احساس ہوجاتا ہے کہ وہ فراڈ قسم کا بندہ ہوگا۔ لال لال آنکھیں، گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں، الجھے ہوئے گندے بال، کڑک دار آواز..... اور کچھ ایسے بھی مل جاتے ہیں جن کو دیکھتے ہی دل میں ہلچل سی ہونے لگتی ہے۔
کوئی کہتا ہے جا اس کی دعائیں لے۔ یہ بہت بڑا انسان ہے۔ اس کی دعائیں تیرے کام آجائیں گی۔ تیری

تسبیح

منظر امام

انسانی خواہشات کی زنجیر ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے مگر حالات کی ہتھکڑی انسان کو اونچی اڑان سے روک دیتی ہے بس... یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی بے بسی اور مایوسی کی انتہا کو چھو لیتا ہے۔ ایسے میں یا تو انسان اندھیرے کی طرف بڑھ جاتا ہے یا روشنی کا کوئی ہالہ اسے اپنے حصار میں لے لیتا ہے... اس کے مقدر کا ستارہ بھی بہت روشن تھا اس کے باوجود ایک تیرگی اس کے دل میں اتر گئی۔

رشتوں کی حقیقتوں کو واضح کرتی ایک

دلخراش روداد

مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔ ان کے پیچھے پڑ جا۔
تو وہ ایسے ہی بابا تھے جن کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔ وہ بابا ایک درخت کے نیچے دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ وہ ایک جانماز پر بیٹھے تھے، اپنی دنیا میں مگن۔

ان کو دیکھتے ہی دل میں عقیدت کے جذبات ابھرنے لگے تھے۔ میں نے ان کے پاس جا کر سو کا نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ شاید میری آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

انہوں نے ایک نظر نوٹ کی طرف پھر میری طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولے۔ ''یہ کیا ہے؟''

''سرکار! شاید اس کی آپ کو ضرورت ہو۔'' میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایک معمولی سا نذرانہ۔''

''کیا میں نے مانگا تھا؟''

''نہیں سرکار! آپ نے تو نہیں مانگا۔'' میں اسی عقیدت سے بولا۔ ''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' بابا نے غصے سے کہا۔ ''جا اٹھ یہاں سے۔ اور چلا جا۔''

ان کے تیور دیکھتے ہوئے میں نے سو کا نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں واپس رکھ لیا۔ یقین تھا کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہیں لیکن میں ان کے پاس سے ہٹا نہیں بلکہ ان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا رہا۔

''کیا بات ہے، کیا چاہتا ہے؟'' اس بار ان کا لہجہ بہت نرم تھا۔

''نظر کرم چاہتا ہوں سرکار...... اور کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے ادب سے کہا۔

''جس کو دیکھو وہی مجبوریوں اور فرمائشوں کی ٹوکریاں اٹھائے گھوم رہا ہے۔''

''سرکار! شب و روز کی گردشوں نے اس حال کو جو پہنچا دیا ہے۔''

''اچھا! اچھا...... یہ لے۔'' بابا نے ایک تسبیح میری طرف بڑھا دی۔ ''یہ شاید ابھی تک تیرے ہی لیے امانت کے طور پر میرے پاس رکھی ہوئی تھی۔''

''سرکار! بڑی نوازش۔'' میں نے ادب سے وہ تسبیح چوم لی۔ اس میں صرف گیارہ دانے تھے اور وہ بھی بہت بڑے بڑے۔ وہ غیر معمولی تسبیح تھی۔

''جا...... لے جا اس کو۔'' بابا نے کہا۔ ''اور اپنی زندگی بدل لے۔''

''بابا! کیا مجھے اس تسبیح پر کچھ پڑھنا پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں پڑھنا۔ یہ تسبیح تیری پانچ خواہشیں پوری کر سکتی ہے...... کوئی سی بھی پانچ خواہشات۔ چاہے وہ کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہوں۔''

''وہ کیسے سرکار؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اس تسبیح کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کرنا ہے اور وہ خواہش پوری ہو جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ ایک خواہش اور دوسری خواہش کے درمیان کم از کم پندرہ دنوں کا وقفہ ہو۔'' بابا نے کہا۔

میں نے یہ تو یقین کر لیا تھا کہ بابا کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ غیر معمولی شخصیت ہیں لیکن اس تسبیح کے بارے میں جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، اس پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''شاید تجھے یقین نہیں آ رہا۔'' بابا غصے سے بولے۔ ''تو سمجھ رہا ہے کہ شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ چل ابھی وقت اپنی کوئی خواہش بیان کر...... ابھی پوری ہو جائے گی۔''

میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا کہ ذرا آزما کر دیکھوں کہ بابا کی باتوں میں کہاں تک صداقت ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے میدان تھا اور اس میدان کے شروع میں ایک درخت تھا۔ بہت بڑا درخت۔ انتہائی گھنا مضبوط۔ اندازے کے مطابق کم از کم پچاس ساٹھ سال تک اس کے گرنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے تسبیح ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے اپنی خواہش بیان کی۔ ''وہ جو سامنے درخت ہے، وہ گر جائے۔'' یہ ایک بے تکی سی خواہش تھی اور صرف آزمانے کے لیے تھی جبکہ اس درخت کے گرنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔

لیکن ایک معجزہ ہوا۔ حیرت انگیز معجزہ۔ ایک دھماکے کے ساتھ وہ تناور درخت اپنی جڑ چھوڑ کر زمین پر گر پڑا۔

ناقابلِ یقین صورتِ حال تھی۔ نہ تو زلزلہ آیا، نہ کوئی طوفان آیا تھا اور پچاس ساٹھ سال سے پہلے نہ گرنے والا درخت زمین بوس ہو چکا تھا۔

اس میدان میں ایک مجمع سا لگ گیا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے اس درخت کے گرد جمع ہو کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

''بابا! یہ تو...... یہ تو کمال ہو گیا۔'' میں نے عقیدت سے کہا۔

''کیا تو نے اس درخت کو گرانے کی بات کی تھی؟'' بابا نے پوچھا۔

''جی سرکار! صرف آزمانے کے لیے۔''

''بے وقوف! تو نے اپنی حماقت سے ایک قیمتی خواہش ضائع کر دی۔'' بابا نے کہا۔ ''اب تیرے اور تیرے خاندان والوں کے پاس صرف چار خواہشات رہ گئی ہیں۔''

''بابا! کیا میرے علاوہ میرے گھر والے بھی اس تسبیح سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جس کے پاس یہ تسبیح ہو، وہ اپنی خواہشات پوری کر سکتا ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''اب تو چلا جا اور اپنی خواہشات پوری کر لے۔''

میں نے بڑی عقیدت کے ساتھ بابا کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس وقت جیسے کائنات میرے ساتھ چل رہی تھی۔

کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ بے پناہ دولت، صحت اور بھی بہت کچھ۔ دنیا کا سارا حسن میرے قدموں میں... آ سکتا تھا۔

گھر میں کیا تھا۔ ایک بیوی یاسمین جو یقیناً اپنی جوانی میں قبول صورت تھی لیکن مفلسی اور پریشانیوں کے ملبے تلے دب کر وہ اپنے وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی تھی۔ جو چہرہ کسی زمانے میں خوب صورت تھا، اب اس پر پریشانیوں نے لکیریں کھرچ دی تھیں۔

وہ آنکھیں جو کبھی ستارہ آنکھیں رہی ہوں گی، ایسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھیں جس کے نیچے چنگاری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک بیوی کے علاوہ دو بچے تھے، ایک بچی اور ایک بیٹا۔ وہ دونوں بڑے ہو چکے تھے لیکن ان کے پاس مستقبل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا منگیتر بہتر زندگی کی تلاش میں بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ خدا معلوم اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ بہت ذہین اور سعادت مند۔ جانے اس بے چارے کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میری بچی اسے بہت پسند کرنے لگی تھی۔ ہماری مشرقی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، جس کے نام کے ساتھ ایک بار وابستہ ہو جائیں پھر کسی اور کے بارے میں سوچتی بھی نہیں ہیں۔

شہانہ بھی ایسی ہی تھی۔ وہ ہر وقت اداس رہتی۔ ہم اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کو ترستے رہتے تھے۔ لڑکے کے ساتھ ایسا تھا کہ وہ صرف بی اے کر سکا تھا۔ جو آج کے دور میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا ارادہ ایم بی اے کرنے کا تھا لیکن اعلیٰ تعلیمی ادارے میں ایم بی اے کی فیس ہی اتنی ہوتی ہے کہ صرف خواہش کی جا سکتی ہے یعنی ہمارے چھوٹے سے گھر میں ہر طرف خواہشیں ہی بکھری ہوئی تھیں...... ادھوری اور سسکتی ہوئی خواہشیں۔ ایسے میں اس تسبیح کا مل جانا کسی عظیم نعمت سے کم نہیں تھا۔

میں جب گھر پہنچا تو میرے چہرے پر بلا کی خود اعتمادی تھی جو شاید اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔ کامیابی کے تاثرات ہی الگ ہوتے ہیں۔ چہرے پر بلا کی چمک اور آنکھوں میں بلا کی مستی ہوتی ہے۔ جیسے پوری دنیا کو ٹھوکروں میں اڑا دینے کی صلاحیت مل گئی ہو۔

یاسمین اور بچوں نے بھی بہت حیران ہو کر مجھے دیکھا تھا۔ میرے لہجے کی خود اعتمادی نے انہیں پریشان کر دیا تھا بلکہ یاسمین نے تو یہ بات کہہ دی تھی۔ ''کیا بات ہے، آج تو اس طرح چمک رہے ہو جیسے پوری دنیا کی دولت مل گئی ہو۔''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس اتنا جان لو کہ اب ہمیں کسی بات کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا، ہمارے پاس وہ سب کچھ ہوگا جس کے ہم خواب دیکھتے آئے ہیں۔''

اس وقت یاسمین کے علاوہ میرے دونوں بچے بھی میرے پاس ہی تھے۔ مجھ سے چونکہ برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نے انہیں وہ تسبیح دکھا دی۔ ''یہ دیکھو، یہ ہے ہمارے مستقبل کے سنہری دروازے کی سنہری کنجی۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ اس طرح کی تو درجنوں تسبیح گھر میں پڑی ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔

''یہ کوئی عام تسبیح نہیں ہے بے وقوف عورت۔'' میں فخر سے بولا۔ ''یہ بہت خاص چیز ہے۔ ایک بہت بڑے انسان کا تحفہ۔ یہ ہماری چار خواہشات پوری کر سکتی ہے۔''

''وہ کیسے ؟'' میرے بیٹے نے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ ہم اس کو سامنے رکھ کر اپنی خواہشیں بیان کریں گے تو وہ پوری ہو جائیں گی۔''

''یہ سب کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں ابا۔'' میرے بیٹے ریحان نے کہا۔ ''حقیقی زندگی میں ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کسی نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔''

میں ان سے یہ کہنے والا تھا کہ میں اس تسبیح کو آزما کر دیکھ چکا ہوں۔ پھر بتاتے بتاتے رک گیا۔ وہ سب کے سب

مجھے بے وقوف سمجھتے کہ میں نے خوامخواہ ایک احمقانہ خواہش کر کے اپنی ایک خواہش ضائع کردی۔ تین ہفتوں بعد بیٹے نے کہا۔
''ابا! کیوں نہ ہم ابھی اس تسبیح کو آزمالیں۔'' میرے بیٹے ریحان نے کہا۔
''او کے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن خواہش کیا ہوگی؟ یاد رکھو، اس ایک خواہش کے بعد صرف تین خواہشیں رہ جائیں گی۔''
''ہاں ہاں، کوئی بات نہیں۔'' یاسمین جلدی سے بولی۔ ''اس طرح اس تسبیح کا امتحان تو ہوجائے گا۔''
بہت دیر کی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ اس تسبیح سے کہا جائے کہ وہ چودھری امجد کا مکان گرادے۔ چودھری امجد ہمارے مکان سے کئی مکان آگے رہتا تھا۔ اس نے جب سے اپنے پرانے مکان کو گرا کر نیا مکان بنوایا تھا ہماری زندگی تلخ کر کے رکھ دی تھی۔
ہر وقت ہمیں یہ احساس دلاتا رہتا کہ ہم ناکارہ اور ناکام لوگ ہیں۔ ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ ہم اپنے پرانے مکان پر رنگ و روغن ہی کرا سکیں۔
وہ جب ملتا تو یہی کہتا۔ ''صفدر صاحب! آپ نے تو اپنی زندگی بے کار گزاری ہے جی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اپنا مکان بیچ کر کوئی دکان ہی کھول لیں۔ چار پیسوں کی آمدنی ہوجائے گی۔''
''انور صاحب! خدا کے فضل سے میں عزت کے ساتھ چار پیسے کما ہی لیتا ہوں۔''
''اچھا اچھا۔'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسنے لگتا۔ ''ہاں جی۔ آج کل چار پیسے کمانا بہت مشکل ہے۔ اب یہی دیکھ لیں، آپ نے برسوں سے اپنے مکان پر رنگ نہیں کروایا ہوگا۔ ظاہر ہے کہاں سے کرواؤ گے۔ اب ہر ایک کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا نا، اب مجھے دیکھیں۔ میں نے پرانے مکان کو تڑوا کر نیا مکان بنوالیا ہے۔ معلوم ہے اس پر کتنے خرچ ہوئے ہیں۔ پورے چالیس لاکھ۔ چالیس لاکھ کم نہیں ہوتے صفدر صاحب۔ بہت بڑی رقم ہوتی ہے لیکن آپ کو کیا معلوم۔''
ایسی باتیں وہ یاسمین اور دونوں بچوں سے بھی کیا کرتا۔ یہ احساس دلاتا کہ میں ایک ناکارہ انسان ہوں۔ میرے حالات کبھی نہیں بدلیں گے اور جس کے حالات ایک دفعہ خراب ہوجائیں، وہ ہمیشہ خراب ہی رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔
ہم سب اس کی بکواس سن سن کر عاجز آچکے تھے۔ اس لیے جب یہ بات ذہن میں آئی کہ اس تسبیح سے چودھری انور کا مکان گرانے کی خواہش کی جائے تو سب نے اتفاق کیا۔
''چلیں ابا! بولیں اس تسبیح سے۔'' ریحان نے کہا۔
''ویسے تو میں جانتا ہوں کہ ہونا ہوانا کچھ بھی نہیں ہے لیکن ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔''
''لیکن ابا! ساتھ میں یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ چودھری کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔'' شبانہ نے کہا۔
''صرف مکان گرجائے، اس کے علاوہ کوئی نقصان نہ ہو۔''
''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے تسبیح سامنے رکھی اور بابا کے بتائے ہوئے طریقے پر بولنا شروع کردیا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ اس گلی میں جو چودھری انور کا مکان ہے، وہ گر جائے لیکن کسی کو جانی نقصان نہ ہو۔ صرف مکان ہی گرے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔''
اپنی اس خواہش کو بیان کرنے کے بعد ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ جبکہ یہ انہونی سی خواہش تھی ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔
لیکن ایسا ہوگیا۔
اچانک ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار۔ ہم سب پاگلوں کی طرح باہر دوڑ پڑے۔ گلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ گرد و غبار کا طوفان سا تھا اور لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو بتارہے تھے کہ چودھری انور کا مکان اچانک زمین بوس ہوگیا ہے۔
کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ مکان کیسے گرا ہوگا۔ نہ تو کوئی زلزلہ آیا، نہ ہی کسی قسم کا طوفان تھا۔ پھر بھی وہ مکان پورے کا پورا گر پڑا تھا۔
پتا چلا کہ اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔ صرف مکان اور فرنیچر کا نقصان ہوا تھا یعنی دوسرے معنوں میں چودھری انور کا لاکھوں کا نقصان ہوگیا تھا۔
اس وقت پورا محلہ چودھری انور کے مکان کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں، یاسمین اور دونوں بچے بھی تھے۔ حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھے جارہے تھے۔
کسی نے چودھری انور کو خبر کردی ہوگی، وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے گھر والوں کو واپس لے آیا۔ شاید وہ لوگ کہیں اور گئے ہوئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد جو واویلا مچا...... بس خدا کی پناہ۔ چودھری نے رو رو کر سارا محلہ سر پر اٹھالیا تھا۔ وہ واقعی بری طرح تباہ ہوچکا تھا۔

پولیس والے بھی تفتیش کے لیے آگئے تھے لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا، وہ مکان اچانک کیسے بیٹھ گیا۔ کسی قسم کا دھماکا بھی نہیں ہوا تھا۔ محلے کے ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ وہ اس وقت مکان کے سامنے ہی کھڑا تھا جب مکان ریت کے ڈھیر کی طرح بیٹھنے لگا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ لمحوں تک ساکت ہی رہا تھا۔ پھر ہوش آنے پر اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ یہ کوئی انتہائی پراسرار معاملہ ہے۔ میں اپنے گھر والوں کو گھر واپس لے آیا۔ ہم سب گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔

''دیکھو، خدا کے لیے تم لوگ اپنی زبانیں بند رکھنا۔'' میں نے سمجھایا۔ ''کسی کو بھنک بھی نہ لگے۔ ورنہ ہم پر کیس بن جائے گا۔''

''ہاں ابا! یہ تو کوئی بتانے والی بات ہی نہیں ہے۔'' ریحان نے کہا۔ ''لیکن جو کچھ ہوا، وہ انسانی عقل سے باہر ہے۔''

''خدا کی پناہ۔ کیسی خطرناک تاثیر ہے تسبیح کی۔'' یاسمین نے گہری سانس لی۔ ''لگتا ہے جیسے جادو ہو گیا ہو۔''

''چار خواہشوں میں سے اب صرف تین خواہشیں رہ گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن خدا کے لیے اب کوئی جلدی نہ کرے۔ اب بقیہ خواہشیں بہت سوچ سمجھ کر اور ایمرجنسی میں کی جائیں۔ یعنی یہ سمجھو کہ جب گردن پر تلوار لٹک رہی ہو، ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسے ہوں، اس وقت تسبیح کو زحمت دی جائے۔''

''اب اس تسبیح کو احتیاط سے اندر بکس میں رکھ دیتے ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے سامنے پڑی ہو اور ہم الٹی سیدھی فرمائشیں کرنے لگیں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' ریحان نے بھی تائید کی۔ ''بہت سوچ سمجھ کر اس کا استعمال کرنا ہے۔''

تسبیح بکس میں رکھ دی گئی۔ اس بکس میں ہمارا مستقبل محفوظ ہو گیا تھا۔ ہماری زندگی کے آنے والے خوب صورت دن اب ہماری دسترس میں تھے۔ ہم جب چاہتے ان دنوں کو نکال سکتے تھے۔ بے شمار خواب تھے لیکن وہ خواب اس وقت ادھورے رہ گئے، جب دوسرے دن ہی میرا ایکسیڈنٹ ہوا اور اسی وقت میری موت واقع ہو گئی۔

ہاں میں مر گیا تھا۔

ہے نا عجیب بات۔ یعنی بہ ظاہر مر گیا تھا میں۔ وہ حادثہ ہی اتنا شدید تھا۔ ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار دی تھی اور میں اچھل کر ایک دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔

بہ ظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن میں مر چکا تھا۔ چوٹ دماغ پر لگی تھی۔ اس کے باوجود میں یہ دیکھ رہا تھا کہ لوگ ہر طرف سے جمع ہو رہے ہیں۔ ایمبولینس آئی ہے اور میرے جسم کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں چیخ رہا ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ میری بات سنو۔ لیکن کوئی میری بات نہیں سن رہا تھا۔ شاید میری آواز کسی تک نہیں جا رہی تھی۔ پھر ایمبولینس میرے جسم کو لے کر روانہ ہوئی اور میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری رفتار بہت تیز تھی میں گویا پرواز کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایمبولینس ایک اسپتال کے گیٹ پر آ کر رکی۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے آواز لگائی۔ مجھے لے جانے کے لیے اسٹریچر بھی آ گیا۔ مجھے اسٹریچر پر لٹا کر تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑا دیا گیا۔ میرے ساتھ آنے والے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔

پھر کسی نے آواز لگائی۔ ''ارے اس بے چارے کے گھر والوں کو تو خبر دے دو۔''

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے میری جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ میرا شناختی کارڈ نکالا گیا جس پر میرا پتا لکھا ہوا تھا۔

کسی اور نے شاید دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس وارڈ بوائے نے میری جیب سے پیسے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ شاید سات آٹھ سو روپے تھے۔

پھر مجھے آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے معائنہ کرنے کے بعد مجھے مردہ قرار دے دیا۔ میں اس وقت بھی وہیں موجود تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ میں ان کے سامنے زندہ کھڑا ہوا ہوں اور یہ مجھے مردہ قرار دے رہے ہیں۔ میں نے ایک بار ان لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں زندہ ہوں اور ان کے ساتھ کھڑا ہوں لیکن کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں بور ہو کر آپریشن تھیٹر سے باہر آ گیا۔

اسی وقت میں نے اپنے گھر والوں کو دیکھا۔ وہ سب روتے پیٹتے ہوئے آپریشن تھیٹر کے باہر جمع ہو گئے۔ یاسمین، شہانہ اور ریحان کے علاوہ خاندان کے بھی کچھ لوگ تھے۔ سب بری طرح رو رہے تھے۔

جب ڈاکٹرز نے باہر آ کر یہ بتایا کہ میری موت ہو چکی ہے تو ان کی آہ و زاری میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ یاسمین کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔ وہ روتے

روتے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ برا حال دونوں بچوں کا بھی تھا۔ ریحان تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ بہر حال اس کے بعد بھی کئی مراحل آئے۔ میرا پوسٹ مارٹم ہوا، اس کی رپورٹ آ گئی۔ سچ یہ ہے کہ اپنے جسم کو ٹکڑے ہوتے دیکھ کر میں خود بھی رونے لگا تھا۔ میری بے آواز سسکیاں کمرے میں گونج رہی ہوں گی لیکن کون سنتا۔

انسان کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ اپنے جسم سے پیار ہوتا ہے اور میں اس لیے رو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے میرے بدن کی دھجیاں کردی گئی تھیں۔

خیر...... تو اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ رونا دھونا۔ تدفین کے مراحل۔ رشتے داروں کا آنا جانا وغیرہ۔

اور میں ہر لحظہ سب کے ساتھ رہا۔ مرنے کے بعد یہ دیکھ کر ایک طرح کی خوشی ہو رہی تھی کہ میرے بچے اور میری بیوی کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔

رو رو کر انہوں نے اپنے آپ کو ہلکان کر لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے سوگ کی گرد بیٹھتی چلی گئی کہ دنیا کا یہی دستور ہے۔

یاسمین کی جب عدت ختم ہوئی تو اس دن بھی بہت سے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر سب کچھ معمول پر آ گیا۔

پھر ایک رات میری بیٹی نے میری بیوی یعنی اپنی ماں سے کہا۔ ''امی! اب تو اس تسبیح کو نکال کر اس سے کام لیں۔''

اس وقت ریحان بھی موجود تھا۔ وہ بھی یہ سن کر پرجوش ہو گیا۔ ''ہاں امی! نکالیں اس تسبیح کو۔ آخر ہم کب تک پریشانی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔''

''یہ لو، مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔'' یاسمین نے کہا۔

''تو پھر نکالیں۔ آخر وہ ہے کس لیے۔''

اس وقت میں بھی اسی کمرے میں موجود تھا۔ جب وہ تسبیح نکال کر سامنے رکھی گئی۔

''ہاں بیٹا، اب خواہش بتاؤ۔'' یاسمین نے پوچھا۔

''امی! سب سے پہلی خواہش تو یہی ہے کہ ہمارے پاس بہت سی دولت آ جائے۔'' ریحان نے کہا۔ ''دولت آ گئی تو دوسرے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' یاسمین نے اس کی تائید کی۔ پھر بلند آواز میں بولی۔ ''ہمیں دولت چاہیے۔ ڈھیری دولت تاکہ ہم آرام کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔''

''چلو۔ اب اس تسبیح کو واپس رکھ دیتے ہیں۔'' ریحان نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''بھول گئیں۔ ابا نے بتایا تھا کہ دوسری خواہش پندرہ دنوں سے پہلے نہیں کی جاتی۔'' ریحان نے یاد دلایا۔ ''ان پندرہ دنوں میں اس خواہش کا رزلٹ بھی سامنے آ جائے گا۔''

اب خود مجھے بھی تجسس سا ہو گیا تھا کہ یہ تسبیح دولت کا مطالبہ کس طرح پورا کرتی ہے اور ایک ہی ہفتے کے اندر حیرت انگیز طور پر ان کے پاس دولت بھی آ گئی۔

یاسمین اس دن اپنے پرانے صندوق سے کپڑے نکال رہی تھی کہ پچیس ہزار روپے کا ایک پرائز بونڈ کپڑوں کے درمیان سے باہر آ گیا۔

میں اس وقت وہیں موجود تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے یہ پرائز بانڈ یاسمین کو اس کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیا تھا جس کو وہ صندوق میں رکھ کر بھول گئی تھی۔

شاید یہ قدرت کا اشارہ ہی تھا کہ اس کو پرانے کپڑوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے صندوق کھولا اور وہ پرائز بونڈ سامنے آ گیا۔ یاسمین نے بھی سمجھ لیا تھا کہ شاید اس پرائز بونڈ ہی کے ذریعے کوئی راستہ نکلنے والا ہے۔

اس نے ایک جوش سے ریحان کو آواز دی۔ وہ دوسرے ہی کمرے میں تھا۔ وہ دوڑا چلا آیا تھا۔

''کیا ہوا امی؟''

''بیٹا یہ پرائز بونڈ۔'' یاسمین نے اسے پرائز بونڈ دکھایا۔

''ارے، یہ کہاں سے آ گیا؟''

''بیٹا، یہ تمہارے ابا نے میری سالگرہ میں تحفے کے طور پر دیا تھا۔'' یاسمین نے بتایا۔ ''ارے اس وقت اس کا دکھائی دینا اس بات کا اشارہ ہے کہ شاید ہماری قسمت بدلنے والی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر کمال ہی ہو جائے گا۔'' ریحان نے کہا۔ ''میں اس کا نمبر لے کر جا رہا ہوں۔ پرائز بونڈز کے پرانے ریکارڈز نکلواتا ہوں۔ خدا کرے، بات بن جائے۔''

اور بات اس طرح بن گئی کہ پورے پانچ کروڑ میرے گھر والوں کو مل گئے تھے۔ پانچ کروڑ، خدا کی پناہ.... اتنی رقم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں وہیں موجود میں تھا جب گھر والوں کے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ آ گئے تھے۔ ان سے کیا نہیں ہو سکتا تھا۔

ریحان کی خواہش تھی کہ وہ اپنا کوئی کاروبار کرے گا اور اب وہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

شہانہ کی شادی ہوسکتی تھی۔ ہمارا مکان بن سکتا تھا، کسی اور محلے میں۔ بہت کچھ ہوسکتا تھا۔

وہ سب باری باری پوری عقیدت اور احترام کے ساتھ اس تسبیح کو بوسے دیے جارہے تھے جس نے صرف ایک ہفتے میں زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔

انہوں نے عقل مندی یہ کی کہ فوراً ہی اپنے دولت مند ہونے کا اعلان نہیں کیا بلکہ اسی مکان میں رہتے رہے۔ اب صرف دو خواہشات رہ گئی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر اس پراسرار تسبیح کو سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔ میں اس وقت بھی وہیں پر تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کیا خواہش کرتے ہیں۔

''امی! اب یہ بات تو طے ہوگئی ہے کہ اس تسبیح میں ایسی قوت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔'' شہانہ نے کہا۔

''ہاں، وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔''

''امی! اب ایک خواہش میری بھی پوری کروا دیں۔''

''وہ کیا؟''

''نوید خیریت سے واپس آجائے۔'' شہانہ نے کہا۔

نوید اس کے اس منگیتر کا نام تھا جو باہر جاکر کہیں غائب ہوگیا تھا۔

''دیکھو، اس طرح ہماری ایک اور خواہش خرچ ہوجائے گی۔'' ریحان نے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ یہی تو میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی یوں ہی اس کے غم میں آنسو بہاتی رہوں۔''

''اچھا بابا! مانگ لو تسبیح سے اپنے نوید کو۔''

میں قریب ہی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ خواہش بھی بہت مشکل تھی۔ وہ لڑکا خدا جانے کہاں ہوگا؟ وہ کہاں جاکر غائب ہوگیا تھا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا اور اب شہانہ اسے بلانے کی خواہش کررہی تھی۔

یاسمین نے تسبیح سامنے رکھ کر بولنا شروع کردیا۔

''میری بیٹی ---- کا منگیتر خیروخوبی کے ساتھ واپس آجائے۔''

خواہش بیان کردینے کے بعد اس تسبیح کو پھر صندوق میں رکھ دیا گیا۔ دیکھنا یہی تھا کہ وہ کس طرح واپس آتا ہے۔

میں چونکہ خالص روح تھا، اس لیے میں پرواز کرکے کہیں بھی جاسکتا تھا لیکن میں اپنے گھر کے آس پاس ہی

بھگتنا رہتا۔ اپنی بیوی کے پاس اپنے بچوں کے پاس۔

اور اس خواہش کو بیان کرنے کے ٹھیک دس دنوں کے بعد شہانہ کا منگیتر نوید واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر آیا تھا۔

اسے ایک جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس نے شرمندگی کی وجہ سے کسی کو خبر نہیں دی تھی۔ خاموشی سے مقدمات کا سامنا کرتا رہا تھا پھر جب عدالت نے اسے بے گناہ ثابت کیا تو اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ سیدھا پاکستان واپس آ گیا تھا۔

یہ ناممکن تھا جو ممکن ہو گیا تھا۔ ایک ایسی خواہش پوری ہوئی تھی جس کی طرف سے ہم سب مایوس ہو چکے تھے۔ صرف شہانہ آس لگائے بیٹھی رہی تھی۔

جس وقت وہ ہمارے یہاں ملنے کے لیے آیا تو اس وقت سب کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ سب ہی رو رہے تھے بلکہ خود میں بھی ایک طرف کھڑا روئے جا رہا تھا۔

نوید جب مل کر چلا گیا تو شہانہ نے صندوق سے تسبیح نکال کر اسے چومنا شروع کر دیا۔ یہ تسبیح اس کی خوشیاں واپس لے آئی تھی۔ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

"امی۔" شہانہ نے کہا۔ "ہماری دو ناممکن خواہشیں پوری ہو چکی ہیں۔ اب ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ پیسے بھی ہیں اور نوید بھی واپس آ چکا ہے۔ اب صرف ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا ہے بیٹا۔" یاسمین نے پوچھا۔

"ابا جی...." شہانہ نے کہا۔ "اگر وہ ہوتے تو ہماری خوشیاں مکمل ہو جاتیں۔"

"لیکن بیٹا! وہ زندہ کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"امی! ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ تسبیح ناممکن کو ممکن کر رہی ہے۔" شہانہ نے کہا۔ "کیوں نہ ہم اس سے کہیں کہ وہ ابا کو واپس بلا لے۔ تو سوچیں ان کے آنے کے بعد ہماری خوشیاں کتنی بھرپور ہو جائیں گی۔"

"لیکن شہانہ...... ہمارے پاس تو اب صرف ایک ہی خواہش رہ گئی ہے۔" ریحان جلدی سے بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس ایک خواہش کو ضائع نہ کریں۔ بلا لیں ابا کو۔"

اس وقت بھی میں ان سب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔

ایک روح کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ کچھ عجیب بات تھی۔

میں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں، ہم یہ احمقانہ خواہش نہیں کریں گے۔"

"کیوں اماں؟"

"اس لیے کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب ہم لوگ اپنی زندگی میں ایڈجسٹ ہو چکے ہیں۔ ان کو بلانے کی خواہش سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی صحت کی بات کروں۔ جو دن بہ دن گرتی چلی جا رہی ہے۔"

"امی ٹھیک کہتی ہیں شہانہ۔" ریحان نے بھی تائید کی۔ "جو چلا گیا اس کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گھر کا سیٹ اپ بدل جائے گا۔ رہنے دو ابا کو وہیں جہاں رہ گئے ہیں۔ بس ان کی مغفرت کی دعائیں کرتے رہو۔ بس ایک خواہش رہ گئی ہے، کم از کم اس کو تو بچا کر رکھیں۔"

شہانہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "تو پھر اس سے کہیں کہ نوید سے میری شادی ہو جائے۔"

"وہ تو ہو ہی جائے گی۔ ہم منگنی تو کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس دولت بھی آ گئی ہے بلکہ ایک کام کرتے ہیں، اس تسبیح سے کہتے ہیں کہ وہ ہم سب کو کسی پرسکون اور اچھے ملک کی نیشنلٹی دلوا دے۔ نوید بھی ہمارے ساتھ ہو پھر ہم پیسے لے کر یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"واہ، یہ بات ہوئی نا۔" ریحان اچھل پڑا۔ "کیا زبردست بات ہوئی ہے۔" پھر اس نے شہانہ کی طرف دیکھا۔ "اب تم بتاؤ، تم کیا کہتی ہو؟"

"مجھے کیا کہنا ہے جو آپ لوگوں کی مرضی۔" شہانہ نے کہا۔ "کم از کم نوید تو ساتھ ہوگا نا۔"

میں اب اس مکان میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں رو رہا تھا۔ دنیا اور زندگی بہت بھیانک اور بے رحم بن کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ ان میں سے کسی کو میری ضرورت نہیں تھی۔

میں مایوس ہو کر اس گھر سے نکل آیا۔

مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس دور میں انسان سے زیادہ ایک تسبیح کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تسبیح جو خواہشات پوری کر سکے۔

اب وہ رشتے میں باپ ہو یا کسی بابا کی دی ہوئی تسبیح ہو۔ اگر خواہشات پوری ہوتی رہیں تو باپ بھی کارآمد ہے اور تسبیح بھی۔

ورنہ دونوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

فخرِ دین و دنیا

ضیا تسنیم بلگرامی

فخر ہمیشہ ایسی صلاحیتوں پر ہوتا ہے جو کسی کو ہزاروں انسانوں میں بھی نمایاں مقام پر لا کھڑا کریں... لیکن فخر میں بھی اس بات کا احساس لازم رکھنا چاہیے کہ اس سے وابستہ ہونے والے لوگ خود پر فخر کریں... ورنہ انسان اپنی ذات پر آپ ہی فخر کرے تو تکبر کہلاتا ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ انسانوں میں ہوتا تھا جن سے وابستگی ہونے پر عام انسانوں کو خوشی ہوتی تھی۔

مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی بغداد میں روحانی تعلیم و تربیت کے معاملے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت میں دور دور سے طالبانِ حق آ کر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ آپ ان میں سے جوہرِ قابل کو الگ کر لیتے اور بقیہ کو نصیحتیں کر کے واپس کر دیتے۔ جنہیں الگ کرتے انہیں روحانی اور باطنی تعلیم دینے لگتے۔

سہ پہر کو عصر سے ذرا پہلے ایک سترہ سالہ نوجوان آپ سے ملاقات کو حاضر ہوا اور پیشِ خدمت مرید سے کہا۔ ”جاؤ

اپنے شیخ سے کہو آپ کا بھانجا ہمدان سے آیا ہے۔ شیخ فخرالدین۔''

مرید نے نوجوان کو اندر پہنچا دیا۔ ماموں نے کھڑے ہو کر نوجوان بھانجے کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس کو گلے لگا کر اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ شیخ نے بھانجے سے گھر کے حالات پوچھے۔ بہن کی خیریت معلوم کی۔ بھانجا شیخ کے سوالات کے مختصر جوابات دیتا رہا۔ شیخ کو اس نوجوان میں کچھ غیر معمولی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔

شیخ نے پوچھا۔ ''فخرالدین تم نے کچھ پڑھا بھی ہے؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے قرآن پاک کم سنی میں ہی حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہمدان ہی میں منقولات اور معقولات پڑھ کر فارغ ہوا۔ اب آپ کی خدمت میں روحانی تعلیم و تربیت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

شیخ شہاب الدین نے دورانِ گفتگو اپنے بھانجے میں کئی خاص باتیں محسوس کیں، نوجوان بھانجے کی آواز میں ترنم تھا اور آنکھوں سے جذب و مستی ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ آپ نے بھانجے سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری آواز میں لحن پایا جاتا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری خوش گلوئی ہمدان بھر میں مشہور ہے۔''

شیخ نے مزید کہا۔ ''تمہارا دل گداز اور آنکھوں میں کیف و مستی ہے۔'' نوجوان خاموش رہا۔

آپ نے ایک مرید کو آواز دی اور کہا۔ ''ذرا اپنی اس بچی کو تو لانا جس کا حسن اور معصومیت مشہور ہے۔''

مرید چلا گیا لیکن نوجوان فخرالدین کی حالت غیر ہونے لگی اور اچانک اٹھ کر باہر جانے لگا۔ شیخ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا۔ ''فخرالدین! کہاں چلے؟ میں تو تیرے گداختہ دل اور حسن پرستی کا امتحان لے رہا ہوں۔ شاید میں نے تیری بابت درست ہی خیال کیا ہے۔''

فخرالدین نے پوچھا۔ ''آپ نے میری بابت کیا خیال کیا ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ حسن پرستی تیری فطرت میں شامل ہے۔ حسن کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں ہو تو دیکھ کر وارفتہ اور حواس باختہ ہو جائے گا۔''

فخرالدین نے سرد آہ بھری۔ ''قبلہ ماموں! کیا عرض کروں؟''

اتنی دیر میں مرید اپنی بچی کو لے کر آ گیا۔ بچی کی مست و خمار آلود آنکھوں پر بڑی بڑی پلکیں، اعضا میں بلا کا تناسب اور رنگ سرخ و سفید، میدہ شہابی، غرضیکہ بچی کی ایک ایک چیز ایسی تھی کہ دیکھنے والا والہ و شیدا ہو جائے۔ فخرالدین نے اس ننھے سے مجسّمے کو جو دیکھا تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھے اور ایک لمبی آہ کھینچ کر نیم مدہوش ہو گئے۔

شیخ نے مرید سے کہا۔ ''اب اس بچی کو لے جاؤ، میں نے پا لیا۔''

مرید بچی کو واپس لے گیا۔ آپ فخرالدین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فرمایا۔ ''فخرالدین! ہوش میں آؤ کیونکہ اتنی جذباتیت ٹھیک نہیں ہے۔''

فخرالدین اب بھی پوری طرح ہوش میں نہیں تھے پھر بھی باکمال ماموں کے حکم پر کسی حد تک ہوش و حواس میں آ گئے۔ شیخ شہاب الدین نے ایک بار پھر آواز دی۔ ''فخرالدین! کیا پوری طرح ہوش میں آ گئے ہو تم؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ماموں! میں اپنے ہوش میں تھا کب نہیں لیکن اب میں بالکل ہوش میں ہوں۔''

شہاب الدین نے فرمایا۔ ''بیٹے! میں نے محسوس کیا ہے کہ تجھ میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور تجھ کو تیری یہ خوبیاں بڑی بلندیوں پر لے جائیں گی۔'' فخرالدین خاموش رہے۔

آپ نے پوچھا۔ ''فخرالدین! کیا تو شاعری بھی کر لیتا ہے؟''

''ہاں جناب! میں شاعری بھی کر لیتا ہوں۔''

شہاب الدین نے فرمایا۔ ''میں تیری باتوں ہی سے سمجھ چکا ہوں کہ تو شاعر بھی ہے لیکن میں تجھ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ شاعری مفید طلب چیزوں کی بابت کرنا، ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی سے محفوظ رہنا۔'' پھر پوچھا۔ ''اور تیرا تخلص کیا ہے؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''ابھی تک میں نے کوئی تخلص بھی نہیں رکھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو اس وقت سرزمین عراق میں ہے اور اب تجھ کو زیادہ تر اسی سرزمین میں رہنا ہے اس لیے میں نے تیرا تخلص عراقی تجویز کیا ہے۔ آج سے تو عراقی ہے۔ فخرالدین عراقی۔''

فخرالدین نے اس تخلص کو شکریے اور عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا اور اب وہ فخرالدین عراقی ہو چکے تھے۔ شہاب الدین سہروردی نے انہیں بیعت کیا اور عبادت و ریاضت میں مصروف کر دیا۔ برسوں کے بعد ان کی حالت ہی کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ ایک دن ماموں نے پوچھا۔ ''فخرالدین! کیا تجھے گھر نہیں یاد آتا؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''جب سے میں نے اس سے لو لگائی ہے، ماسوا کو بھلا دیا ہے۔''

شہاب الدین نے حکم دیا۔ ''اچھا تم ہمدان واپس جاؤ اور وہاں تدریس کا کام اختیار کرو۔''

فخرالدین نے اپنے پیر و مرشد ماموں کے حکم کی تعمیل میں بغداد سے ہمدان کا سفر کیا۔ یہاں عزیز رشتے دار ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کامیاب واپسی پر مبارک بادیں دیں۔ عراقی نے ہمدان میں تعلیم دینا شروع کر دی اور ساتھ ہی شاعری بھی کرتے رہے۔ ہمدان میں درس و تدریس کے دوران بھی آپ پر اکثر کسی حسین شے کے دیکھنے سے وجدان اور غشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ حسن کسی بھی شے میں ہوتا۔ شعر میں، شکل میں، مناظر فطرت میں، اچھے اشعار عراقی پر وجد طاری کر دیتے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہتے۔

ایک دن عراقی بڑے جوش و خروش سے پڑھا رہے تھے کہ مدرسے کے سامنے قلندروں کی ایک جماعت نے قیام کیا قلندروں نے عراقی کو پڑھاتے دیکھا تو خوب ہنسے۔ ایک قلندر نے پوچھا۔ ''عراقی کیا ہو رہا ہے؟''

عراقی نے جواب دیا۔ ''علم تقسیم کر رہا ہوں۔''

قلندر نے طنزاً کہا۔ ''عراقی تو کن کاموں میں الجھ گیا۔ تو نے خود کو پہچانا نہیں پھر رب کو کس طرح پہچانے گا؟''

عراقی نے پوچھا۔ ''میں خود کو کس طرح پہچانوں؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''عراقی میں تیرے اندر سوئے ہوئے عراقی کو بیدار کرتا ہوں، سن۔'' اس کے بعد قلندر نے چند دل گداز اشعار پڑھے۔

''میں مسجد کا سامانِ خرابات لیے جاتا ہوں
اور زہد و کرامات کے صفحے پر خطِ تنسیخ پھیرتا ہوں
میں تو پیرِ مغاں کے کوچے میں عاشقوں کی صف میں بیٹھ گیا
اور رندانِ خرابات کے ہاتھوں سے شراب کا جام کھینچنے لگا
ہم زہد و مکافات سے بار بار گزرے ہیں
کیونکہ یہ بار بار گزرنے کی طاقت بھی ہمیں زہد و مکافات سے حاصل ہوتی ہے۔''

ان اشعار نے عراقی کو از خود رفتہ کر دیا۔ انہوں نے درس گاہ چھوڑ دی اور حالت وارفتگی میں قلندروں میں چلے گئے، بولے۔ ''دوستو۔! تم نے کیا کر دیا؟ میں اپنے دل میں ایک آگ سی محسوس کر رہا ہوں۔''

ایک انتہائی حسین قلندر آگے بڑھا اور کہا۔ ''عراقی! ادھر دیکھو۔''

عراقی نے ادھر دیکھا تو ہوش و حواس بالکل ہی جاتے رہے بے اختیار کہا۔

وہ چہ خوش باشد کہ دل دارم تو باشی ...... ندیم و مونس و یارم تو باشی

(کیا ہی اچھا ہو کہ تو میری دلداری قبول کرے...... اور تو میری دوستی مونسی اور یاری میں رہنے لگے)

حسین قلندر نے جواب دیا۔ ''عراقی! ہم تجھے مسجد و مدرسے سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ تو یہاں سے ہمارے ساتھ چل اور سیاحت کر۔''

عراقی نے مدرسے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ قلندروں کے ساتھ ہو لیے اور سیاحت شروع کر دی۔ یہ ایک بار پھر بغداد گئے اور اپنے ماموں شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات کی۔ ماموں نے حکم دیا۔ ''عراقی! ہندوستان جاؤ۔''

عراقی نے قلندروں سے کہا۔ ''شیخ نے ہندوستان جانے کا حکم دیا ہے۔''

قلندروں نے جواب دیا۔ ''چلو، ہندوستان چلیں، ہمیں وہاں جانے سے کب انکار ہے۔''

اس کے بعد عراقی نے قلندروں کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ مہینوں بعد یہ لوگ ہندوستان میں داخل ہو گئے اور پہلے برصغیر کے مشہور شہر ملتان میں قیام کیا۔ ان دنوں ملتان میں بہاؤالدین زکریا ملتانی کا طوطی بول رہا تھا۔ عراقی

قلندروں کے ساتھ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں پہنچے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی کشش محسوس کی۔

عراقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''شیخ شناسا نظر آتے ہیں۔''

زکریا ملتانی نے پوچھا۔ ''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''میں شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا ہوں۔''

پیر ملتانی نے فرمایا۔ ''اور میں ان کا مرید اور ادنیٰ خادم ہوں اور انہی کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہوں۔'' دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

قلندروں نے جو یہ منظر دیکھا تو تنہائی میں کہا۔ ''عراقی! ہمارا خیال ہے کہ اب تم سیاحت نہیں کرو گے؟''

عراقی نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

حسین قلندر نے جواب دیا۔ ''ملتان شیخ تمہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور یہ تمہیں روک لے گا۔''

عراقی نے کہا۔ ''بے شک، میں خود بھی ملتانی پیر میں زبردست کشش محسوس کر رہا ہوں۔ میں یہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھاتا ہوں تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے دونوں پاؤں زمین سے پیوست ہو گئے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ انہیں اٹھاؤں اور تمہارا ساتھ دوں مگر زمین پاؤں پکڑے رکھتی ہے۔''

قلندر نے کہا۔ ''تو تم یہیں رہ جاؤ۔ ہم اپنی راہ لیں۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں اپنی کوشش کروں گا کہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن میں ملتان میں بے بس اور مجبور ہو رہا ہوں۔''

قلندروں نے کہا۔ ''عراقی! تمہیں جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کرلو۔ ہم ملتان میں زیادہ دن نہیں رک سکتے۔''

عراقی نے بہاءالدین زکریا سے اجازت چاہی۔ ''حضرت! اب اجازت دیجیے۔ میں دنیا کی سیاحت کو نکلا ہوں اور سیاحت جاری رکھنا چاہتا ہوں۔''

زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔ جاؤ لیکن تمہیں ایک نہ ایک دن یہاں آنا پڑے گا۔''

عراقی نے کہا۔ ''حضرت! ملتان نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ میرے ساتھی قلندر مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں سخت کشاکش میں ہوں، بولیے اب میں کیا کروں؟''

زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''عراقی! تم جا سکتے ہو لیکن میں نے تم سے جو کہہ دیا کہ تم کو یہاں واپس آنا ہے۔''

عراقی نے کہا۔ ''اگر آپ بلانا چاہیں گے اور بلائیں گے تو میں آجاؤں گا۔''

قلندر جلدی کر رہے تھے۔ ''عراقی! یا تو ساتھ چلو ورنہ ساتھ چھوڑ دو۔ اب ہم چلتے ہیں۔''

عراقی نے محسوس کیا۔ ان کے پاؤں چھوڑ دیے گئے ہیں اور وہ آزاد ہیں۔ اب قلندروں کا رخ دہلی کا تھا۔ عراقی بھی ان کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں چند دن رہ کر سومنات کا رخ کیا۔ اب قلندروں نے یہ بات صریح طور پر محسوس کر لی تھی کہ عراقی میں وہ پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ لیکن دل کی گداز یت میں زیادہ شدت آچکی تھی۔ عراقی قدم قدم پر یہی محسوس کرتے رہے کہ ملتان انہیں کھینچ رہا ہے۔

ابھی سومنات فاصلے پر تھا کہ مشرق سے اندھیرے کی چادر اٹھی اور ان کی طرف بڑھنے لگی۔ فضا میں پرند مغرب کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ مشرق سے اٹھنے والی سیاہی سورج کی شعاعوں سے روشن ہو گئی اور اس میں اڑتے بھاگتے پرند بڑا دلچسپ منظر پیش کر رہے تھے۔ عراقی نے قلندروں سے پوچھا۔ ''مشرقی فضا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''یہ آندھی ہے کالی آندھی۔ ہمیں آندھی آنے سے پہلے ہی پناہ گاہ کا انتظام کر لینا چاہیے ورنہ کہاں بھاگے پھریں گے۔''

اب تیز ہوا کے جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے جس سے ان کا توازن بگڑنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ جب آندھی نے ان کے وجودوں کو ہلا ڈالا اور تنکوں کی طرح انہیں اڑانا شروع کر دیا تو وہ سب بہت پریشان ہو گئے اور خدا

سے حفظ و امان میں رکھنے کی دعائیں مانگیں۔ آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ ایک قلندر کو کہیں اڑا لے گیا۔ دوسرے جھونکے نے ان سب کو ایک دوسرے سے منتشر کر دیا۔ عراقی نے بڑی کوشش کی کہ خود کو قابو میں رکھیں لیکن وہ بے قابو ہی رہے اور مغرب کی طرف بھاگتے ہی چلے گئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا گویا بہت سارے ہاتھ انہیں دھکیل رہے ہیں۔ ہوا کی شدت نے ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ ہوا کپڑوں میں گھسی جا رہی تھی۔ عراقی نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ ''قلندرو... !تم سب کہاں ہو؟ آواز دو میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟''

لیکن اس کا جواب ہوا کے جھکڑوں نے یہ دیا کہ انہیں زمین پر گرا دیا۔ عراقی زمین پر لڑھکنے لگے۔ ہوا انہیں کسی رولے کی طرح دور تک لڑھکائے چلی گئی۔

کافی دیر بعد طوفان تھما تو عراقی نے اپنے آس پاس طوفان کے تباہ کن اثرات دیکھے۔ درختوں کا جال سا بکھرا ہوا تھا جو جڑوں سے اکھڑ کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مکانوں کے تختے، چھپڑ وغیرہ نے زمین کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔ جانوروں کی لاشیں اور نیم مردہ مویشی ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ انسانوں میں جوان، بوڑھے، بچے یا تو مر چکے تھے یا سسک رہے تھے۔ عراقی نے ان میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملے۔ آخر عراقی نے ان زخمیوں کی مدد کرنا شروع کر دی۔ ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے اور زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر گاؤں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ وہاں ان کا علاج کیا جانے لگا۔

اب عراقی نے ایک بار پھر اپنے قلندروں کی تلاش شروع کی لیکن ان میں سے ایک بھی نہ ملا۔ یہ بہت پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ آخر دل نے مشورہ دیا کہ سومنات کی طرف چل وہیں تیرے ساتھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے سومنات کا رخ کیا اور قلندروں کی تلاش میں دور تک چلے گئے۔

آخر کسی نے کان میں کہا۔ ''عراقی! تو کس کی تلاش میں سرگرداں ہے؟ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے۔ اب وہیں واپس جا جس سرزمین نے تیرے پاؤں پکڑ لیے تھے۔''

عراقی نے لوگوں سے پوچھا۔ ''بھائیو...! ملتان جانا ہے۔ مجھے کس طرف سفر کرنا چاہیے؟''

ایک نے ایک مغربی راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''یہ سڑک پیچ و خم کے بعد تمہیں ملتان پہنچا دے گی۔''

عراقی تن تنہا اس سڑک پر چل پڑے۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟ بس بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کوئی انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یہ کھنچے چلے جا رہے تھے۔ کافی دنوں بعد دور ہی سے ملتان کے آثار دکھائی دیے۔ کسی راہ گیر سے پوچھا۔ ''بھائی یہاں سے ملتان کتنی دور ہے؟''

راہ گیر نے جواب دیا۔ ''اب ملتان دور کہاں رہا؟ وہ سامنے رہا ملتان۔''

عراقی فرطِ شوق میں ملتان کی طرف بڑھے اور یہ سفر کس طرح طے ہوا انہیں کچھ ہوش نہ تھا۔

ہوش جو آیا تو خود کو بہاء الدین زکریاؒ کے سامنے کھڑا پایا۔

بہاء الدین زکریاؒ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''عراقی! کہاں، آخر آ گئے نا...؟'' عراقی نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔

''زمانہ اور زمانے کے ساتھ ہی میری زندگی میرا ساتھ چھوڑ دے یہ ممکن ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ میں تجھ سے منحرف ہو جاؤں اور تجھ سے گریز کروں۔ میں تیری مہربانیوں کا اسیر ہوں۔ تیری مہربانی اور نظر ہر تعریف سے بالا ہے۔ شیرِ مادر (ماں کا دودھ) کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو لیکن تیری مہربانی اور نظر اپنی وقعت اور قیمت میں سو گنا زیادہ ہیں۔''

پیر ملتانی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور تخلیے میں لے گئے۔ فرمایا۔ ''عراقی! تو بہت گھوم پھر لیا اب چلہ کشی کر۔''

عراقی تابعدار فرماں بردار بن کر چلے میں بیٹھ گئے۔ گیارھویں دن ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ اندر بے اختیار رو رو کر پرسوز لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''ساقی کا پہلا جام ہی ایسا تھا جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا

اس کی آنکھوں کی مستی نے شراب میں کچھ زیادہ ہی اثر بھر دیا ہے

وہ جب کسی عیش و عشرت کے دلدادہ کو بے خود کرنا چاہتے ہیں تو

اس کی خوشی میں بے خودی کی شراب انڈیل دیتے ہیں

جب وہ کسی عاشق کی مرنج جاں کو قید کرنا چاہتے ہیں
تو وہ ان زلفوں کو کام میں لاتے ہیں جو ہمیشہ فتنوں کی تلاش میں رہتی ہیں
ساری دنیا کے آلام و مصائب کو جب یک جا کیا گیا
تو اس کا نام عشق قرار پایا
افسوس کہ تو اپنا راز خود ہی کھول دیتا ہے اور
عراقی کو خوامخواہ بدنام کرتا ہے۔''
عراقی حجرے میں لہک لہک کر اشعار سنا رہے تھے اور ان کی آواز باہر پیر ملتانی کے مریدوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ سہروردیہ سلسلے میں سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مریدوں نے حضرت زکریا ملتانی سے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! ہمارے یہاں تو سماع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن عراقی حجرے میں یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہیں منع کیا جائے۔''
حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ ''ہاں دوسروں کے لیے سماع ممنوع ہے لیکن عراقی کے لیے اجازت دی گئی ہے۔'' مرید خاموش ہو گئے۔
اب عراقی کی حالت کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔ چند دنوں بعد حضرت زکریا ملتانی کے ایک مرید خرابات کے پاس سے گزرے تو انہوں نے نشے میں بدمست رندوں کو وہ غزل گاتے سنا جو عراقی حجرے میں لہک لہک کر سنا چکے تھے۔
مرید نے یہ واقعہ پیر و مرشد کو سنا دیا کہا۔ ''حضرت! اب تو عراقی کا کلام رندوں تک پہنچ چکا ہے۔''
حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا۔ ''عراقی کا کام تمام ہوا۔''
اس کے بعد عراقی کو طلب کیا اور خلوت میں لے جا کر پوچھا۔ ''عراقی! وہ مناجات جو حجرے میں کی گئی تھی، وہ وہاں سے نکل کر خرابات تک کس طرح پہنچ گئی؟''
عراقی جواب دینے کے بجائے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگے۔ حضرت زکریا ملتانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی دعائیں دیں۔ آپؒ نے اپنا خرقہ انہیں پہنا دیا اور اپنی بیٹی کا نکاح پڑھا دیا۔ عراقی اپنے پیر و مرشد اور خسر کے پاس رہنے لگے اور یہاں پچیس سال گزار دیے۔

☆☆☆

حضرت زکریا ملتانی نے وصال سے پہلے انہیں اپنا خلیفہ اور جانشین بنا دیا لیکن عراقی مغلوب الحال تھے۔ انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ وہ شعروں میں اپنی کیفیات کا برملا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کے مریدوں کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے عراقی پر زور دیا۔ ''عراقی! یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے، تم شاعری چھوڑ دو۔''
عراقی نے جواب دیا۔ ''مجھے میرے مرشد نے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لیے شاعری چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں شاعری نہیں چھوڑ سکتا۔''
مریدوں نے افسوس سے کہا۔ ''اگر تم مسلک سہروردیہ پر قائم نہیں رہ سکتے تو پھر تم خلیفہ بھی نہیں بن سکتے اس لیے یہ جگہ اس کے لیے خالی کر دو جس نے مسلک سہروردیہ کو جزو ایمان سمجھ رکھا ہے۔''
عراقی نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ کر سکتا ہوں اور ایسا کروں گا۔ میں عنقریب یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔''
آخر ایک دن آپ نے عدن کی راہ لی۔ عدن کا حکمران عراقی کا بے حد مداح تھا اور اس نے کئی بار ان کو بلوایا تھا چنانچہ جب عدن کے سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ عراقی اس کے پاس آ رہے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے دربار کے علما اور صلحا کو جمع کیا اور انہیں عراقی کی تشریف آوری کا مژدہ سنایا۔ آخر میں کہا۔ ''عراقی آ رہا ہے تم سب کو اس کا استقبال کرنا ہے۔''
عراقی عدن پہنچے تو انہیں استقبال کرنے والوں کا عظیم الشان ہجوم نظر آیا۔ استقبال کرنے والوں میں سلطان خود بھی شامل تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر عراقی سے بغل گیر ہوا اور بوسہ دیا۔ استقبال کے بعد یہ لوگ شاہی قصر کی طرف چل پڑے۔ سلطان نے اپنے محل کے ایک حصے میں عراقی کو ٹھہرایا اور صبح شام ان کی خدمت میں حاضریاں دینے لگا۔ خاطر تواضع میں حد درجہ تکلف سے کام لیا۔ یہاں تک کہ عراقی کو شرم محسوس ہونے لگی۔ عراقی نے خانۂ کعبہ کی زیارت کا منصوبہ

بتایا۔ سلطان سے کہا۔ ''جناب والا! میں خانۂ کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہوں اگر آپ لوگ چند دنوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''واہ جناب! آپ کو تنہا کیوں چھوڑا جائے۔ ہم سب آپ کے عقیدت مندوں میں داخل ہیں۔ آپ خانۂ کعبہ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے ہم سب آپ کے گرد و پیش پروانوں کی طرح موجود رہیں گے۔''

عراقی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے مجھ کو اکیلا ہی جانا چاہیے۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''نہیں حضرت! آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔''

عراقی نے مزید کچھ کہنا فضول جانا اور ایک دن سلطان کو بتائے بغیر کعبہ چلے گئے۔ سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے خود بھی خانۂ کعبہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ کچھ دور گیا بھی مگر پھر معلوم نہیں کیا سوچا کہ راستے سے واپس آگیا۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے بے انتہا مال و زر آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور ہدایت کردی کہ پوری کوشش کی جائے کہ عراقی، سلطان کا یہ نذرانہ قبول کرلیں لیکن اگر وہ نہ مانیں تب پھر اس مال و زر کو ان کے معتقدین میں تقسیم کردینا۔ واپس ہرگز مت لانا۔

خانۂ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ان کا حال ہی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ انہوں نے احرام باندھ کر ایک شاندار قصیدہ کہہ ڈالا۔ اس کے بعد جب خانۂ کعبہ پر نظر پڑی تو اس کے انوار اور تجلیات نے انہیں کچھ ایسا مسحور کیا کہ ایک دوسرا قصیدہ بھی کہہ ڈالا۔

سلطان کے آدمیوں نے انہیں وہ مال و زر پہنچایا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور سختی سے کہا۔ ''میں مال و زر سے دور بھاگتا ہوں اور مال و زر میرا پیچھا کرتے ہیں۔''

یہاں سے آپ نے مدینے کا سفر شروع کیا۔ مدینے میں داخل ہوتے ہی آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک رات میں پانچ قصیدے کہہ ڈالے۔ طبیعت کسی طرح قابو میں نہیں آتی تھی۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری دی اور شدتِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

مدینے سے نکل کر اقصائے روم (ترکی) کی سیاحت کو چل پڑے۔ قونیہ پہنچے اور شیخ محی الدین عربیؒ کے خلیفہ اور جانشین شیخ صدرالدینؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں عراقی کو بڑی دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہیں انہوں نے تصوف کی مشہور کتاب خصوص الحکم کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی مشہور کتاب لمعات تصنیف کی۔ اس کتاب کو صدرالدین نے پڑھا تو فرطِ جوش میں پکار اٹھے۔

''اے فخرالدین عراقی! تو نے تو اہلِ فتوت (جوان مردوں) کی باتیں سب پر کھول کر رکھ دیں۔''

اس کتاب نے اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اشعۃ اللمعات اور مولانا صائن الدین علی ترکہ اصفہانی نے ضوء اللمعات کے ناموں سے اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کتاب کی اس طرح تعریف کی گئی۔

''اربابِ بصیرت پر مخفی نہیں کہ لمعات فیض کا ایک قطرۂ سحاب ہے جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے دریائے معرفت سے فخرالدین عراقی کی زبان پر ٹپکا۔''

☆☆☆

قونیہ کا امیر معین الدین، عراقی کا بے حد معتقد ہوچکا تھا۔ وہ ہر وقت آپ کی دل جوئی کی فکر میں رہتا۔ اس نے بارہا آپ پر زور دیا کہ۔ ''عراقی! اپنے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرکے خانقاہ بنالیجیے۔''

کچھ عرصے تو آپ انکار کرتے رہے لیکن پھر توقات نامی جگہ میں خانقاہ بنوالی۔

ایک دن امیر معین الدین ان کی خدمت میں کچھ نقد رقم لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے یہ رقم نہیں لی، انکار کردیا۔ امیر معین الدین کو بڑا دکھ پہنچا اور افسوس سے کہا۔ ''حضرت! آپ نہ تو مجھ سے کوئی خدمت لیتے ہیں اور نہ ہی میری طرف التفات فرماتے ہیں؟''

عراقی نے ہنس کر امیر معین الدین کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اے امیر! میرے لیے زحمت نہ کیا کر۔ التفات کا وقت

آنے دے تو خود دیکھ لے گا کہ میں تیرے لیے کیا کروں گا۔''
ایک دن امیر ان کی ملاقات کو آیا تو انہیں نہ پاکر ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ باہر کچھ شور وغل ہو رہا تھا۔ امیر ادھر گیا تو دیکھا کہ چند لڑکوں نے ان کے گلے میں رسی ڈال رکھی ہے اور انہیں ادھر ادھر دوڑا بھگا رہے ہیں۔ تماشائیوں نے عراقی پر طنز کیا مگر امیر نے انہیں ڈانٹ دیا اور کہا۔ ''تم لوگ عراقی کو نہیں سمجھ سکتے۔''
امیر نے عراقی کو لڑکوں سے رہائی دلائی اور خانقاہ میں واپس لایا۔ یہاں لاکر پوچھا۔ ''حضرت! یہ سب کیا تھا؟''
آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے ان کی خوشی کا سامان کر دیا۔''
امیر نے کہا۔ ''حضرت! لوگ آپ پر ہنستے ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''گویا میں نے انہیں بھی خوش کر دیا۔'' امیر خاموش ہو گیا۔
کئی دن بعد امیر دوبارہ خانقاہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ عراقی دو دن سے غائب ہیں، کچھ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔ امیر نے ہر طرف اپنے آدمی دوڑا دیے لیکن اکثر مایوس واپس آئے کہ ان کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ چوتھے دن چند آدمیوں نے خبر دی کہ ایک پہاڑ کے دامن میں موجود ہیں۔ امیر معین الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ مذکورہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔ انہوں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ عراقی ننگے پاؤں، ننگے سر پسینے میں شرابور برف کے تودوں پر رقص کر رہے تھے۔ امیر نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''عراقی! میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''
عراقی نے پوچھا۔ ''کہاں...... کہاں واپس لے جائے گا؟''
امیر نے جواب دیا۔ ''آپ کی خانقاہ میں۔ توقات...... واپس چلیے۔''
آپ نے اپنے شرابور جسم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اے امیر! تو میرا حال دیکھ رہا ہے۔ میں جس آگ میں پھنک رہا ہوں اس کو یہ برف بھی سرد نہیں کر سکتی۔''
امیر نے عرض کیا۔ ''میں آپ کو واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ آپ خانقاہ واپس چلیے۔''
عراقی نے جواب دیا۔ ''امیر! مجھے یہیں رہنے دے، میں تیرا شکر گزار رہوں گا۔''
امیر نے اصرار کیا۔ ''حضرت! میں آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ خانقاہ واپس لے جاؤں گا۔''
عراقی امیر کے اصرار کے آگے مجبور ہو گئے اور خانقاہ واپس چلے گئے۔ اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ امیر معین الدین پر شاہی عتاب نازل ہوا اور حکومت کی طرف سے ضبطی املاک کے احکام صادر ہو گئے۔ ان احکام پر اتنی جلدی عمل درآمد ہوا کہ لوگوں کو بڑی عبرت ہوئی۔ امیر معین الدین وقتی طور پر کسی شناسا کے گھر چلا گیا لیکن دو ایک دن بعد اس شناسا نے بھی معذرت کر لی اور کہا۔ ''جناب! آپ کہیں اور چلے جائیں کیونکہ آپ حکومت کے معتوب ہیں، میں بھی حکومت کی نظر میں آجاؤں گا۔''
امیر نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے آج شام کو میں چلا جاؤں گا تو فکر مند نہ ہو۔''
رات کی تاریکی میں امیر نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور خانقاہ میں چلا گیا۔ آپ نے اس کی بڑی دلجوئی کی اور فرمایا۔
''تو یہیں میرے ساتھ رہ۔''
امیر نے جواب دیا۔ ''نہیں شیخ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ میں کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔''
عراقی کو بڑا دکھ ہوا۔ پوچھا۔ ''میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''
امیر نے اپنے سامان میں سے جواہرات کا ذخیرہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کہا۔ ''شیخ! اسے آپ اپنے پاس رکھیں اور جس طرح چاہیں کام میں لائیں اور اگر موقع ملے تو میرا ایک کام کر دیجیے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''اپنا کام بتا، کون سا کام ہے؟''
امیر نے جواب دیا۔ ''شیخ! میرا ایک بیٹا مصر میں قید ہے۔ آپ اس کی رہائی کی کوشش کیجیے۔ اگر وہ رہا ہو جائے تو اس کو اپنے پاس رکھیے اور اس کو نظروں سے اوجھل تک نہ ہونے دیجیے۔ اس کو اپنا پرانا خرقہ پہنا دیجیے اور اس کو موقع نہ

دیجیے کہ وہ اس خرقے کو ضائع کرے۔ یہ دنیا کچھ بھی نہیں۔ میں دنیا سے مایوس ہو چکا ہوں اور اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ میرا پیارا دنیا میں ضائع ہو جائے۔''

امیر پر گریہ طاری ہو گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ آپ بھی رونے لگے اور گلوگرفتہ آواز میں اس کو تسلیاں دیتے رہے۔ امیر چلا گیا۔ آپ نے جواہرات کا ذخیرہ احتیاط سے رکھ لیا۔ امیر معین الدین کے بعد اس علاقے کا امیر خواجہ شمس الدین کو مقرر کیا گیا۔ اسی عہد کے ایک دوسرے بزرگ مولانا امین الدین عراقی سے بڑی محبت کرتے تھے اور نیا امیر خواجہ شمس الدین، مولانا امین الدین کا عقیدت مند تھا۔ خواجہ شمس الدین جب اپنا عہدہ سنبھالنے توقات آیا تو اس کے ساتھ مولانا امین الدین بھی آ گئے اور توقات میں داخل ہوتے ہی عراقی سے ملنے چلے گئے۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور کچھ دیر بعد سیر و سلوک پر گفتگو شروع ہو گئی۔ دن گزرا رات آئی اور رات سے پچھلی رات ہوئی مگر دونوں باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس طرح مولانا امین الدین عراقی کے پاس تین دن تک مقیم رہے۔ چوتھے دن امیر خواجہ شمس الدین کے پاس واپس پہنچے۔

امیر نے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! آپ نے بڑا انتظار کروایا۔''

مولانا امین الدین نے جواب دیا۔ ''خواجہ! افسوس کہ تو عراقی سے نہیں ملا۔ میں نے اس جیسا شخص زندگی بھر نہیں دیکھا وہ جس موضوع پر بھی زبان کھولتا ہے سمندر کی طرح اپنا علم بہا دیتا ہے۔ میں تین دن عراقی کے پاس رہا اور اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر میں ان کے پاس تین سال بھی رہتا تو یوں ہی تشنگی محسوس کرتا اور یہ تین سال بھی کچھ نہیں، شاید پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی میں یوں ہی تشنہ رہتا۔ وہ تو عجیب و غریب آدمی ہے۔ میں اس کی تعریف تک نہیں کر سکتا۔''

خواجہ شمس الدین نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو مجھ کو بھی ان بزرگ سے ملوا دیجیے۔''

امین الدین نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو عراقی کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔''

خواجہ شمس الدین نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔ کسی وقت بھی عراقی کے پاس چل سکتا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ میں عراقی کی دعوت کروں اور وہ اپنے پاک قدم سے میرے غریب خانے کو زینت بخشیں۔''

مولانا امین الدین نے کہا۔ ''عراقی سے آپ کی طرف سے درخواست تو کر سکتا ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اس دعوت کو قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔''

خواجہ نے کہا۔ ''آپ ان سے درخواست تو کیجیے ممکن ہے قبول کر لیں۔''

مولانا امین الدین عراقی کے پاس چلے گئے اور صاف صاف عرض کیا۔ ''عراقی! میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں، امید ہے آپ میری درخواست ٹھکرائیں گے نہیں۔''

عراقی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مولانا! آپ درخواست کیوں کریں حکم دیجیے۔ میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں۔''

مولانا امین الدین نے فرمایا۔ ''خواجہ شمس الدین غائبانہ ہی آپ کا مداح اور عقیدت مند ہو چکا ہے۔ اس نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر بعد میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی دعوت کر کے آپ کو مدعو کیا جائے چنانچہ اس نے آپ کی دعوت کر دی ہے اور میں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کو دعوت میں لے چلنے کے لیے رضامند کر لوں گا۔ اب آپ چاہیں گے تو میں سرخ روئی حاصل کر لوں گا اور نہیں چاہیں گے تو میں شرمندگی اٹھانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ آپ جس میں خوشی محسوس کریں مجھے بتا دیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''عراقی دوسروں کی خوشی کی خاطر زندہ ہے۔'' عراقی نے کہا۔

مولانا نے جواب دیا۔ ''میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ اس کی دعوت پر تشریف لے چلیں۔''

عراقی نے کہا۔ ''میں ضرور چلوں گا۔''

مولانا امین الدین نے خواجہ شمس الدین کو خوش خبری سنائی کہ عراقی نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے چنانچہ خواجہ نے عراقی کے لیے ایک خلعت اور اونٹ روانہ کیا اور اس اونٹ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنہیں عراقی کے آس پاس ادب سے چلنا

تھا۔

دوسری طرف خواجہ شمس الدین نے معززین اور مولانا امین الدین کو ساتھ لیا اور آپ کے استقبال کو آگے بڑھا۔ جب دور سے شیخ عراقی کی سواری نظر آئی تو خواجہ شمس الدین اپنے ہمراہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور نہایت احترام سے عراقی کا استقبال کیا۔ عراقی کی نظر جوں ہی مولانا پر پڑی بے اختیار فرمایا۔ ''مولانا! مجھ کو یہاں تک لانے میں تمہارا ہی فتنہ کارفرما ہے۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ جس چیز کو فتنہ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لیے سعادت ہے۔''

خواجہ شمس الدین آپ کے قریب پہنچا اور عرض کیا۔ ''زہے نصیب کہ آپ تشریف لائے۔ یہ آپ کا ایک ایسا کرم ہے جس کا میں شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتا۔''

یہ لوگ امیر کے محل میں گئے۔ عراقی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور سلوک پر گفتگو شروع ہوگئی۔ شیخ عراقی نے بولنا شروع کیا تو ہر کوئی گونگا ہو گیا۔ گفتگو کی تاثیر اور گرمی نے سامعین کے دلوں کو پگھلا دیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ خواجہ شمس الدین کا بہت برا حال تھا۔ حاسد یہاں بھی موجود تھے۔ کچھ عرصے بعد ان حاسدوں نے حکومت کو مطلع کیا کہ سابق امیر معین الدین کی دولت خانقاہ میں شیخ عراقی کے پاس موجود ہے۔ حکومت نے خواجہ شمس الدین کو حکم دیا کہ شیخ عراقی سے امیر معین الدین کی دولت زبردستی واپس لے لی جائے۔

خواجہ شمس الدین کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ وہ اس پر عمل درآمد کس طرح کرے گا۔ وہ خانقاہ میں تلاشی کی نیت سے داخل ہونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ خواجہ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کیا کرے۔ آخر وہ تنہا خانقاہ پہنچا اور شیخ عراقی سے کہا۔ ''شیخ! اس وقت میں انتہائی نازک اور اہم مقصد سے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''میں تیری مشکل سے واقف ہوں۔ حاسد تیرا ابھی پیچھا کر رہے ہیں۔''

خواجہ نے عاجزی سے پوچھا۔ ''حضرت! بتایئے میں کیا کروں؟ میری تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی کہ میں حکومت کے حکم کا آپ سے ذکر کر سکوں۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''امیر! تو نہ گھبرا ویسے وہ بات درست ہے۔ امیر معین الدین کے جواہرات امانتاً میرے پاس موجود ہیں۔ امیر کا بیٹا مصر میں قید ہے۔ میں اسے رہا کرواؤں گا اور امیر کے جواہرات اس کے حوالے کر دوں گا۔''

خواجہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس پر حکومت کے بدباطن آپ کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھیے۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''خواجہ! حکومت کے آدمی مجھے گرفتار کر سکتے ہیں کر لیں گرفتار لیکن میں امیر معین الدین کی امانت حکومت کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ جس کی ہے اسی کو دی جائے گی۔''

خواجہ نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! مجھ پر رحم فرمائیں کچھ کریں ورنہ اس خانقاہ میں جو کچھ ہوگا بہت برا ہوگا۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''خواجہ! تو کیوں فکر کرتا ہے۔ میں عنقریب اس خانقاہ سے چلا جاؤں گا اور مصر جا کر امیر معین الدین کے بیٹے کی رہائی کی کوشش کروں گا۔ حکومت کا میرے خلاف حکم آیا ہی اس لیے ہے کہ میں تو قات چھوڑ کر مصر چلا جاؤں۔ یہی مشیتِ ایزدی ہے اور یہی حکم الٰہی۔''

خواجہ شمس الدین کی آنکھیں بھر آئیں، بولا۔ ''میں یہ بات اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا تھا۔ میں آپ کی بے حرمتی بھی گوارا نہیں کر سکتا اس لیے بصد ادب آپ سے درخواست ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

عراقی نے جواب دیا۔ ''میں آج ہی تو قات کو چھوڑ رہا ہوں اور مصر جا رہا ہوں۔''

خواجہ مطمئن ہو کر اپنے محل واپس چلا گیا اور آپ نے اسی وقت سامانِ سفر باندھا اور امیر معین الدین کی امانت لے کر مصر کا رخ کیا۔ دو مرید آپ کے ساتھ تھے۔ مصر کی خانقاہ صالحیہ میں قیام کیا۔ انہوں نے سلطان مصر سے ملنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ ملاقات کی کوئی صورت نکلتی ہی نہیں تھی۔ آخر عاجز آکر سلطان کے محل کے دروازے پر پہنچے اور دربان سے اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ دربانوں نے روک لیا اور پوچھا۔ ''تو ہے کون؟ سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس ایک شخص کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطان کے ذریعے اس شخص تک پہنچادی جائے۔''

دربانوں نے سلطان کے حاجب کو مطلع کیا کہ ایک مست قلندر سلطان سے ملنا چاہتا ہے اور تقریب ملاقات میں جو کچھ کہہ رہا ہے، دربان نہیں سمجھ سکتے۔

حاجب نے جواب دیا۔ ''اسے حاضر کیا جائے۔''

دربان نے عراقی کو حاجب کے سامنے پہنچادیا۔ حاجب نے پوچھا۔ ''ہاں تو اب بتا، تو سلطان سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

عراقی نے جواب دیا۔ ''میرا نام فخرالدین عراقی ہے۔ میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔ بادشاہ کو میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''

حاجب نے حیرت سے کہا۔ ''عراقی! یعنی تو فخرالدین عراقی ہے؟ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا بھانجا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں عراقی ہوں شیخ کا بھانجا۔''

حاجب احتراماً کھڑا ہوگیا۔ بولا۔ ''حضرت! معاف کیجیے گا دربان آپ کو کیا پہچانیں گے۔ میں ابھی سلطان سے ملواتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے، آپ کو کون نہیں جانتا۔'' عراقی خاموش رہے۔

حاجب نے سلطان کو مطلع کیا کہ ''مشہور صوفی اور باکمال شاعر فخرالدین عراقی ہم سب کی خوش قسمتی سے ملاقات کو حاضر ہوا ہے۔ باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

سلطان نے حکم دیا۔ ''فوراً حاضر کیا جائے۔''

حاجب عراقی کو اپنے ساتھ لے کر سلطان کے پاس پہنچ گیا۔ سلطان آپ کے مرتبے سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ پوچھا۔ ''تیرا مجھ سے کیا کام ہے؟''

عراقی نے جواہرات کی پوٹلی بادشاہ کے سامنے رکھ دی اور خاموش کھڑے ہوگئے۔ سلطان نے پوٹلی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

عراقی نے جواب دیا۔ ''امانت...... ایک شخص کی امانت ہے جو سلطان کے ذریعے ہی پہنچائی جاسکتی ہے۔''

سلطان نے حاجب کو حکم دیا۔ ''پوٹلی کھولی جائے۔''

حاجب نے پوٹلی کھولی تو اس میں سے بیش قیمت جواہرات کی چمک نے آنکھیں چکاچوند کردیں۔ سلطان حیرت زدہ دیکھتا رہ گیا۔ بولا۔ ''حضرت! یہ جواہرات کس کے ہیں اور میرے پاس کیوں لائے گئے؟''

عراقی نے پوری روداد سنادی اور کہا۔ ''میں اس امانت کی وجہ سے بہت پریشان تھا لیکن اب میں خوش ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوگئی اور صحیح شخص تک پہنچ گیا۔''

سلطان نے حیرت سے کہا۔ ''عراقی! میں آپ کی ایمان داری پر حیرت زدہ ہوں۔ جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی مجھے بتایا۔ قیدی کے باپ نے یہ جواہرات آپ کو دیے تھے۔ آپ انہیں اپنے تصرف میں لاسکتے تھے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آپ نے کس طرح سمجھ لیا کہ امیر معین الدین نے یہ جواہرات اپنے بیٹے کے لیے دیے تھے؟''

عراقی نے جواب دیا۔ ''سلطان! میں دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتا ہوں۔ مال و متاع انسان کو کہیں کا بھی نہیں رکھتا۔ یہ جواہرات میرے کس کام کے، ان سے ایک امیر زادہ ہی مطمئن ہوسکتا ہے۔ ایک درویش کا اپنا خرچ ہی کتنا۔ متاعِ دنیا جتنی کم ہوگی فقیر کو اتنی ہی آسودگی ملے گی۔''

سلطان آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے پاس ادب سے بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''یہ گستاخی ہے کہ میں آپ سے دور اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں۔''

آپ بڑی دیر تک سلطان کے سامنے تقریر کرتے رہے۔ سلطان دنیا و مافیہا سے غافل آپ کی باتیں سنتا رہا۔ آخر سلطان نے فرمان جاری کردیا۔ ''امیر معین الدین کے بیٹے کو رہا کردیا جائے۔''

لڑکے کو رہا کر کے سلطان کے پاس حاضر کردیا گیا۔ بادشاہ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آیا اور انعام واکرام سے

نواز دیا۔
ترک سلطان نے عراقی کو محل میں ٹھہرالیا اور مؤدبانہ گزارش کی: ''حضرت! میں آپ کو اپنی سلطنت کا شیخ الشیوخ بنانا چاہتا ہوں۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیا یہ بہت ضروری ہے؟''
سلطان نے جواب دیا۔ ''ہاں میں بہت ضروری سمجھتا ہوں' آپ کی موجودگی سے میری حکومت کو چار چاند لگ جائیں گے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں سلطان کی خوشی کے لیے شیخ الشیوخ کا منصب قبول کرلوں گا۔''
سلطان نے کہا۔ ''تو میں اس تقریب میں شرکت کے لیے سب کو دعوت دے دوں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''جیسی سلطان کی مرضی۔''
سلطان نے اسی وقت تقریباً چھ ہزار علما اور صوفیا کو شیخ الشیوخ کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی۔
سلطان نے موعودہ دن ایک خاص اہتمام کیا۔ عراقی کو بڑے اعزاز کے ساتھ خلعت اور طیلسان پہنایا گیا اور ایک جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ سلطان نے اعلان کر دیا۔ ''اس جلوس میں عراقی کے سوا ہر شخص پیدل چلے گا۔ فخر الدین عراقی گھوڑے پر سوار ہوں گے، تمام صوفیا، علما اور امرا ان کے ہم رکاب پیدل چلیں گے۔''
عراقی نے سلطان سے کہا۔ ''سلطان! دوسروں کو بھی گھوڑوں پر سوار ہونے کی اجازت دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح موجودہ صورتِ حال میں، میں آزمائش میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''
سلطان نے جواب دیا۔ ''شیخ! یہ عزت منجانب اللہ ہے اور جو چیز اللہ کی طرف سے ہو اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔'' شیخ عراقی خاموش ہو گئے۔
عراقی خلعت وطیلسان پہن کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور شریک جلوس صوفیا، علما اور امرا سلطان کے حکم سے عراقی کے ہم رکاب پاپیادہ چلے۔ عراقی نے اپنے آس پاس معززین کو پیدل چلتے دیکھا تو اپنی عظمت اور توقیر کی وجہ سے نفس میں غرور کا غلبہ محسوس کیا۔ انہوں نے اضطراری حالت میں دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے آگے رکھ لیا، گھوڑے سے اتر کر زمین پر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد دستار کو دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا۔
حاضرین نے ان کا مذاق اڑایا۔ ''تعجب ہے سلطان نے اس دیوانے کو شیخ الشیوخ بنا دیا۔ آخر اس میں خاص بات کیا ہے؟''
ایک عالم نے کہا۔ ''مجھے تو اس میں علم بھی نظر نہیں آتا۔ سلطان نے اس میں ایسی کیا چیز دیکھ لی جو ان کا اتنا والہ وشیدا ہو رہا ہے۔ میری تو عقل کام کر ہی نہیں رہی ہے۔''
سلطان نے اپنے وزیر سے کہا۔ ''ذرا شیخ سے معلوم تو کرو کہ انہوں نے دستار اور طیلسان کو اتار کر زین کے پاس کیوں رکھ دیا تھا اور خود گھوڑے سے کیوں اتر پڑے؟''
وزیر نے جب یہی سوال عراقی سے کیا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''تم سلطان کو بتا دو کہ اس نے جو عزت اور احترام بخشا ہے اس نے میرے نفس میں تکبر اور غرور پیدا کر دیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس تکبر اور غرور کو شرمندہ اور خوار کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کے بغیر سرکش نفس قابو ہی میں نہ آتا۔''
وزیر نے آپ کے جواب سے سلطان کو مطلع کیا تو بادشاہ نے حکم دیا۔ ''جلوس چلتا رہے۔''
جلوس اسی شان سے رواں دواں رہا۔ آخر جب یہ تقریب اختتام کو پہنچی تو خلوت میں سلطان نے خود سوال کیا۔ ''اے شیخ! آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''سلطان! افسوس کہ تجھ کو حال کی خبر ہی نہیں۔''
سلطان نے کہا۔ ''پھر بھی میں آپ کی زبان سے اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''سلطان! اس وقت میں اپنے نفس کا غلبہ محسوس کر رہا تھا اور نفس کو اس طرح قابو میں لایا جاسکتا تھا کہ لوگ اس پر ہنسیں اس کا مذاق اڑائیں اور اس کو شرمندہ کریں۔''

سلطان نے فرطِ عقیدت سے کہا۔ ''شیخ! آپ نے میرا دل اپنی مٹھی میں کرلیا ہے۔ بلاشبہ آپ نہایت عظیم انسان ہیں۔''

سلطان نے ان کے وظیفے میں اضافہ کر دیا۔

آپ کے مزاج کی آشفتگی اور بے قراری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ شیخ الشیوخ ہو جانے کے باوجود آزادانہ بازاروں، گلیوں، سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے اور اب بھی یہ حال تھا کہ حسن انہیں بے قابو کر دیتا۔ آپ اگر کسی حسین چیز کو دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے اور یہاں تک کہ اپنے آپ میں نہ رہتے۔ دوسرے لوگ آپ کا مذاق اڑاتے۔ جب یہ کسی بازار سے عامیانہ گزرتے تو حاسد انہیں دیکھ کر طنزاً کہتے۔ ''دیکھنا تو بے چارہ شیخ الشیوخ کیسا رواں دواں ہے۔''

ایک حاسد عالم نے کہا۔ ''میاں زمانے کی ناقدری اسی کو کہتے ہیں کہ ایک دیوانہ شیخ الشیوخ بن گیا اور فرزانہ دور کھڑا حسرت و عبرت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔''

کسی معتقد نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ لوگ جو چاہیں کہیں لیکن میں اس شخص کو دیوانہ نہیں کہہ سکتا۔ سلطان کچھ دیکھ کر ہی اس شخص کو اتنی قدر و منزلت پر مجبور ہیں۔ میں خود بھی اس میں ایک عجیب سی کشش اور شان محسوس کرتا رہتا ہوں۔''

عالم نے اسے جھڑک دیا۔ ''تو خود جاہل ہے تجھ کو کیا پتا کہ علم کیا ہے اور جہل کسے کہتے ہیں؟ کچھ بھی ہو جائے عالم اور دانا اس شیخ الشیوخ کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے۔''

معتقد نے جواب دیا۔ ''ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ ہاں جب خدا نے یہ عظمت اور شان ان کو عطا کر دی ہے تو اب کون ہے جو ان سے چھین لے۔''

ایک دن سلطان کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی کہ عراقی شیخ الشیوخ ہونے کے باوجود عامیوں کی طرح گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

سلطان نے جواب دیا۔ ''شیخ اتنے بڑے اور عظیم انسان ہیں کہ ہم میں ایک بھی ایسا نہیں جو ان پر تنقید کرے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہیں اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ شیخ کا کوئی بھی قدم غلط نہیں ہوتا۔''

اس کے بعد شیخ کو بلا کر عاجزی سے عرض کیا۔ ''شیخ! آج سے میں نے آپ کو یہ اختیار دیا کہ آپ میرے پاس جس وقت اور جہاں بھی آنا چاہیں، بے تکلف آزادی سے چلے آئیں۔ آپ کو کوئی بھی نہیں روکے گا حتیٰ کہ میری حرم سرا اور خواب گاہ میں بھی آپ ہر وقت آ جا سکتے ہیں۔''

چنانچہ اس اجازتِ خاص کے بعد سلطان کو جب بھی شیخ کی آمد کی اطلاع ملی، وہ ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آپ کے پاس آ جاتا تھا۔ اس کے ادب و احترام میں حد درجے غلو شامل ہو گیا تھا اور اس کی عقیدت خلوص اور اعتقاد کا مثالی نمونہ بن گئی تھی۔ لوگوں کو اس خبر نے اور زیادہ انگاروں پر لٹا دیا۔ آپ کی طبیعت مصر سے بھی اکتا گئی اور سلطان سے کہا۔ ''میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''شیخ! میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکوں گا۔''

آپ اپنی بات پر قائم رہے اور پھر کہا۔ ''سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے پھر وہی جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے عرض کیا نا کہ میں آپ کی مفارقت نہیں برداشت کر سکوں گا۔''

عراقی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''سلطان! میں شام جانا چاہتا ہوں۔''

سلطان لاجواب ہو گیا پوچھا۔ ''حضرت کتنے عرصے کے لیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شام کی طرف سے بوئے موانست آ رہی ہے۔ میں شام ضرور جاؤں گا۔''

سلطان نے عرض کیا۔ ''حضرت! مجھ میں اتنی ہمت و مجال کہاں کہ آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف روک لوں۔ آپ شام تشریف لے جائیں میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ واپس کب تک آئیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''واپسی کا علم خدا کو ہے میں نہیں جانتا، میں جو جانتا تھا بتا چکا کہ شام سے مجھے بوئے موانست

آ رہی ہے اور میں اس طرف کھنچا جا رہا ہوں۔"
سلطان نے کہا۔ "آپ شام تشریف لے جائیں، وہ میرے ہی زیرِ نگیں ہے۔"
اس کے بعد سلطان نے شام کے ملک الامراء کے نام فرمان جاری کیا کہ "شیخ الشیوخ شیخ فخر الدین عراقی تشریف لا رہے ہیں۔ ان کا شاندار استقبال کیا جائے اور انہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے کیونکہ یہ نادرۂ روزگار ہستی ہم سب کی عزت و احترام کی مستحق ہے۔"
عراقی نے مصر چھوڑ دیا اور شام روانہ ہو گئے۔ شام کے امیر الامراء نے ان کا شاندار استقبال کیا اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ آپ کا بیٹا کبیر الدین ملتان سے شام ملاقات کی غرض سے پہنچ گیا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور بیٹا سینے میں منہ چھپائے زار و قطار روتا رہا۔ آپ بھی رو دیے۔
بیٹے کو اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا۔ "میں تیری وجہ سے شام چلا آیا ورنہ ابھی مصر ہی میں ہوتا۔"
بیٹے نے کہا۔ "بابا جان! ملتان تشریف لے چلیے۔"
باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! شام کی مٹی میں انس و محبت کی بو پائی جاتی ہے۔ یہاں سے اور کہیں نہیں جا سکتا۔"
بیٹے نے عاجزی سے کہا۔ "آپ پھر واپس آ جائیے گا۔"
آپ نے جواب دیا۔ "اب اتنا وقت کہاں؟ جام عمر چھلکنے ہی والا ہے۔ زندگی کے ماہ و سال سے یہ لبریز ہو چکا ہے۔"
بیٹے نے عرض کیا۔ "میں نے تو اسی لیے حاضری دی تھی۔"
آپ نے جواب دیا۔ "اور میں نے تجھے اسی لیے بلایا تھا کہ آخری بار تجھے دیکھ لوں۔" بیٹا ایک بار پھر زار و قطار رونے لگا۔
چند دنوں بعد شیخ کے چہرے پر ورم نمودار ہوا اور آپ تنفس میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ علاج شروع ہوا لیکن آپ نے اپنے بیٹے کو بتا دیا۔ "بیٹے! یہ ورم مرض الموت ہے۔ کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ شام کی زمین سے انس و محبت کی بو محسوس ہو رہی ہے؟"
بیٹے کو ملال تھا کہ باپ سے ملاقات ہوئی بھی تو کس وقت۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں۔ ورم اور تنفس کی اذیت نے شیخ کو پانچ دن تک سونے نہیں دیا۔ آخری لمحوں میں بیٹے سے کہا۔ "کبیر الدین! یہ آیت تو نظر سے گزری ہوگی؟"
بیٹے نے پوچھا۔ "بابا جان کون سی؟ ارشاد فرمائیں۔"
آپ نے آیت پڑھی۔ ترجمہ "جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا اور ان میں کا ہر شخص ایسے مشغلے میں ہوگا کہ وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے گا۔"
اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ "بیٹے! خدا حافظ!"
آپ نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور سفرِ آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
وفات کے وقت آپ کی عمر اٹھاسی سال تھی۔ انہیں مشہور صوفی شیخ محی الدین عربی کے مزار کے برابر دفن کیا گیا اور یہ دونوں مزار محلہ صالحیہ میں واقع ہیں۔ محی الدین عربی کے مزار پر لکھا ہے "بحر العرب" اور شیخ فخر الدین عراقی کے مزار پر "بحر العجم" کندہ کر دیا گیا۔ گویا عرب اور عجم کے دو عظیم علمی اور روحانی سمندر دو دو گز زمین میں سما گئے اور ان دونوں سمندروں کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے۔

ذکارِ ابرار۔ محمد غوثی شطاری۔ دربارِ اکبری مولانا محمد حسین آزاد۔
انوار الصفا۔ محمد خصلت حسین صابری۔ صوفیائے نقشبند۔ سید امین الدین۔
انوار الاصفیا۔ غلام علی اینڈ سنز۔ سکینتہ الاولیا۔ داراشکوہ

احساس سرشاری میں دنیا کو فراموش کرنے والے ایک جوڑے کی اڑان

بے وفا

یاسمین فرحت

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس سے شدید محبت کرتا ہے اسے صرف اور صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اس میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کرسکتا مگر... جب اسے یہ شراکت مجبوراً برداشت کرنی پڑجائے تو وہ اس سے فرار کے ہر ممکن طریقے پر غور کرتا ہے... خوش قسمتی سے اسے بھی ایک ایسا ہی طریقہ سوجھا تھا جس پر عمل کرکے اس نے لاٹھی بھی محفوظ کرلی اور سانپ کا سر بھی کچل دیا۔

قریب سے گزرنے والی کار کی روشنی کھڑکی سے اندر آئی اور چند لمحوں کے لیے مارون کے تاریک کمرے کو جگمگا گئی لیکن جلد ہی چاروں طرف وہی بھیانک تاریکی دوبارہ پھیل گئی۔ مارون نے ہلکی سی آہ بھر کر کرسی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرکے کچھ سوچنے لگا۔ ”افسوس میری! اس نے بڑبڑا کر کہا۔ ”میں تمہارے لیے کتنی اچھی، کتنی خوب صورت خبر لے کر آیا تھا۔“

پھر وہ کرسی سے اٹھا اور تاریکی میں ٹٹولتا ہوا ایک

طرف بڑھا تھوڑی سی کوشش کے بعد اس کا ہاتھ جانی پہچانی بوتل سے ٹکرایا۔ انتہائی ضرورت کے تحت اس نے بوتل کو فوراً اٹھایا۔

”اف!“ جونہی اس کے حلق سے تلخ رقیق اتر کر پیٹ میں گیا۔ ایک ایک رگ سلگ اٹھی۔ سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنے جسم میں حرارت دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سکون ملا، گھبراہٹ، بے چینی اور پریشانی دم توڑ گئی اسے یاد آگیا کہ بائیں ہاتھ میں اس نے جو کاغذ دبا رکھا ہے۔ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ اسے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف حفظ ہو چکا تھا۔ وہ اس کی مخصوص، ترچھی لیکن ستھری ہینڈ رائٹنگ سے واقف تھا۔ ہینڈ رائٹنگ ہی سے نہیں بلیو بلیک انک بھی اس کی شناسا تھی۔ وہ اس قلم کو بھی پہچانتا تھا جس سے یہ رقعہ لکھا گیا تھا۔ وہی قلم تھا جو اس نے پچھلے کرسمس پر میری کو دوسرے قیمتی تحائف کے ساتھ پیش کیا تھا۔

”میری!“ اس کے ذہن میں کسی نے چلا کر کہا اور دوسرے ہی لمحے رقعے پر لکھے ہوئے میری کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

”میں جیک کے ساتھ جا رہی ہوں، یہاں سے بہت دور۔ میں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا ہے، بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ ہماری شادی کو مردہ ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں۔ شاید اپنی بے حسی کے باعث تمہیں اس کا احساس نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے جانے کا دکھ ہوگا دکھ تو مجھے بھی ہے مگر مجبور ہوں اور صرف یہی نصیحت کر سکتی ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو زندگی کے اصولوں کو نظر انداز نہ کرو۔ مجھے دولت سے زیادہ تمہاری بھرپور محبت کی ضرورت تھی۔ تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچایا، کبھی کوئی تکلیف نہیں دی پھر بھی میں جیک کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی ہوں کیونکہ اس کے پاس مجھے وہ چیز مل گئی ہے جو میری ہر ممکن کوشش کے باوجود تم سے نہ مل سکی تھی۔ میں تمہیں بھی نہیں بھلا سکوں گی۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس فرنیچر اور کراکری کی فہرست تھی جو میری اپنے میکے سے لے کر آئی تھی اور اس وکیل کا پتا درج تھا جس تک میری کی ہدایت کے بموجب ہارون کو وہ سارا سامان پہنچانا تھا۔ اس کا جسم اچانک لرز اٹھا اور نہ جانے کیوں وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کھڑکی سے باہر اتھاہ تاریکی تھی۔ شاید کہر بھی گر رہی تھی۔ اس کا گھر ہمیشہ سے ایسا تھا کہ اس میں رہ کر سردی سے بچنا ناممکن تھا۔ اگر معقول قسم کی حرارت کا انتظام نہ کیا جاتا تو یہاں رہنے والا ہر شخص ٹھٹھر کر ختم ہو جاتا۔ اس نے ایک بار پھر شراب کی بوتل اٹھالی۔ شراب انڈیلتے ہوئے اچانک چھلک گئی اور کچھ اس کے کپڑوں اور کچھ میری کے رقعے پر پڑی۔ کپڑوں کو نظر انداز کر کے وہ جلدی جلدی رقعہ صاف کرنے لگا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں میری۔ بہت محبت کرتا ہوں۔“ اس نے رقعے کو مخاطب کر کے کہا۔ ”افسوس، تم نے جانے میں بہت جلدی کی۔“

اچانک ہی رقعے میں جان پڑ گئی۔ ”میں جیک کے ساتھ جا رہی ہوں، میں جیک کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

اس نے گھبرا کر کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارا۔ جیک کنٹری کلب میں سب سے خوش اخلاق اور خوش پوشاک سمجھا جاتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی سفید گاڑی تھی اور وہ اسی فرم میں جہاں ہارون ملازم تھا، سب سے کم عمر سیلز منیجر تھا۔ پچھلے دنوں جب اس کے ہاں سفیدی ہو رہی تھی، وہ ہارون سے درخواست کر کے چند روز کے لیے ان کے ہاں منتقل ہو گیا تھا اور وہ اپنا زیادہ وقت میری کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں گزارتا تھا۔

ہارون نے افسوس سے اپنا سر ہلایا۔ اعتبار اور اعتماد نے اسے بالکل ہی اندھا کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میری اور جیک کا اس حد تک گھلنا ملنا مناسب نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے جب وہ سالانہ سیلز کانفرنس میں حصہ لے کر نیویارک سے گھر واپس پہنچا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی پشت پر کسی آدمی کی آواز سنی تھی۔

”یہ جیک کی آواز ہے۔“ میری نے اسے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔ ”آج میری کار کچھ خراب ہو گئی تھی چنانچہ کھیل کے بعد وہ مجھے اپنی کار پر گھر تک چھوڑنے کے لیے آگیا۔ اب یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات تھی کہ میں اسے گھر مدعو کر کے ذرا سا مشروب تک پینے کے لیے نہ کہتی، ہے نا ڈارلنگ؟“ ہارون کو خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی اخلاق و آداب سے عاری نہیں ہے۔ وہ خود جیک کے پاس گیا اور اس نے میری کو گھر تک پہنچانے کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”ارے اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔“ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے طے کیا کہ اگلے ہفتے ٹینس کا ایک دوستانہ میچ کھیلیں گے۔

ہارون کے ہاتھ سے میری کا رقعہ گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں میری کی تصویر گھومنے لگی۔ میری اور جیک

اپنے اپنے سوٹ کیس کار میں رکھ رہے تھے اور اس پر ہنس رہے تھے کہ جب مارون گھر پہنچے گا اور میری وہاں نہیں ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

لیکن مارون نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ تو اپنی میری کو یہ خوش خبری سنانے آیا تھا کہ اب اسے زیادہ سفر نہیں کرنے پڑیں گے اور وہ اپنا زیادہ وقت خصوصاً اپنی راتیں میری کے ساتھ گزارا کرے گا۔

''مارون!'' آج ہی اس کے باس نے کہا تھا۔ ''ہم لوگ تمہارے کام سے بہت خوش اور بہت مطمئن ہیں۔ اب ہم نے یہ طے کیا ہے کہ دفتر کا سارا کام تمہیں سونپ دیں۔ رہ گیا آؤٹ ڈور کام تو وہ کوئی اور شخص بھی انجام دے لے گا۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے تمہاری ماہانہ تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ بھی کیا جارہا ہے۔''

مارون یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے گم صم بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ قسمت اس حد تک اس پر مہربان ہوسکتی ہے پھر اس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں اپنے باس کو بتایا تھا کہ اس کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ میری سے دور رہ کر وہ ذہنی مریض بنتا جارہا تھا۔

اور تب اس کے باس نے ہنستے ہوئے کہا تھا ''تم یہ بات میری کو بھی بتادو۔ اس کی راتیں تنہا نہیں گزریں گی کیونکہ روزانہ سرِشام اس کا شوہر گھر پہنچ جایا کرے گا۔''

مارون فوراً ہی یہ اطلاع لے کر گھر روانہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ میری یہ خبر سن کر خوش ہوگی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ میری کے چہرے کو گلاب کے پھول کی طرح کھلتا ہوا دیکھے۔ اتنی بڑی خوش خبری سن کر وہ اپنے احساسات و جذبات کو ہزار کوشش کے بعد بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔

مارون دو بجے گھر پہنچ گیا۔ جس وقت اس نے دروازہ کھولا اس کے ہونٹوں پر خوشی کا نغمہ تیر رہا تھا۔ ''روٹھی ہوئی مسرتیں دوبارہ آگئیں۔ جدائی کے لمحات دم توڑ گئے۔ اب ہمیں اور تمہیں کوئی جدا نہیں کرسکے گا۔''

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ میز پر رکھا ہوا میری کا یہ رقعہ اس کا استقبال کررہا تھا۔ ''میں جیک کے ساتھ جارہی ہوں۔''

''میری اور جیک ..... میری اور جیک!'' اس کا دماغ ہچکولے کھانے لگا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' اندر ہی اندر اس کے دل نے بغاوت کی۔ ''میری کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں سمجھ لوں گا ایک ایک کو۔''

وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا اور فون کے پاس پہنچا۔ یہاں گلی کے کھمبے سے ہلکی سی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس روشنی میں اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا پھر چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا کہ اسے فون کہاں کرنا چاہیے؟ پھر اس نے آہستہ آہستہ نمبر ڈائل کرنا شروع کردیے۔

''ہیلو!'' اس نے اپنی فرم کی کلرک سے کہا۔ ''میں مارون بول رہا ہوں اور جیک سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

کلرک کی آواز آئی۔ ''مسٹر مارون مسٹر جیک سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے جیک کے اسسٹنٹ نے فون سنبھال لیا۔

''مسٹر جیک یہاں نہیں ہیں مسٹر مارون۔''

''کب تک واپس آجائیں گے؟''

''کم از کم دو ہفتے بعد۔ باس نے انہیں ایک طویل کاروباری سفر پر بھیج دیا ہے۔''

''باس سے میری گفتگو کروادو۔''

''مجھے افسوس ہے مسٹر مارون باس کانفرنس روم میں ہیں۔''

''جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' مارون نے گرج کر کہا۔

''بہت اچھا جناب، بہت اچھا۔''

چند لمحوں بعد باس کی آواز آئی۔ ''کہو مارون۔''

مارون نے اپنے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کیا۔ ''تمہیں معلوم ہے باس اس وقت جیک کہاں ہوسکتا ہے؟''

''میں نے اسے کاروباری سفر پر روانہ کردیا ہے۔'' باس نے کہا ''کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہو؟''

''مہربانی کرکے ذرا یہ معلوم کرلو وہ سفر کے اخراجات کے لیے کتنی رقم لے گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ جیب میں معقول رقم ہو اور ساتھ میں کسی کی اغوا کی ہوئی حسین بیوی ہو تو کوئی شخص بھی کاروباری فرائض ایمانداری سے انجام نہیں دے سکتا۔'' اس سے قبل کہ باس کچھ اور پوچھتا، مارون نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے چہرے کا پسینا پونچھنے لگا۔

''یہی ہوگا جیک! اب تو یہی ہوگا۔ تم دونوں نے اپنی تباہی اور بربادی کے بیج خود بوئے ہیں۔ میں تو بس فصل کاٹنے والا ہوں۔'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اسے خیال آیا کہ پولیس کو بھی مطلع کردیا جائے۔

کیا پولیس والے ان دونوں کو واپس لاسکتے ہیں؟ اس نے سوچا۔ ایک عجیب سی سفاکانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ وہ انہیں واپس نہیں لاسکتے، میری اور جیک بہت دور جاچکے ہیں پھر بھی پولیس کو اطلاع دینی ضروری ہے۔ اتنی بدگمانی ٹھیک نہیں، پولیس کو تفتیش کا موقع ضرور دینا چاہیے۔ مگر پولیس کو مطلع کرنے سے قبل ضروری تھا کہ ہر شخص کو میری اور جیک کے فرار کی داستان معلوم ہوجائے، کیوں نہ وہ پولیس کے ساتھ ہی ساتھ جیک کے بینکر، بروکر اور اکاؤنٹینٹ کو بھی اس کی اس حرکت کی اطلاع دیدے؟ ایک دوست نے اپنے دوست کی بیوی کو بھگا کر جس کمینے پن کا ثبوت دیا تھا اس سے بھی کا واقف ہونا ضروری تھا۔ احتیاط اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آئندہ بھی کوئی شخص کسی دوست پر اتنا اعتبار اور اعتماد نہ کرے جتنا مارون نے جیک پر کیا تھا۔

اس نے باری باری سب کو جیک اور میری کی داستانِ بے وفائی سنائی۔ پولیس کو پوری بات بتاتے ہوئے اس کی آواز بھی بھرا گئی۔ اسے واقعی میری سے دلی محبت تھی اور جب وہ سب کو اطلاع دے چکا تو اچانک اسے شدید سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور رکھ کر دوبارہ دیوار کو ٹٹولنا شروع کردیا اور دیوار کے سہارے چلتا ہوا وہ باورچی خانے کی طرف بڑھا۔

باورچی خانہ خوب گرم تھا گھر کو گرم رکھنے کے لیے اس نے جس بھٹی کا انتظام کیا تھا۔ وہ تیز دہک رہی تھی لیکن یہ کیسی گرمی تھی جو ابھی تک اس کے کانپتے ہوئے جسم کی سردی دور نہیں کرسکی تھی۔ اس نے ہمت کرکے بھٹی کا دروازہ کھول دیا اور اس کے پاس کھڑے ہوکر ہاتھ تاپنے لگا۔ بھٹی میں میری اور جیک کے جسم جل بھن کر راکھ ہوچکے تھے۔ کوئی شخص اسے دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھر آکر مارون نے جس وقت میری کا رقعہ میز پر رکھا ہوا دیکھا اس وقت دونوں اندر ہی تھے اور فرار ہونے کی تیاریاں کررہے تھے اور مارون نے بروقت ٹینس کا بلا استعمال کرکے انہیں بے ہوش کردیا تھا اور جب وہ دونوں بے ہوش ہوگئے تو انہیں ٹینس کے بلے سمیت بھٹی میں ڈال دیا تھا۔

اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پاس میری کا لکھا ہوا خط موجود تھا جس میں اس نے اپنے فرار ہونے کی اطلاع دی تھی۔

''میں جیک کے ساتھ جارہی ہوں۔'' وہ پولیس سے شکایت کرسکتا تھا کہ بروقت مطلع کردینے کے باوجود پولیس جیک اور میری کو تلاش کرنے میں ناکام رہی، مگر وہ اس سردی کا کیا علاج کرے جو دہکتی ہوئی بھٹی کے باوجود ابھی تک اس کے جسم کی کپکپی دور نہیں کرسکی تھی۔

شہ مات

سلیم انور

کوئی کتنا ہی بڑا شہ زور کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی سیر کو سوا سیر مل ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اسی گھمنڈ کا شکار تھا کہ اچانک لگنے والی ٹھوکر نے اس کی چال کو ایسا لڑکھڑایا کہ دو قدم بھی چلنا دوبھر ہو گیا... ایسے میں منزل تک پہنچنا کس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو گیا تھا۔

[illegible]

فریڈرک قیمتی فرنیچر کے درمیان پنجوں کے بل دبے پاؤں خاموشی سے حرکت کر رہا تھا۔ وہ خاص طور پر چینی منگ بادشاہ کے عہد کے چینی کے گلدان کے بارے میں خاصا محتاط تھا کہ کہیں وہ ٹھوکر لگنے سے گر نہ جائے جو کمرے کے عین وسط میں رکھا ہوا تھا۔

اچانک کمرے کی لائٹیں روشن ہو گئیں۔

فریڈرک نے تیزی سے پلٹ کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں مکان کا مالک تامسن منرو

کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کی نال کا رخ فریڈرک کی سمت تھا۔

"لعنت ہو۔" فریڈرک بڑبڑایا۔

"بے شک۔" ناتھن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے چہرے پر سے ماسک اتار دیا۔ "مین اوہ مین۔ کیا منحوس ہفتہ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "عام طور پر مجھے اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن یہ میری بدبختی ہے جیسے جہنم سے آئی ہو۔"

ناتھن منرو کمرے کے گوشے میں بنے ہوئے بار کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ریوالور کا رخ بدستور فریڈرک کی جانب تھا البتہ اس کے انداز سے قدرتی بے پروائی عیاں تھی۔ ناتھن منرو بہ ظاہر اس ٹائپ کے لوگوں میں سے تھا جو ہاتھ میں کسی ہتھیار کی موجودگی میں خود کو بے حد مطمئن محسوس کرتے ہیں۔

"پہلے تو پیر کے روز میری کار خراب ہو گئی اور اسے ورکشاپ لے جانا پڑا۔ منگل کے روز ڈرائی کلین والوں نے میرا سوٹ گم کر دیا۔ بدھ کے روز اپنے پسندیدہ چائنیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے سے مجھے فوڈ پوائزننگ ہو گئی اور سب سے بڑھ کر اب یہ صورت حال سامنے آ گئی۔" فریڈرک نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔" ناتھن منرو نے کہا۔ "مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔"

"دیکھو میری یہاں موجودگی کسی ذاتی وجوہ کی بنا پر نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ ڈاکا ڈالنے کو ایک قسم کی بے حرمتی تصور کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اس بات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر میں ان لوگوں کے گھروں میں ڈاکا ڈالنے کے ارادے سے داخل ہوتا جو مجھے پسند نہیں ہیں تو میں یقیناً یہی کرتا۔" فریڈرک نے کہا۔

ناتھن منرو نے برانڈی کی ایک چسکی لی اور بولا۔ "یہ بات تسلی بخش ہے۔"

"مثال کے طور پر تم مجھے بے حد معقول شخص لگتے ہو۔ ذہین اور عمدہ ذوق کے مالک۔ گفت و شنید کے لیے..... آمادہ۔"

"گفت و شنید؟" ناتھن منرو نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

فریڈرک نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں یہ بات ہم دونوں کے درمیان سے کہیں آگے بڑھے۔"

"آئی سی۔" ناتھن منرو نے ایک بار پھر بھویں اچکا دیں۔ "بائی دی وے کیا تم مسلح ہو؟"

فریڈرک اس بات پر چونک گیا۔ "نہیں، نہیں۔ میں کبھی اسلحہ لے کر نہیں چلتا۔ مجھے ہتھیاروں سے نفرت ہے۔ ان میں بری بات یہ ہے کہ وہ چل پڑتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کا مطلب نیویارک کی مرکزی جیل میں سیدھا دس سال کی قید کاٹنا ہے۔ بلا کسی سبب کے۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں موجود ہوں؟ میں تین ہفتوں تک اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ میں تمہاری تمام حرکات و سکنات سے واقف ہو چکا ہوں۔ اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ اس وقت تمہیں مکان کے دوسرے حصے میں ہونا چاہیے تھا اور تم ٹوکیو بات کر رہے ہوتے۔"

"درحقیقت بالکل ایسا ہی تھا۔" ناتھن منرو نے بتایا۔ "لیکن میں نے حال ہی میں ایک نئی سیکیورٹی ڈیوائس نصب کرائی ہے۔ اس کا نام پینتھیون تھری زیرو زیرو ہے۔"

یہ سن کر فریڈرک کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ "اوہ کرائسٹ!" وہ کراہ اٹھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم نے اس ڈیوائس کے بارے میں سن رکھا ہے۔" ناتھن منرو نے کہا۔

"ہاں، میں نے سنا ہے کہ وہ ایک جدید ترین سیکیورٹی ڈیوائس ہے۔ کہنے کو کیا یہ قدرے غیر ضروری نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ صرف ایک گھر ہے، کوئی فورٹ ناکس نہیں۔ تم کسی بھی گارڈن ورائٹی سیکیورٹی سسٹم سے اپنا کام چلا سکتے تھے۔ اس دھوکے باز نے تم سے اس سسٹم کی ڈھیروں قیمت وصول کی ہوگی۔" فریڈرک نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ رقم صحیح جگہ اور صحیح طور پر صرف کی گئی ہے۔" ناتھن منرو نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "جس لمحے کوئی بھی احاطے میں داخل ہوتا ہے تو یہ سسٹم مجھے ہوشیار کر دیتا ہے۔ تم نے جس لمحے میرے لان میں قدم رکھا تھا تو مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم یہاں آ گئے ہو۔"

فریڈرک نے یہ سن کر اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے سر لٹکا دیا۔ "اور بلاشبہ تم نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔"

"نہیں، میں نے پولیس کو فون نہیں کیا۔ ابھی تک تو نہیں کیا۔" ناتھن منرو نے جواب دیا۔

فریڈرک نے حیرت سے ناتھن منرو کی طرف دیکھا۔

"ابھی تک نہیں کیا؟"

"نہیں، میں نے ابھی تک اپنے ذہن کو کسی فیصلے پر

تیار نہیں کیا ہے۔''

فریڈرک کاؤچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدم آگے بڑھنے کے بعد بولا۔ ''دیکھو میرے پاس کچھ نقد رقم ہے۔ اگر اس سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے تو تم وہ رقم لے لو۔''

ناتھن منرو یوں بن گیا جیسے اس نے فریڈرک کی یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ ''ویسے تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام؟ فریڈرک!''

''خوب..... فریڈرک..... جب تم نے میرا احاطہ پھلانگا تھا، میرا لان عبور کیا تھا اور میرے گیراج کے راستے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے تو کیا تمہیں اس کار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو وہاں کھڑی ہے؟''

''اوں، نہیں۔ حقیقت میں نہیں۔ وہاں اندھیرا تھا۔'' فریڈرک نے جواب دیا۔

''اگر تم نے وہاں لائٹ جلانے کی زحمت کی ہوتی تو شاید تم اس لمبوتری مرسی لیگو اسپورٹس کار کو بھی دیکھ لیتے جو دیگر کاروں کے درمیان وہاں موجود ہے۔'' ناتھن منرو نے کہا۔

''اس کار کی کیا خاص بات ہے؟''

''اس کی قیمت تقریباً تین لاکھ ڈالرز ہے۔''

فریڈرک کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ ''تین لاکھ ڈالرز! صرف ایک کار کی قیمت؟'' اس نے ناقابلِ یقین لہجے میں کہا اور ساتھ ہی حیرت سے سر ہلانے لگا۔

ناتھن منرو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اب بتاؤ، تم مجھے کوئی پیشکش کر رہے تھے؟''

فریڈرک نے بلند آواز سے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''اس حقیقت کے پیش نظر ہم گفتگو کے اس حصے کو حذف کرتے ہوئے براہ راست ترس کھا کر معاف کر دینے کی بات کرتے ہیں۔''

''تم دیکھنے میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہو جنہیں ترس کھا کر معاف کر دیا جاتا ہے۔''

''تمہیں شاید اس بات پر حیرت ہوئی۔ میرا مطلب ہے میں حقیقت میں جیل نہیں جانا چاہتا۔'' فریڈرک نے کہا۔

ناتھن منرو یہ سن کر بظاہر حیران سا ہو گیا۔ ''جیل؟ میں نے تو جیل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میرے خیال میں تم غلط سمجھے ہو۔ جب میں نے یہ کہا تھا کہ میں نے ابھی تک اپنے ذہن کو کسی فیصلے پر تیار نہیں کیا ہے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آیا تمہیں زندہ رہنے دیا جائے یا نہیں۔''

فریڈرک نے آنکھیں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ایکسکیوزمی؟''

''بات اسیری یا رہائی میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کی نہیں ہے۔'' ناتھن منرو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''معاملہ زندگی اور موت میں سے کسی کے انتخاب کا ہے۔''

فریڈرک نے یہ سن کر قدرے توقف کیا پھر بولا۔ ''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟''

''بہرصورت میں تمہیں ابھی اور عین یہیں پر قتل کر سکتا ہوں اور مجھے کون الزام دے سکتا ہے؟ یہاں میں اکیلا اور تنہا......''

''تمہارے پاس ریوالور ہے۔'' فریڈرک نے اشارہ کیا۔ ''تم نہتے نہیں ہو۔''

''مجھے کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں اپنی حفاظت کے پیش نظر اپنا ریوالور اٹھا لیتا ہوں۔ پھر میں اپنی اسٹڈی میں پہنچتا ہوں تو وہاں ایک خطرناک مجرم کو موجود پاتا ہوں جو ایک بلیمین ٹائیگر کی قوت سے مجھ پر قلانچ بھرتا ہے۔''

''اوہ، خدا کے واسطے......''

''اس غیر متوقع حملے پر میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں اور میرا جسم کچھ سوچے سمجھے بغیر حرکت میں آجاتا ہے۔ پھر اس سے قبل کہ مجھے احساس ہوتا کہ کیا ہو گیا ہے، ایک بدقسمت برگلر کی لاش پڑی دکھائی دیتی ہے جس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہے۔''

''تم ایسا کیوں کر، کر سکتے ہو؟''

ناتھن منرو بے پروائی سے ریوالور کو اپنی انگلیوں میں نچاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی بالکل یہی بات سوچ رہا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہیں اس بات کا جواب پسند نہیں آئے گا۔ ہماری اس گفتگو میں ایسی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں کہ جن سے میں خاص طور پر لطف اندوز ہوا ہوں۔''

''سچ تو یہ ہے کہ میں شاید تجسس کی بنا پر تمہیں قتل کر دوں۔'' ناتھن منرو نے کہا۔ پھر کمرے کے ایک گوشے میں موجود شطرنج کی بساط پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''کیا تم شطرنج کھیلتے ہو فریڈرک؟''

''ہاں، میں شطرنج کھیلتا ہوں۔ حقیقت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں شطرنج کا نہایت عمدہ کھلاڑی ثابت ہوتا ہوں۔'' فریڈرک نے کہا۔ ''میں بولز کا کھیل سکتا ہوں، ٹیلی وژن دیکھتا ہوں اور گولف کے کھیل میں میری اوسط سے زیادہ ضربات کی تعداد آٹھ ہے۔ مزید اور کچھ؟''

ناتھن منرو نے سائڈ ٹیبل کو ایک جانب کھسکاتے ہوئے جگہ بنائی اور ایک کرسی کمرے کے وسط میں لے آیا۔ ''وہاں میز پر ایک بساط رکھی ہوئی ہے۔ اسے یہاں لا کر

سیٹ کردو۔'' اس نے فریڈرک سے کہا۔
''اگر میں نے یہ کردیا تو کیا تم مجھے جانے دوگے؟''
''اگر تم نے یہ نہیں کیا تو میں اسی وقت شوٹ کردوں گا۔''
''تب میں بساط بچھا دیتا ہوں۔'' فریڈرک نے ماربل کے چیس بورڈ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ فاتر العقل ہو یا بالکل بھی احساس نہیں ہے؟''
''مجھے اس سے بھی بدترین الفاظ سے نوازا گیا ہے۔''
''حال ہی میں؟''
ناتھن منرو یہ سن کر مسکرا دیا۔ ''میں سفید مہرے لوں گا۔''
''بے شک۔'' فریڈرک نے کہا اور پیرس ڈیزائن کی ایک کرسی گھسیٹ کر ناتھن منرو کے مقابل میز پر بیٹھ گیا۔
''تم جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے اور بہت سے کام بھی کرسکتا ہوں۔ تمہاری مدد کے لیے۔ میں قطعی سنجیدہ ہوں۔ میں حقیقت میں ایک نہایت عمدہ چور ہوں۔''
''لیکن شواہد اس کے برعکس ہیں۔''
''مجھے ایک موقع تو دو۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارے پاس پینتھیون تھری زیرو زیرو سیکیورٹی سسٹم موجود ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ ایسے طریقے موجود ہیں جن سے میں تم جیسے شخص کی مدد کرسکتا ہوں...''
ناتھن منرو نے کھیل کا آغاز کرتے ہوئے اپنے پیادے کو آگے بڑھا دیا اور بولا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''
فریڈرک اپنا پیادہ دو خانے اٹھا کر ناتھن منرو کے وزیر کے سامنے لے آیا اور اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''اور تمہارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہوں۔''
''میں سن رہا ہوں۔'' ناتھن منرو نے اپنا گھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔
فریڈرک نے جواباً اپنا گھوڑا بڑھا دیا۔
ناتھن منرو نے اپنے فیل کو حرکت دی تو فریڈرک نے تقریباً بے سوچے سمجھے اپنا دوسرا گھوڑا بھی بڑھا دیا۔
''جیسے کہ تمہیں کسی کے بارے میں کوئی معلومات درکار ہوں ..... تمہارا کوئی مدمقابل یا کوئی اور۔'' فریڈرک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یا اس ملازم کے بارے میں جو تمہارے خیال میں تم سے کچھ چوری کر رہا ہو..... میں اندر داخل ہوکر وہ معلومات لاسکتا ہوں۔ نہایت رازداری کے ساتھ..... لاسکتا ہوں۔ میں اس معاملے میں نہایت عمدہ ہوں۔''
ناتھن منرو کی نگاہیں بساط پر جمی ہوئی تھیں۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔
''تمہیں اس بات سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کہیں تم مجھے شوٹ نہ کردو۔'' فریڈرک نے جواب دیا۔
''کھیل پر توجہ دو، فریڈرک۔ اب تمہیں چال چلنی ہے۔ کیا یہ..... یہ ٹریکسلر کاؤنٹر اٹیک ہے؟''
''میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں شطرنج کھیلتا رہا ہوں۔''
''زبردست!'' ناتھن منرو نے فریڈرک کو جیتنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی سی۔ اب مجھے تم کو قدرے زیادہ سنجیدگی سے لینا ہوگا۔''
فریڈرک اپنے نکتے پر زور دینے کے لیے آگے کی طرف جھک گیا اور بولا۔ ''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اگر تم مجھے صحیح طریقے سے استعمال کرو تو.....''
ناتھن منرو نے پیادہ آگے بڑھایا اور بولا۔ ''ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا۔''
''ایسا کیوں نظر نہیں آتا؟''
''کیا یہ ظاہر ایسا نہیں ہے کہ ایک بار جب میں تمہیں یہ کمرا چھوڑ کر جانے کی اجازت دے دوں گا تو میرے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم غائب نہیں ہوجاؤ گے؟'' ناتھن منرو نے پوچھا۔
''مجھے مار ڈالنے سے تمہیں کیا ممکنہ فائدہ حاصل ہوگا؟''
ناتھن منرو کی نگاہیں شطرنج کی بساط پر جمی ہوئی تھیں۔
''تم ایک عمدہ.....''
فریڈرک اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے بولا۔
''میری بات کا جواب دو۔''
تب ناتھن منرو نے سرد مہری سے اپنا ریوالور بلند کیا اور بولا۔ ''دھیان سے بوائے چک! اپنے جذبات کو قابو میں رکھو ورنہ پھر میں اپنا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ سمجھ گئے؟''
فریڈرک اپنی کرسی پر سکون سے بیٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہے۔''
''تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کیے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ اب تک میں خاص طور پر ایک اچھا آدمی رہا ہوں۔ حقیقت میں تو میں بارہا وہ رہا ہوں جسے تم ایک فضول شخص کہہ سکتے ہو۔''
''مجھے یہ سن کر شاک پہنچا۔''
ناتھن منرو نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''میں نے جھوٹ بولا ہے، میں نے دھوکے بازی کی ہے، میں نے چوری کی

ہے..... میں اس سے کہیں زیادہ کچھ کر چکا ہوں جو تم کبھی کر سکو گے مائی ڈیئر فریڈرک! اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود میں نے حقیقت میں آج تک کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں صرف یہ تصور کر سکتا ہوں کہ کسی کو قتل کرنے پر کیسا محسوس ہوتا ہے۔''

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''کیا میں احساسِ جرم سے خود کو تباہ کر لوں؟ نصف شب کو پسینے میں شرابور نیند سے بیدار ہو جایا کروں؟ تمہارا چہرہ مجھے ذہنی آزار پہنچاتا رہے اور میرے تصور سے نکلنے سے انکار کر دے؟''

''اسی پر انحصار کرو۔'' فریڈرک نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''یا پھر میں یہ سوچ لوں کہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہوا؟ کیا یہ مسحور کن بات نہیں؟ یہ ان فلسفیانہ سوالات میں سے ایک ہے جو آپ ہمیشہ سوچتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع نہیں ملتا۔''

''کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم قتل کے متعلق بات کر رہے ہو؟'' فریڈرک نے توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، قتل کی بات تم کر رہے ہو۔'' ناتھن منرو نے وضاحت کی۔ ''میں حفظِ ماتقدم کی بات کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرنے والے کی نظروں میں امتیاز بے محل ہے لیکن ان کے لیے جو ہم میں سے زندہ بچ رہتے ہیں، ایک منفرد اور نمایاں فرق ہوگا۔ قتل ہوا تو مجھے جیل جانا پڑے گا۔ بائی دی وے اب تمہاری چال ہے۔''

فریڈرک نے بساط پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے رخ کو آگے بڑھا دیا اور بولا۔ ''کیا تمہارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے؟''

''اخلاقیات کا درس دیتے ہوئے تم خود خاص طور پر تذبذب کا شکار ہو۔ آخرکار یہ تم ہو جو میرے گھر میں زبردستی داخل ہوئے ہو......''

''چوری کرنے کے لیے..... قتل کرنے کے لیے نہیں! کرائسٹ، اپنے پاس سب کچھ موجود ہونے کے باوجود بھی تم اب بھی کسی چیز کی کمی محسوس کر رہے ہو۔'' فریڈرک نے کہا۔

ناتھن منرو نے اپنے شانے سیدھے کیے اور براہِ راست فریڈرک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہاں تم غلطی پر ہو۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے اسے اکٹھا کرنے میں مجھے بہت طویل وقت لگا ہے..... بے حد طویل وقت۔ مجھے بہت خون تھوکنا پڑا ہے۔ تم تو یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے کہ میں جہاں موجود ہوں وہاں تک کس طرح پہنچا ہوں۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں کی شکستہ لاشوں کو پھلانگا ہے اور میں کسی حقیر سے کیڑے کو اس بات کی اجازت دینے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا کہ ڈائم اسٹور کا ایک معمولی چور میری دولت کا ایک ڈالر بھی چرا کر لے جائے۔ کیا یہ بات ہمارے درمیان مکمل طور پر واضح ہو چکی ہے؟''

''کرسٹل کے مانند!''

''گڈ!'' ناتھن منرو نے ایک اچٹتی نگاہ شطرنج کی بساط پر ڈالی اور مسکرا دیا۔ ساتھ ہی اپنے رخ کی چال چلتے ہوئے فریڈرک کے فیل کو مار دیا۔ ''اوہ...... تم بے پروا ہو رہے ہو۔ کیا اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو؟''

''یہ کیفیت میرے لیے باعثِ حیرت نہیں ہے۔'' فریڈرک نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سو بنیادی طور پر تم مجھے اس لیے قتل کرو گے تاکہ یہ جان سکو کسی کو قتل کرنے سے کیسا محسوس ہوتا ہے؟''

''میں اسی پر سوچ بچار کر رہا ہوں۔ خیر اس بات کا سامنا کرتے ہیں کہ بھلا اس سے بہتر موقع مجھے اور کب مل سکتا ہے؟ تم جیسے متکبر، اناڑی چھوٹے سے چور نے یہ کیسے تصور کر لیا تھا کہ مجھ سے کچھ چرا کر لے جاؤ گے اور تم نے یہ توقع کی ہوئی تھی کہ تمہیں اس کا کوئی نتیجہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟ اور اس کے علاوہ تمہاری اپنی کسی قسم کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ تم کوئی بہت اچھے چور نہیں ہو۔ تمہارا شطرنج کا گیم پر تخیل تو ہے لیکن قابلِ توجہ ہرگز نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم شادی شدہ نہیں ہو......''

''نہیں۔''

''تب تو تمہیں جانا ہی ہوگا لیکن پہلے اس کے دوسرے رخ پر بھی بات کر لیتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں ایک عمدہ جواز پیش کرو کہ میں تمہیں زندہ کیوں رہنے دوں؟'' ناتھن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے اس سوال پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ پھر بولا۔ ''میرے خیال میں...... میں کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا۔''

''سو تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کس مقام پر آن کھڑے ہوئے ہیں۔''

''ٹھہرو! تم نے ابھی کیا کہا تھا...... یہ کہ میں ایک اچھا چور نہیں ہوں۔ شاید اسی سے بات بن جائے۔''

''کیا بات بن جائے؟''

''شاید اسی طرح میں تمہارے لیے دولت حاصل کر سکوں، میرا مطلب ہے حقیقی دولت! میں ایسا پہلے بھی

کر چکا ہوں۔'' فریڈرک نے بتایا۔

ناتھن منرو نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے ہم اس بارے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔''

''میری بات تو سن لو۔ اگر تمہیں وہ بات پسند نہ آئے جو میں کہنا چاہ رہا ہوں تو پھر تم ریوالور کا ٹریگر دبا سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر فریڈرک نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ''اس گھر میں تمہاری سب سے قیمتی شے کیا ہے؟''

''یقیناً مصری گلاب!''

فریڈرک کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ ''ایک پھول؟''

''ایڈیٹ، وہ ایک ہیرا ہے۔'' ناتھن منرو نے جواب دیا۔ ''مغربی نصف کرہ میں سب سے مہنگا ڈائمنڈ۔ تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ تم نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا؟ جبکہ میرا یقین یہ ہے کہ تم اسی کو چرانے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

''ہوں.....''

''تم آخر کس قسم کے چور ہو؟ مصری گلاب نامی اس ہیرے کی مالیت برے دنوں میں بھی ایک کروڑ ڈالرز سے کم نہیں ہے۔''

''زبردست۔ کیا ہیرا بیمہ شدہ ہے؟''

''یقیناً۔''

فریڈرک کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''تب یہی ہمارا ٹکٹ ہے۔''

ناتھن منرو نے الجھی نگاہوں سے فریڈرک کو گھورا اور بولا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ میں کوئی چیز مس کر رہا ہوں۔''

''اوکے، میری پیشکش یہ ہے۔ تم ہمیشہ کی طرح آج رات بھی اپنے بیڈروم میں تھے جب تم نے کوئی آواز سنی۔ تم دوڑتے ہوئے آئے لیکن تمہیں دیر ہو چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی، ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی اور کوئی تمہارا مصری ٹیولپ لے کر فرار ہو چکا تھا۔''

''مصری ٹیولپ نہیں مصری گلاب!'' ناتھن منرو نے تصحیح کی۔

''جو بھی نام ہو۔ نکتہ یہ ہے کہ وہ غائب ہو چکا ہے۔ تم پولیس کو فون کرتے ہو۔ وہ تلاشی لیتے ہیں، کھوج اکٹھا کرتے ہیں لیکن قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ وہ ہیرا ریکارڈ میں چوری کردہ درج ہو جاتا ہے۔ پھر بیمہ کمپنی آتی ہے۔ وہ تفتیش کرتی ہے، ٹوہ لیتی ہے۔ میری انگلیوں کے نشانات پاتی ہے اور پھر تمہیں رقم ادا کر دیتی ہے۔ اب تم ایک کروڑ ڈالرز مزید حاصل کر لیتے ہو۔ اب یہ ایک عمدہ منافع ہے۔''

''کیا تم یہ تجویز کر رہے ہو کہ میں تمہیں مصری گلاب چوری کرنے کی اجازت دے دوں تاکہ اپنے لیے بیمے کی رقم بٹور سکوں؟'' ناتھن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یقیناً میں اسے چوری نہیں کروں گا۔ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لوں گا، آس پاس کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دوں گا، اپنی انگلیوں کے نشانات ہر جگہ چھوڑ دوں گا اور پھر اس ہیرے کو تمہیں لوٹا دوں گا۔ اس کے عوض تم مجھے فرار ہونے کی اجازت دے دینا۔''

ناتھن منرو خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''پولیس کے پاس فائلوں میں میری انگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ موجود ہے۔ انہیں پہلے ہی علم ہے کہ میں ایک چور ہوں۔ کسی کو بھی یہ شبہ تک نہیں ہوگا کہ ہمارے درمیان کوئی باہمی رابطہ رہا ہے یا ہم کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ سوائے اس طرح تم ہیرا اپنے پاس رکھنا اور کچھ عرصے کے لیے اسے کسی خفیہ جگہ چھپا کر رکھ دینا، بیمہ کی رقم وصول کر لینا اور میں بھی مرنے سے بچ جاؤں گا۔ اس طرح ہم دونوں کی جیت ہو جائے گی۔'' فریڈرک نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

ناتھن منرو نے توجہ ہٹانے کی خاطر اپنی نظریں شطرنج کی بساط پر جما دیں اور بولا۔ ''اب کس کی چال ہے؟''

''تمام محاذوں پر اب تمہاری باری ہے۔''

ناتھن منرو بولا۔ ''مجھے غور کرنے دو کہ کیا میں نے تمہاری بات صحیح طور پر سمجھ لی ہے۔ تم زبردستی میرے گھر میں داخل ہوتے ہو ..... جیسا کہ تم داخل ہوئے ..... تم اسٹڈی میں آ جاتے ہو ..... جیسا کہ تم آئے ..... تم مصری ڈائمنڈ چوری کر لیتے ہو ..... پھر وہ تم مجھے واپس لوٹا دیتے ہو اور ہر جگہ اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ جاتے ہو تاکہ پولیس کو وہ نشانات مل جائیں ..... پھر پولیس کو تمہیں گرفتار کرنے اور جیل میں ڈالنے سے روکنا ہے جو کہ تم کسی طور پر نہیں چاہتے ہو؟ کیا میں نے صحیح سمجھا ہے؟''

فریڈرک نے شانے اچکا دیے۔ ''اس کے لیے انہیں پہلے مجھے پکڑنا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ ایک آئیڈیل منصوبہ ہے لیکن مجھے اپنی بقیہ تمام زندگی بھاگتے رہنا ہوگا لیکن یہ مرنے سے بہتر ہوگا۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا ہوں۔'' ناتھن منرو نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ کیسے پتا چلے گا کہ کسی بدقسمتی کے باعث اگر تمہیں دھر لیا جاتا ہے تو تم سب کچھ اگل نہیں دو گے؟''

''ایک جانب ہمارے پاس ایک انتہائی امیر، دولت مند، کمیونٹی میں ایک اچھی ساکھ کے حامل، قانون کی

پاسداری کرنے والے سوسائٹی کے اہم ستون کا زبانی حلف ہے تو دوسری جانب ایک سابقہ مجرم کا عہد ہے جو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے......"

یہ سن کر ناتھن منرو مسکرا دیا۔ "کیا تم ایک بات جانتے ہو، فریڈرک؟ مجھے تقریباً یقین ہے کہ یہ پلان کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ قدرے ترمیم کے ساتھ...... یہ ایک ایسا پلان ہے...... جس کے بارے میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں...... یہ لگ بھگ میرے شایانِ شان ہے۔"

"اور قابلِ تعریف بھی۔ او کے، تو پھر اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کام کو جلد از جلد نمٹا دیتے ہیں۔ اس سے قبل کہ پولیس یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو کہ یہ انگلیوں کے نشانات کس کے ہیں، مجھے کینیڈا کے لیے اپنی فلائٹ بک کرانا ہوگی۔"

یہ کہہ کر فریڈرک نے اپنے دستانے اتار دیے اور پھر تسلسل کے ساتھ کمرے میں موجود ہر شے پر اپنی انگلیوں کے نشانات ثبت کرنا شروع کر دیے۔ اس نے لیمپس، میزوں کو چھوا، درازیں کھولیں، کتابیں الٹ پلٹ کیں۔

"میں ان کے لیے آسانیاں فراہم کر رہا ہوں۔"

"یہ یقین رہے کہ تمہاری انگلیوں کے نشانات سیف پر بھی اچھی طرح سے ثبت ہو جائیں۔" ناتھن منرو نے کہا۔

"وہ سیف کہاں پر ہے؟"

ناتھن منرو نے میز کے نیچے کسی بٹن کو دبایا تو سامنے کی دیوار کا ایک حصہ اوپر اٹھ گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے کے دوسرے حصے میں پہنچا اور ایک تصویر کے فریم کے پیچھے لگے ہوئے ایک اور بٹن کو دبا دیا۔ دیوار کی دو سلنڈیں کھل گئیں اور سیف نمودار ہو گیا۔

"بہت خوب!" فریڈرک نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"تم نے بالکل صحیح کہا۔" ناتھن منرو نے تائید کی۔ "تم یہاں ایک عمدہ ترین اسٹیٹ آف دی آرٹ اکیوپمنٹ کو دیکھ رہے ہو، میرے دوست۔ میں تمہیں یہاں ایک مہینے کے لیے تنہا چھوڑ دوں تب بھی تم اسے کھول نہیں سکتے۔"

"اس بات کو رہنے دو۔ مجھے اس کا کمبی نیشن بتاؤ۔" فریڈرک نے کہا۔

"یہ دس اعداد پر مشتمل کوڈ ہے جس پر تم نے دس سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت میں لازمی عمل درآمد کرنا ہے ورنہ پولیس کے پاس الارم بجنا شروع ہو جائے گا۔ اس کوڈ کے نمبروں کو ترتیب کے مطابق ملانا ہے۔ واپس پیچھے کی طرف نہیں جا سکتے ورنہ پولیس کے پاس الارم بجنا شروع ہو جائے

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

1۔ گناہ سے پرہیز کرنا، ثواب حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

2۔ جہالت عیب ہے۔ علم کے باوجود عمل نہ ہونا سب سے بڑا عیب ہے۔

3۔ انسان کی تکمیل علم اور عمل دونوں سے ہوتی ہے۔

4۔ مسلمان برکت کا خواہش مند اور کافر کثرت کا حریص ہوتا ہے۔

5۔ جب زبان کی اصلاح ہو جاتی ہے تو دل بھی صالح ہو جاتا ہے۔

6۔ دل کو روشن کرنا ہو تو غیر ضروری (فضول) باتوں سے پرہیز کرو۔

7۔ خدمت اور ادب کا تاج سر پر رکھ...... اور بادشاہی کر۔

8۔ خوفِ خداوندی سے نکلنے والا ایک آنسو قسمت بدل دیتا ہے۔

9۔ غریبوں کے لیے نہ کھلنے والا دروازہ ڈاکٹروں کے لیے ضرور کھلتا ہے۔

10۔ مہذب گفتگو اور اچھا لب و لہجہ انسان کے وقار کو بڑھا دیتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

***

علم، دولت اور بھروسا تینوں دوست تھے، ایک ایسا وقت آیا کہ تینوں کو جدا ہونا پڑا، تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ وہ کہاں جائیں گے؟

علم بولا۔ "میں مدرسے، مساجد اور اسکول جاؤں گا۔"

دولت نے کہا۔ "میں محل اور امیروں کے پاس جاؤں گی۔"

لیکن بھروسا خاموش رہا۔

دونوں نے وجہ پوچھی۔

تو بھروسے نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔ "میں ایک بار چلا گیا تو پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

گا۔ ہر نمبر کو چٹکی سے ملانا ہوگا ورنہ......''
''میں سمجھ گیا۔ وہ کوڈ کیا ہے؟''
''مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے اس کوڈ نمبر پر فخر ہے۔ یہ ایسا نمبر ہے جسے یاد رکھنے کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اس کے باوجود شاید کوئی اس کے مخزن کا کھوج نہیں لگا سکتا۔''
''تمہاری باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے تم کسی عجائب گھر یا خزانے کے ذمے دار عہدے دار ہو۔'' فریڈرک نے تبصرہ کیا۔ ''اور یقیناً میرے اس کام کے بعد تم اس کوڈ کو تبدیل کرنا چاہو گے۔''
''ہاں۔'' ناتھن منرو نے افسردگی سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ میری تمام محنت اکارت ہو جائے گی۔''
''یہ دس ملین ڈالرز ہیں جو تمہیں اضافی ہاتھ آئیں گے۔'' فریڈرک نے یاد دلایا۔ ''اب بتاؤ، وہ کوڈ کیا ہے؟''
''فورنائن فائیو زیرو فائیو ون فائیو ٹو فائیو تھری۔'' ناتھن منرو نے بتایا۔
فریڈرک نے ایک لمحے کے لیے اس پر غور کیا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیوار گیر سیف کی جانب بڑھ گیا۔ ''میں سمجھ گیا۔'' اس نے کہا۔
''یہ ایک دلچسپی کی بات ہے کہ میں حقیقت میں اس کوڈ نمبر تک کیوں کر پہنچا۔ میں تمہیں اس بارے میں بتا سکتا ہوں کیونکہ مجھے بہرحال اسے تبدیل تو کرنا ہی ہے لیکن......''
''یہ وہ سال ہیں جب نیویارک یانکیز نے لگاتار پانچ برس تک ورلڈ سیریز بیس بال چیمپئن شپ جیتی تھی۔ انیس سو انچاس سے انیس سو ترپن تک یعنی 4950515253 میں سمجھ گیا۔ تم بہت چالاک ہو۔''
ناتھن منرو یہ سن کر قدرے افسردہ سا ہو گیا۔ ''ہاں۔ تم نے درست شناخت کیا ہے۔''
''میں اس بارے میں تمہیں ایک ٹپ دے رہا ہوں۔ عورتیں اپنے لیے جو کوڈ منتخب کرتی ہیں وہ لگ بھگ ہمیشہ ان کے بچوں کی پیدائش کی تاریخیں ہوتی ہیں۔ مردوں کے لیے انتخاب ان کی پسندیدہ اسپورٹس ٹیمیں ہوتی ہیں۔'' فریڈرک نے بتایا۔ ''تمہارے معاملے میں ہال وے میں موجود نیویارک یانکیز بیس بال ٹیم کے کھلاڑی ڈیرک جیٹر کا وہ قد آدم مجسمہ ہے جس نے تمہارے کوڈ کا بھانڈا پھوڑا ہے...... اور جو کہ قدرے سنسنی خیز بھی ہے۔''
''تھینک یو۔'' ناتھن منرو نے قدرے ترشی سے کہا۔
''میں تمہاری اس ٹپ کو یاد رکھوں گا۔''

فریڈرک دیوار کی سائڈ میں بنے ہوئے کی بورڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر تیزی سے اور اعتماد کے ساتھ کی بورڈ کے نمبروں کو پنچ کرنے لگا۔
اچانک کلک کی ایک آواز ابھری اور سیف کھل گیا۔
فریڈرک نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سیف میں داخل کر دیا پھر جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک بڑا سا ہیرا دبا ہوا تھا۔
''یہی ہے؟''
''ہاں۔'' ناتھن منرو نے سر ہلا دیا۔ ''نائس جاب!''
فریڈرک روشنی میں ہیرے کو جانچنے لگا۔ ''یہ واقعی نہایت خوب صورت ہے۔ آل رائٹ، مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کے دس ملین ڈالرز دے سکتا ہوں لیکن کچھ بھی سہی، اس کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔'' اس نے وہ ہیرا ناتھن منرو کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
ناتھن منرو نے وہ ہیرا اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''اگر کبھی غیر متوقع طور پر ہماری ملاقات دوبارہ ہو جاتی ہے تو تم مجھے یاد دلانا کہ تمہیں وہ داستان سناؤں کہ یہ ہیرا میں نے کس طرح خریدا تھا۔ ایک چور سے دوسرے چور تک اس ہیرے کے پہنچنے کی داستان!''
یہ کہہ کر ناتھن منرو کمرے کے ایک کونے میں گیا اور ایک شیلف پر سے ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر فریڈرک کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو!''
فریڈرک نے الجھی نگاہوں سے ناتھن منرو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ کس لیے ہے؟''
''تم نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ سیف میں اس ہیرے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔'' ناتھن منرو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً تیس لاکھ ڈالرز نقد رکھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں انکم ٹیکس والوں کو علم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کاغذات ہیں جنہیں میں ٹوہ لینے والوں کی نظروں سے چھپائے رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان سب چیزوں کو اس بیگ میں ڈال دو۔ میں انہیں عارضی طور پر کسی اور جگہ محفوظ کر دوں گا۔ جب انشورنس کمپنی اپنی تفتیش مکمل کر لے گی تو میں انہیں ان کی جگہ واپس رکھ دوں گا۔''
فریڈرک نے سراہتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم ہر ایک بات پر باریک بینی سے دھیان دیتے ہو۔ ہے نا؟''
یہ کہہ کر فریڈرک سیف کی جانب پلٹ گیا اور اس میں موجود تمام اشیا کو بیگ میں منتقل کرنے لگا۔
''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ناتھن منرو نے آہستگی

سے کہا۔

فریڈرک سیف میں موجود تمام قیمتی اشیا بیگ میں ڈالنے کے بعد اسے ناتھن منرو کے حوالے کرنے کے ارادے سے پلٹا تو اس کی نگاہ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال پر پڑی جو اس کے سینے کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

وہ بے دلی سے مسکرا دیا اور بولا۔ ''اوکے۔ میرا ان سب چیزوں کو چوری کرنے اور لے کر بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن ... ''

''مجھے اس بارے میں واقعی افسوس ہو رہا ہے۔'' ناتھن منرو نے کہا۔ ''تم حقیقت میں مجھ پر حاوی ہونا شروع ہو گئے تھے۔''

فریڈرک نے ناقابلِ یقین نظروں سے ناتھن منرو کو گھورنا شروع کر دیا۔ ''تم اب بھی مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟''

ناتھن منرو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہی ہے۔''

''لیکن خدا کے لیے، کیوں؟''

ناتھن منرو نے آگے بڑھ کر فریڈرک کے ہاتھوں سے وہ بیگ لے لیا۔ ''مجھے خیال آیا کہ تم نے جو کچھ بھی تجویز کیا وہ میں کر سکتا ہوں ..... ہیرے کا چوری ہونا، بیمے کی دس ملین ڈالرز کی رقم کی وصولیابی، اس کی چوری کا الزام تمہارے سر دھرنا..... اور ان سب کے باوجود اپنے تجسس کو تسکین پہنچانا۔''

''تم حقیقت میں ایک دھوکے باز کتیا کے بچے ہو۔''

ناتھن منرو یہ سن کر مسکرا دیا۔ ''اگر تم یہ سن کر خود کو قدرے بہتر محسوس کرو گے تو یہ حقیقت میں اپنے تجسس کو تسکین پہنچانے کی بات نہیں ہے۔ تم ان میں سے ایک ہو جسے عام اصطلاح میں ''بے کار آدمی'' کہا جا سکتا ہے اور میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ بے کار آدمی کو بہتر ہے کھلا نہ چھوڑا جائے۔''

فریڈرک حیرت سے سر ہلانے لگا۔ ''کیا عمدہ بات ہے۔ اوکے، دیکھو مجھے مارنے سے قبل جس کا مجھے احساس ہے کہ تم کر گزرو گے۔ اوکے، فائن۔ تو کیا تم مجھے اس گیم کو مکمل کرنے کی اجازت دو گے؟ میرا مطلب ہے گیم کے خاتمے کا کچھ احساس تو ہے؟''

''بے شک۔'' ناتھن منرو نے جواب دیا۔ ''میں قطعی طور پر بے رحم نہیں ہوں۔''

''شکریہ۔ میں اس بات کی قدر کرتا ہوں۔''

فریڈرک یہ کہہ کر دھیرے دھیرے شطرنج کی بساط کی جانب بڑھ گیا۔ ''مجھے ایک بات تو بتاؤ، منرو۔ کیا تم نے کبھی جوناتھن لیونگسٹن نامی شخص کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''

''یہ نام جانا پہچانا تو نہیں لگتا لیکن میں اپنی زندگی میں ہزاروں لوگوں سے معاملات کر چکا ہوں۔'' ناتھن منرو نے بتایا۔

''تم نے شاید کبھی اس کے ساتھ معاملات نہ کیے ہوں۔ لیونگسٹن وہ شخص تھا جو بیس سال قبل تعلیم کے لیے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی گیا تھا۔ وہ ایک ادنیٰ طالبعلم تھا لیکن اس کے والدین کے پاس دولت تھی لہٰذا انہوں نے اس کی تعلیم جاری رکھی۔''

''بہت خوب۔ کیا مسٹر لیونگسٹن تمہارے کوئی شناسا تھے؟''

فریڈرک نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کبھی اس شخص سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

''تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ ہماری گفتگو میں کیوں کر داخل ہوئے ہیں؟'' ناتھن منرو نے کہا۔

''جوناتھن لیونگسٹن کو موجد اور سیلز مین بننے، دونوں سے لگاؤ تھا۔'' فریڈرک نے پرسکون لہجے میں بتایا۔ ''تمام رپورٹوں کے مطابق وہ بہ طور موجد تو کامیاب نہ ہو سکا لیکن بہ طور سیلز مین اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے لیکن وہ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے وہ جس بارے میں بات کر رہا ہے اس کی بابت اسے سب کچھ معلوم ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اس سے اتفاق کرو گے کہ یہ بات کتنی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

ناتھن منرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

فریڈرک نے ایک اچٹتی نگاہ ناتھن منرو پر ڈالی اور بولا۔ ''تمہاری چال ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ناتھن منرو نے وقتی طور پر اپنے وزیر کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سو تمہارا یہ دوست ... مسٹر لیونگسٹن۔''

''رائٹ... لیونگسٹن۔ اس نے پہلے اپنی دکان لاس اینجلز میں سیٹ کی، پھر لاس ویگاس میں، پھر نیویارک میں۔ ہر اس مقام پر جہاں اسے نہایت امیر لوگوں کا ایک بڑا گروپ مل سکتا تھا اور وہ لوگ جو زیادہ ذہین نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے طور پر حقیقت میں ایک جینئس تھا۔ خاص طور پر جب بات اس کی پروڈکٹ کی آتی تھی۔''

''اور اس کی پروڈکٹ ..... وہ اصل میں کیا بیچتا تھا؟'' ناتھن منرو نے جاننا چاہا۔

''یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ وہ سیکیورٹی سسٹم ڈیزائن کرتا تھا۔''

ناتھن منرو یہ سن کر چونک پڑا اور سرونگاہوں سے فریڈرک کو گھورنے لگا۔

"شہ۔" فریڈرک نے اسے ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے کیا کہا..... سیکیورٹی سسٹم؟"

فریڈرک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں۔ خاص طور پر اس نے اپنا وہ بھاری بھر کم ناکام سسٹم ڈیزائن اور مارکیٹ کیا جسے پینتھیون تھری زیرو زیرو زیرو کے نام سے جانا جاتا ہے۔"

ناتھن منرو نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

"کیا یہ بات درست ہے؟"

"حقیقت یہ ہے منرو اور یہ میں تمہیں تمہارے اپنے فائدے کے لیے بتا رہا ہوں کہ اس سسٹم میں خامی ہے۔ یہ دیکھنے میں عمدہ لگتا ہے اور ایک عام سے چور کو تم سے پرے رکھ سکتا ہے لیکن ایک حقیقی پیشہ ور کے ہاتھوں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔"

تب ناتھن منرو اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور ریوالور کا رخ فریڈرک کی جانب کر دیا۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس گفتگو کا رخ کس جانب ہو رہا ہے۔"

"تم دو منٹ سے بھی کم وقت میں بہت کچھ جان جاؤ گے۔ بات یہ ہے کہ ایک حقیقی پیشہ ور نہ صرف یہ بہ خوبی جانتا ہے کہ پینتھیون تھری زیرو زیرو زیرو کو کس طرح مات دی جاسکتی ہے بلکہ ناقابل یقین حد تک یہ سسٹم مالک مکان کے خلاف حقیقت میں کام کرسکتا ہے۔ چند وائر کھینچ لیں، کچھ کنکشنز کو گنڈ کر دیں تو یہ وہ ویڈیو رسائی فراہم کرسکتا ہے جو کچھ فاصلے پر موجود وین میں بآسانی ٹیپ ہوسکتی ہے۔"

"ویڈیو رسائی؟"

"گھر میں موجود افراد کی نقل و حرکت، وہ کہاں موجود ہیں، کیا کر رہے ہیں، اپنے ہتھیار کہاں رکھتے ہیں، اس قسم کی باتیں۔"

تب ناتھن منرو نے اپنے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

لیکن کوئی فائر نہیں ہوا۔ وہ ٹریگر دباتا چلا گیا۔

"سو مفروضہ یہ کہ تم گھنٹوں قبل زبردستی گھر میں داخل ہوتے ہو..... اس وقت جب مالک مکان ڈنر کے لیے باہر گیا ہوا ہو..... اور ریوالور میں سے تمام گولیاں نکال لیتے ہو..... تم یہ بات سمجھنے پر مائل ہونا؟" فریڈرک نے پرسکون لہجے میں کہا۔

ناتھن منرو نے دروازے کی جانب بڑھنا چاہا لیکن فریڈرک نے پھرتی سے اپنا چھوٹا سا ریوالور نکال لیا جو اس نے اپنی پنڈلی سے باندھا ہوا تھا۔ اس نے ناتھن منرو کی پیشانی کا نشانہ باندھ لیا۔ "اتنی تیزی مت دکھاؤ، بوائے چک۔ ابھی ہم نے پورا سبق مکمل نہیں کیا۔"

"میں نے بہ ظاہر تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔" ناتھن منرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ تمہاری سوچ ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم تھا کہ میں پولیس کو فون نہیں کروں گا؟" ناتھن منرو نے سوال کیا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک چانس لیا تھا کہ اپنی دولت پر اترانے والا یہ شخص اس صورت حال کو اپنے طور پر ہینڈل کرنا چاہے گا۔ مجھے اس بات کا کسی طور شبہ نہیں تھا کہ تم مجھے حقیقت میں ہلاک کرنے والے ہو، یہ میرے لیے ایک سرپرائز تھا کہ تم مجھے اذیت پہنچا کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہو، حرام زادے!" فریڈرک نے کہا۔

پھر اس نے بیگ کی تمام اشیا ایک جم بیگ میں منتقل کردیں جو اس نے کاؤچ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ "لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ وہ شخص بہ خوبی جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ شخص جس نے تمہارا سیف ڈیزائن کیا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ آپ کتنے ہی اپنے کام میں ہنرمند رہے ہوں لیکن آپ اس سیف کو کھول نہیں سکتے تھے، ہزار برسوں میں بھی نہیں۔ اس میں موجود کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ اس کا احمق مالک عملی طور پر پاس ورڈ آپ کے سپرد کردے اور اس میں خلاف توقع کیا رہا؟"

"سو تم حقیقت میں اسی کے لیے آئے تھے۔ مصری گلاب کے لیے!" ناتھن منرو نے کہا۔

فریڈرک نے شانے اچکا دیے۔ "یس۔ لیکن تیس لاکھ ڈالرز ایک عمدہ سیکنڈ پرائز ہے۔ اب ڈائمنڈ میرے حوالے کردو، پلیز!"

ناتھن منرو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی جیب سے ڈائمنڈ نکال کر فریڈرک کے حوالے کر دیا۔

فریڈرک باہر جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن پھر پلٹ پڑا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے شطرنج کی بساط کے پاس پہنچ کر اپنا وزیر دوسرے خانے میں کھسکاتے ہوئے ناتھن منرو کے بادشاہ کو گھیر لیا اور حقارت سے بولا۔ "شہ مات، کتیا کے بچے!"

اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہدِ حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جارہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا.. جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے یہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی کہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رختِ سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کے مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... ہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظورِ نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا زندہ ماجرا

وہ اپریل کی ایک نیم گرم شام تھی۔ آج میری مہندی کی رسم ادا ہونا تھی۔ زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری شادی میری تایازاد عارفہ سے ہو رہی تھی۔ وہ لوگ بھی لاہور کے رہائشی تھے اور وہ گلبرگ میں رہتے تھے جبکہ ہم چوبرجی میں تھے۔ ہمارا رشتہ قریباً ڈیڑھ سال پہلے طے ہوا تھا۔ یہ عرصہ دن گن گن کر ہی گزارا گیا تھا اور اب...... آخرکار وہ گھڑیاں آ گئی تھیں جن کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا اور خاص طور سے مجھے اور عارفہ کو۔

میں سارا دن مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا اور اب قریباً تھک کر چور ہو چکا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بستر پر پڑ کر سو جاتا اور اگلے روز صبح دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتا لیکن آج ایسا کیسے ہوسکتا تھا جبکہ یہ میری مہندی کی رات تھی۔

دونوں گھروں میں علیحدہ علیحدہ مہندی ہونا تھی۔ یہ

1973ء کی بات ہے۔ ان دنوں ابھی شادی ہالز کے رواج نے زور نہیں پکڑا تھا اور ابھی مہندیاں وغیرہ تو گھر سے باہر کرنے کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی جان نے مہمانوں کے لیے بریانی کی دو دیگیں چڑھوا دی تھیں۔ پورے گھر میں گہما گہمی تھی۔ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے تھے۔ خاندان کی عورتوں نے مجھے مہندی لگائی اور رسمیں وغیرہ ادا کیں پھر وہ سب لوگ عارفہ کے گھر چلے گئے۔

اب گھر میں، میں اور بس ایک دو ملازم ہی رہ گئے تھے۔ میں نے عارفہ کو فون کرنا چاہا۔ دوسری طرف سے عارفہ کی چھوٹی بہن نے فون اٹھایا اور شوخی سے بولی۔ ''بس بھائی جان! اب کوئی بات نہیں...... کوئی فون نہیں۔ اب تھوڑا سا انتظار فرمائیے۔ چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے پھر جی بھر کر باتیں فرمائیے گا۔''

میں نے اس کی منت سماجت کی لیکن وہ سماج کی دیوار بنی رہی اور مجھے ستاتی رہی۔ میں نے تھک ہار کر فون بند کر دیا۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر نیم دراز ہو گیا اور سوچنے لگا، وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اور مختلف منزلیں یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ میرا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ والد صاحب کا لکڑی کا کاروبار تھا۔ بڑے بھائی ٹی ٹرالیز بناتے تھے اور ہماری فرم کا اچھا خاصا نام تھا۔ میں بھی گریجویشن کے دوران میں ہی اپنے کاروبار کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لکڑی یعنی ٹمبر کا کام میری طبیعت کے مطابق تو نہیں تھا لیکن والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کام میں آ جاؤں۔ آج کل میں والد کے ساتھ دکان پر ہوتا تھا اور اپنی ہمت کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میری زندگی کے بندھے راستوں پر بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی۔ شام تک دکان پر رہتا، پھر اپنے بچپن کے دوست تنویر کے ساتھ گپ شپ کرتا یا فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا۔ ٹی وی ان دنوں نیا نیا آیا تھا۔ اس میں بھی ہم لوگ بے حد دلچسپی محسوس کرتے تھے۔ اردو ڈراموں کے علاوہ، رابن ہڈ، فیوجی اور آئرن سائڈ جیسی سیریز شوق سے دیکھا کرتے۔ میرا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ میں اپنے حال میں مست رہنے والا شخص تھا۔ اسی لیے گھر والے بعض اوقات مجھے پیار سے ہارون کے بجائے ہارون بادشاہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا اپنی مہندی کی رات کی۔ میں تھکن سے چور تھا، ذرا سکون لینے کے لیے بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا...... میں جو کچھ آپ کو بتانے لگا ہوں، اس سے پہلے میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ میں صدقِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں ایک حقیقت پسند بندہ ہوں۔ میں نے مافوق الفطرت سوچوں کو کبھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی اور نہ اب دیتا ہوں۔ ہر ناقابل فہم بات کے پیچھے میں نے ہمیشہ ٹھوس وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب رہا ہوں۔

اب میں پھر اصل روداد کی طرف آتا ہوں۔ میں بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ تو گیا لیکن میرا ابھی سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے گھر والوں کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ پلکوں پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی طرح نیم دراز رہا اور خیالوں کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ وہ نیند اور بیداری کی کوئی درمیانی حالت تھی، مجھے ایک دم لگا جیسے اس اکیلے کمرے میں کوئی اور بھی میرے آس پاس موجود ہے۔ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ کمرے کے دروازے کے سامنے نظر آیا۔ وہ ایک سفید ہیولا سا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس جس کا سر بھی سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس سیاہ اور سفید داڑھی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا...... اور ایسا نہیں ہوا...... اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

پھر ایک دم وہ ہیولا اوجھل ہو گیا۔ میں جیسے چونک کر غنودگی کی حالت میں سے نکل آیا۔ کمرا خالی تھا۔ دروازہ بند تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک سنائی دی۔ سوئیاں رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہوا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ قریب ہی ریڈیو سیٹ پڑا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے پھر ریڈیو پر کوئی اسٹیشن تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

غنودگی کی حالت میں جو فقرہ میں نے سنا تھا، وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا...... ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا...... اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ مجھے اس کا کوئی سر پیر سمجھ نہیں آیا لیکن عجیب بات تھی کہ فقرے کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود تھا اور لفظ ہی نہیں، لہجہ، آواز، آواز کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ جیسے میری سماعت میں نقش ہو گیا تھا۔ بہرحال اس وقت میں نے اس واقعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ انسانی تصورات عجیب و غریب شکلیں بناتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی یہ تصورات کسی غیر مرئی آواز کا روپ دھار لیتے ہیں،

کبھی کسی منظر کا۔ کبھی کوئی اندیشہ بن جاتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور کبھی کوئی خوب صورت سپنا بن کر آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی قلبی واردات تھی۔

میرے گھر والوں کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ایک بار پھر گھر میں شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ڈھولک بجنے لگی اور گیت گائے جانے لگے۔ اب ہر ایک کو آنے والے دن کا انتظار تھا۔ تاریخ تھی 17 اپریل اور یہ دن تھا میری شادی کا۔ ہاں، وہی دن جس کا پل پل انتظار کیا گیا تھا۔

ان دنوں براتیں شام کے فوراً بعد ہی دلہن کے گھر جا پہنچتی تھیں۔ میری برات بھی آٹھ بجے کے قریب گلبرگ میں موجود تھی۔ وہ رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کی رات تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نکاح کی رسم کے فوراً بعد کھانا شروع ہو گیا۔ میں اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ رواج کے مطابق میرا کھانا اسٹیج پر ہی میز پر سجا دیا گیا۔ میرے دائیں بائیں میرے گھر والے موجود تھے۔ بڑے بھائی فاروق نے میرے لیے کھانا پلیٹ میں نکالا۔ میں نے پہلا لقمہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری نظر سامنے مہمانوں کی طرف اٹھی۔ بہت سے افراد کے پیچھے مجھے ایک شخص نظر آیا اور مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہے۔ یہ وہی کل رات والا ہیولا تھا۔ سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس۔ چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ بس سفید اور سیاہ ڈاڑھی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جیسے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے نظر آ کر وہ اوجھل ہو گیا۔ میں ہکا بکا سا بیٹھا تھا۔ بڑے بھائی جان نے کہا۔ ''کیا بات ہے ہارون! کیا ہوا؟''

''کک...... کچھ نہیں بھائی جان۔''

''کسی سے کچھ کہنا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں۔''

''تو کھانا کھاؤنا بھئی۔'' وہ چمچ میرے ہاتھ میں تھما کر بولے۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اب کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پر جبر کر کے میں نے کھانا کھانے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کیوں، کل رات سنا ہوا فقرہ...... بے معنی فقرہ پھر میرے کانوں میں گونجنے لگا...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

یہ کیا فقرہ تھا؟ یہ کیا لفظ تھے؟

انسان کے دشمن

انسان کے چار دشمن بڑے خطرناک ہیں، ان سے بچنے کے لیے نہایت ہوشیاری اور کوشش درکار ہے۔

1۔ دنیا...... نہایت دھوکے باز اور مکار ہے۔
2۔ نفس...... یہ تمام دشمنوں سے زیادہ عیار ہے۔
3۔ شیطان...... اس کا تو مشن ہی انسان دشمنی ہے۔
4۔ برا انسان...... برا ساتھی، شیطان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو لاحول ولا سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ تو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید عباسی، نیو سینٹرل جیل ملتان

میں نے خود کو ملامت کی اور اپنے بے مطلب خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ماورائی خیالات...... اور توہمات کے لیے میرے ذہن میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں نے ہر چیز کو ہمیشہ ٹھوس ثبوتوں اور سائنسی نقطۂ نظر کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات بھی اس واقعے نے مجھ پر تادیر اثر نہیں کیا۔ میں نے اپنی اس پریشان خیالی کو جلد ہی فراموش کر دیا اور شادی کے ہنگاموں میں کھو گیا۔

کھانے کے بعد پورے جوش و خروش سے مختلف رسمیں ادا ہوئیں اور میری برات، گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں، دلہن کو گلبرگ سے لے کر چوبرجی پارک ہماری رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اپریل کی وہ شب بڑی خوشگوار تھی۔ موسم قدرے ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں بہانے سے بار بار اپنے کمرے کی طرف جاتا تھا۔ میری بہنیں اور کزنز وغیرہ مجھ پر فقرے کستی تھیں اور مجھے وہاں سے چلتا کرتی تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنا مشکل ہو رہی تھیں۔ کتنا اہم ہوتا ہے یہ شادی کا دن۔ زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے...... اور اس سے بھی اہم شبِ عروس۔ خوشیوں اور مرادوں کی گھڑیاں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جوڑوں کی صورت میں بنایا پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کی پھر انہیں قربت کی مسرتوں اور جدائی کی

تکلیفوں سے آشنا کیا...... ایک ایسا نظام بنایا جو اس کائنات میں زندگی کو رواں دواں رکھتا ہے۔

میں گھر کے سامنے گراسی لان پر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے چھیڑنے اور تنگ کرنے میں میرا قریبی دوست تنویر پیش پیش تھا۔ دل کے اندر خوشی ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری زندگی ایک کتنے سنگین رخ پر مڑنے والی ہے۔ میں ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چکا ہوں جس کی ایک جانب میری دلہن ہے، میرا گھر ہے اور بے مثال خوشیاں ہیں۔ دوسری طرف تاریکی ہے، ویرانی ہے اور لرزا دینے والے واقعات ہیں۔

بعض اوقات انسانی زندگی کا رخ موڑنے کے لیے کسی بڑے واقعے یا حادثے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی چھوٹی سی بات، کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی تہلکہ خیز تبدیلیاں لے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آج ان باتوں کو کم و بیش 41 سال گزر چکے ہیں۔ میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میرے بچے ہیں، ان کے بچے ہیں۔ زندگی کا باقی سفر شاید اب بہت طویل نہیں رہا لیکن میں آج بھی اس رات کو اور اس رات میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کیا وہ اتنی ہی بڑی بات تھی جس کی وجہ سے میرے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس نے مجھے ہی نہیں، میرے اہلِ خانہ اور میرے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، تہس نہس کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے لگاتے مجھے پیاس محسوس ہوئی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے اندر آیا۔ لان میں بھی ایک شامیانہ لگا تھا۔ قنات کے قریب سے گزرتے ہوئے میں ذرا ٹھٹک گیا۔ قنات کی دوسری طرف ہمارے محلے کی ہی دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے اتنا پاس ہے اور ان کی آواز صاف سن رہا ہے۔ ایک عورت نے کہا۔ ''ہاں...... ہارون ابھی کرتا ورتا تو کچھ نہیں۔ باپ ہی پیسے اس کی جیب میں ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے بوجھ اٹھائے گا بیوی کا اور پھر بچوں کا۔''

دوسری عورت نے کچھ اس سے بھی زیادہ سخت بات کی۔ مطلب اس بات کا بھی وہی تھا جو پہلی عورت کی بات کا تھا۔

پہلی عورت نے دوبارہ کہا۔ ''بس بڑوں نے ہی پکڑ دھکڑ کر شادی کر دی ہے۔ اب وہی اس کا گھر بھی چلائیں گے۔''

میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ عورتیں سرگوشی کے لہجے میں زہر اگل رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین کے اندر گڑ گیا ہوں۔ میں اتنا گیا گزرا تو نہیں تھا جتنا وہ مجھے سمجھ رہی تھیں اور پھر ان کی زبان اور لہجہ...... میرا دل چاہا کہ ان کے سامنے چلا جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور یہ سب کچھ کہنے کا کیا جواز ہے ان کے پاس۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ بندے کو پتا چلتا ہے کہ اس کی پیٹھ پیچھے کس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔

میں اپنی پیاس وغیرہ بھول گیا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ چھت خالی تھی۔ میں جیسے نڈھال سا ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چھت پر بجلی کے وہ تار بچھے تھے جن کے ذریعے آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ چھت پر بھی محسوس کی جا سکتی تھی لیکن میرے اندر کا منظر کچھ اور ہو گیا تھا۔ میرے اندر کی ساری روشنیاں جیسے ایک دم بجھ گئی تھیں۔ گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی۔ مجھے لگا میں دلہا نہیں ہوں، ایک مرا ہوا شخص ہوں جس کے کفن دفن کا انتظام کیا جانے والا ہے۔ ایک کھنڈر ہوں جو تیز بارش میں کسی بھی وقت مسمار ہو جائے گا یا ایک کھوکھلی جڑوں والا درخت جسے ہوا کا ایک تیز جھونکا اکھاڑ پھینکے گا۔

یہ کیا ہو گیا تھا میرے ساتھ؟ آناً فاناً میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔ ارد گرد کی خوشیوں، رونقوں اور روشنیوں سے بہت دور چلا گیا تھا میں۔ منظر اجنبی محسوس ہو رہے تھے اور آوازیں غیر لگ رہی تھیں...... ہاں، میں آج بھی سوچتا ہوں، کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ میں نے دو عورتوں کو اپنے بارے میں طنزیہ گفتگو کرتے سنا تھا یا پھر کوئی اور وجہ بھی تھی...... کوئی ایسی وجہ جو زیادہ بڑی تھی، زیادہ گہری اور گمبھیر تھی؟

میں قارئین سے کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، صاف سیدھے الفاظ میں بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ کہیں کہیں مجھ سے اتفاق نہ کیا جائے۔ میرے عمل کو غیر حقیقی یا جذباتی سمجھا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ شاید اصل روداد سے فلاں واقعے کا زیادہ تعلق نہیں...... لیکن میں وہی بتاؤں گا جو جو میرے ساتھ ہوا اور جو اس کہانی کا حصہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں قریباً آدھ گھنٹا اس تاریک چھت پر بیٹھا رہا اور اپنے اندر کی بجھی ہوئی روشنیوں میں سے کوئی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کرن کہیں نہیں تھی۔ روشنی کا نقطہ تک نہیں تھا۔ میں بجھ چکا تھا۔

مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ دل و دماغ پر ایک سیاہ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی جیسے میرے اندر سے یہ آواز بلند کیے رہا تھا...... ہارون! چلے جاؤ یہاں سے...... بہت دور نکل جاؤ...... سب کچھ چھوڑ دو...... خیر آباد کہہ دو۔ یہاں کچھ نہیں ہے تمہارے لیے...... یہاں رکے رہو گے تو دم گھٹنے سے مر جاؤ گے۔ تم یہاں کے لیے نہیں ہو...... اور یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ایک بے کار انسان ہو۔ دنیا کی حقیر ترین مخلوق ہو۔ تم کسی کے کام کے نہیں ہو۔ اپنا چہرہ چھپا لو...... اپنی شکل لے کر ویرانوں کا رخ کر لو، کسی سمندر کی تہ میں بیٹھ جاؤ...... کسی صحرا کی ریت میں دفن ہو جاؤ یا پھر خاک بن کر دور دراز کی ہواؤں میں بکھر جاؤ۔

کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ مجھے میرے گھر سے نکال رہا تھا۔ جگمگاتی روشنیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ میری دلہن چند قدم کے فاصلے پر حجلۂ عروسی میں موجود تھی۔ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سننے کی منتظر تھی اور میں ذہنی طور پر اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر جا چکا تھا۔ نچلی منزل سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے چہکار رہے تھے۔ صحن میں بڑے بھائی جان کھڑے تھے۔ شاید کل کے ولیمے کے لیے ابا جان اور دوسرے بھائیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔

میں جیسے ایک سیاہ غبار میں چلتا ہوا نیچے آیا۔ کسی نے مجھ سے کیا کہا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے کسی کو کیا جواب دیا، مجھے یہ بھی یاد نہیں...... میرے اردگرد اس وقت کیا ہو رہا تھا، میں یہ بھی بھول چکا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے...... بہت سے مہمان سو چکے تھے۔ کئی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا والدہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ شاید شکرانے کے نفل ادا کرنے میں مصروف تھیں۔ میں ان کے پاس سے گزر کر اپنی الماری تک آیا۔ الماری میں میرا پاسپورٹ اور کچھ دیگر کاغذات موجود تھے۔ میں نے پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا، کچھ نقدی الماری میں سے لی، کچھ سلامیوں کی صورت میں میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ میں کسی معمول کی طرح چلتا ہوا صحن میں پہنچا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ شاید کسی نے عقب سے مجھے آواز دی تھی، شاید میں نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً یہ کہا تھا کہ میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں...... کولڈ ڈرنک لینے......

اور میں نکل آیا تھا۔ اپنی شب عروسی کو چھوڑ کر، اپنی دلہن کو چھوڑ کر اور اپنے جگمگاتے گھر کو چھوڑ کر۔ میرے قدم بے ساختہ اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ میرے جسم پر وہی دو ملے والا پینٹ کوٹ تھا...... اور ان پھولوں کی خوشبو ابھی تک میرے لباس میں موجود تھی جو رسموں کے دوران میں مجھ پر نچھاور کیے گئے تھے۔ وہ رات قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں نے مین سڑک پار کی اور مزنگ چونگی کی طرف چل دیا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ جو لوگ لاہور کے اس علاقے کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ چوبرجی پارک اور مزنگ چونگی کے درمیان لاہور کا سب سے بڑا...... بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا قبرستان میانی صاحب پڑتا ہے۔ میں اسی قبرستان کے اندر سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور حد نگاہ تک بس جھاڑیاں تھیں یا قبروں کے بیکراں سلسلے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں بھی ایک مردہ ہوں اور ابھی ابھی کسی قبر سے نکل کر چل پڑا ہوں۔ جتنی تاریکی باہر تھی، اس سے کئی گنا زیادہ میرے اندر تھی۔

اچانک مجھے دو جسیم کتے نظر آئے۔ یہ آوارہ کتے جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا لیکن میں زندہ کہاں تھا۔ اپنے اندر کی روشنیاں بجھنے کے بعد، میں تو ایک مردہ تھا اور جو پہلے ہی مردہ ہو اسے مرنے یا تکلیف جھیلنے کا ڈر کہاں ہوتا ہے۔ کتے شور مچاتے ہوئے میری طرف لپکے تو میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا...... ان کا جوش قدرے ماند پڑ گیا۔ وہ جیسے تعجب کے عالم میں مجھے دیکھتے رہے، پھر وہ آگے بڑھے اور ان کی تھوتھنیاں میری ٹانگوں سے آ لگیں۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ وہ اپنی تھوتھنیوں کے ساتھ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ جیسے وہ جان گئے ہیں کہ میں کتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہا ہوں۔ وہ مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔ مجھے اس سنگین اور بھیانک غلطی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں ایک ٹرک سنسان سڑک پر سے فراٹے بھرتا ہوا گزرا۔ یہ سڑک بس دس پندرہ قدم کی دوری پر تھی۔ ٹرک کے شور اور اس کے کرخت ہارن نے کتوں کی توجہ میری طرف سے ہٹا دی...... وہ ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹے اور پھر جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ میری دیوانگی کا ریلا مجھے پھر اپنے آپ میں بہانے لگا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا مزنگ چونگی پہنچا۔ وہاں جو بس سب سے پہلے نظر آئی، میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس چوک یتیم خانے کی طرف جا رہی تھی۔ چوک یتیم خانے کی جانب جاتے ہوئے یہ بس پھر ہماری رہائش گاہ کی جانب سے گزری۔ قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مجھے اپنے دو منزلہ

گھر کی رنگ برنگی روشنیاں نظر آئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سینے میں پھیلا ہوا غبار کچھ اور بھی گہرا ہوگیا۔ ایک بار جی میں آیا کہ اپنے قدم روک لوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ واپس چلا جاؤں..... لیکن تیر کمان میں سے نکل چکا تھا..... تقریباً دس منٹ بعد میں چوک یتیم خانے میں تھا۔ یہاں سے دوسرے شہروں کو جانے والی گاڑیاں... بہ آسانی مل سکتی تھیں۔ میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ جگہ بھی ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک بس کھڑی تھی۔ ساہیوال جانے کے لیے تیار تھی، میں اس میں سوار ہوگیا۔

کچھ واقعات اتفاقاً پیش آتے ہیں اور ہم انہیں اپنے ساتھ اور اپنے حالات کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ بس میں جو تین بہ ظاہر غیر اہم واقعات پیش آئے، ان کا تعلق میری ذات سے تھا یا نہیں لیکن وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میں انہیں بغیر کمی بیشی کے یہاں لکھ دیتا ہوں۔ ہم ابھی بہ مشکل لاہور شہر سے باہر نکلے تھے کہ اچانک بس کے بریک زور سے چرچرائے۔ پھر وہ بری طرح لہرائی۔ مسافروں کے منہ سے بے ساختہ 'یااللہ خیر' کے الفاظ نکل گئے۔ ڈرائیور گاڑی کو بہت مشکل سے کنٹرول کر سکا تھا۔ دراصل کوئی جانور گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔ پتا نہیں کیوں میری آنکھوں سے لگاتار آنسو بہتے چلے جارہے تھے، جنہیں چھپانے کے لیے میں آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اپنی پیشانی اگلی نشست کی پشت سے ٹکائی ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ کیوں ہو رہا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

بس لاہور سے ساٹھ ستر میل دور آچکی تھی، جب ایک بار پھر مسافروں کے دل سینوں میں اچھل کر رہ گئے۔ سڑک کراس کرنے والے کسی دیہاتی کو بچاتے ہوئے بس ایک بار پھر بری طرح لہرائی اور سڑک کنارے بجری کے ایک ڈھیر پر چڑھ گئی۔ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ اس نے بس کو... بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ مسافروں میں سے کئی ایسے بھی تھے جو اسے تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ کچھ احتیاط سے گاڑی چلانے کی ہدایت کرنے لگے۔ ڈرائیور بہ ظاہر تجربہ کار ہی دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ تاہم اس مرتبہ گاڑی کی رفتار خاصی کم تھی..... اور ڈرائیور کے علاوہ مسافر بھی الرٹ نظر آرہے تھے۔ ابھی ہم ساہیوال سے دس پندرہ میل دور ہی ہوں گے کہ ایک بار پھر سب دہل گئے۔ اس مرتبہ گاڑی کے نیچے سے کچھ زوردار آوازیں آئی تھیں۔ جیسے لوہے کے ساتھ لوہے نے زوردار رگڑ کھائی ہو۔ کئی مسافروں نے کلمۂ طیبہ پڑھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کنارے پر روک دی۔ کنڈیکٹر بھی نیچے اتر آیا اور ٹارچ کے ذریعے گاڑی کے نیچے تاک جھانک کرنے لگا۔

مجھے ڈرائیور کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ وہ پہلے تو پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر مسافروں کی طرف دیکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں پندرہ سال سے گاڑی چلا رہا ہوں لیکن اس طرح کا تماشا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ سواریوں میں سے جو بھی اپنا برا مقدر لے کر اس بس میں بیٹھا ہوا ہے، خدا کے واسطے نیچے اتر جائے۔ نہیں تو ہم کبھی ساہیوال نہیں پہنچیں گے۔''

پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور نیچے اتر کر چل دیا۔ کئی مسافر... ہکا بکا سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے بعد سواریوں نے میرے بارے میں کیا کہا یا ڈرائیور اور کنڈیکٹر وغیرہ نے کیا تبصرہ کیا..... مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنے ہی ریلے میں بہتا چلا جارہا تھا..... اور اس وقت مجھے یہی لگ رہا تھا کہ شاید ڈرائیور نے ''برے مقدر والی سواری'' کی جو بات کی ہے وہ میرے بارے میں ہی تھی۔ واقعی مجھ سے برے مقدر والا اور کون ہوسکتا تھا..... جو اپنی من چاہی دلہن کو پھولوں کی سیج پر چھوڑ کر ویرانوں کی طرف نکل آیا تھا۔

اب رات کا آخری پہر تھا۔ کچے راستے کو گھنے درختوں اور گھٹا ٹوپ تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اپنی چمچماتی ہوئی گھڑی دیکھی۔ فجر کی اذان ہونے میں قریباً پون گھنٹا باقی تھا۔ میں اندازاً ایک فرلانگ چلنے کے بعد کھیتوں کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے اردگرد تاریک تنہائی تھی اور ان دیکھے راستے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ اپنی تہجد گزار ماں یاد آئی..... اور عارفہ یاد آئی۔ میں رونے لگا۔ پہلے سسکیاں لیتا رہا..... پھر ہچکیوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ میں رویا اور کھل کر رویا لیکن لگاتار بہتے ہوئے آنسوؤں نے بھی سینے کی آگ کم نہیں کی۔ یہاں کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ..... اے پہلی رات کے سجے سجائے دُولہا تم ان ویرانوں میں بیٹھ کر کیوں گریہ کر رہے ہو..... دیکھو، تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔ تمہارا عروسی لباس مٹی میں لتھڑ گیا ہے۔ تمہارے چہرے پر مسافت کی

گرد ہے اور تمہاری آنکھوں میں بربادیوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں...... ہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور نہ دلاسا دینے والا تھا۔ بس کانوں میں وہی زہریلے الفاظ گونج رہے تھے جو شامیانے کے اندر بیٹھی ہوئی ان دو عورتوں نے کہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ الفاظ صرف ان دو عورتوں نے نہیں کہے، ساری دنیا نے کہے ہیں لیکن میں پھر کہوں...... میں نے اس وقت سوچا تھا اور اب بھی یہی سوچتا ہوں......

کیا بس وہ چند طنزیہ الفاظ ہی تھے جنہوں نے مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کرایا؟ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر جگہ ہوا ہی کرتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر بدخواہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بڑے بڑے اچھوں کو بھی برا بنا دیا جاتا ہے۔ غلط بیانیاں، جھوٹ، الزام تراشیاں، تضحیک، کردار کشی، کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن کیا کسی ایسے واقعے کی وجہ سے اتنا بھیانک قدم اٹھایا جاسکتا ہے؟ یا پھر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی، اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ تھی...... اور تب...... ایک بار پھر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔

میرے کانوں میں وہی ناقابلِ فہم فقرہ گونجا...... یہ کیا الفاظ تھے؟ یہ کیوں کہے گئے تھے؟ کیا یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا یا پھر یہ اتفاق نہیں تھا۔ میری سماعت ان الفاظ کی بازگشت کو پھر محسوس کرنے لگی...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا نا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ان الفاظ میں اور میرے یہاں اس جگہ موجود ہونے میں ایک تعلق ہے۔ گہرا تعلق۔

میں ان بے معنی الفاظ کی بازگشت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اسی کوشش میں اٹھ بیٹھا۔ میرا نیا نکور پینٹ کوٹ کھیتوں کی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے جھاڑا اور ایک بار پھر نامعلوم سمت میں چل دیا۔ میں کہاں جارہا تھا۔ سینے میں پھر دھواں سا بھر رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اپنی اس بے کار اور گناہ گار زندگی سے پیچھا چھڑالوں...... خود کو ختم کرلوں۔ بس یہی ایک حل نظر آتا تھا اپنے اندر کی بے پناہ اذیت سے چھٹکارا پانے کا۔ اچانک مجھے پانی کے بہاؤ کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا تو جھاڑیوں کے درمیان ساہیوال کی بڑی نہر نظر آئی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور شب کی خاموشی میں پانی کے بہنے کی صدا بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اس وسیع نہر کے کنارے گھاس پر جا کھڑا ہوا۔ پانی کو دیکھنے لگا۔ دل و دماغ میں پیدا ہوجانے والے خیالات بڑے خوفناک تھے۔ مجھے اس پانی کی گہرائی میں اپنی نجات نظر آرہی تھی۔ جو قدم اٹھا کر میں اپنے گھر سے یہاں چلا آیا تھا، وہ بہت بڑا تھا۔ اس کے نتیجے بھی بہت بڑے اور سنگین نکلنا تھے۔ ان سارے نتیجوں اور اندیشوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی نظر آرہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اگر میں نہر میں کود جاتا تو یقیناً اس دنیا کے غموں سے چھٹکارا پاجاتا۔

اچانک ''اللہ اکبر'' کی صدا میرے کانوں میں پڑی۔ یہ اذانِ فجر تھی۔ آخرِ شب کی جادوئی فضا میں یہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی تو جیسے چند لمحوں کے لیے میرے سینے میں سلگتی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تاریکی میں دھیان سے دیکھا...... وہ ذرا لمبے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول براؤن ٹوپی تھی۔

وہ ذرا ڈرے ڈرے لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کررہے ہو؟''

''کک...... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی کھڑا تھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں...... کوئی...... نشہ وغیرہ تو نہیں کیا ہوا تم نے؟''

''نن...... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

اس شخص کا خوف اب ذرا کم ہوگیا تھا۔ وہ ہمدرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ میں تمہیں وہاں اس کھیت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے تم نہر میں گر پڑو گے۔ کہاں سے آئے ہو تم...... ساہیوال کے تو نہیں لگتے ہو؟''

''نہیں...... میں...... ملتان سے آیا ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا گھورا۔ میرا انتہائی قیمتی سوٹ، مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ''بش پپی'' کے بوٹوں کی حالت اس سے بھی پتلی تھی۔ میری گھڑی، میری انگوٹھی وغیرہ مجھے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ثابت کرتے تھے۔ وہ الجھے الجھے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک ٹیوب ویل کے قریب نیم کے پیڑ کے نیچے آبیٹھے۔ اس شخص

نے اپنا صافہ نما کپڑا گھاس پر بچھا دیا تھا۔ اب ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو زیادہ اچھے طریقے سے دیکھ سکتے تھے۔ اس شخص کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ اردو بولتا تھا تاہم لہجہ کسی حد تک بلوچی تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام فیروز خان بتایا اور...... یہ بتایا کہ وہ یہاں ایک پاس کے گاؤں میں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بوڑھی والدہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ خود کوئٹہ میں ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ مہینے دو مہینے بعد یہاں گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ یہ گھر اس کی بیوی کو اپنے والدین کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ میں نے فیروز کو اپنا نام اشرف بتایا اور کہا کہ میں ملتان سے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے ساہیوال آیا تھا۔ رات کو کسی بات پر والد سے جھگڑا ہو گیا اور میں ناراض ہو کر ادھر چلا آیا۔

فیروز نے میری بات پر کس حد تک یقین کیا؟ اور پتا نہیں کیا بھی یا نہیں؟ بہرحال اس نے مجھ سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ اس کے رویے میں سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ میری حالتِ زار کو دکھ کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور میرے لیے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آج شام ہی کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور اگر میں اس سے کسی طرح کی مدد چاہتا ہوں تو اسے بتاؤں۔

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے جا سکتے ہیں؟ میں چند دنوں کے لیے اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دور جانا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔ ”لیکن تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ تمہیں کسی طرح انہیں اطلاع تو پہنچا دینی چاہیے۔“

”آ...... آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں اطلاع پہنچا دوں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ کرائے وغیرہ کی فکر نہ کرے، میرے پاس پیسے موجود ہیں۔

وہ بولا۔ ”آؤ، میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہوگا انکل۔ میرا حلیہ دیکھ کر آپ کے گاؤں والے حیران ہوں گے۔ میں یہاں سے سیدھا ساہیوال ریلوے اسٹیشن چلا جاتا ہوں۔ آپ نے بھی وہاں سے ہی سوار ہونا ہے نا؟“

انکل فیروز کا جواب ”ہاں“ میں تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے درمیان سارا پروگرام طے ہو گیا۔ مجھے ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر انکل فیروز کا انتظار کرنا تھا۔ اسے شام پانچ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے وغیرہ جھاڑے۔ جہاں مٹی کے سخت داغ تھے ان جگہوں کو گیلے رومال سے صاف کیا۔ ٹیوب ویل کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا اور اپنے بکھرے بالوں میں کنگھی کی، اس کے بعد میں انکل فیروز سے رخصت ہو کر پکی سڑک کی طرف چل دیا۔ اب میری طبیعت کچھ بدلی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت تادیر رونے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ اب میں آگے...... اور آگے نکلنا چاہتا تھا۔

میں بذریعہ بس دن گیارہ بجے کے قریب ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل سے بسکٹ اور چائے کا ناشتا کیا۔ کچھ بھی گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ یہ سوچ کر آنکھیں پھر نم ہو گئیں کہ اگر اس وقت میں اپنے گھر میں ہوتا تو شاید عارفہ کے گھر والے اس کا ناشتا لے کر ہمارے گھر آئے ہوتے...... ہر طرف کھانوں کی خوشبو اور قہقہے بکھر رہے ہوتے۔

اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں انتظار گاہ سے باہر لکڑی کی ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ دل میں پھر دھواں سا جمع ہونے لگا۔ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟ عارفہ پر کیا بیت رہی ہوگی؟ گھر والے مجھے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے؟ لوگ کس طرح کی باتیں بنا رہے ہوں گے؟ دل چاہا کہ کسی جگہ سے، گھر ٹیلی فون کروں اور گھر والوں کو کم از کم اتنا بتا دوں کہ خیریت سے ہوں۔ والدہ کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومی اور یہ خیال مزید پختہ ہونے لگا کہ مجھے کسی طرح گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، ایک بار پھر میرے اندر کی ساری بتیاں بجھ گئیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہی سفید کپڑوں والا ہیولا میرے پیچھے کہیں موجود ہے۔ جسے میں نے اپنی مہندی کی رات دیکھا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ بھی سفید کپڑے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھے ہرگز واپس نہیں جانے دے گا اور اگر میں جانے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے زبردستی روکے گا۔ شاید زخمی کر دے گا یا پھر مار دے گا۔

مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جو قرآنی سورتیں یاد تھیں، انہیں پڑھنے کی کوشش

کرنے لگا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ میرے گھر سے نکلنے میں دو عورتوں کی زہریلی گفتگو کا اتنا دخل نہیں ہے، جتنا اس سفید پوش ہونے کو ہے۔ اگر میں ان دو عورتوں کی گفتگو نہ بھی سنتا تو شاید کوئی ایسی بات ہو جاتی جس کی وجہ سے مجھے اپنی دلہن کو چھوڑ کر آنا پڑتا۔ یہ سب کچھ ایک پہیلی کی طرح تھا اور اس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پروگرام کے مطابق پانچ بجے سے پہلے ہی فیروز اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ میرے لیے گھر سے آلو والے پراٹھے پکوا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی دہی کی چٹنی تھی۔ اس نے بہت اصرار کر کے مجھے دو چار لقمے کھلائے۔ وہ ٹکٹ کے پیسے نہیں لینا چاہتا تھا لیکن میں نے زبردستی دیے۔ وہ دو ٹکٹ لے آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے گھر والوں کو فون کیا؟ میں نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی مجھے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

گاڑی قریباً دو گھنٹے لیٹ تھی۔ جب گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پلیٹ فارم پر کھلبلی سی مچ گئی۔ قلیوں کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ہمارے پاس چونکہ برائے نام ہی سامان تھا اس لیے ہم اطمینان سے تھے۔ میں نے یونہی اپنے عقب میں دیکھا۔ ایک بار پھر مجھے یہی لگا جیسے سینے میں میرا دل رک گیا ہے۔ بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پیچھے مجھے ایک بار پھر اسی سفید پوش کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ جھلک ایک سیکنڈ کے لیے تھی یا شاید اس سے بھی کم وقت کے لیے۔ میں آنکھیں پھاڑے اس سمت میں دیکھتا چلا گیا۔ فیروز نے میرا کندھا ہلایا۔ ”کیا بات ہے اشرف؟“

”کچھ...... نہیں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا اور ریلوے لائن کی طرف دیکھنے لگا جہاں دور ہماری گاڑی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ کیا میں واہموں کا شکار تھا؟ میری نظریں بار بار دھوکا کھا رہی تھیں؟ مجھے ایک ایسا منظر دکھا رہی تھیں، جس کا کوئی وجود نہیں تھا؟ نفسیات کی زبان میں اسے ”بصری دھوکا“ کہا جاتا ہے...... یعنی Optical illusion۔ ایسے بصری دھوکوں کا تعلق عموماً انسان کے اپنے اندر کی کیفیات سے ہوتا ہے۔

اسی دوران میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے اور ساہیوال سے کوئٹہ کی طرف ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ میں گاڑی کی کھڑکی میں سے شمال کی طرف دیکھنے لگا...... شمال کی طرف لاہور تھا...... میرا گھر تھا...... میرے گھر والے تھے...... اور میری دلہن تھی۔ میں ان سب سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز ہم کوئٹہ میں تھے۔ بلوچستان کا دارالحکومت، ایک خوب صورت شہر۔ یہاں موسم قدرے خنک تھا۔ انکل فیروز کو اب میں فیروز چاچا کہنے لگا تھا اور ایسا فیروز چاچا کی خواہش پر ہی ہوا تھا۔ فیروز چاچا کا خیال تھا کہ ”انکل“ کا لفظ کچھ بھاری بھاری ہے اور اس میں بیگانگی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تین دنوں میں فیروز چاچا نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ ان کے بہت اصرار کرنے پر میں نے انہیں اپنا اصل نام ہارون بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا تعلق ملتان سے نہیں بلکہ لاہور سے ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا اور فیروز چاچا کی دانائی تھی کہ انہوں نے مزید کچھ جاننے پر زور بھی نہیں دیا تھا۔

کوئٹہ کے بارونق علاقے میں فیروز چاچا کا چھوٹا سا ہوٹل تھا لیکن ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ رات بارہ بجے تک ہوٹل بند ہو جاتا تھا اور ہم اس کے اندر ہی سو جاتے تھے۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، ہم سونے سے پہلے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فیروز چاچا نے میری گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں فی الحال پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا اور میری خواہش ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ایران چلا جاؤں۔ فیروز چاچا کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پاس معقول رقم موجود ہے جو ایران کے سفر میں میرے کام آ سکتی ہے۔ فیروز چاچا نے کہا۔ ”ہارون! تم کسی اچھے گھر کے چشم و چراغ لگتے ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو۔ میں تمہیں مشورہ دینے کے قابل تو نہیں ہوں پھر بھی ایک بڑے کی حیثیت سے اتنا ضرور کہوں گا کہ وطن...... وطن ہی ہوتا ہے۔ پردیس میں بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ اپنی جان پر بڑا ظلم سہنا پڑتا ہے۔“

”میں نے سب سوچ لیا ہے چاچا...... اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“

”گھر والوں کو جانے کی اطلاع ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا چاچا...... کہ ساہیوال سے ہی فون کر دیا تھا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

فیروز چاچا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر تم ارادہ کر ہی چکے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم سو گئے...... لیکن اگلے روز یہ ہوا کہ فیروز چاچا کی مدد لینے کے بجائے میں نے خود ہی ایرانی ویزے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں کیا

ہو رہا تھا میرے اندر۔ دل یہ چاہتا تھا کہ بس جلد از جلد پاکستان کی سرحدوں سے نکل جاؤں۔ پیچھے کا خیال کرتا تھا تو ایک دم میرے اندر کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی تھیں۔ یہ اندر کا اندھیرا مجھے ڈراتا تھا اور اس اندھیرے میں ایک سفید پوش کا ہیولا چمکنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ ویزے کی درخواست کے لیے سب سے پہلے حفاظتی ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں اور اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں مقررہ اسپتال گیا اور وہاں سے حفاظتی ٹیکے لگوائے۔ حفاظتی ٹیکے لگانے والا بلوچی نوجوان عابد میرے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ ملنسار شخص تھا۔ ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر گھر لے گیا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے مجھے پر تکلف کھانا کھلایا اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لاہور چھوڑنے کے بعد میرے اندر ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ''مجھ سے ملنے والے'' مجھ سے ہمدردی اور لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔ پہلے فیروز چاچا اور اب عابد بھائی بھی ایسے ہی رویے کا اظہار کر رہے تھے۔ فیروز چاچا کی طرح میں نے عابد کو بھی یہی بتایا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ والد سے جھگڑے کے بعد گھر چھوڑ آیا ہوں اور اب انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ میرے اندر کا دکھ میرے لہجے میں بولتا تھا اور سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔

میں نے وہ رات عابد بھائی کے گھر ان کی بیٹھک میں ہی گزاری۔ صبح اس نے مجھے ڈبل روٹی، انڈے، بسکٹ اور چائے کا ناشتا کروایا اور اپنے ساتھ ہی اسکوٹر پر دفتر لے آیا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس نے میرا ٹیکوں کے کورس والا سرٹیفکیٹ تیار کروا دیا۔

میں نے عابد کا شکریہ ادا کیا اور واپس فیروز چاچا کے ہوٹل پہنچ گیا۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ سفر کے لیے معقول رقم بھی موجود تھی۔ مجھے امید تھی کہ ایران کے لیے میرا ویزا لگ جائے گا لیکن اگلے روز مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایرانی قونصلیٹ پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ پنجاب میں رہائش رکھنے والوں کو ایرانی ویزا کوئٹہ سے نہیں اسلام آباد سے ملتا ہے۔

میں سخت پریشان ہوا۔ کسی بندے نے مشورہ دیا کہ فلاں افسر سے ملو شاید کام بن جائے۔ میں اس افسر کے دفتر کی طرف جانا چاہ رہا تھا جب ایک گارڈ نے مجھے روکا اور سخت کلامی کی۔ بڑا بدتمیز سا بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کا دماغ ٹھکانے لگانا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ وہ اپنے تن و توش میں مجھ سے دوگنا کے قریب تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ میں چند سیکنڈ میں اسے ناکوں چنے چبوا سکتا ہوں مگر میں اپنے شہر میں نہیں تھا۔ پردیسی تھا اور بدحال تھا۔ کسی بڑے جھگڑے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس خرد ماغ گارڈ کی گالیاں بھی سن لیں اور دو چار دھکے بھی کھا لیے۔ اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ ایک قریبی باغیچے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ ایک بلوچی...... جو شاید میری ہی طرح یہاں کے عملے کا ستایا ہوا تھا، میرے قریب آ بیٹھا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔

شام کے وقت میں فیروز چاچا کے ہوٹل واپس پہنچ گیا۔ چاچا کے ہوٹل میں میرا قیام و طعام بالکل مفت تھا۔ دلجوئی کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا میں برے لوگوں کی کمی نہیں تو اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ میں نے وہ رات بے چینی کے عالم میں گزاری اور اگلے روز پھر عابد بھائی کے پاس اس کے دفتر میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق عابد بھائی بڑی خوش دلی سے ملا۔ چائے بسکٹ سے میری تواضع کی۔ میری کل کی کارگزاری کے بارے میں پوچھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے صورت حال بتائی۔ وہ بھی آزردہ ہو گیا۔ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کل میں تمہارے ساتھ قونصلیٹ جاؤں گا۔''

دفتر کا ٹائم ختم ہو گیا تو عابد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اچھا کھانا کھلایا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے آٹو رکشا میں بٹھا کر ایرانی قونصلیٹ لے گیا...... جس خرد ماغ سیکیورٹی گارڈ نے کل مجھ سے بدتمیزی کی تھی، وہ دور کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ بہر حال عابد بھائی کو میرے ساتھ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھ سے کچھ کہتا یا مجھے روکنے کی کوشش کرتا۔ ہم دونوں برآمدے سے گزرتے ہوئے سیدھے ہائی کمشنر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہائی کمشنر خندہ پیشانی سے ملا۔ عابد کا حال احوال دریافت کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ عابد نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ ہائی کمشنر چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، تمہیں ویزا دے دیتے ہیں۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بہ مشکل شکریے

کے الفاظ کہے۔

گھنٹی بجا کر ایک ملازم کو بلایا گیا۔ اس نے ویزا درخواست کا فارم اور قلم میرے سامنے رکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''اسے پُر کر دیجیے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے فارم بھرنا شروع کیا۔ اس وقت مجھے مزید حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہائی کمشنر صاحب خود اٹھ کر میرے پاس چلے آئے اور میرے قریب کھڑے ہو کر فارم بھرنے میں میری مدد کی۔ اسی دوران میں باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو چائے لانے کا آرڈر بھی ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہی خرد ماغ گارڈ میرے سامنے جھک کر چائے پیش کر رہا تھا جس نے کل مجھ سے بدزبانی کی اور دھکے دیے تھے۔ میں چاہتا تو کمشنر صاحب سے شکایت کر سکتا تھا مگر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

عابد بھائی کی کوشش رنگ لائی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی ایرانی ویزا میرے ہاتھ میں تھا۔ عابد بھائی کے لیے میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ بہ وقتِ رخصت میں نے باقاعدہ عابد بھائی کے ہاتھ چومے اور اس نے مجھے گلے سے لگایا...... ساتھ ہی صدقِ دل سے دعا کی کہ اللہ میری مصیبتیں آسان کرے اور مجھے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔ وہ ایک بے لوث مخلص تھا۔ میں اس کے بعد اس سے کبھی نہیں ملا لیکن وہ میرے ذہن میں نقش ان گنت یادوں میں سے ایک یاد کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

میں فیروز چاچا کے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اپنی شادی کی رات کو لاہور چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے اندر تھوڑی سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ یہ آگے کے سفر پر روانہ ہونے کی خوشی تھی مگر میں ان سنگین حالات اور واقعات سے بالکل بے خبر تھا جو مجھے آئندہ پیش آنے والے تھے۔ یہ واقعات میرے راستے میں شکاری جانوروں کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جب فیروز چاچا کو بتایا کہ مجھے ایرانی ویزا مل گیا ہے تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے سفر کے بارے میں بے شمار ہدایات دیں (ماضی میں وہ بھی ایک دفعہ ایران کا سفر کر چکا تھا) فیروز چاچا نے مجھے نماز پڑھنے کی ہدایت بھی کی۔ اس نے کہا۔ ''اللہ اپنے بندوں پہ مصیبتیں اسی لیے ڈالتا ہے کہ وہ اس کی طرف اپنا دھیان کریں اور جب بندہ دھیان کر لیتا ہے تو مصیبتیں دھند کی طرح چھٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔''

فیروز چاچا کی ہدایات کے مطابق ضروری تھا کہ میں کل بس اڈے پر جا کر اپنا ٹکٹ بک کروا لوں۔ رات ہوٹل میں گزارنے کے بعد میں صبح بس اڈے پہنچا اور تفتان بارڈر کے لیے ٹکٹ بک کروایا۔ یہیں سے میں نے ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ کرنسی بھی تبدیل کروائی۔ اب میرے پاس پاکستانی روپوں کے علاوہ ایرانی ''تومان'' بھی آ گئے۔ بس کے ڈرائیور اسحاق سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا قیمتی لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر مجھے خصوصی اہمیت دی۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ نام وغیرہ پوچھا اور لاہور کا حال احوال دریافت کیا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے ملنے والے اکثر افراد مجھ میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی بھی جاگتی ہے۔ بس ڈرائیور اسحاق سے ہونے والی گپ شپ بھی میرے لیے فائدہ مند رہی اور اس کا پتا مجھے اگلے روز چلا۔

اگلے روز فیروز چاچا اور دیگر لوگوں سے رخصت ہو کر اور فیروز چاچا کی ڈھیروں دعائیں لے کر میں بس اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ بس کے روانہ ہونے کا ٹائم ہے اور میں آدھ پون گھنٹا لیٹ ہو چکا ہوں۔ رکشا پر سوار جب میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو ڈرائیور اسحاق دو تین دیگر سواریوں کے ساتھ کھڑا بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے مجھ پر غصہ تو تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور بولا۔ ''ہارون! یار تم نے تو ہمارا بلڈ پریشر ایک دم آسمان کو لگا دیا ہے، کہاں رہ گیا تھا تم؟''

''میں...... بہت بہت معافی چاہتا ہوں اسحاق بھائی! بس سواری ملنے میں ذرا دیر ہو گئی۔''

''کوئی اور ہوتا تو پندرہ بیس منٹ پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن ام تمہارے لیے رکا رہا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ اسحاق بھائی...... اور ان سب سواریوں کا بھی جنہیں میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔''

میں بس میں داخل ہوا، مجھے کہیں جگہ نظر نہیں آئی۔ میں نے رونی صورت بنالی۔ مجھے لگا کہ شاید اب گھنٹوں تک مجھے یونہی کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے گا۔ ڈرائیور اسحاق نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''گھبراؤ نہ یار! ام نے تمہارے لیے بالکل فرنٹ پر ایک سیٹ رکھا ہوا ہے۔''

میں نے شکر کی سانس لی اور فرنٹ پر بالکل اسحاق کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ میرے قیمتی لباس اور حلیے کی وجہ سے سب لوگ بڑے دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور کسی حد تک مرعوب بھی نظر آتے تھے۔ بس میں زیادہ تر

مسافر بلوچی ہی تھے۔ میلے کچیلے سندھی افراد کا ایک گروپ بھی نظر آرہا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ میں نے سب پر نظر دوڑائی اور یہی وقت تھا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی۔ وہ سندھی عورتوں اور بچوں کے درمیان بیٹھی تھی، اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ دبلی پتلی، تیکھے نقوش والی۔ وہ زیادہ خوب صورت بھی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں کوئی کشش تھی جو دیکھنے والے کو چونکاتی تھی۔ اس کا رنگ دیگر سندھیوں سے قدرے صاف تھا اور چھوٹی سی ناک میں بڑی سی نتھ چمک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ناک بہ مشکل نتھ کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی چنچل آنکھیں تھیں۔ میں اس کی آنکھوں کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا کیونکہ اس نے فوراً ہی اپنی بھاری اوڑھنی اپنے چہرے کے سامنے کرلی تھی اور رخ بھی ذرا سا پھیرلیا تھا۔

میری ذہنی کیفیت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ میں کسی خوب صورت چہرے یا خوب صورت منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوسکتا۔ میرے سینے میں تو ہر وقت ایک گاڑھا سیاہ دھواں بھرا رہتا تھا اور اردگرد کی کوئی شے بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

جلد ہی بس چل پڑی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جوں جوں بس آگے بڑھتی گئی اردگرد کے مناظر بدلتے گئے۔ یہ مناظر میری توجہ کو کسی حد تک اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہ لق ودق صحرائے بلوچستان تھا۔ آبادیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب میلوں تک کوئی متنفس دکھائی دیتا تھا اور نہ کسی آبادی کے آثار۔ بس سیاہ چٹانیں تھیں اور خشک بنجر پہاڑ تھے۔ بڑی دیر تک گاڑی چلتی رہتی تھی، تب کہیں جاکر کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر کوئی کچی بستی دکھائی دیتی تھی۔ دھوپ میں جلتی ہوئی اور ریت سے ڈھکی ہوئی۔ نہ کہیں سبزے کا نشان، نہ پانی کے آثار۔ بستی کے گھروں کو سفیدی مائل رنگ کیا جاتا تھا۔ سیاہ پہاڑوں کے پس منظر میں یہ گاؤں نما بستیاں کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہلکے صحرائی جھکڑ چلنے شروع ہوگئے۔ ریتلی گردآلود ہوا بس کے شیشوں سے ٹکرانے لگی اور انہیں مزید دھندلا کرنے لگی۔

راستے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں ایک ریلوے لائن کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور اسحاق نے بتایا۔ ”یہ زاہدان کو جانے والا لائن ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اسحاق بھائی! یہ ہماری سڑک ایسے ہی تنگ رہے گی یا آگے جاکر کچھ اچھی بھی ہوجائے گی۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”حوصلہ پکا کرو بابو صاحب۔ آگے جاکر یہ اور خراب ہوگا۔“

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمارا سفر مزید مشکل اور ہچکولے دار ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ میں بس پر نہیں بلکہ اونٹ پر بیٹھا ہوں اور کسی پرانے دور کا مسافر ہوں۔

وزنی نتھ والی لڑکی کے قریب بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور عاجزی کے لہجے میں بولا۔ ”بابو سائیں، کھڑکی پھر کھل گئی ہے، بند کردو۔“

میں نے کھڑکی بند کردی۔ یہ دوسری تیسری بار ہوا کہ میں نے کھڑکی بند کی تھی۔ بے دھیانی میں، میں کھڑکی پھر کھول دیتا تھا...... اور گرم ہوا اندر آنے لگتی تھی، کسی نہ کسی سواری کی درخواست پر مجھے کھڑکی بند کرنا پڑتی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد پھر یہی ہوا۔ دھندلے شیشے کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ویرانے میں اونٹوں کے ایک کارواں کو دیکھنے کے لیے میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ گردآلود ہوا اندر آگئی۔ اب پھر ایک سواری نے مجھے کھڑکی بند کرنے کے لیے کہا لیکن اس مرتبہ عاجزی کے لہجے میں درخواست نہیں کی گئی بلکہ بڑے سخت لہجے میں چلا کر کہا گیا۔ ”بند کرو...... بند کرو...... نان سنس۔“

مجھے ڈانٹنے والا ایک پچیس چھبیس سالہ شخص تھا۔ چہرہ لمبا، ناک اونچی اور آنکھوں میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی سندھی لباس میں تھا اور لڑکی والی نشست کے عین پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اب تک کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب اگر بولا تھا تو اتنے درشت طریقے سے۔

میرا دماغ کھول گیا۔ میں نے کھڑکی بند تو کردی مگر گھوم کر اسے دیکھا اور کہا۔ ”یار! بات تو تمیز سے کرو۔“

”کیا بات؟...... کیا تمیز...... تم خبیث...... تم......“ اس کو آگے بات نہیں آئی اور وہ کسی نامعلوم زبان میں بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور غصیلے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی فوراً سیل مرغ کی طرح سینہ پھلایا اور میری طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بس کے اندر ہی ایک دوسرے سے بھڑ جاتے، دو تین افراد ہمارے درمیان آگئے۔ ڈرائیور اسحاق نے بھی بس سڑک کے کنارے روک دی اور بیچ بچاؤ کرانے لگا۔ وہ شخص میری توقع سے زیادہ آتش مزاج تھا۔ تاہم میں نے بھی اسے برابر کے جواب دیے۔ اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ عربی

جیسی زبان بول رہا ہے۔ کسی وقت اس کی زبان پر سندھی کے لفظ آجاتے تھے۔

سواریوں نے ہم دونوں کو ٹھنڈا کر کے اپنی اپنی نشست پر بٹھایا اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر سے بس پھر روانہ ہوئی۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان پنجاب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ سندھی کون ہیں اور کہاں جارہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ان کے پاس سعودی عرب کے ویزے ہیں۔''

''سعودی عرب کے ویزے؟'' میں نے حیران ہوکر کہا۔ ''ان کی حالت تو سعودی عرب والی نہیں ہے۔''

سلیم مسکرایا۔ ''سنا ہے جی شاہ فیصل نے ہماری گورنمنٹ سے خاص رعایت کی ہے اور وہاں سعودی عرب میں ناجائز رہنے والے کئی لوگوں کو ویزے دے دیے ہیں۔ یہ لوگ بھی شاید ان میں سے ہیں۔''

اس دوران میں میں نے دیکھا کہ اس شخص نے آگے کی طرف جھک کر نتھ والی چنچل لڑکی سے کوئی بات کی۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ بہرحال لڑکی کا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا کیونکہ وہ گھونگھٹ کے پیچھے تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ لمبے قد والے اس سخت گیر نوجوان کا تعلق اس لڑکی سے ہے۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ میرے ساتھ اس کے سخت رویے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس بس میں سب سے خوش لباس اور اچھے حلیے والا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے دو چار دفعہ بے دھیانی میں لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

میں نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں محتاط رہوں گا اور کھڑکی بھی بند رکھوں گا۔ خوامخواہ ٹینشن پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بس نے تقریباً 100 کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا جب ڈرائیور اسحاق نے اسے روک دیا اور مسافروں سے کہا کہ وہ کچھ کھا پی لیں۔ میں نے ویرانے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کہیں کوئی ہوٹل نام کی چیز نظر نہیں آئی۔ سواریاں ایک طرف چل پڑی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ کچھ آگے گئے تو ایک منظر دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک بہت بڑی چٹان کو کاٹ کر ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل اندازاً 300 فٹ گہرا اور 100 فٹ چوڑا ہوگا۔ اوپر بوسیدہ چھپر تھے۔ بڑے بڑے مٹکوں میں پانی رکھا تھا۔ یہاں بجلی وغیرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جہازی سائز کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، ان کے آگے لکڑی کی بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں پر بڑی بڑی پگڑیوں والے دیونما لوگ بیٹھے تھے۔ کوئی قہوہ پی رہا تھا، کوئی چرس سے شغل کر رہا تھا۔ کوئی کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میزوں پر ان کا اسلحہ وغیرہ بھی نظر آرہا تھا۔ شوخ آنکھوں والی لڑکی بھی دیگر افراد کے ساتھ ایک چارپائی پر موجود تھی۔ یہ لوگ کھانے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہوٹل کا ایک ملازم میرے پاس آیا۔ اس نے میلی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''کیا کھائے گا بابو جی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بس روٹی سالن لے آؤ۔''

چند منٹ بعد میرے سامنے ایک کشادہ سی پلیٹ رکھی تھی۔ اس میں اونٹ کے گوشت کی دو بڑی بڑی بوٹیاں تھیں اور شوربے کے اندر تین سالم آلو بھی نظر آرہے تھے۔ ساتھ میں خمیری روٹیاں تھیں۔ لاہور میں برگر اور چائنیز کھانے والے کے لیے یہ بڑا انوکھا کھانا تھا۔ بہرحال بھوک تھی اس لیے چاروناچار کھانے لگا۔ گوشت ذرا سخت تھا۔ ایک بوٹی کو دانتوں سے توڑنے کی کوشش کی تو وہ میرے ہاتھ سے نکل کر میز پر جاگری اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔

میرے کانوں سے ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ جلترنگ جیسی یہ دبی دبی ہنسی انہی افراد کی طرف سے ابھری تھی۔ فوارے کی طرح بے ساختہ ابل پڑنے والی یہ ہنسی اسی شوخ چشم لڑکی کی تھی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ ایک بار پھر گھونگھٹ میں دکھائی دی۔ اونچی ناک والے دراز قد شخص نے لڑکی کو گھورا اور غصے میں کچھ کہا۔ لڑکی رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دو دیگر عورتوں نے بھی رخ پھیر لیا۔

اس ہوٹل نما جگہ کا ماحول عجیب تھا۔ دیوہیکل انسان اور ان کے اسلحے کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرے قیمتی لباس کی وجہ سے یہ سب لوگ مجھے بڑے دھیان سے دیکھتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی بس کی سواریاں وہاں سے نکل آئیں اور واپس بس میں آبیٹھیں۔ یہ تقریباً ایک گھنٹے کا وقفہ تھا، بس دوبارہ چل پڑی۔

اس مرتبہ میں نے دیکھا کہ نتھ والی چنچل لڑکی کچھ پیچھے چلی گئی ہے۔ اس کا اونچی ناک والا کرخت ساتھی بھی اب ایک پچھلی نشست پر نظر آرہا تھا۔ نوجوان اور لڑکی کی شکل کچھ ملتی جلتی بھی لگتی تھی۔ وہ بہن بھائی ہوسکتے تھے اور قریبی کزن بھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی تو روانی سے سندھی

میں بات کرتی تھی لیکن نوجوان نے مجھ سے لڑتے وقت عربی جیسی زبان بولی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت کم سندھی جانتا ہے۔

صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والی بس سہ پہر چار بجے کے قریب تو کنڈی پہنچی۔ پاک ایران بارڈر یہاں سے قریباً پانچ میل دور تھا۔ ہمارے دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گئے۔ باوردی اہل کاروں نے کاغذات کی چیکنگ شروع کی۔ سندھی خواتین و حضرات کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ اپنے حلیوں سے وہ بے چارے گداگر ہی لگتے تھے۔

میری باری آئی تو پہلے مکمل جامہ تلاشی لی گئی۔ پھر کرنسی کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے کوئٹہ سے تقریباً 1000 پاکستانی روپوں کو ایرانی کرنسی میں تبدیل کروایا تھا، اس کے علاوہ قریباً 2000 روپیا پاکستانی کرنسی کی صورت میں میرے پاس تھا۔ ان دنوں یہ کافی بڑی رقم تھی۔ میں نے آفیسر سے کہا۔ ''میرے پاس پانچ سو پاکستانی روپے ہیں۔''

اس نے مجھے سر تا پا گھورا پھر مسکرا کر بولا۔ ''لگتا تو ایسا نہیں..... اگر اور پیسے ہیں تو بتا دیں۔ آپ جناب کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

اس کے خوشگوار رویے سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے جراب میں نیچے کی طرف رکھے ہوئے پانچ پانچ سو کے تین نوٹ اسے دکھا دیے۔ وہ ہنس کر چپ ہو گیا (ایرانی کرنسی ڈرافٹ کی صورت میں تھی)

اس دوران میں میری نظر نتھ والی دبلی پتلی لڑکی پر پڑی۔ وہ ہر وقت جیسے اپنے ہی حال میں مست رہتی تھی۔ اب بھی وہ چیکنگ وغیرہ کی پریشانی سے بے پروا صحن میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر بیر کی طرح کا چھوٹا چھوٹا سا پھل لگا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ میں ہونے کے باوجود پنجوں کے بل کھڑی ہو ہو کر پھل اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اونچی ناک والے کرخت نوجوان نے قریب جا کر اسے منع کیا اور اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں آ گیا۔ چیکنگ سے فارغ ہو کر ہم سب پھر بس میں آ بیٹھے اور چاپا پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے پاک ایران بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ ''تفتان'' کہلاتی ہے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ سورج کا سرخ گولا دور مغربی افق کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ٹھنڈی ریگستانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ہمیں آج کی رات اسی ریگستان میں کھلے آسمان کے نیچے گزارنا تھی۔ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں ہم تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومے۔ پھر ٹیلوں کے پیچھے ایک جگہ قیام کے لیے چن لی۔

بس کی تمام سواریاں تھکی ہاری تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد سب نے اپنی اپنی مرضی کی جگہ بستر وغیرہ بچھانے کے لیے چن لی۔ میرے پاس بستر تو کیا اوپر اوڑھنے کے لیے چادر تک نہیں تھی۔ ایک گلاس تک نہیں تھا کہ پانی ہی پی سکوں۔ بہرحال میرے لباس اور شکل و صورت کی وجہ سے بس کی اکثر سواریاں مجھے کوئی افسر قسم کی شے ہی سمجھ رہی تھیں..... اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ ایک ٹیلے کے پاس مجھے تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی۔ میں نے اس جگہ کو کنکر وغیرہ سے صاف کیا۔ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے، انہیں تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ اوپر تاریک آسمان تھا اور اس پر ہزار ہا ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی آسمان سیکڑوں میل دور لاہور میں بھی دکھائی دے رہا ہوگا۔ یہی ستارے وہاں بھی چمک رہے ہوں گے۔ پتا نہیں، وہاں کیا حالات ہوں گے۔ مجھے کیسے کیسے یاد کیا جا رہا ہوگا اور تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ پہلے اپنی والدہ کا تصور ذہن میں آیا، پھر اپنی نوبیاہتا بیوی کا اور آسمان کی طرح بے شمار ستارے میری آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ رخساروں پر نمی رینگنے لگی۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہوا تھا یہ سب کچھ......؟ اور وہ سفید ہیولا؟ کیا وہ میرا وہم ہی تھا؟ یقیناً وہم ہی تھا لیکن یہ وہم اتنا طاقتور کیوں تھا؟ اور پھر وہ بے معنی الفاظ......؟

اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ میرے سامنے کھڑی ناک والا وہی دراز قد نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر خشک لہجے میں مجھ سے کچھ کہا۔ اس کی سندھی میں سے بس دو چار لفظ ہی میری سمجھ میں آئے ... ادھر..... عورتیں..... پردہ..... وہاں ....

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے پھر سندھی میں کچھ کہا۔ سندھی کچھ کچھ میرے پلّے پڑ جاتی تھی کیونکہ میں کالج کے زمانے میں کچھ عرصہ سانگھڑ میں رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے یہاں سے ''بستر'' اٹھانے کے لیے کہہ رہا ہے..... اور کہہ رہا ہے کہ میں ٹیلے کی دوسری طرف چلا جاؤں کیونکہ یہاں میری نظر عورتوں پر پڑے گی۔

وہ بالکل نامناسب بات کر رہا تھا۔ مجھے قافلے سے الگ تھلگ سلانا چاہ رہا تھا۔ یہاں غیر مرد تو اور بھی موجود تھے۔ اس کا نزلہ مجھ پر ہی کیوں گر رہا تھا جبکہ سندھیوں میں سے گھنی ڈاڑھی والا ایک اور شخص بھی آ گیا۔ اس ادھیڑ

عمر شخص کا نام نور بخش تھا۔ اس نے کھڑی ناک والے نوجوان کو تلخ کلامی سے روکنا چاہا اور میری طرف سے بات کی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے میرے لیے یہاں سے اٹھنے کا حکم جاری کرتا رہا۔ بات بڑھ گئی۔ جب کھڑی ناک والے نے میرے بوٹ اٹھا کر دور پھینکنا چاہے تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ اب میرے لیے بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تیموری خون نے میرے اندر جوش مارا۔ میں نے سر جھکا کر اس کی کمر کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور پوری طاقت سے دھکیلتا چلا گیا۔ وہ قد میں مجھ سے لمبا تھا اور جسم بھی اچھا خاصا تھا لیکن میں نے اس کے قدم جمنے نہیں دیے۔ میں اسے بیس پچیس قدم پیچھے لے گیا۔ ہم عورتوں اور ان کے سامان کے اوپر گرے۔ برتن بکھرتے نظر آئے اور پانی والے چھوٹے مٹکے ٹوٹ گئے۔ عورتیں چلاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ میں نے کھڑی ناک والے کے چہرے پر کئی زوردار مکے رسید کیے۔ میری طلائی انگوٹھی نے اس کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔ اس نے مجھے ٹانگوں کی دھکیل سے دور پھینکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی آگئی تھی۔ یہ چھوٹی لیکن وزنی لاٹھی تھی۔ اس پر لوہے کے موٹے چھلے سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ لاٹھی سونت کر دیوانہ وار میری طرف لپکا۔ میں اس وقت تک کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ میرے سر پر وار کیا۔ میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ وہ اتنا شدید وار تھا کہ اگر مجھے لگ جاتا تو میرا تہلکہ خیز سفر وہیں ختم ہو جاتا...... اور آج میں آپ کو یہ روداد سنانے کے لیے زندہ نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم، میں نے کس طرح خود کو اس وار سے بچایا۔ ہاں یہ پتا مجھے چل گیا کہ میں نے اس شخص کو دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دینا، کیونکہ اگر اسے دوسرا موقع مل گیا تو وہ ضرور میری کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔ میرے کانوں میں مرد و زن کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نیچے جھکا اور طوفانی رفتار سے اپنے سر کی ٹکر اس غضب ناک شخص کے سینے پر رسید کی۔ وہ وار کرنے کے لیے لاٹھی اٹھا چکا تھا۔ بھرپور ٹکر نے اسے آٹھ دس قدم پیچھے ہٹا دیا لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ میں نہتا تھا اور آہنی چھلوں والی خطرناک لاٹھی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی مگر پھر قدرت نے کرشمہ دکھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص پھر میری طرف آتا یا کسی بھی طرح میری ضرب کا جواب دیتا...... ایک دم کھٹکے کی زوردار آواز آئی۔ جیسے لوہا لوہے سے ٹکرایا ہو، اس کے ساتھ ہی کافی ساری ریت میرے حریف کے پاؤں کے پاس سے اچھلی۔ وہ الٹ کر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے، پھر اللہ داد تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جھک کر اس کا پاؤں دیکھنے لگا۔ اس کا پاؤں جیسے کسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ تین چار دیگر افراد بھی میرے حریف کی طرف بڑھے۔

''کیا ہوا میڈے سائیں۔'' اللہ داد نے چلا کر پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس کراہ رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ ایک شخص نے لالٹین اونچی کی اور تب مجھے بھی پتا چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ لوہے اور لکڑی کا بنا ہوا ایک زنگ آلود پھندا تھا...... جو نہ جانے کب سے ریتیلی مٹی میں دبا ہوا تھا۔ شاید کبھی کسی شکاری نے کسی جانور کے لیے یہ پھندا لگایا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ پھندے کی جگہ بھول گیا ہو، یا کوئی اور وجہ ہو گئی ہو۔ آج اتفاقاً میرے دراز قد حریف کا پاؤں اس پھندے میں جکڑ گیا تھا اور وہ اس جکڑن کی تکلیف سے تڑپنے لگا تھا۔ چند لمحے بعد میں بھی لڑائی کی گرما گرمی بھول کر موقع پر پہنچ گیا۔ میرے دراز قد حریف کے ہاتھوں سے وزنی لاٹھی چھوٹ چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی دبائی ہوئی تھی اور کراہ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی پر خون کی لالی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً وہ ایک سخت جان شخص تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کراہنے کے بجائے چلا رہا ہوتا۔ اس پھندے میں ایک طاقتور اسپرنگ تھا۔ وزن پڑنے کے بعد وہ پورے زور سے کھلا تھا اور لوہے کی دو قوسوں نے اس شخص کی پنڈلی، ٹخنے کے اوپر سے بری طرح جکڑ لی تھی۔ ایک قوس تو اس کی پنڈلی کے اندر دھنس گئی تھی اور شاید ہڈی تک جا پہنچی تھی۔ یہ پھندا ایک زنگ آلود زنجیر کے ذریعے ایک پتھر کے ساتھ اٹیچ تھا۔ پھندے کی طرح یہ زنجیر بھی ریت میں دبی ہوئی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ دراز قد شخص کے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔ پھندا چونکہ پرانا ہو چکا تھا اس لیے کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دو تین افراد مل کر جب پھندا کھولنے کے لیے زور لگاتے تو دراز قد شخص کا حال اور برا ہو جاتا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی پیشانی پسینے سے تر نظر آرہی تھی۔

میرا ذہن ہمیشہ سے کچھ ٹیکنیکل رہا ہے، میرے بڑے بھائی جان ٹی ٹرالیز بنانے والا ایک بڑا کارخانہ چلاتے تھے۔ مجھے بھی مینوفیکچرنگ کی کافی سمجھ بوجھ تھی۔

میری یہ سمجھ بوجھ اس ویرانے میں اس پھنسے ہوئے شخص کے لیے کام آئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ لگالیا کہ یہ شکنجہ زور لگانے سے نہیں کھلے گا بلکہ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ اگر کسی طرح شکنجے کے اسپرنگ کو ایک طرف سے نکال دیا جاتا تو وہ بے پناہ دباؤ ختم ہوسکتا تھا جو اسپرنگ کھلنے کی وجہ سے پنڈلی پر آیا ہوا تھا۔

میں نے وزنی تھڑے والی چنچل لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ان پریشان کن لمحوں میں وہ اپنا لمبا گھونگھٹ بھی بھول چکی تھی۔ میں نے ادھیڑ عمر اللہ داد سے کہا۔ ”چاچا! تمہارے سامان میں کوئی پیچ کش وغیرہ ہوگا؟“

ایک دوسرا شخص بولا۔ ”ہاں سائیں، مینڈے پاس ہے پیچ کش۔“

وہ دوڑ کر گیا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا سا پیچ کش لے آیا۔ میں لالٹینوں کی روشنی میں شکنجے کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ دراز قد شخص کا خون بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہورہا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ خاصا تو انا اسپرنگ کے ایک سرے کو اسٹیل کی ایک موٹی پن کے ذریعے لاک کیا گیا ہے۔ یہ پن سوراخ میں سے نکل جاتی تو اسپرنگ کا ایک سرا آزاد ہوجاتا اور اسپرنگ شکنجے سے باہر نکل آتا۔ میں نے ہتھوڑی کا کام ایک گول پتھر سے لیا۔ پیچ کش کے سرے کو سوراخ میں ڈال کر تین چار ہلکی چوٹیں لگائیں تو لوہے کی پن باہر نکل آئی۔ جو کام بے پناہ زور لگانے کے باوجود نہیں ہوسکا تھا، وہ ایک پن نکل جانے سے ہوگیا۔ اسپرنگ باہر آگیا اور اس کے ساتھ ہی دراز قد شخص کا لہولہان پاؤں شکنجے میں سے نکل آیا۔

سب نے سکھ کی سانس لی۔ اللہ داد اور دیگر عمر رسیدہ افراد نے مجھے باقاعدہ شاباش دی۔ دراز قد شخص کا نام مجھے جعفر معلوم ہوا۔ وہ اب لڑنے کے قابل کہاں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی پنڈلی دبا رکھی تھی اور کراہتا چلا جارہا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر فاصلے پر چلا گیا۔ عمر رسیدہ سندھی افراد میں سے ایک مفلوک الحال شخص کا نام نور بخش تھا۔ یہ بندہ دیسی طریقۂ علاج جانتا تھا۔ اس کے پاس مرہم پٹی کا برا بھلا سامان بھی موجود تھا۔ اس ویرانے میں زخمی جعفر کے لیے اور کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ نور بخش نے اس کا خون بند کرنے کی کوشش کی۔ خون کا رساؤ کم ہوگیا تو اس کے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ دی گئی۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد بیٹھ گئے۔ سب کے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں ارد گرد ایسا کوئی اور پھندا موجود نہ ہو۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا اہم تھا۔ ایرانی اہلکاروں نے ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کرنا تھے اور ہمیں ایران میں داخلے کی اجازت ملنا تھی۔ بس کی بیشتر سواریوں کی حالت گداگروں جیسی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ان لوگوں کو ایران میں ”انٹری“ مل جائے گی۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سب نے برا بھلا ناشتا کیا اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ بارڈر کی طرف چل دیے۔ دراز قد جعفر کے پاؤں پر بھاری بھرکم پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دو سندھی افراد کے سہارے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کے لمبوترے چہرے پر کدورت کے آثار تھے۔ حالانکہ رات کو جو کچھ بھی ہوا، اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ باقی سب لوگ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔

بارڈر پر پہنچے تو وہاں ایرانی بارڈر پولیس کے اہلکار تو نظر آئے لیکن کوئی افسر قسم کا شخص دکھائی نہیں دیا۔ ہمیں روکھے لہجے میں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ ہم وہیں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنے سامان کے اوپر بیٹھنا مناسب سمجھا۔ جعفر کا چہرہ بری طرح تمتمارہا تھا اور آنکھوں میں سرخی سی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پاؤں کی سوجن کی وجہ سے اسے تیز بخار بھی ہوگیا تھا۔

قریباً دو ڈھائی گھنٹے کے مشکل انتظار کے بعد ہمیں ایک ایرانی افسر کی صورت نظر آئی۔ اس نے اشاروں کنایوں اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ہمیں بتایا کہ ان کے بارڈر انسپکٹر کو حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ بولا۔ ”یہ بات کلیئر ہے کہ جب تک تم لوگوں کے کاغذات چیک نہیں ہوتے، تم ایران میں داخل نہیں ہوسکتے اس لیے صبر سے انتظار کرو۔“

میں نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایرانی افسر کی یہ بات بس کی دیگر سواریوں تک پہنچائی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ جعفر بھی غصیلے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

بس کی تقریباً تمام سواریوں نے ایک طرح سے مجھے اپنا لیڈر بنالیا تھا۔ یہ وہی اندھوں میں کانا راجا والی بات تھی۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ مدقوق چہرے والے ایک دیہاتی نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ”بابو جی! آپ پڑھے لکھے ہیں، ان سے بات کریں۔ اگر ہم آج یہاں سے نہ نکل سکے تو کسی اور مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ''میں کیا بات کروں، میں بھی آپ لوگوں کی طرح انجان ہی ہوں۔''

عورتیں اور بچے بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ گرمی اور پیاس علیحدہ پریشان کر رہی تھی۔ بس کی ساری سواریاں بلند آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ احتجاجی انداز میں شور مچانے لگے۔ اب دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ شور بڑھا تو ایرانی اہلکاروں میں سے ایک سینئر بندہ باہر آیا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی کافی چوڑی تھی۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ''مجھے اردو وغیرہ بالکل نہیں آتی۔ میں کیسے آپ لوگوں سے سوال جواب کر سکتا ہوں۔ مجھ سے پاسپورٹ بھی چیک نہیں ہوں گے۔''

پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں خیال آیا۔ مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں اور پاسپورٹوں کا اندراج رجسٹر میں کر دیں تو کام آسان ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کر سکتا ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اس شخص نے مجھے ساتھ لیا اور بارڈر انسپکٹر کے سجے سجائے ٹھنڈے دفتر میں پہنچ گیا۔ بس کی سواریاں گرتی پڑتی ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ اس شخص نے مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر ایک بڑی میز کے سامنے ایک لگژری کرسی پر بٹھا دیا اور میں نے مسافروں کے پاسپورٹ چیک کرنے شروع کر دیے۔ میں سوٹڈ بوٹڈ تھا، کرسی پر بیٹھ کر مجھے لگا جیسے واقعی کوئی افسر ہوں۔ اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہنس دیا۔ صرف چار دن پہلے ایرانی دفتر کے ایک معمولی گارڈ نے مجھے گالیوں سے نوازا تھا اور باقاعدہ دھکے دیے تھے۔

اگلے دو گھنٹے میرے لیے کافی کٹھن تھے۔ پٹھانوں اور سندھی بھائیوں کے نام خاصے مشکل اور گنجلک تھے۔ خاص طور سے خواتین کے نام۔ ان کا اندراج رجسٹر پر کرنا میرے لیے کافی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے ہر مسافر سے دو چار سوال بھی کرنا پڑ رہے تھے۔ جعفر تو زخمی ہونے کی وجہ سے باہر ہی بیٹھا رہا۔ بہرحال اس کی ساتھی لڑکی کو اندر میرے سامنے آنا پڑا۔ میں کچھ اور بھی اکڑ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اندر آئی۔ وہ واضح طور پر ڈری سہمی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا رعب سے اس کا نام پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

''مہرالنساء ...... سائیں۔''

''یہ سائیں کیا ہے۔ صرف اپنا نام بتاؤ۔''

''مہرالنساء ...... جی۔ گھر میں مہرو کہتے ہیں۔''

''والد کا نام؟''

''غلام نبی ...... جی۔'' وہ ذرا جھجک کر بولی۔

''والدہ کا نام؟''

''حبیبہ مائی۔''

''یہ پاسپورٹ پر فوٹو تمہاری ہے؟''

''ہاں جی۔''

''اپنا چہرہ دکھاؤ۔'' میں نے رعب سے کہا۔ حالانکہ چہرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔

وہ چپ ہو گئی۔ پھر لرزاں لہجے میں بولی۔

''سائیں ...... میں پردہ کرتی ہوں۔''

میں بھی اسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ ویسے یہ ضرورت بھی تھی کہ اس کی شکل دیکھی جاتی۔ میں نے کہا۔ ''چہرہ نہیں دکھاؤ گی تو کارروائی کیسے پوری ہو گی؟ چلو، اٹھاؤ یہ گھونگھٹ۔''

اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزتے ہاتھ سے گھونگھٹ تھوڑا سا ہٹایا۔ چنچل آنکھوں میں فی الحال شوخی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹی سی نازک ناک میں چاندی کی وزنی نتھ ظلم ڈھا رہی تھی۔ عام شکل وصورت کے باوجود اس میں کشش تھی۔ میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں نے بھاری آواز میں کہا۔

اس نے گھونگھٹ دوبارہ نکال لیا۔

میں نے رجسٹر میں اس کا پاسپورٹ نمبر درج کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ جعفر تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''وہ جی...... وہ جی ...... بابو سائیں ......''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، ایرانی افسر اندر آگیا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی کام نمٹانے کو کہا اور میرے اب تک کے کام کو چیک کرنے لگا۔ مہرو کا اندراج ہو چکا تھا۔ وہ باہر چلی گئی اور اس کی جگہ ایک اور عورت اندراج کے لیے آگئی۔

یہ کام مکمل ہوتے ہوتے قریباً ڈھائی بج گئے۔ ایرانی افسر نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے لیے لنچ منگوایا۔ ایرانی طرز کی بریانی اور روسٹ چکن تھا۔ ساتھ میں خوشبودار قہوہ۔ مجھے اے سی والے ٹھنڈے دفتر میں بیٹھ کر لنچ کرنا اچھا لگا۔

کچھ دیر بعد جب میں باہر نکلا تو پھر وہی گرمی تھی اور وہی پھٹے پرانے کپڑوں والے میرے مسافر ساتھی۔ بچے

ریں ریں کر رہے تھے اور مائیں انہیں جھڑکیاں دینے میں مصروف تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک سے نکل کر اچانک تیسری دنیا کے کسی مصیبت زدہ ملک میں آ گیا ہوں۔

ہم ایرانی علاقے میں داخل ہوئے اور کچھ دور تک پیدل چلے۔ یہاں ماحول بدلا ہوا تھا اور صفائی ستھرائی نظر آتی تھی۔ ہمیں لے کر جانے والی بس سامنے ہی کھڑی تھی۔ یہ جرمنی کی بنی ہوئی شاندار بس تھی اور ان دنوں دنیا کی بہترین بسوں میں شمار ہوتی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے عزت بخشتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر جگہ دی۔ جعفر بھی دو افراد کے سہارے لنگڑاتا ہوا بس میں آ بیٹھا۔ بھاری نتھ والی مہرو بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی عجیب لگی تھی۔ مہرو نے اپنی والدہ کا نام ”حبیبہ“ لکھوایا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اندرون سندھ عورتوں کے ایسے نام نہیں ہوتے، خاص طور سے پرانی عورتوں کے۔ کیا ”حبیبہ“ کا تعلق سندھ سے نہیں تھا؟ جعفر کو سندھی کیوں نہیں آتی تھی؟ کیا جعفر اور مہرو قریبی رشتے دار تھے؟ ایسے ہی کئی سوال میرے ذہن میں چکراتے رہے اور ہماری نگوڑی بس ایرانی شہر زاہدان کی طرف محوِ سفر رہی۔

جعفر کے چہرے پر میرے لیے اب بھی بیگانگی اور کدورت کے آثار تھے۔ وہ اور مہرو اس دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے جعفر کی پیشانی پر گاہے بگاہے بل پڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنا زخمی پاؤں اٹھا کر نشست پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ مہرو نے اپنی بھاری اوڑھنی کے اندر سے اپنا نازک ہاتھ نکالا اور آہستہ آہستہ جعفر کی پنڈلی دبانے لگی۔ وہ جب سے زخمی ہوا تھا، وہ اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔

میرا تجسس اب کافی بڑھ چکا تھا۔ میرے ساتھ والی نشست پر رحیم یار خان کا ایک غریب صورت نوجوان امین بیٹھا تھا۔ وہ بھی روزگار کے سلسلے میں قسمت آزمانے کے لیے کویت کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ کوئٹہ میں وہ سندھی افراد کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا تھا۔ میں نے امین سے پوچھا۔ ”یہ جو لڑکی ہے لال اوڑھنی والی، یہ کیا لگتی ہے جعفر کی؟“

”یہ بہن ہے جی اس کی۔“ امین نے کہا۔ ”یہ اسے اپنے ساتھ عراق لے کر جا رہا ہے۔ یہ وہیں عراق میں ہی رہتا ہے نا۔ شاید بغداد میں۔“

”لیکن...... لیکن لڑکی تو سندھی ہے اور یہ جعفر شاید عربی بول رہا تھا۔“

”مجھے اس بارے میں زیادہ پتا تو نہیں ہے جی۔ میرا خیال ہے کہ یہ جعفر صیب عراق میں پلا بڑھا ہے جبکہ یہ لڑکی یہاں نواب شاہ میں رہی ہے اپنی دادی کے پاس۔ باپ شاید فوت ہو چکا ہے۔“

میرا تجسس ان دونوں کے بارے میں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بہرحال امین کو اس بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں تھا۔

بس صاف ستھری سڑکوں پر رواں دواں رہی اور میرا ذہن بھی مختلف سمتوں میں بھاگتا رہا۔ پچھلے چند دنوں میں جو کچھ ہوا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ اپنی مہندی کی رات میں نے غنودگی کی حالت میں اپنے سامنے ایک سفید ہیولا دیکھا۔ اس نے چند ناقابلِ فہم الفاظ کہے...... کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی...... اور پھر شادی کی رات میں نے دو عورتوں کا مکالمہ سنا۔ وہ قنات کے پیچھے بیٹھی بول رہی تھیں۔ ان عورتوں کے الفاظ نے میرے اندر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ کیا وہ واقعی ہی بڑی بات تھی کہ اس کے نتائج اتنے برے نکلتے؟ کبھی کبھی میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آتا تھا۔ میں سوچتا تھا...... کیا وہ عورتیں وہاں موجود بھی تھیں یا نہیں؟ کہیں وہ میرا وہم ہی تو نہیں تھا۔ بصری واہمے کی طرح سماعتی واہمہ یعنی Audio Illusion

اچانک میں اپنے سنسنی خیز خیالات سے چونک پڑا۔ ایک شخص بڑے غصے سے چلایا تھا۔ یہ شخص بس کے تین چار ایرانی مسافروں میں سے ایک تھا۔ دراصل سندھی افراد کے گروہ میں سے ایک چھوٹے بچے نے ایرانی کا بوٹ گندا کر دیا تھا۔ بچے کا شاید پیٹ خراب تھا۔ اس نے بس کے فرش پر ہی اپنی حاجت پوری کر لی تھی۔ اب ایرانی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو کر تابڑ توڑ فارسی بول رہا تھا۔ بچے کے مفلوک الحال والدین لرزہ بر اندام تھے، ایک مرد نے اپنی چادر سے ایرانی کا بوٹ صاف کیا مگر اس کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب پاکستانی خود کو خجل محسوس کر رہے تھے...... اور کسی حد تک سہم بھی گئے تھے۔ آدھ پون گھنٹا بولنے کے بعد ہی ایرانی کا غصہ کچھ کسی حد تک کم ہوا۔

باقی کا سفر گہری خاموشی اور تناؤ کی کیفیت میں گزرا۔ خدا خدا کر کے زاہدان کے مضافات نظر آنے شروع ہوئے۔ زاہدان ایران کے اچھے اور خوب صورت شہروں

میں سے ایک ہے۔ یہاں کے باشندوں میں سکھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ شہر کا نام زاہدان بھی سکھوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر باہر سے آنے والے لوگوں نے سمجھا کہ یہ متقی و پرہیزگار مسلمانوں کا شہر ہے۔ اس لیے اسے زاہدان یعنی زاہدوں کے رہنے کی جگہ کہا جانے لگا۔

بس ایک خوب صورت اسٹینڈ پر رکی۔ شہر کی شان و شوکت دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ شیشے کی طرح صاف شفاف سڑکیں، بلند عمارتیں، باغیچے۔ صفائی ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہم آہستہ آہستہ بس سے اترے۔ زاہدان کی خوشبودار، ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ زخمی جعفر بھی اپنی بہن اور ایک دوسرے شخص کے سہارے بہ مشکل بس سے اترا۔ ایک بار دل چاہا کہ اس سے دو چار الوداعی کلمات کہوں لیکن پھر اس کا سوجا ہوا تھوبڑا دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی اب میں تنہائی اور سکون کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

میرے پاس سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس ایک شاپر سا تھا جس میں میں نے پانی کی دو تین بوتلیں اور کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ ذرا آگے جا کے مڑ کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ سندھی مسافروں کا گروہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ جیسے انہوں نے مجھے مستقل طور پر اپنا راہنما تصور کر لیا ہو اور اب میرے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہوں۔ مجھے الجھن محسوس ہوئی۔ میں تو خود "بادِ گم کردہ" مسافر تھا۔ میرے اندر اتنی اہلیت کہاں تھی کہ کسی معاملے میں ان لوگوں کی راہنمائی یا مدد کر سکتا۔ میں رک گیا۔

"کیا بات ہے بزرگو؟" میں نے اللہ داد سے پوچھا۔

وہ عاجزی سے بولا۔ "بابو سائیں! تم پڑھے لکھے ہو، بات کر سکتے ہو۔ رہنے کے لیے جو جگہ تمھیں ٹھیک اور چنگی لگے گی، وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔ کوئی سستا سا سرائے مل جائے تو سب کے لیے ٹھیک رہے گا۔"

میں نے ذرا بیزاری سے کہا۔ "چاچا! ابھی میرا کسی سرائے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ لوگوں نے جو کرنا ہے اپنے طور پر کر لیں اور یہ جعفر بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔ یہ تو تھوڑی بہت یہاں کی زبان بھی جانتا ہوگا۔"

"اس کو تو اپنی پڑی ہوئی ہے بابو سائیں۔ آپ ہی کچھ مدد کرو نا......"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ یہ واقعہ آج تک پوری تفصیل کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اس کو اپنے لیے ایک شرم ناک واقعہ ہی کہوں گا۔ ان لمحوں میں جو ذلت میں نے اپنے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے محسوس کی، وہ تاحیات یاد رہے گی۔ ہوا یوں کہ جب ہم وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے قریب ہی ایک ایرانی اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں بچے اسکول سے باہر سڑک پر نظر آنے لگے۔ یہ سب لڑکے تھے۔ ان کی عمریں چھ سات سال سے لے کر چودہ پندرہ سال تک تھیں۔ جب یہ بچے اسکول سے باہر آئے، مسافروں میں سے ایک بوڑھا ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کر رہا تھا۔ پتا نہیں ان بچوں کے ذہن میں کیا بات آئی۔ ان میں سے کچھ نے پہلے مفلوک الحال مسافروں پر آوازے کسے، پھر انہیں پتھر مارنے شروع کر دیے۔ شاید وہ انہیں گداگر سمجھے تھے یا پھر چور اچکا تصور کر رہے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماضی قریب کا کوئی تلخ واقعہ ان کے طیش کا سبب بنا ہو۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا، میں اور اللہ داد باقی قافلے سے بیس پچیس میٹر دور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ قافلے میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں چلانے لگیں۔ مسافروں کے ہاتھوں سے بستر بند گر گئے اور وہ کنستر وغیرہ بھی جن میں انہوں نے آٹا یا چاول قسم کی اشیا ڈال رکھی تھیں۔ ماؤں سے بچے علیحدہ ہوگئے اور شوہروں سے بیویاں۔ ایرانی بچے انہیں پتھر مار مار کر بھگا رہے تھے۔ میں بھی بھاگ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ مفلوک الحال سندھی ساتھی میرے سامنے سے یوں دوڑتے ہوئے گزر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے موت کے فرشتے لگے ہوں۔ ایک لڑکی دھڑام سے میرے قدموں میں گری۔ وہ چلائی۔ "بابو سائیں بچاؤ۔"

میں نے دیکھا یہ وہی بھاری نتھ والی مہرو تھی۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ امید تھی کہ ہم بپھرے ہوئے لڑکوں کی نظر سے بچ جائیں گے لیکن پھر ایک گھر کی چھت پر کھڑے شخص نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا اور فارسی میں چلا کر کچھ کہا۔ تین لڑکوں کی ایک ٹولی گلی سے نکل کر ہماری طرف آئی۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔ اس نے مہرو کو دیکھ لیا۔ وہ پُرطیش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"رک جاؤ ... اسٹاپ اٹ۔" میں چلایا۔

ایک لڑکے نے مجھے دھکا دے کر مہرو سے علیحدہ کرنا

چاہا۔ میرا سر پیچھے دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ جب دوسرے لڑکے نے مہرو کے جسم پر ہاکی سے ضرب لگانا چاہی تو میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ تیسرا لڑکا قد میں ذرا لمبا تھا۔ اس نے عقب سے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ اب ضروری تھا کہ میں دفاع کرتا۔ میں نے سامنے والے لڑکے کے پیٹ میں لات رسید کی اور ایک جھٹکا دے کر ہاکی اسٹک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ مہرو پشت سے میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ دائیں طرف والے لڑکے نے میری گردن پر گھونسا رسید کیا۔ میں نے بھی بے دریغ ہاکی گھمائی جو اس کی کنپٹی کے پاس لگی۔ وہ سر پکڑ کر اوندھے منہ گرا۔ یقیناً اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر باقی دونوں لڑکے الٹے قدموں پیچھے ہٹے۔ یہ سارا واقعہ بہ مشکل آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے مہرو کا بازو پکڑا اور ایک تنگ گلی میں بھاگا۔ چھت پر کھڑا شخص بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ شاید دیگر لڑکوں کو بتا رہا تھا کہ ہم اس طرف سے بھاگ رہے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ ہم بیس پچیس قدم آگے گئے تھے کہ دور کچھ فاصلے پر مجھے ایک نیون سائن نظر آیا۔ اس پر جو الفاظ لکھے تھے، وہ یقیناً پولیس اسٹیشن کے ہی تھے۔

''آؤ مہرو۔'' میں نے مہرو کا بازو کھینچا اور پولیس اسٹیشن کے رخ پر بھاگا۔

لیکن ابھی ہم نے بہ مشکل آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گلی کے ایک موڑ پر دو تین ایرانی نظر آئے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں دور سے ہی ایک موٹی لکڑی دکھائی دی۔ یہ لکڑی اس نے یقیناً ہتھیار کے طور پر ہی اٹھا رکھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ زور سے بولا اور انگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ میں مہرو کو کھینچ کر ایک اور گلی میں داخل ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ گھیرا تنگ ہو گیا ہے اور ہم ان مشتعل لوگوں سے بچ نہیں سکیں گے۔ ایرانی اسکول بوائے کے زخمی ہونے سے یہ معاملہ یقیناً اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک اسٹیشن ویگن نظر آئی۔ اسے ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ میری نظر ویگن کی کھڑکی سے گزری اور مجھے پتا چل گیا کہ اس کا بائیں جانب والا دروازہ لاک نہیں ہے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا دیا۔ سلائڈنگ دروازہ کھل گیا۔ میں مہرو کو گھسیٹ کر اندر لے آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ بہ ظاہر گلی خالی تھی لیکن کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں صرف دعا ہی کر سکتا تھا کہ کسی نے ہمیں ویگن میں گھستے دیکھا نہ ہو۔

ہم پچھلی نشستوں کے درمیان دبک کر بیٹھ گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس گلی میں مشتعل لڑکے اور دیگر افراد داخل ہو گئے۔ وہ چاروں طرف بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں ہاکیاں یا لکڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ نے پتلونوں کی وزنی بیلٹس ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں، وہ گاڑیوں کے اندر جھانک رہے تھے اور ہر ایسی جگہ پر نگاہ دوڑا رہے تھے جہاں کسی کے چھپنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

اندر مہرو کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور چنچل آنکھوں میں وحشت کے ڈیرے تھے۔ میں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں سیدھا لیٹ گیا...... میں نے مہرو کو اپنے اوپر لٹا لیا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ ویگن کے اندر نیم تاریکی تھی اور ہم امید کر سکتے تھے کہ شاید ہمیں دیکھا نہ جا سکے۔

''سائیں! یہ لوگ مار دیں گے ہم کو۔'' مہرو کراہی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

ویگن کے اردگرد بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر ویگن ہولے ہولے ہلی۔ وہ لوگ یقیناً اندر جھانک رہے تھے۔ یہ نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ہم اپنی جگہ پتھر کے بت بن گئے۔ مہرو بے چاری کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ برق رفتار دھڑکن میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ خود کو اوجھل رکھنے کے لیے وہ میرے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل ترین گھڑیاں گزریں اور ویگن کے اردگرد قدرے سکون محسوس ہوا۔

بہرحال یہ سکون عارضی طور پر برقرار رہا۔ کچھ دیر بعد ویگن کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور کوئی شخص دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور وہ اسٹارٹ ہو گئی۔

مہرو نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح نشستوں کے درمیان پھنسی پھنسائی لیٹی رہی۔ اسٹیشن ویگن اب تیزی سے چل رہی تھی اور موڑ وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ پتا نہیں یہ شخص کون تھا؟ ہمیں دیکھ لیتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا؟ اسکول بوائے سے جو ہاکی اسٹک میں نے چھینی تھی، وہ ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ اپنے دفاع کے

لیے میں اسے استعمال کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

قریباً دس منٹ تک زاہدان کی سڑکوں پر چلنے کے بعد وین رک گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سایہ دار درختوں کے درمیان یہ ایک خاموش جگہ تھی۔ گاڑی والے نے انجن بند کیا۔ اب اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ہمیں فوراً دیکھ لیتا...... اور پھر یہی ہوا۔ اس ڈاڑھی والے نیم گنجے شخص نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہاکی کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی لیکن اس کے بعد جو ہوا، وہ توقع کے مطابق نہیں تھا۔ وہ شخص پہلے فارسی میں کچھ بولا پھر انگریزی میں کہنے لگا۔ ''گیٹ ڈاؤن...... ناؤ گیٹ ڈاؤن۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ہماری موجودگی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے ہاتھ بڑھا کر سلائڈنگ دروازہ کھول دیا۔ پہلے مہرو اٹھ کر باہر نکلی پھر میں بھی نکل آیا۔ ہاکی اسٹک میں نے وین کے فرش پر ہی رہنے دی تھی۔

یہ ایک درمیانی عمر کا گورا چٹا ایرانی تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بل تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر شکستہ انگلش میں بولا۔ ''میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن لڑکے کو چوٹ لگا کر تم نے بے وقوفی کی ہے۔ اگر تم ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ یقیناً تمہاری دو چار ہڈیاں تو توڑ ہی ڈالتے۔''

میں نے بھی انگریزی میں کہا۔ ''جناب! ہم نے یہ سب خود کو بچانے کے لیے کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکے بے وجہ......؟''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے...... مجھے وضاحت کی ضرورت نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹی اور بولا۔ ''اب جاؤ یہاں سے...... اور ان سے بچ کے رہنا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وین اسٹارٹ کی اور ایک موڑ کاٹ کر درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ جہاں برے لوگ ہوتے ہیں، وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔

مہرو ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں؟ لڑائی کے دوران میں وہ شاپر بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا جس میں، میں نے کھانے پینے کی اشیا رکھی ہوئی تھی۔ اب میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ مہرو کا حال بھی یہی تھا۔ اس کے سر پر شاید کوئی پتھر لگا تھا۔ بالوں میں سے خون رس کر پیشانی تک آ گیا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے اپنی بھاری اوڑھنی سے خون صاف کیا۔

''اب کہاں جانا ہے تو نے؟'' میں نے بیزار لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بابو سائیں...... مم...... میں نے پا (بھائی) کے پاس جانا ہے۔''

میں نے جھلا کر کہا۔ ''تو مجھے کیا پتا کہ اب کہاں ہے وہ تیرا پا؟ خوامخواہ کی مصیبت ڈال دی ہے تم لوگوں نے مجھے۔ سریش بن کر چمٹ گئے ہو مجھ سے۔''

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالنے لگی اور پھر رونے لگی۔ قریب سے دو سائیکل سوار ہمیں گھورتے ہوئے گزرے۔ اس کی وجہ سے کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کر۔ کسی اور مصیبت میں نہ ڈال دینا۔''

اس نے سہم کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے تاہم اس کا سینہ وقفے وقفے سے ہچکی سے دھڑکتا رہا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ جب کوئی سڑک پار کرنا ہوتی تھی، مجھے اس کا ہاتھ پکڑنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے مستقل طور پر ہی اس کی کلائی پکڑ لی یعنی ایک پردیسی دوسرے پردیسی کا ہاتھ تھام کر پناہ کی تلاش میں نکلا تھا۔ ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم غلطی سے پھر اسی طرف نہ نکل جائیں جہاں اسکول کے لڑکوں سے واسطہ پڑا تھا۔

مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں زاہدان میں مسافر سرائے بھی ہوتی ہیں جہاں پردیسیوں کو بہت کم قیمت پر رہائش اور کھانے کی سہولت مل جاتی ہے۔ میں نے راستے میں دو چار لوگوں سے پوچھا اور مہرو کو لے کر ایک ایسی ہی مسافر سرائے میں آ گیا۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے کی دونوں سائڈز پر بھی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تاہم دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، کئی مسافر ان چٹائیوں پر ہی تکیے وغیرہ رکھے سو رہے تھے۔ ان میں ایک دو فیملیاں بھی تھیں۔ ایک فیملی شاید پاکستانی تھی۔ میں مہرو کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا بھائی بہت پریشان ہوگا۔ وہ زخمی بھی ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا حالت ہوگی۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی۔ سرائے کے ملازم سے کھانا منگوایا۔ عجیب طرز کی لمبوتری سی روٹی تھی اور ساتھ کسی ترکاری کا سالن تھا۔ مجھے بھوک محسوس رہی تھی لیکن مہرو نے چکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے سندھی لہجے میں کہنے لگی کہ میں باہر جاؤں اور پتا کروں کہ بس کے باقی مسافر کہاں گئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ ابھی لڑکوں والا معاملہ تازہ ہے۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ ہو اور وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں۔''

اس کے سر پر پتھر لگنے سے کٹ سا آگیا تھا۔ میں باہر گیا اور ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے دوا لے کر آیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے یہ ''پاؤڈر میڈیسن'' اس کے کٹ پر لگائی۔ مجھے اس کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی سفری کاغذ نہیں تھا پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ اس کے بھائی جعفر کے پاس تھے۔ ایسے میں اگر کوئی پوچھ تاچھ کرلیتا تو یہ لڑکی مصیبت میں پڑسکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بھی۔

ہم نے رات جیسے تیسے گزاری۔ اگلے روز میں نے اس سے کہا۔ ''میں باہر نکل کر کچھ پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کمرے کے اندر ہی رہنا۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''سائیں! اگر کسی نے کچھ پوچھا تو؟''

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''تم بس سندھی ہی بولنا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ تمہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔''

اسے ضروری ہدایات دے کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے دو تین جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تفتان بارڈر سے زاہدان کی طرف آنے والی بسوں کا اسٹینڈ کس طرف ہے۔ کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ جواب مل بھی جاتا تو ابھی اس طرف جانے میں خطرہ تھا۔ میں گھومتا گھومتا ایک بازار میں نکل گیا۔ یہاں کپڑوں کی بہت سی دکانیں بھی تھیں۔ ان میں زنانہ گارمنٹس کی شاپس بھی تھیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ سب سے پہلے اس مہرو نامی لڑکی کا حلیہ تبدیل کرنا ضروری ہے۔ میں نے ایک مقامی طرز کی سستی سی شلوار قمیص لے لی۔ اوپر پہننے کے لیے وہ گاؤن تھا جو اکثر ایرانی خواتین زیب تن کرتی تھیں۔ براؤن رنگ کا ایک اسکارف بھی لباس کا حصہ تھا۔

میں یہ چیزیں لے کر سہ پہر کے وقت سرائے پہنچا تو مہرو نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ ''بابو سائیں! دیر کیوں لگائی؟'' اس نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

''بس دیر ہوگئی۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''سائیں! پتا چلا کچھ پا (بھائی) کا؟''

''اب یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ کچھ ٹائم لگے گا اس میں۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اور تم مہربانی فرما کر ذرا حلیہ بدلو۔ اتارو یہ بدبودار کپڑے۔''

''جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں نے کپڑوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو، ادھر پیچھے زنانہ حمام ہے۔ وہاں جا کر نہالو اور پہن لو۔''

اس نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کپڑے سائیں؟''

''ہاں بھی۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی لیکن جب میں نے سختی سے کہا تو وہ کپڑے لے کر حمام کی طرف چلی گئی۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو کافی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا گندمی رنگ نکھرا نکھرا تھا۔ اس نے اسکارف بھی باندھ لیا تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے جاذب نظر کہا جاسکتا تھا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں لیکن فی الوقت ان میں گہری پریشانی کی دھند تھی۔

یہ مسافر سرائے زیادہ صاف نہیں تھی۔ کھانا بھی ناقص تھا۔ باتھ روم کی طرف سے کسی وقت بدبو کا جھونکا بڑے ہال کمرے تک آجاتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بہتر جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ میری اگلی منزل تہران تھی لیکن تہران روانہ ہونے سے پہلے میں اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتا تھا جو مہرو کی صورت میں مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ میں رات کو بھی صدقِ دل سے دعا کرتا رہا تھا کہ اس کے وارث اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائیں اور میں اسے ان کے حوالے کردوں۔ آج صبح جب میں باہر نکلا تھا، اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا اور وہ یہ کہ کیوں نہ میں سرائے واپس ہی نہ جاؤں میرا کون سا سامان وہاں پڑا تھا لیکن پھر میرے ذہن نے یہ بات قبول نہیں کی۔ وہ جو بھی تھی مسلمان تھی اور میری ہم وطن تھی۔ میں یوں پردیس میں اسے چھوڑ جاتا تو میرا ضمیر یقیناً مجھے ملامت کرتا۔

اگلے روز صبح سویرے اسے چھوڑ کر میں کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نکلا۔ اچھی جگہیں تو بہت تھیں لیکن ان کے کرائے بھی بہت تھے۔ کافی کوشش کے بعد میں ایک مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ایک سستا سا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر چھ سات کمرے بنے ہوئے تھے۔ کرایہ پاکستان کرنسی کے حساب سے قریباً 100 روپے یومیہ تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے ذریعے ہوٹل کے رجسٹر میں اندراج کرایا۔ مہرو کا اندراج میری بیوی کے طور پر ہوا۔ شکر کا مقام تھا کہ اندراج کرنے والے نے مہرو کا پاسپورٹ طلب نہیں کیا۔

سہ پہر تک ہم اس نئی جگہ منتقل ہو گئے۔ رات کو سونے کا ٹائم ہوا تو میں نے مہرو سے کہا۔ ”میں فرش پر چادر بچھا لیتا ہوں۔ تم بیڈ پر سو رہو۔“

وہ لرز کر بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بابو سائیں؟ آپ اوپر سوئیں، میں نیچے سو جاؤں گی۔“

میں نے بہت کہا لیکن وہ نہیں مانی۔ مسلسل نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ایک چادر بچھائی اور صوفے کی ایک گدی تکیے کے طور پر رکھ لی۔ ہم اکیلے کمرے میں تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے خوف نہیں کھا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میری ذات پر بہت بھروسا کر رہی تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پریشان لہجے میں بولی۔ ”بابو سائیں! میرا پا (بھائی) بہت گھبرا رہا ہوگا۔ پتا نہیں کہاں کہاں مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں کیا کروں؟“

میں نے کہا۔ ”میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم کیا کرو۔ مجھے تو خود پتا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تمہارا وہ پا (بھائی) مجھ پر تمہیں اغوا کرنے کا الزام ہی نہ لگا دے۔“

”اغ وا؟ یہ کیا ہوتا ہے بابو سائیں؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ”کسی کو زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا۔“

”نہیں نہیں بابو سائیں! تم بہت اچھا ہے۔ ہمارا پا (بھائی) بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اس طرح کبھی نہیں سوچ سکتا اور پھر میں خود بھی تو سب کچھ بتاؤں گی اس کو۔“

”وہ مجھے بہت غصے والا لگتا ہے اور سندھی بھی نہیں لگتا۔ تم پوری سندھن ہو۔ وہ تمہارا بھائی کیسے بن گیا؟“

”وہ ادھر عراق میں رہتا ہے بابو سائیں۔ ہم وہاں نواب شاہ میں رہتا۔ اس لیے وہ ذرا اور طرح کا لگتا ہے۔“

”مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ میں نے کہا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے مہرو سے پوچھا۔ ”تم نے رجسٹر میں اپنی ماں کا نام حبیبہ مائی لکھوایا تھا۔ ہمارے سندھ میں تو عورتوں کے نام اس طرح کے نہیں ہوتے۔“

”ماؤ (ماں) تو عراق کی رہنے والی تھی نا سائیں۔“

”یعنی تمہاری ماں عراق کی تھی اور باپ سندھ کا؟“

”جی سائیں! یہ بڑی پرانی بات ہے، انگریزوں کے وقت کی۔ میرا ابا انگریزوں سے لڑتا تھا، پھر وہ بھاگ کر عراق چلا گیا۔ نواب شاہ میں رہتا تو انگریز اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ اس وقت میرے ابے کی عمر کوئی بیس سال تھی۔ وہاں بغداد میں وہ سخت مجدوری کرتا رہا۔ وہاں پر ہی اس کو میری ماؤ (ماں) ملی۔ دونوں کا سنجوگ ہو گیا۔“

”اب کہاں ہے تمہارا ابا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ”وہ تو سات آٹھ سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اب میں اپنے تاؤ کے پاس رہتی تھی اور داڈی (دادی) کے پاس۔“

”اور تمہاری ماؤ؟“

”وہ بھی کچھ سال پہلے اللہ سائیں کے پاس چلی گئی تھی۔“

”وہ بھی یہیں پاکستان میں فوت ہوئی؟“

”نہیں وہ وہاں بغداد میں ہوتی تھی۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا تمہارا باپ پاکستان واپس آ گیا تھا اور ماؤ وہیں رہ گئی تھی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ”ہاں بابو سائیں! ان دونوں کے درمیان بگاڑ ہو گیا تھا۔ میں پانچ چھ سال کی تھی جب میرا ابا مجھے لے کر پاکستان آ گیا تھا۔ میرا پا (بھائی) جعفر مجھ سے بڑا تھا۔ وہ وہیں ماؤ کے پاس رہ گیا۔ شروع میں ابا سوچتا تھا کہ شاید میری ماؤ میرے پا کو لے کر پاکستان آ جائے گی۔ پر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہ ہی پھر میرا ابا سائیں کبھی واپس عراق گیا۔ پر وہ میری ماؤ کو یاد جرور کرتا تھا۔“

”کیا تم بھی اپنی ماؤ کو یاد کرتی تھیں؟“

”ہاں...... کچھ کچھ...... لیکن میں اپنے پا جعفر کو زیادہ یاد کرتی تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے، پھر میں ابا سائیں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ وہ وہاں اکیلا رہ گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب تیرہ چودہ سال بعد وہ تم کو بغداد سے ڈھونڈتا ہوا وہاں نواب شاہ پہنچا؟“

مہرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی ناک کی تھلی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمکنے لگی۔ میرے سوالوں کے جواب میں مہرو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں رک رک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مہرو کا بھائی جعفر بغداد میں رہا لیکن اپنے باپ اور بہن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی بہن مہرو پاکستان کے شہر نواب شاہ میں کہیں رہتی ہے اور ایک پسماندہ بستی میں اپنے تایا کے پاس تنگی کی زندگی گزار رہی ہے۔ دوسری طرف جعفر کا شمار کھاتے پیتے

لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے دل میں اکثر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ پاکستان جائے اور اپنی بہن سے ملے۔ اس کے بعد کوشش کرے کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلی آئے۔ وہ پاکستان پہنچا اور مہرو کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ اس نے مہرو کو اپنے ساتھ چلنے پر کیسے راضی کیا اور مہرو کے تایا نے کیسے اجازت دی، یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔ بہرحال اب مہرو اپنے بھائی کے ساتھ اپنی رضامندی سے بغداد جا رہی تھی۔ سندھی قافلے میں جو نور بخش نام کا بوڑھا شخص تھا، وہ بھی دور نزدیک سے مہرو کا رشتے دار ہی تھا اور ان دونوں کے ساتھ بغداد جا رہا تھا۔ اب راستے میں یہ واقعہ ہو گیا تھا اور سب لوگ بکھر کر رہ گئے تھے۔ شوخ آنکھوں والی یہ بھولی بھالی سی مہرو میرے پلے بندھ گئی تھی اور میری مصیبتوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

اپنی روداد سنانے کے بعد وہ فرش پر میرے جوتوں کے پاس ہی لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور مختلف سوچیں میرے ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ میں جو کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ بہرحال اس کے عجیب عجیب نقشے میرے ذہن میں بن رہے تھے اور میرے اندر خوف جگا رہے تھے۔ ذہن میں خیال آتا تھا، پتا نہیں، وہاں کیا قیامت مچی ہو گی؟ مجھے کیسے کیسے تلاش کیا جا رہا ہو گا؟

جسم تھکن سے چور تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کسی شور کی وجہ سے کھلی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ شور کس چیز کا تھا۔ شاید کوئی زور سے بولا تھا یا پھر کوئی دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، مہرو فرش پر الٹی سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں گندمی چہرے پر بکھری تھیں۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے ایک چادر اس پر ڈال دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سوئی رہے گی لیکن وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے اوڑھنی اپنے سینے پر درست کی۔ پھر آنکھیں مل کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

میں دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ واش روم میں چلی گئی اور وضو کر کے باہر آ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے دعا کرتی رہی۔ یقیناً اپنے وارثوں سے دوبارہ ملنے کی دعا کر رہی تھی۔

یکایک نچلی منزل سے پھر شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے ایک دروازہ زور سے بند ہوا پھر دو تین افراد بلند آواز میں گرجنے برسنے لگے۔ یقیناً یہ ایرانی ہی تھے۔

میں نے باہر والی کھڑکی ذرا سی کھولی اور احتیاط سے جھانکا۔ ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایرانی پولیس کی دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ دو باوردی اہل کاروں کے ساتھ دو تین سادہ پوش افراد بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں جم سا گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ نوجوان ان افراد میں شامل تھا جنھوں نے اسکول کے سامنے لڑائی کے بعد ہمارا پیچھا کیا تھا۔

تو کیا ہمیں ڈھونڈ لیا گیا تھا؟ یا پھر ویسے ہی یہاں تلاشی وغیرہ ہو رہی تھی؟ یہ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کا دور تھا۔ ایجنسیاں بہت سرگرم نظر آتی تھیں...... مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکوک افراد کے لیے اکثر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں چیکنگ وغیرہ ہوتی ہے۔

مہرو دعا سے فارغ ہوئی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا ہوا بابو سائیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہاں ہوٹل میں تلاشی ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔“

”ہائے اللہ، اب کیا ہو گا بابو سائیں؟“ مہرو کا رنگ ہلدی ہو گیا۔

اب سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید اہلکار اب تلاشی لینے کے لیے اوپر آ رہے تھے۔

میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ”مہرو! تم اپنی نماز جاری رکھو۔ وہ لوگ تمہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ واپس چلے جائیں۔ وہ اس حلیے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکیں گے۔“

”لیکن بابو سائیں......“

”بس کوئی سوال نہیں۔“ میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”تم نماز پڑھو، میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔“

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اَن لاک کر دیا اور خود واش روم میں چلا گیا۔ لرزتی کانپتی مہرو نے میری ہدایت کے مطابق نفلی نماز شروع کر دی تھی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اب اوپر کی منزل پر تھے۔ دروازے دھڑا دھڑ بجائے جا رہے تھے۔ اہلکاروں کی آوازیں گرج دار تھیں۔ وہ فارسی بول رہے تھے۔ میں واش روم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا اور... کی ہول میں سے چابی نکالنے کے بعد ہول میں سے جھانکنے لگا۔ مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس دروازے پر بھی زور سے دستک ہوئی۔ میری ہدایت کے مطابق مہرو نماز پڑھنے میں مشغول رہی۔ دوسری

تیسری دستک کے بعد دروازے کا ہینڈل گھوما اور ایک باوردی اہلکار اندر آیا۔ مجھے بس اس کی ٹانگیں اور پیٹ ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا، یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ آخر یہ لمحے گزر گئے۔ اہلکار واپس چلا گیا اور دروازہ بند کردیا...... اپنے بدلے ہوئے لباس اور حلیے کی وجہ سے مہرو سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔ میں جلدی سے باہر آیا اور دروازہ پھر اندر سے لاک کردیا۔

مہرو کی پیشانی پر پسینا نظر آرہا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے اس نے اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر اور چہرے پر رکھا تھا کہ اس کی تھیلی بالکل نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ یہ تھیلی بڑی خطرناک تھی اور فوراً اس کی پہچان کراسکتی تھی۔ تھیلی کے علاوہ وہ سندھی لباس بھی ایک شاپر میں موجود تھا جو مہرو نے مسافر سرائے میں بدلا تھا۔ یہ شاپر بھی سامنے الماری میں ہی رکھا تھا۔ اگر تلاشی لینے والے تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو ہم سخت مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

میں نے سب سے پہلے تو مہرو سے وہ وزنی تھیلی اتروائی اور اسے ٹشو پیپر میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا۔ اس کے بعد مہرو کا سندھی لباس بھی اچھی طرح الماری کے عقبی خلا میں چھپادیا۔

”بابو سائیں! کون لوگ تھے یہ؟“ مہرو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ وہی تھے جن کے ساتھ ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ ساتھ میں پولیس کے لوگ بھی تھے۔“

مجھے نیچے سڑک کی طرف سے کچھ آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی کی درز میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے دیکھا۔ باوردی ایرانی اہلکار چار پانچ افغانی باشندوں کو گرفتار کرکے گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ یقیناً یہ لوگ ہوٹل کی تلاشی میں ان کے ہتھے چڑھے تھے۔ ممکن تھا کہ مہرو کی طرح ان کے پاس بھی سفری کاغذات نہ ہوں۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔

وہ دن بھی ہم نے ہوٹل کے اسی کمرے میں چھپ کر گزارا۔ مہرو نے مجھے اپنے بارے میں کچھ مزید باتیں بھی بتائیں مثلاً یہ کہ اس کی دادی اس سے بہت پیار کرتی ہے لیکن اب وہ بہت بیمار رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے بھائی جعفر کے ساتھ عراق بھیجنے پر تیار ہوگئی ہے...... مہرو نے اپنے معصوم لب ولہجے میں یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی جعفر اسے بغداد لے جاکر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بڑی خدمت گزار قسم کی لڑکی تھی۔ میں کھانا لاتا تو وہ کہتی۔ ”پہلے آپ کھائیں بابو سائیں۔ میں بعد میں کھاؤں گی۔“

میں نہانے کے لیے باتھ روم میں گیا تو اس نے وہاں پہلے ہی صابن تولیا وغیرہ رکھ دیا اور بالٹی بھر دی۔ نہاتے ہوئے میں نے کی ہول سے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی پرانی اوڑھنی سے میرے بوٹ صاف کررہی تھی۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ مہرو کل رات کی طرح فرش پر چادر بچھا کر سوچکی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے نچلے حصے سے موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ جدید قسم کی موسیقی تھی جس میں شور شرابا زیادہ ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ سلسلہ رک جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند تو ابھی ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا سوئی ہوئی مہرو کے چہرے پر سادگی اور معصومیت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو چھوٹی سی بچی ہو...... میں نے اس کے جسم پر چادر درست کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں سیڑھیاں اترا اور نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کی اکثر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور ایک دو کے سوا سب میزیں خالی نظر آتی تھیں۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر دو ملازم اونگھ رہے تھے۔

میں ایک کوریڈور میں داخل ہوا تو موسیقی کی دھادھم مزید شدت سے سنائی دینے لگی۔ یہ دھادھم سیاہ رنگ کے ایک دروازے کے پیچھے سے ابھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر دروازے کو تھوڑا سا اندر کی طرف دھکیلا۔ موسیقی کی آواز کان پھاڑنے لگی۔ اندرونی منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہاں تین چار درجن لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ یہ ہپیوں کا کوئی گروہ تھا اور شاید آج شام ہی اس ہوٹل میں اترا تھا۔ یہ نیم برہنہ مرد وزن اندھادھند ناچ رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں شراب کے جام تھے، کچھ سگریٹ وغیرہ کے کش لے رہے تھے۔ اس پورے ہال میں چرس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور نیم تاریکی میں رنگ برنگی روشنیاں اسپارک کررہی تھیں۔

ابھی میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لمبی تڑنگی گوری نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے تیزی سے اندر کھینچ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم میرے ساتھ کیا ہوگیا

ہے۔ میں دیوانہ وار رقص کرتے لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے، نازیبا حرکات کر رہے تھے۔ نیم عریاں جسم موسیقی کی تیز لہروں پر اندھا دھند تھرک رہے تھے۔ مجھے اندر کھینچنے والی دراز قد لڑکی نے مجھے بھی رقص میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اپنی طرف کھینچا۔ میرے ہونٹوں سے بدبودار وھسکی کا جام لگانا چاہا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس سے علیحدہ کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن تب ایک اور قیامت میرے سامنے آگئی۔ چوبیس پچیس سال کی یہ خوش اندام ہپی لڑکی دھوئیں کے مرغولوں میں سے نکلی اور جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔

''ڈانس بوائے ڈانس..... ڈانس بوائے ڈانس۔'' وہ مسلسل کہتی جا رہی تھی۔

میں خود کو چھڑانے کے لیے اس سے کوئی زبردستی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگی اور اس نے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک دم برہم ہو گئی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر انگلش میں پتا نہیں کیا کچھ بولنے لگی۔ ایک ہٹے کٹے ہپی نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے لڑکی کو زور سے دھکا دیا ہے اور وہ گرتے گرتے بچی ہے۔ درمیانی عمر کا یہ ہپی نشے میں چور تھا۔ بڑے غصیلے انداز میں میری طرف آیا۔ بالکل ایسے ہی لگا جیسے مجھے تھپڑ مارنا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ یہ غلطی کر گزرتا تو یقیناً اس کے لیے..... بلکہ ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوتا۔ میں تھپڑ کھا کر چپ رہنے والا شخص نہیں تھا۔ بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ہٹا کٹا ہپی مجھ تک پہنچتا، ایک شخص تیزی سے میرے اور ہپی کے درمیان آگیا..... اس نے کہہ سن کر ہپی کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ یہ کوئی پاکستانی لگتا تھا۔ اس نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے پورے جسم پر لپ اسٹک کے نشان نظر آرہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ رحیم یار خان کا وہی امین نامی نوجوان تھا جس نے بس میں ہمارے ساتھ زاہدان تک کا سفر کیا تھا۔ امین کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ خود بھی نشے میں چور تھا۔ اس کی توانا گردن کی رگیں نشے کی حدت سے پھولی ہوئی تھیں۔

''امین! تم یہاں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہی بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں جی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

موسیقی کے شور کی وجہ سے ہم دونوں کو بہت زور سے بولنا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس غلطی سے یہاں آگیا۔''

''یہ اچھی غلطی ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر انجوائے کر لو۔ یہ کھاتے پیتے ہپی ہیں۔ سب کچھ ان کے خرچے پر ہی ہو رہا ہے۔''

یہ امین کا ایک نیا روپ تھا۔ بس میں وہ مجھے ایک غریب صورت، شریف النفس لڑکا نظر آیا تھا جو حق حلال کی روزی کے لیے پردیس کا رخ کر رہا تھا لیکن یہاں وہ کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے ساتھ ساتھ حرص و ہوس کی چمک بھی تھی۔ مجھے اس سے کراہت محسوس ہوئی۔ اسی دوران میں ایک ذرا صحت مند ہپی لڑکی نظر آئی اور ڈارلنگ کہتے ہوئے امین سے لپٹ گئی۔ امین کے سرخ و سپید جسم پر نظر آنے والے سرخ نشان شاید اسی بھدی سی ہپی لڑکی کی لپ اسٹک کے تھے۔

میں نے حیران نظروں سے دیکھا۔ کئی بدمست جوڑے ہال کے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور اردگرد کے ماحول سے یکسر بے پروا نظر آتے تھے۔ شاید امین بھی کچھ دیر بعد گندگی کی اسی دلدل میں دھنسنے والا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ شاید چرس کا دھواں بھی مجھ پر اثر کر رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھرکتے جسموں کے درمیان سے راستہ بنایا اور ہال کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

مجھے مہرو کی فکر تھی۔ میں اسے کمرے میں مقفل چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ آہستہ سے چابی گھما کر دروازہ کھولا۔ یہ دیکھ کر شاک لگا کہ مہرو ڈری سہمی میرے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرا بازو پکڑ لیا۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے بابوسائیں! آپ مجھ کو بتا کر تو جاتے۔''

''سوری..... سوری۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بے آرام نہ کروں۔ میں بس ذرا سڑک تک گیا تھا۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا، جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

''یہ نیچے کوئی ناچ گانا ہو رہا ہے بابوسائیں!''

''پ..... پتا نہیں۔ میں اس طرف گیا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

میرا بازو بدستور اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت میں

تھا۔ جیسے اس پردیس میں یہ بازو ہی اس کا واحد سہارا ہو اور وہ ہرگز اسے چھوڑنا نہ چاہتی ہو۔ وہ بدستور روہانسی آواز میں بولی۔ ”بابو سائیں! آگے ایسا مت کرنا۔ یہ دیکھو میرا کلیجا کیسے دھک دھک بج رہا ہے۔“ اس نے کسی چھوٹی بچی کی سی معصومیت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا۔

میں سٹپٹا گیا۔ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کرنے سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔“

وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ پاکستان، لاہور...... اور اپنے گھر کی یاد آتی رہی۔ آنکھیں بھیگتی رہیں اور خشک ہوتی رہیں۔ اگلے روز صبح میں ناشتا لینے کے لیے نیچے گیا تو ایک بار پھر امین پر نظر پڑی۔ وہ موٹے نقوش والی قدرے فربہ اندام گوری کے ساتھ موجود تھا اور مزے سے اورنج جوس پی رہا تھا۔ دو تین اور جوڑے بھی اردگرد موجود تھے۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔

ہماری بات دوپہر کے وقت ہوئی۔ اس وقت امین اکیلا تھا، اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ہم دونوں لابی کے ایک صوفے پر آبیٹھے۔ باہر آنے سے پہلے میں نے مہرو کو اچھی طرح تسلی دے دی تھی کہ میں ہوٹل کے اندر ہی موجود ہوں۔

امین کا نشہ اب اترا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات والے واقعات پر شرمندہ نظر آئے گا لیکن کوئی خاص شرمندگی مجھے اس کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔ اس کے بجائے اس نے مجھے قدرے شوخ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”ہارون بھائی! آپ تو چھپے رستم نکلے۔“

”کیوں، کیا ہوا ہے؟“

”نہیں...... کچھ برا تو نہیں ہوا۔ اگر کوئی لڑکی آپ کے ساتھ ہے تو اچھا ہی ہے۔ یہ سب کچھ یہاں کے ماحول کے مطابق ہی ہے۔“ اس نے اپنے میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ اندھے کو سارے اندھے ہی نظر آتے ہیں۔ جو تم سمجھ رہے ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔ یہ کوئی اور عورت نہیں...... وہی سندھی لڑکی ہے جس نے بس میں ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے اس کا بھائی بھی ساتھ ہی تھا۔“

”اوہو...... تو یہ اس عراقی جعفر کی بہن ہے۔“ امین کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور وہ حیران نظر آنے لگا۔ ”لیکن ہارون صاحب! اس کا بھائی اور وہ رشتے دار نور بخش کہاں ہیں؟“

”تمہیں نہیں معلوم، وہاں بس سے اترنے کے بعد کیا ہوا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ سب کچھ تو بہت شرمندہ کرنے والا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آئی، ایک دم کیا ہو گیا تھا جی۔ وہ لڑکے تو اس طرح پتھر مارنے لگے تھے جیسے ہم کوئی آوارہ جانور ہیں اور ان کے محلے میں گھس آئے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ گیا۔ میرے کندھے پر بھی ایک پتھر لگا تھا جی۔ میں ایک کوڑے دان کے پیچھے چھپ گیا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک چھوٹی گلی میں گھس گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ کسی نے سامنے سے مجھے پکڑا نہیں اور میں بڑی سڑک پر آ گیا...... اور آپ کے ساتھ کیا ہوا؟“ آخر میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

”وہی کچھ جو دوسروں کے ساتھ ہوا۔“ میں نے کہا اور پھر اس واقعے کی مختصر روداد اسے سنا دی۔

پوری روداد سننے کے بعد وہ بولا۔ ”اب اس لڑکی کا کیا کریں گے آپ؟“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ اس کے پاس پاسپورٹ ہے اور نہ کوئی اور کاغذ۔ پولیس اسٹیشن نہیں جاسکتا، نہ کسی اور ادارے سے رجوع کرسکتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے وہ...... اور ساتھ میں، میں خود بھی۔“

امین بولا۔ ”ویسے تہران میں دو تین سندھی فیملیوں کے پتے میرے پاس ہیں، اگر یہ لڑکی ان فیملیوں تک پہنچ جائے تو ہوسکتا ہے کہ اپنے وارثوں سے بھی مل جائے......“

میں نے امین کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ نیت کا ٹھیک بندہ نہیں۔ وہ مجھے اس بات کے اشارے دے رہا تھا کہ وہ اس بے آسرا لڑکی کو اپنے ساتھ تہران لے جاسکتا ہے اور اس کے وارثوں تک پہنچانے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سندھی قافلے کے لوگوں کی اگلی منزل تہران ہی تھی۔

میں نے کل رات امین کو جس حالت میں دیکھا تھا، اس کے بعد میں اس پر ہرگز اعتبار نہیں کرسکتا تھا...... اور مہرو کے سلسلے میں تو ہرگز نہیں۔ میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا اور دیگر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ان دو چار دنوں میں ہی امین ان ہی لوگوں کے ساتھ خوب گھل مل گیا تھا۔ اس کے منہ سے چرس کی ہلکی سی بو بھی آرہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عنقریب کسی برے چکر میں پھنسنے والا ہے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ ویسے تو وہ کویت پہنچنے اور محنت مزدوری کرنے کا ارادہ رکھتا

ہے لیکن بھی بھی اسے یہ بھی لگتا ہے کہ ان مزدوریوں میں بندہ اور بندے کی عمر خرچ ہو کر رہ جاتی ہے۔

وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ”ویسے ہارون بھائی! ایک بڑے منافع بخش کام کا پتا مجھے چلا ہے۔ ابھی میں خود ریسرچ کر رہا ہوں، کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو پھر آپ کو بھی بتاؤں گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیسے بتاؤ گے، میں تو بغداد جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم نے خیر سے پہنچانا ہے کویت۔“

”لیکن ہارون بھائی! جانا تو میں نے بھی بغداد سے ہو کر ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہاں دس پندرہ روز ہم رکیں گے بھی۔“ ”ہم“ سے اس کی مراد یقیناً اس کے لوفر ہم سفر ہی تھے۔

اس نے پتلون کی ایک جیب میں سے بوسیدہ بٹوا نکالا اور پھر ایک پرچی پر ایک فون نمبر لکھ کر مجھے دیا۔ یہ کسی یوتھ ہاسٹل کا نمبر تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہارون بھائی! بغداد میں آپ اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے رابطہ ہو جائے گا۔“ پھر ذرا جھجک کر بولا۔ ”لیکن ہارون بھائی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بغداد کیوں جا رہے ہیں آپ؟“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”وہاں میرا کوئی اپنا ہے۔“

”کوئی رشتے دار ہے؟“

”رشتے دار تو غم دیتے ہیں۔ وہ غم لینے والا ہے، درد بانٹنے والا ہے۔ بڑا غم گسار، بڑا مہربان۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے بہت سے دکھوں کا مداوا کرے گا اور میرا ہاتھ بھی پکڑے گا۔“

”اللہ کرے جی کہ آپ کی امیدیں پوری ہوں..... ویسے پردیس میں ایسی امیدیں کم ہی پوری ہوتی ہیں۔“

میں چپ رہا۔ اسے کیا جواب دیتا..... دیتا بھی تو شاید اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ میں عالی مرتبت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی بات کر رہا تھا۔ وہ بغداد میں ہی مدفون تھے۔ ان کے مزار اور عالی شان مسجد کی تصویریں میں نے کئی بار دیکھی تھیں۔ اب وہی جگہ مجھے اپنی طرف کشش کر رہی تھی۔ میں غموں کے ایک ناقابلِ فہم گھیرے میں تھا۔ ایک ریلا سا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں کسی اللہ والے کے دست مہربان کی ضرورت مجھے بڑی شدت سے محسوس ... ہو رہی تھی۔ میں کہیں بھی جانے سے پہلے، کسی بھی ملک کا رخ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت شیخ جیلانیؒ کے روضے پر جانا چاہتا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ وہی بھدی سی سفید فام لڑکی دوبارہ نظر آئی جو کل رات جونک کی طرح امین سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور امین سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں اور مہرو تہران کی طرف محو سفر تھے۔ جرمنی کی شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس تھی جس میں باہر کی گرمی بالکل بے اثر ہو جاتی تھی۔ کسی رن وے کی طرح کشادہ اور صاف شفاف سڑک پر بس بڑے ہموار طریقے سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ مہرو مقامی لباس میں تھی۔ اس نے اپنا چہرہ حجاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بالکل خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تہران میں کچھ سندھی فیملیوں کے ایڈریس میرے پاس ہیں، ان میں دو فیملیاں نواب شاہ کی بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں سے اس کے وارثوں کا کچھ پتا چل جائے۔ یہ فیملیاں ایک ہی بڑی بلڈنگ میں رہتی تھیں اور یہ ایڈریس میں نے امین اکرم سے ہی لیا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب ہمیں کہیں کوئی سبزہ اور درخت نظر نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبے دکھائی دیتے تھے جو نہایت خوب صورت اور صاف ستھرے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ لوگوں نے جدید گھر اور شیشے کی نفیس دکانیں پیرس سے منگوا کر یہاں رکھ دی ہیں۔

راستے میں ایک جگہ بس کچھ دیر کے لیے رکی۔ میں اور مہرو بھی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ یہاں موسم بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا ارا وَنڈا باؤنٹ تھا جس کے اندر باغیچہ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں بہت سی درمیانی عمر کی ایرانی عورتیں بیٹھی اور لیٹی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور کچھ سو رہی تھیں۔ میں اور مہرو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ عورتیں اتنی بے فکری سے لیٹی ہوئی تھیں۔ مہرو کی نگاہیں شرمیلے انداز میں جھک گئیں۔ بہرحال یہ یہاں کا رواج تھا۔

ہم کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے تو جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بہت سے ایرانیوں کی میزوں پر بکروں وغیرہ کی ابلی ہوئی سریاں رکھی تھیں۔ وہ چھری کانٹے سے ان سریوں کو نوچ

نوچ کر کھا رہے تھے۔ ہلکی سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''بابو سائیں! میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' مہرو نے کہا۔

میں اسے لے کر فوراً باہر نکل آیا۔ ایک اسٹال سے ہم نے دو چکن برگر لیے اور واپس بس میں آن بیٹھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی میں جب بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، مجھے وہ فقرے ضرور یاد آ جاتے تھے جو میں نے اپنی مہندی کی رات اپنے کمرے میں سنے تھے۔ جب سے میں اس طویل سفر پر روانہ ہوا تھا، وہ فقرے مجھے دوبارہ سنائی نہیں دیے تھے اور نہ ہی وہ ہیولا نظر آیا تھا۔ جس نے پہلے مہندی کی رات اور پھر شادی کی شام مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اس کے باوجود پتا نہیں کیوں کھانا شروع کرتے ہوئے مجھے اس ہیولے کی اور ان فقروں کی یاد ضرور آتی تھی اور چند لمحوں کے لیے جسم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات مہرو نے بھی نوٹ کی تھی اور ایک دو بار مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں کھانا شروع کرتے ہوئے ایک دم چپ سا کیوں ہو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس کا کوئی معقول جواب اسے نہیں دے سکا تھا۔

ایک طویل سفر کے بعد ہماری بس عظیم الشان تہران کے مضافات میں پہنچ گئی۔ پہلے بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ نظر آئیں پھر شاندار عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیکھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ اہلِ تہران کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔ جا بجا وسیع باغات اور آبی گزرگاہیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ باغات اور شاہراہوں پر جگہ جگہ شاہ ایران کے مجسمے نصب تھے۔ جوں جوں ہم تہران کے قریب پہنچتے گئے، عمارتوں کے نقشے بدلتے گئے اور ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان فلک بوس عمارتوں کے پس منظر میں پہاڑ تھے اور دور برفیلی چوٹیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ ہم جیسے رنگ و بو کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔

بس سے اترے تو شام ہو چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر پیدل ہی چلتے رہے۔ پھر ایک شاندار باغیچے میں بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ہمیں کوئی چھوٹا سا ہوٹل تلاش کرنا تھا۔ وہیں باغیچے میں بیٹھے بیٹھے مہرو بولی۔ ''بابو سائیں! آپ تھک گئے ہیں تو میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔''

میں سٹپٹا گیا۔ ''تمہاری عقل کام کر رہی ہے یا نہیں؟ کیا میرا اور اپنا تماشا بنانا چاہتی ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم دو مسکینوں کی طرح تھے جو انتہائی خوش لباس لوگوں اور نہایت قیمتی گاڑیوں والے ایک ''پیرس نما شہر'' میں گھوم رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ایک اندرونی سڑک پر ہمیں اپنے بجٹ کے مطابق ایک سستا سا ہوٹل مل گیا۔ یہاں اندراج کے لیے پھر میرا پاسپورٹ استعمال ہوا۔

یہاں کمرے میں پھر وہی مسئلہ تھا۔ ایک ہی ڈبل بیڈ تھا۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود مہرو نے یہاں بھی وہی ترتیب بنائی۔ یعنی خود لڑکی کے فرش پر چادر بچھائی اور مجھے بستر پر سلایا۔ کافی تھکاوٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم سو گئے۔ آنکھ کھلی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مہرو کا چہرہ بھی بھوک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ہم نے کمرا لاک کیا اور نکل آئے۔ تہران رنگوں اور روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ یہ سستا علاقہ تھا اس کے باوجود لاہور کے مال روڈ یا میکلوڈ روڈ سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا..... ایک جگہ ہمیں ایک ریڑھی پر کھانے پینے کی اشیا نظر آئیں۔ ہم نے

...... ب سے ردعمل ہے اور ہم پڑے۔ کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ اردگرد کے مناظر دیکھتے رہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی ایک ہی جیسی عمارتیں اور سڑکیں نظر آرہی تھیں۔

اگلے دو تین منٹ کافی پریشانی میں گزرے۔ مہرو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا بابو سائیں؟''

''لگتا ہے ہم راستہ بھول گئے ہیں۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ منمنائی۔

میں کیا جواب دیتا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ذہن پر زور دیا اور پھر اندازے سے ایک راستہ منتخب کرکے اس پر چل پڑا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک جوتیاں چٹخاتے رہے لیکن کہیں کوئی جانی پہچانی عمارت نظر آئی اور نہ راستہ۔ ہم گم ہو چکے تھے۔ آخر میں ایک بڑے ڈیپار ٹمنٹل اسٹور کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ تھکن اور پریشانی سے برا حال تھا۔ یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ میرا پاسپورٹ وغیرہ بھی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ سنگین غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت میں نے ہوٹل کا نام غور سے دیکھا اور نہ ہی ہوٹل کا کارڈ اپنی جیب میں رکھا۔ ہم کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔

''یا اللہ اب میں کیا کروں؟'' میں نے دل ہی دل میں پکارا۔

بے بسی کا یہ عالم تھا کہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اگر ہم وہ ہوٹل نہ ڈھونڈ سکے تو کیا ہوگا؟ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹا مزید تہران کی سڑکوں پر گھومے اور بالکل نڈھال ہوگئے۔ شدید پریشانی کے سبب میرے بازو میں درد ہونے لگا...... مجھے یوں محسوس ہوا کہ بے ہوش ہوکر گر جاؤں گا۔ سب سے زیادہ فکر مجھے اپنے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ کی تھی۔

مہرو نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''اب ہم کیا کریں گے بابو سائیں؟''

میں نے جھلا کر جواب دیا۔ ''اب ہم نے کیا کرنا ہے۔ جو کریں گے یہاں کے پولیس والے ہی کریں گے۔ ہمیں اٹھا کر کہیں جیل میں ڈال دیں گے اور ہم سڑتے رہیں گے وہیں پر۔''

''بابو سائیں! آپ کسی اچھے بندے سے بات کرکے دیکھو، شاید وہ ہماری کوئی مدد کرسکے۔''

''کس سے بات کروں؟ کون سمجھے گا یہاں ہماری بات؟'' میں نے تقریباً چلا کر کہا۔

''بابو سائیں! مجھ پر کیوں غصہ ہوتے ہیں، میرا کیا قصور ہے؟''

''ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ میں ہی گناہ گار ہوں۔ جوتے مارو میرے سر پہ۔ میں نے ہی تمہیں اپنے ساتھ چمٹایا ہوا ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ مجھے ہی شوق چڑھا ہوا ہے تمہارے ساتھ سیر سپاٹے کرنے کا۔ بے وقوف کہیں کی...... الو کی پٹھی...... میں نے کہا بھی تھا کہ کمرے میں رہو...... میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آجاتا ہوں...... لیکن تو کسی کی سنتی بھی ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب تیری وجہ سے...... سب تیری وجہ سے ہے۔'' میں دہاڑ کر بولا۔

قریب سے گزرتے ہوئے دو ایرانی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ یہ رات ایک بجے کا عمل تھا۔ ویک اینڈ کے باوجود سڑکوں پر رش کم ہو گیا تھا۔ میری ڈانٹ سن کر وہ بالکل گم صم ہوگئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حجاب کے اندر سسکیاں لے رہی ہے۔

میں اٹھ کر ایک بار پھر چل دیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ بڑے اذیت ناک لمحے تھے۔ میں انہیں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ اچانک مجھے عقب سے مہرو کی آواز آئی۔ وہ کراہ کر پہلو کے بل پختہ سڑک پر گری تھی۔ دراصل یہ موٹر سائیکل پر سوار دو اوباش لڑکے تھے۔ انہوں نے مہرو سے بدتمیزی کی تھی اور ان کا دھکا لگنے سے وہ گر گئی تھی۔ اب وہ موڑ کاٹ کر راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ یہ سارا منظر ایک سیکنڈ کے اندر اندر میری نظروں سے گزر گیا اور میری سمجھ میں بھی آگیا۔ میں پہلے ہی غصے سے بھنایا ہوا تھا۔ نتیجے سے بے پروا ہوکر میں موٹر سائیکل کے پیچھے بھاگا۔ ساتھ ہی میں چنگھاڑا تھا۔ ''ٹھہرو حرامزادو۔''

مجھے خود پر جھپٹتے دیکھ کر موٹر سائیکل چلانے والا بوکھلا گیا۔ موٹر سائیکل ایک بڑے ڈسٹ بن سے ٹکرائی اور بری طرح ڈگمگا گئی۔ پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا اس پر سے گر گیا لیکن اس کا ساتھی بھاگ نکلا۔ یہ ایک دبلا پتلا لڑکا لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی اٹھ کر بھاگ نکلتا، میں نے اسے چھاپ لیا۔ اس نے فارسی میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور میرے سینے پر سر کی ٹکر مار کر مجھے گرانا چاہا۔ یہ سارے داؤ پیچ میرے آزمائے ہوئے تھے۔ میں نے نہ صرف اس کا یہ وار بچایا بلکہ اس کی گردن پر ایسا زوردار چھانپڑ رسید کیا کہ وہ چار پانچ میٹر تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میری ٹانگ اس کے

سینے پر پڑی اور وہ ڈسٹ بن سے ٹکرا کر پھول دار پودوں میں گرا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ کسی کمزور بندے سے نہیں پڑا۔ وہ پھولوں والی کیاری سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن مہرو نے میرے راستے میں آ کر مجھے روک لیا۔ ''نہیں بابو سائیں...... جانے دیں...... وقت ہو گیا ہے...... جانے دیں۔''

یہ ایک چھوٹی سی نیم تاریک سڑک تھی۔ بس چند دکانوں کے اندر ہی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ارد گرد کسی شخص نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ میں نے اپنا لباس درست کیا...... مہرو سے اس کی خیریت پوچھی...... اور تب ایک بار پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار میں مہرو کے آگے آگے چلنے کے بجائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب میرا رخ قدرے بڑی اور روشن سڑک کی طرف تھا۔ مہرو کچھ مزید سہم گئی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ چل چل کر اب ہم دونوں کی ہمت جواب دینے والی ہے۔ اچانک مہرو نے ایک طرف انگلی اٹھائی اور بولی۔ ''بابو سائیں...... وہ بھیس جرا۔ وہ کون ہے؟''

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا اور یکایک دل خوشی سے سینے میں اچھل پڑا...... یہ ایک لمبے قد کا انگریز تھا اور اسے میں نے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو...... ہاؤ آر یو۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے دردناک لہجے میں اسے بتایا کہ میں ہوٹل کا راستہ بھول گیا ہوں اور اپنی ساتھی کے ساتھ قریباً تین گھنٹے سے دربدر پھر رہا ہوں۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے بیئر کا ایک طویل گھونٹ لیا اور مسکرا کر انگلش میں بولا۔ ''مجھے نہیں پتا تم کہاں رہے ہو...... لیکن اب تم اپنے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہو۔ وہ سامنے دیکھو۔ یہی ہوٹل ہے۔''

میں حیرت سے گنگ ہو کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ہوٹل کا عقبی دروازہ ہے۔ وہ سفید رنگ والا بڑا دروازہ سامنے کی طرف ہے۔''

اس نے مجھے اور مہرو کو ساتھ لیا اور تیس چالیس قدم چل کر سامنے کی طرف آ گیا۔ میں ہوٹل کا سفید بڑا دروازہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ خوشی سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔ ہم بوسیدہ لباس والے اس دراز قد گورے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہ بہ ظاہر شائستہ نظر آتا تھا لیکن گاہے بگاہے چور نظروں سے مہرو کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس زمانے کا ایران کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھا۔ چلتی پھرتی عورتوں کو ایسے ہی بے باک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ گورا...... امریکن ہے اور اکیلا ہی مڈل ایسٹ کی سیاحت کو نکلا ہوا ہے۔ اس کا نام اینڈرسن معلوم ہوا۔

میں اپنے کمرے میں یوں آیا جیسے پانی سے بچھڑی ہوئی مچھلی واپس تالاب میں آتی ہے۔ سب سے پہلے الماری کا اندرونی خانہ کھول کر اپنا پاسپورٹ اور نقدی وغیرہ چیک کی...... پاسپورٹ کو باقاعدہ ہونٹوں سے لگا کر چوما اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں احتیاط کے ساتھ رکھ لیا۔

مہرو اپنے فرشی بستر پر کسی مجرم کی طرح گم صم بیٹھی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ راستے میں میری طرف سے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت پریشانی ہی اتنی تھی کہ میں اپنے لب و لہجے پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ جائے۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہی لیکن جب میں نے ذرا تحکم سے کہا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے مہرو! میں نے تم سے سخت لہجے میں بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس کے لیے معاف کر دو۔''

وہ ایک دم تڑپ سی گئی۔ ''آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں بابو سائیں! کیوں مجھ کو گناہ گار کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ میں نے اپنی مصیبتیں آپ کے گلے میں ڈال دی ہیں۔ میرے لیکھ ہی ایسے ہیں۔ اللہ سائیں کرے میرا بابا مجھے مل جائے...... یا پھر ویسے ہی مجھے موت آ جائے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں نے تمہیں رلایا ہے اور غلطی رونے والے کی نہیں ہوتی رلانے والے کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ بولو معاف کیا ہے یا نہیں؟''

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ''بابو سائیں! کہاں آپ کی شان...... کہاں میں گلیوں میں رلنے والی نیچ ذات...... آپ مجھے اتنا شرمندہ نہ کریں سائیں کہ میری جان ہی چلی جائے۔''

میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ تسلی آمیز

انداز میں اس کا کندھا تھپکا اور اسے نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوئی موئی کے پھول جیسی تھی۔ جلدی سے مرجھا جاتی اور جلدی سے کھل بھی جاتی تھی۔ اس نے اسکارف کے پلو سے اپنی نم آنکھیں صاف کرلیں۔ میں نے کہا۔ ''چلو اب دوبارہ دوستی ہوگئی ہے۔ اس خوشی میں کل دوپہر تمہیں ہوٹل سے اچھا سا کھانا کھلواؤں گا۔ تمہاری پسندیدہ بریانی......''

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ ''نہیں...... بابو سائیں! آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ ہم فضول خرچی نہیں کریں گے۔ ہم بریانی کھائیں گے لیکن خود پکا کر۔ آپ مجھے دو چار چیزیں لادیں، میں آپ کو سندھی بریانی کھلاؤں گی۔''

''پکاؤ گی کہاں؟''

''یہاں ساتھ والے کمرے کے پیچھے باورچی خانہ بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے بابو سائیں! بڑا صاف ستھرا ہے۔ برتن وغیرہ بھی ہیں۔''

''نہیں۔ میں تمہیں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنے دوں گا۔''

''نہیں بابو سائیں! آپ کے لیے پکا کر مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے بہت جیادہ اچھا لگے گا۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

اس کا انداز بالکل سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے رویے میں کہیں کوئی ذرا سی آلائش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے بالکل ایسے ہی بات کرتی تھی جیسے اپنے گھر کے دیگر افراد سے کرتی ہوگی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے لیکن اب سوجاؤ۔ رات بہت زیادہ ہوچکی ہے۔''

وہ بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے فرشی بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی گردن پر گھروچنے کا سرخ نشان ابھی تک نظر آرہا تھا۔ یہ نشان انہی اوباش لڑکوں کی بدتمیزی کا نتیجہ تھا جو راستے میں ہم سے ٹکرائے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ صبح ناشتے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ ان سندھی فیملیز کا سراغ لگاؤں جو یہاں تہران میں موجود تھیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ مہرو جلد از جلد اپنے وارثوں کے پاس پہنچ جائے یا کم از کم ایسے قابلِ بھروسا لوگوں کے پاس پہنچ جائے جو اسے اس کے وارثوں تک پہنچا سکیں۔

صبح مہرو کو سمجھا بجھا کر میں ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ہوٹل کا کارڈ جیب میں نہ رکھنے والی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ پاسپورٹ بھی میرے پاس ہی تھا۔ امین کا دیا ہوا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دو بسیں بدلیں اور پھر قریباً تین کلومیٹر پیدل چل کر اس ایڈریس تک جا پہنچا۔ یہ ایک سرکاری دفتر کی عمارت تھی۔ یہ جان کر مجھے ازحد حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی سندھی یا پاکستانی فیملی قیام پذیر نہیں تھی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا تھا۔ یہاں بس فرسٹ فلور پر بیرونِ ملک جانے والوں کو انجکشن وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ امین نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ اس سے امین کی نیت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ جاتے اور میں اسے اس کے حوالے کردیتا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں تھکا ہارا سہ پہر کے وقت واپس ہوٹل پہنچا۔ اس بات کا افسوس تو تھا کہ اس کے والی وارثوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا لیکن اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ ابھی وہ میری ہم سفر تھی اور کسی غیر یقینی صورتِ حال کا شکار نہیں تھی۔ ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی یہاں کسی سندھی فیملی کا سراغ نہیں ملا۔ وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

اس نے کمرے کو آئینے کی طرح صاف ستھرا کردیا تھا۔ ہر چیز قرینے سے اس کی جگہ پر رکھی تھی۔ میں ہوٹل آتے ہوئے مہرو کی بتائی ہوئی اشیا لے آیا تھا۔ یہ اسپیشل سندھی بریانی کی چیزیں تھیں۔ چاول، چکن، آئل، پیاز، لہسن اور مسالے وغیرہ۔ بریانی اس نے رات کو پکانی تھی، اس لیے دوپہر کی پیٹ پوجا کے لیے میں دو بڑے برگر اور لسی کی بوتلیں لے آیا تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے وہ اچانک بولی۔ ''آپ کی شادی ہوئی ہے بابو سائیں؟''

''ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کتنے بچے ہیں؟''

''بچہ ابھی کوئی نہیں۔''

''آپ کی زال کیسی ہے سائیں؟'' (زال یعنی بیوی)

''بہت اچھی...... بہت نیک۔''

''آپ اسے چھوڑ کر روزی کمانے نکل آئے ہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہوگی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ہاں، بہت یاد کرتی ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں میں دلہن بنی عارفہ کا چہرہ گھوم گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی تک حجلۂ عروسی میں بیٹھی منتظر نظروں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میرے قدموں کی چاپ کا انتظار کررہی ہے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہاری شادی کب ہورہی ہے؟''

اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں ایک دم رنگ سے بکھر گئے۔ شرما کر بولی۔ ''مجھے کیا پتا جی...... میرے بڑوں کو پتا ہوگا یا پھر میرے پا کو پتا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہارا اپنا کوئی خیال نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے اردگرد کوئی ایسا نہیں جو تمہارے ساتھ شادی کے لیے مناسب ہو؟''

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نہیں بابو سائیں۔'' میں نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم ہنسی کیوں ہو؟''

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بس ایسے ہی ہنسی نکل گئی بابو سائیں۔''

''ہنسی ایسے ہی تو نہیں نکلتی۔ کوئی وجہ ہوتی ہے۔''

''بس غلطی ہوگئی جی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اسے اس بارے میں تھوڑا سا کریدا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے تائے چاچے کے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا ہے جو اسے پسند کرتا ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے لیکن اسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ویسے بھی مہرو کی معصومیت ایسے معاملوں میں حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ بڑے عرصے بعد دل چاہا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ میرے اندر جو جان لیوا ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی، وہ کسی روحانی سہارے کا تقاضا کرتی تھی اور مصیبت میں خدا سے بڑا سہارا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ ساتھ مہرو کے لیے بھی دعا مانگنا چاہتا تھا کہ اس کا بھائی جلد سے جلد مل جائے اور وہ اس دیارِ غیر میں کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ اس سے بڑی مصیبت کیا تھی کہ اس کے پاس سفری کاغذات تک نہیں تھے۔ وہ کسی بھی وقت حوالات میں پہنچ سکتی تھی۔

مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگیا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرا تو میری نظر سب سے پہلے مہرو کے بھائی جعفر پر پڑی۔ جعفر کے ساتھ ہی سفید ڈاڑھی والا نور بخش نماز پڑھ رہا تھا۔ نور بخش کے ساتھ ہی ایک اور ادھیڑ عمر سندھی تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی کے بجائے بڑی سی پگڑی تھی۔ یہی لوگ مہرو کے وارث تھے۔ مجھے لگا کہ دعا مانگنے سے پہلے ہی دعا قبول ہوگئی ہے۔ سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں اٹھ کر اگلی صف تک پہنچا اور دراز قد جعفر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے...... آخری رنگ میں شدید حیرانی کے ساتھ ساتھ غصے کی جھلک بھی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا آٹھ دس قدم پیچھے آگیا۔ باقی دونوں افراد بھی ہمارے پیچھے آئے۔ جعفر تیز تیز کچھ بولنے لگا۔ مسجد کے صحن میں اس کی آواز بلند ہوتی چلی جارہی تھی۔

وہ یقیناً مہرو کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مہرو میرے پاس ہے اور خیریت سے ہے لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور چلانے لگا۔ وہ عربی میں کہیں کہیں اردو کے لفظ بھی بول جاتا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کروں۔

عمر رسیدہ نور بخش میرے اور جعفر کے درمیان آیا۔ اس نے جعفر کو بہ مشکل پیچھے ہٹایا۔ میں نے نور بخش سے کہا۔ ''تم اس کو سنبھالو۔ میں اسے بتا بھی رہا ہوں کہ مہرو میرے پاس ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔''

نور بخش کی اردو بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہرحال وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے جعفر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہاں ہے ہماری دھی (بیٹی) ہمیں جلدی سے اس کے پاس لے جاؤ۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم دیوانہ ہوگیا ہے سائیں۔''

پگڑی والا سندھی مجھے زاہدان والی بس میں نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً یہ یہاں کا کوئی مقامی سندھی ہی تھا۔ میں ان تینوں افراد کو لے کر ہوٹل میں پہنچا۔ مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی تو مہرو نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی اور وہ بریانی کے لیے پیاز وغیرہ کاٹ رہی تھی۔ اپنے سامنے اپنے بھائی کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوشی کی یورش ایک ساتھ نظر آئی۔ پھر وہ چلا کر اپنے بھائی جعفر سے لپٹ گئی۔ وہ بلند آواز میں رونے لگی تھی۔ عمر رسیدہ نور بخش مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

مہرو کے رونے سے دراز قد جعفر نے پتا نہیں کیا مطلب لیا۔ اس کے لمبوترے چہرے پر میرے لیے ایک بار پھر طیش کی لہریں دکھائی دینے لگی۔ بہرحال اگلے چار پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہوگیا۔ مہرو نے جعفر اور نور بخش کو تفصیل سے بتایا کہ میں نے اس سے کیا سلوک کیا ہے اور اس کے لیے کس کس طرح خود کو مصیبت میں ڈالا ہے۔

دونوں بزرگ میرے بے حد شکر گزار نظر آنے لگے تھے۔ جعفر کی نظریں بھی کچھ جھکی جھکی تھیں۔ نور بخش نے مجھے بتایا کہ انہیں زاہدان میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ لڑکوں کے

حملے کے بعد میں اور مہرو اکٹھے ہی بھاگے تھے۔ وہ تین چار دن زاہدان میں ہر ممکنہ جگہ پر مجھے اور مہرو کو تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس مسافر سرائے میں بھی پہنچے جہاں میں نے اور مہرو نے دو دن قیام کیا تھا لیکن جعفر اور نور بخش کے پہنچنے تک ہم سرائے سے ہوٹل شفٹ ہو چکے تھے۔ بہرحال جعفر وغیرہ کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم زاہدان سے تہران روانہ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ وہ ہم سے ایک دن پہلے ہی یہاں تہران پہنچے تھے۔

میں نے ان لوگوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ میں انہیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا لیکن انہیں جلدی تھی۔ وہ تہران کے مضافات میں ٹھہرے ہوئے تھے اور آخری بس روانہ ہونے سے پہلے بس اسٹینڈ پہنچنا چاہتے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ مہرو سمیت مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں بزرگوں نے مجھے بار بار گلے سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ جعفر کو بھی میرے ساتھ ہاتھ ملانا پڑا اور شکریے کا لفظ کہنا پڑا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا یا شاید مسکراتا ہی نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ دوسرا احسان تھا جو میں نے اس پر کیا تھا۔ پہلا احسان وہ تھا جب میں نے تفتان بارڈر پر، ریت میں دبے ہوئے شکنجے سے اس کی جان چھڑائی تھی، ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ہی ٹوٹ جاتی۔ اس کا یہ زخم اب کافی حد تک بہتر تھا۔ دوسرے احسان کو میں احسان تو نہیں کہہ سکتا، یہ ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے پورا کیا اور مہرو کو بخیر و عافیت اس تک پہنچایا۔ اس میں اللہ نے بھی بہت مدد کی...... خانۂ خدا میں نماز ادا کرتے ہوئے ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

وقتِ رخصت مہرو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ بابو صاحب۔'' اس نے کہا اور نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہیں میرے پاؤں کو چھو رہی تھیں۔ وہ جیسے ایک خاموش ادا کے ساتھ خود بھی میرے پاؤں چھو رہی تھی۔ ایک عجیب عقیدت ایک انوکھا سا احترام تھا اس کے انداز میں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ میں گناہ گار سا بندہ اتنے احترام کے قابل تو نہیں تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ زندگی کے سفر میں لوگ ایسے ہی ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ شب و روز کی مسافت کو اگر ریل گاڑی سے تشبیہ دی جاتی ہے تو کچھ غلط نہیں دی جاتی۔

سامنے میز پر چنے ہوئے چاول پڑے تھے۔ کٹا ہوا پیاز اور لہسن وغیرہ پڑا تھا۔ میں نے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالیں اور ہوٹل کے ایک ملازم کو دے دیں۔

اگلے روز کچھ اداسی سی رہی۔ ویک اینڈ گزرنے کے بعد ہوٹل میں بھی بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔ ہاں وہ امریکی وہیں تھا جو کل رات ہمیں سڑک پر ملا تھا اور ہم اس کی مدد سے اپنے ہوٹل کو پہچان سکے تھے۔ ناشتے کے بعد میں وقت گزاری کے لیے اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اینڈرسن نامی اس امریکن کو بتایا کہ میں آج کل شدید الجھن اور پریشانی کا شکار ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے بغداد کے ایک بہت بڑے ولی اللہ کے روضے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اینڈرسن نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ قریباً اٹھارہ سال سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ وہ اردو بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ہم تادیر لابی میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے۔ میں نے اینڈرسن سے کہا۔ ''آپ نے قریباً ساری دنیا گھومی ہے۔ آپ کو سب سے اچھے لوگ کہاں کے لگے؟''

وہ بولا۔ ''ایک قوم کی حیثیت سے، میری رائے کے مطابق سب سے سخت مزاج لوگ ایرانی اور مصری ہیں۔ یہ اپنے خیالات کے حوالے سے بے حد کرخت اور کٹر محسوس ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پاکستانیوں کے بارے میں آپ جناب کا کیا خیال ہے؟''

وہ بولا۔ ''میری رائے میں یہ اچھی اور سادہ قوم ہے۔ خوش اخلاق بھی ہے...... لیکن کچھ پاکستانی مجھے شریر بھی محسوس ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

اینڈرسن کے ساتھ اچھی گپ شپ رہی۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہاں بھی سری پائے بڑے ذوق و شوق سے کھائے جا رہے تھے...... اور بغیر روٹی کے کھائے جا رہے تھے۔ یہاں پلیٹوں پر مختلف بزرگوں کی تصویریں بنی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ لوگ ان تصویروں والی پلیٹوں میں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا اور ایک خوانچے والے سے دال روٹی کھا کر پیٹ پوجا کر لی۔ تہران باغات اور پھولوں کا شہر تھا۔ گلی کوچے جنت کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اطراف کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والا شفاف پانی، آبی گزرگاہوں سے گزرتا تھا اور تہران کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ باشندے...... شہر سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتے تھے۔ چاق و چوبند پولیس والے جدید بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکلز پر دندناتے پھرتے تھے اور کسی کو قانون شکنی کی

جرأت نہیں تھی۔ مجھے مہرو کا خیال آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ راستے میں ایک نہایت خوب صورت مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر میں ہوٹل پہنچا تو امریکن اینڈرسن گھومنے پھرنے کے لیے باہر جارہا تھا۔ ہم نے دور ہی سے علیک سلیک کی۔

کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے اور ٹی وی دیکھنے کے بعد میں سو گیا۔ دوبارہ میری آنکھ ایک شور سے کھلی۔ گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ معمول کے مطابق ہوٹل کا مین دروازہ بند ہو چکا تھا۔ امریکن اینڈرسن باہر تھا اور شور مچا رہا تھا کہ دروازہ کھولا جائے۔ ایرانی گارڈ بضد تھا کہ ٹائم اوپر ہو چکا ہے اب وہ کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گا۔ امریکن تقریباً آدھے گھنٹے تک شور مچاتا رہا اور انگریزی میں چلاتا رہا لیکن ایرانی گارڈ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ آخر گارڈ اپنے کیبن میں واپس چلا گیا اور امریکن بکتا جھکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

صبح سات بجے کے لگ بھگ جب ہوٹل کا دروازہ کھلا تو امریکن کو اندر آنا نصیب ہوا۔ وہ ساری رات نہ جانے کہاں خجل خوار ہوتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں ایرانی گارڈ کی ثابت قدمی پر خوش ہوا۔ اس نے امریکی بہادر کی سنگین دھمکیاں سننے کے باوجود اپنے اصول سے انحراف نہیں کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''مسٹر اینڈرسن! تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ایرانی قوم دنیا کی ''سخت ترین مزاج'' والی قوموں میں سے ایک ہے۔''

☆☆☆

ٹھیک تین روز بعد میں بھرے پرے تہران کو اور اس کی رونقوں کو خیرآباد کہہ کر عراق کا رخ کر رہا تھا۔ اپنے چند ہم سفروں کے ساتھ میں ایک آرام دہ بس میں سوار تھا۔ دو روز پہلے ہی ہمارے پاسپورٹس پر عراق کے ویزے بہ آسانی لگ گئے تھے۔ ویزے لگنے کے بعد اور ٹکٹ خریدنے کے بعد اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب ایک نیا سفر تھا، نئی سرزمین تھی، نئے لوگ، نیا جہاں۔ تاریخ اس خطے کے تذکروں سے بھری پڑی تھی۔ امیر معاویہ سے لے کر صلاح الدین ایوبی تک اور سلاطین عباسیہ سے لے کر سلاطین عثمانیہ تک نہ جانے کتنے فرماں روا یہاں آئے اور گئے۔ کتنی سلطنتیں آباد اور برباد ہوئیں......

ہماری بس بڑی تیز رفتاری سے پہلے بلند و بالا پہاڑوں پر چڑھی اور ہمیں شدید سردی کا مزہ چکھایا...... پھر بتدریج نیچے اتری...... اور اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ریگستانی علاقہ شروع ہو گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ہم عراق میں داخل ہونے والے ہیں۔ بلندی سے نشیب کا یہ سفر قریباً آٹھ دس گھنٹے پر مشتمل تھا۔ آخر بالکل خشک میدانی علاقہ آ گیا...... آب و ہوا یکسر بدل گئی۔ تھوڑے مزید سفر کے بعد ہم ایران عراق بارڈر پر پہنچے۔ بارڈر پر ایک طرف شاہ ایران کا بلند و بالا مجسمہ تھا اور دوسری طرف صدر صدام حسین کا۔ وہ جیسے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے...... ایک کہہ رہا تھا، میرے پاس زیادہ ''تیل'' ہے، دوسرا کہہ رہا تھا میرے پاس زیادہ ''ترقی'' ہے۔

گاڑی یہاں رک گئی۔ ہمارے کاغذات وغیرہ چیک ہوئے۔ تب ہم ایک عراقی بس میں سوار ہوئے اور عراق میں داخل ہو گئے۔ عراقی بس میں بیٹھ کر پاکستان کی کھٹارا بسوں کی یاد تازہ ہو گئی اور صرف بس ہی نہیں اردگرد کے سارے مناظر بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ علاقہ خشک اور بنجر۔ بغیر فٹ پاتھ کے خستہ حال سڑکیں، بوسیدہ مکانات، کچھ یہی حال لوگوں کا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عراقیوں کی اکثریت نے لنڈے کے کپڑے زیب تن کر رکھے ہیں۔ ہماری بس چند گھنٹوں تک خشک میدانی علاقوں میں دھول اڑاتی رہی اور آخر بغداد پہنچ گئی۔ بغداد کہانیوں اور داستانوں کا شہر جو لاتعداد مرتبہ اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ بغداد سے میرا پہلا تعارف بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں مثلاً بغداد کا چور اور الہ دین وغیرہ سے ہوا تھا۔ اب وہی تصوراتی شہر میرے سامنے تھا اور میں اسے اپنی آنکھوں سے جیتی جاگتی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ بغداد کی مساجد سے شام کی اذان بلند ہو رہی تھی۔

ہماری بس شہر کے ایک مضافاتی اسٹینڈ پر رکی تھی۔ میں نے راہ گیروں سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کا پتا پوچھا اور پیدل ہی چل دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا لمبا ثابت ہو گا۔ میں گنجان علاقے میں داخل ہوا تو اصل راستے سے ہٹ گیا۔ پرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پرانے بازار، محرابی دروازے، قدیم بالکونیاں اور تنگ راستوں پر چلتے پھرتے لوگ۔ سب کچھ کہانیوں کے مناظر جیسا لگا۔

بہت زیادہ چلنے اور تھک کر چور ہونے کے بعد میں رات کوئی ساڑھے گیارہ بجے غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے پر پہنچا۔ ایک عجیب طرح کے روحانی احساس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کہ میں زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ نماز پڑھنے میں بھی باقاعدگی نہیں تھی اور اللہ والوں کے پاس یا ان کے مزارات

پر جانے کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا...... لیکن پچھلے دنوں میں جن سنگین حالات سے گزرا تھا اور میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ مچی تھی اس نے مجھے، اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ کیا تھا اور مجھے روحانی سہاروں کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد مبارک کو دیکھ کر میرے دکھ یلغار کر کے میری آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ جیسے کوئی دکھوں کا مارا بچہ اپنے کسی شفیق بزرگ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، میں بھی رو دیا۔ ہچکیوں اور آہوں سے میرا سینہ دہلنے لگا۔ نہ جانے میں کتنی دیر اسی طرح اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتا رہا۔ آخر دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، مزار کا دروازہ رات گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ بند دروازے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میرے اندر کا وجدانی جوش مجھے اندر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ میں نے آہنی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد ایک خادم نظر آیا۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ بال منتشر تھے۔ اس نے عربی میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟

میں نے اشاروں کی زبان اور انگلش کو ملا جلا کر اسے بتایا۔ ”میں ایک مسافر ہوں۔ یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں۔“

وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں یا پھر چوری کی نیت رکھتا ہوں۔ اس نے کرخت لہجے میں عربی بولی اور مجھے بتایا کہ وہ اس وقت میرے لیے دروازہ نہیں کھول سکتا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی واپس چلا گیا۔

میری دلی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ آنسو مسلسل آنکھوں سے رستے چلے جا رہے تھے۔ میں کسی دھتکارے ہوئے بھنک منگے کی طرح باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ بدن تھکن سے چور تھا۔ رات تو کسی طرح گزارنا ہی تھی۔ اردگرد تاریکی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں مجھے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آبائی قبرستان کا چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ اگر فٹ پاتھ پر ہی بیٹھا رہتا تو گشتی پولیس والے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دیتے۔ میں اٹھا اور غنودگی کی سی حالت میں چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا۔ رات کے اس پہر یہ شہر خموشاں کچھ اور بھی خاموش و سنسان نظر آ رہا تھا۔ قبروں کی طویل قطاریں تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں دو قبریں نمایاں نظر آتی تھیں جن پر سنگِ مرمر لگا ہوا تھا۔ یہ ڈرانے والے مناظر تھے لیکن موت سے بڑا ڈر کس چیز کا ہوتا ہے...... اور میں تو جیسے زندگی اور موت کے احساس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ شاید میں اسی وقت مر گیا تھا جب اپنے گھر کی چھت پر میرے اندر کی ساری روشنیاں اچانک بجھی تھیں اور میں اپنی منتظر دلہن کو چھوڑ کر نکل آیا تھا۔

میری ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ میں ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر شیخ عبدالقادرؒ کے مزار کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں روشنی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو کھڑکی میں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر مبارک بھی نظر آئی۔ ایک بار پھر میں ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں پکار کر کہا۔ ”حضرت! دیکھیں آپ کا یہ فقیر کہاں کہاں سے دھکے کھاتا ہوا آپ تک پہنچا ہے۔ اس کا جسم تھکن سے چور ہے اور روح اس سے بڑھ کر زخمی ہے لیکن آپ کے محافظوں نے اسے دھتکار دیا ہے۔ اسے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دے رہے اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی پہنچنے دیں گے یا نہیں...... “

میں روتا رہا اور پھر نڈھال سا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ نیند آ رہی ہے۔ میں کہیں بھی لیٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔ سامنے ہی سنگِ مرمر کی دو قبریں ساتھ ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ یہ قبریں اوپر سے اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ سائبان سا بن گیا تھا۔ اب قبرستان میں تھوڑی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ان دونوں قبروں کے درمیان خلا میں گھس کر لیٹ گیا۔ اپنے بوٹ اتار کر میں نے تکیے کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے تھے۔ یہ عجیب رات تھی اور یہ سونا بھی عجیب سونا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ دائیں طرف والی قبر سے کسی ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ نکلا ہے اور اس نے مجھے اپنی قبر کے اندر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بائیں طرف والی قبر میں پراسرار حرکت محسوس ہوئی اور میری سماعت سے کسی عورت کی مدھم ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ مجھے پتا تھا یہ سب میرے واہمے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا لیکن میری یہ نیند زیادہ طویل نہیں تھی۔ شاید آدھ پون گھنٹا ہی گزرا ہوگا، اچانک میں جاگ گیا۔ مجھے پھر محسوس ہوا کہ کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس مرتبہ مجھے پہلو کی طرف سے نہیں بلکہ پاؤں کی طرف سے کھینچا جا رہا تھا...... اور یہ یقیناً وہم نہیں تھا۔ کوئی تھا وہاں ..... جو مجھے کھینچ رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں مجھے یہی لگا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

(جاری ہے)